دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
نومبر 2010
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ — 11
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

تارِ عنکبوت — ایچ اقبال — 18
آتش انتقام کو سرد کرنے کی کوشش میں جرم کی
راہ اختیار کرنے والے نوجوان کی سرگزشت

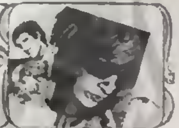
وش کنیا — منظر امام — 60
موت سے محبت کرنے والے محبوب کی
کہانی موت اسے زندگی دان کر گئی تھی

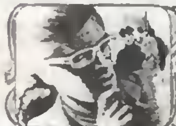
پیش گو — آصف ملک — 67
اسرار و تحیر کی دھند میں ملفوف
مجرم کی تلاش کا پر تجسس ماجرا

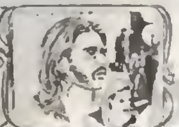
صورت گر — مختار آزاد — 81
قناعت پسند مصور کی کتھا، اسے وہ سب
کچھ ملنے والا تھا جس کا وہ تمنائی نہ تھا

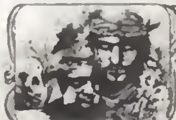
للکار — طاہر جاوید مغل — 96
محبت کے محاذ پر لڑتے ہوئے شخص کی جدوجہد...
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

تیسری کہانی — محمد عفان آزاد — 141
اس جیلر کا قصہ جو خطرناک مجرموں کی
موجودگی میں اپنی جیل کو محفوظ تصور کرتا تھا

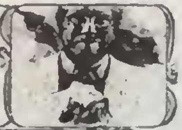
کرتب — سلیم انور — 151
پولیس اور مجرم کے درمیان کھیلی
جانے والی دلچسپ آنکھ مچولی.....

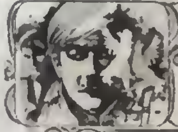
گرداب — اسماء قادری — 156
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چال بازی مقدر
کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

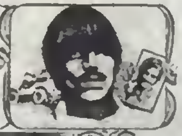
قسمت ظریف — کاشف زبیر — 185
جلیل کا نیا کارنامہ..... لبوں پہ
مسکراہٹیں بکھیر دینے والا سلسلہ ہنگامہ

بااصول — بابر نعیم — 209
ایک اصول پسند قاتل کا احوال.....
قارئین کے لیے مختصر توشۂ خاص

ملوث — محمد فاروق انجم — 211
اس جھکی بوڑھے کا ماجرا، جس کی
بدزبانی سے سب تنگ آ چکے تھے

نقشِ پا — سنیم فاروقی — 219
بااصول استاد کی کہانی..... جس پر
دیانت داری کا جرم ثابت ہو گیا تھا

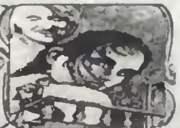
اصلی نقلی — شبنم شفیق — 258
سفاک دل جاگیردار کا فسانۂ حیات....
ہر کوئی اس کی جان اور مال کے درپے تھا

جلد 39 • شمارہ 11 • نومبر 2010 • زر سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی نکتہ چینی

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من... السلام علیکم!

نومبر 2010ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ کہانی کی تاریخ بہت پرانی ہے... شاید یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ ان دو انتہاؤں کے بیچ نت نئے انداز، انوکھے کردار، پہلودار واقعات اور پُرپیچ قصے ان گنت کہانیوں کے تانے بانے بنتے رہیں گے۔ ہمارے اور آپ کے گرد و پیش میں ہر طرف کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں... ان میں دکھ دینے والی کہانیاں بھی ہیں اور دل و دماغ کو تازہ کرنے والی کہانیاں بھی... جو پچھلے لوگوں نے پڑھا... وہ آج کی کہانیوں سے بہت مختلف تھا، جو آنے والے پڑھیں گے وہ آج جیسا نہ ہوگا... ہاں، انسان اور اس کے احساسات و جذبات ہمیشہ ایک ہی رہیں گے... گرمی اور بہار کا موسم گزرنے کے بعد... اب سرمائی رت ہے جس میں خزاں رسیدہ خشک پتے درختوں سے ٹوٹ کر قدموں تلے آکے چرمراتے ہیں... ایسے میں بستروں میں دبک کر کہانیاں پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور ہم آپ کی ان معصوم خواہشات کا برسوں سے احترام کرتے آئے ہیں۔ اس موسم کی ایک خوبی یہ ہے کہ بجلی والوں کی اندھیر نگری اور ستم رانی کے اثرات ذرا کم ہو جاتے ہیں۔ دل گھبراتا ہے، نہ پسینہ آتا ہے۔ دعا کریں کہ یہ موسم سدا یونہی رہے... پر یہ ہونا ممکن نہیں تو پھر اپنے ربِ ذوالجلال کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں... گیس، تیل اور بجلی والوں کے پتھر دل نرم ہوں... وہ تیز، مؤثر اور ایمان دارانہ منصوبہ بندی کر کے کراچی سے چترال تک کے بندگانِ خدا کو اپنے دیے اندھیروں سے بچائیں۔

ان اندھیروں سے نکل کے آپ کی روشن محفل میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ نے الفاظ کے کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں۔

قمر تقی، کہوٹہ راولپنڈی سے لکھتے ہیں "انتظار کی آگ میں جلتے ہوئے بندۂ ناچیز کو اس کی دوائیعنی جاسوسی ڈائجسٹ 4 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق پر موجود حسینہ کافی عرصے کی شادی شدہ لگ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اعلیٰ درجے کا بدمعاش ہاتھ میں موجود نئے پستول کی نمائش کر رہا تھا اور دوسرے آدمی کا منہ کسی خوفناک چیز کے دیکھنے سے کھلا ہوا تھا۔ اس بار انکل نے اپنی ساری محنت حسینہ کے بجائے اس گنجے آدمی پر لگائی جس کا سر بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ بہرحال، اشتہارات کی دیواروں کو پھلانگتے ہوئے دوستوں کی محفل میں پہنچے جہاں عذرا ہاشمی کرسیِ صدارت پر براجمان تھیں۔ بہت بہت مبارک باد قبول کیجیے۔ تصویر العین صاحبہ! اگر جاسوسی کے سحر نے جکڑا نہ ہوتا تو ہم اس کے لیے بے چین نہ ہوتے۔ ایک مہینے کا انتظار بھی کتنا دشوار ہوتا ہے، یہ بات ہمارے دل سے پوچھیے۔ محمد شبلی صاحب! انفال اینڈ صبا مرزا کو زیادہ مکھن نہ لگائیں۔ ایسا نہ ہو کہ... انفال اینڈ صبا مرزا صنفِ نازک تو ہوتی ہی چینی کے شیرے میں کالی مرچیں ڈالنے کے لیے۔ گرل فرینڈ ہو تو بیوی کا ڈر اور بیوی ہو کر سانس بھی نہیں لینے دیتی۔ ہم بے چارے مردوں کے لیے ہمیشہ صنفِ کرخت کا لفظ اور پیسا کمانا... اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے سلیم فاروقی کی نیشِ عشق پڑھی۔ کہانی کا موضوع پرانی فلموں کی طرح تھا۔ مصنف سے گزارش ہے کہ کسی نئے موضوع پر کہانیاں لکھیں۔ محمد عفان آزاد کی تحریک ایک اچھی کہانی تھی۔ سالہا سال گزرنے کے باوجود قدرت نے آخر مجرم کو گرفت میں لے ہی لیا۔ مختار آزاد کی دماغ فروش جاسوسی کے معیار کے مطابق تھی۔ اس کے بعد اپنی ہر دل عزیز للکار پڑھی۔ تابی تو اب مرد کا بچہ بنا ہے لیکن عمران کے بغیر ان کی جوڑی مکمل نہیں ہے۔ جاوید انکل کی کردار پر گرفت مضبوط بلکہ بہت مضبوط ہوتی ہے۔ چاہ کن میں سلطان نے ایک بے گناہ پر الزام لگانا چاہا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ قدرت ہماری تقدیر لکھتی ہے۔ ہم جتنی بھی چالاکی اور طاقت آزمائیں، تقدیر نہیں بدل سکتے۔ قاتل گھنٹی میں ایک رائٹر نے جس چیز سے تنگ آکر دو خون کیے، اسی چیز نے اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا۔ گرداب میں اسما قادری صاحبہ شاید بیک وقت اتنے کرداروں پر گرفت نہیں رکھ سکتیں جیسا کہ پہلے اکرم خان، سجاد رانا، رانی، عمران اور اب مہتاب۔ ہر قسط میں کوئی نہ کوئی کردار ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ماہ بانو پھر اکیلی رہ جائے۔ چالاک احمق میں پولیس کی بروقت آمد نے ان دونوں احمقوں کی زندگی بچالی۔ ویسے بھی وہ کوّے کی طرح ہنس کی چال چلنے لگے تھے اور ظاہر ہے انہیں پکڑ میں آنا تو تھا۔ کیا واقعی احمقوں کا انجام بلکا ہوتا ہے؟ اس کا جواب تو دوستوں آپ ہی بتاؤ کیونکہ آپ کی تو اس ڈائجسٹ میں لائن لگی ہوئی ہے۔ اس بار اسٹوری آف دی منتھ کچھ پھیکی رہی۔ واقعی کاشف زبیر کی کسی کہانی میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ ہر کہانی کا ایک الگ موضوع اور خوب صورت بیان ہوتا ہے۔ کہانی اتنی جاسوسی سے بھرپور تھی کہ ہم اس میں کھو گئے۔ پہلا رنگ انسان میں موجود بے حسی، درندگی، مکاری اور ہوس پرستی کی عکاسی تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خون کے رشتے کیوں پانی سے بھی زیادہ پھیکے ہو گئے ہیں۔ احمد اقبال صاحب! آپ جب کچھ لکھتے ہیں کمال کر دیتے ہیں اور آتے ہی چھا جاتے ہیں۔ عامر خاں پاکستانی جیسے کردار پاکستان میں بکھرے پڑے ہیں جنہیں پوری زندگی کانٹے سہنے پڑتے ہیں لیکن ہر کسی کو پیسا ایک بریف کیس میں نہیں ملتا۔ کچھ اسی حالت میں زندگی ہار دیتے ہیں اور کچھ حلال حرام کی تمیز لیکن اب بھی یہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جن میں غیرت اور خودداری اب بھی باقی ہے۔"

مبارک احمد محمود کا اظہارِ رائے ضلع چنیوٹ سے "سرورق اس بار دل کو موہ لینے والا تھا جس کی دلنشیں آنکھیں اور گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کے ہونٹ غضب ڈھا رہے تھے۔ ساتھ میں بلیو کلر کی موجودگی آنکھوں کو بھلی لگی۔ ہاتھ میں پسٹل لیے آدمی کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ حلقۂ یاراں میں پہنچے تو کرسیِ صدارت پر عذرا ہاشمی صاحبہ براجمان تھیں۔ ان کا تبصرہ واقعی اچھا لگا۔ جعفر حسین صاحب کا تبصرہ معنی خیز ہوتا ہے۔ ہمایوں سعید بھی اپنے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ اچھے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ تصویر العین صاحبہ اپنے مختصر مگر جامع تبصرے کے ساتھ آئیں۔ اسی طرح آتی رہا کریں۔ آپ کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے۔ ماہا ایمان صاحبہ کو حج کی سعادت پر جانے کے لیے مبارک باد۔ ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اس کے بعد پسندیدہ اسٹوری للکار پڑھی۔ طاہر انکل کی عمدہ کاوش ہے اور دیوی کی طرح سپر ہٹ جا رہی ہے۔ کچھ ثروت کو بھی سامنے لائیں۔ گرداب بھی اچھی جا رہی ہے۔ ویلڈن اسما قادری صاحبہ۔ گمشدہ

کل، احمد اقبال کی مزاح اور رومانس کے ساتھ ایک اچھی تحریر تھی۔ کٹھ پتلی کی کچھ سمجھ نہ آئی۔ کاشف صاحب سے درخواست ہے کہ جلیل کو بھی واپس لائیں۔ یہ کردار ہمیں بہت پسند ہے۔ زر، زن، زمین ایک عام مگر سنسنی خیز کاوش تھی۔ سلیم فاروقی کی نیشِ عشق عام سی ہونے کے باوجود اچھی لگی۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

عقیل عابد امروی کھاریاں سے پہلی دفعہ حاضر ہوتے ہیں "میں جو کہ جاسوسی کا خاموش قاری ہوں، آج قلم اٹھانے پر مجبور ہو ہی گیا ہوں۔ اس دفعہ جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل گرل کی آنکھیں اس شخص پر جمی تھیں جو کہ شاید انجانے میں اپنے دشمن کا وار سہہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت زدہ تھیں کہ یہ کیا ہو گیا اور سینٹر میں گنجا عینکو وار کر کے مسکرا رہا تھا۔ اشتہارات کا سرسری جائزہ لے کر چینی، نکتہ چینی کا ابتدائیہ اور دوستوں کے خطوط پڑھے۔ مدیر صاحب نے ٹھیک بتایا کہ لیاقت علی خان کے قتل سے جو سازش ہوئی وہ آج بھی محسوس ہوتی ہے اور آگے ہمارے ملک کی ڈور مختلف حکمرانوں کے پاس ہے جدھر چاہے لے جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو سلامت رکھے، آمین۔ اس کے بعد سیدھے للکار پر جا کر رکے اور اس کے مطالعے میں غرق ہو گئے۔ طاہر جاوید صاحب نے جس طرح للکار کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے مزہ آ گیا۔ مغل صاحب کو اتنا اچھا لکھنے پر مبارک ہو کہ انہوں نے ایسی کہانی تخلیق کی جسے پڑھ کر ہمیں اپنے اندر جینے کا درس ملتا ہے۔ اسما قادری اس دفعہ فارم میں نظر آئیں۔ افضل کی فیملی کا افسوس ہوا جو کہ لگتا ہے اب خود بھی اس کہانی سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ اسامی! کتنے لوگ آپ نے اس کہانی میں مروا دیے، اب بلنڈا کو میجر ذیشان سے ٹکرا دیا۔ میجر صاحب جو کہ ملک کے لیے جان بھی قربان کر سکتے ہیں، بلنڈا کے سحر میں گرفتار ہو کر کہیں ماہ بانو کو کراچی چھوڑنے کے بعد گوری میم کو سب کچھ نہ بتا دیں۔ شہریار اور ماہ بانو کا ملن سین بہت اچھا لگا، ویل ڈن اسامی۔ نیشِ عشق سلیم فاروقی صاحب کی کچھ تیز رفتاری میں دکھائی دی۔ ملاقات ہوئی... پیار ہوا... بیاہ ہوا اور دی اینڈ آف ڈیتھ۔ تصور العین صاحبہ! میں نے کچھ لڑکیاں دیکھی ہیں جنہیں مہندی پسند نہیں۔ آپ ٹائٹل گرل کو انہی میں تصور کر لیں۔ ماہا ایمان آپ کو عمرے کی بہت مبارک۔ محمد عفان آزاد نے چالیس سال پرانے مُردے اکھاڑے، پڑھ کر مزہ آ گیا۔ مجرم چاہے جتنا بھی اپنے گناہ پر پردہ ڈالے قاتل ایک نہ ایک دن بے نقاب ضرور ہوتا ہے۔ منظر صاحب کی سیلاب کے بعد اچھی کاوش تھی۔ پہلا رنگ زر، زن، زمین تنویر صاحب کی بہت اچھی تحریر تھی۔ واقعی حقیقی رشتے زمین، جائداد کے لیے کیا کیا ظلم نہیں کر سکتے۔"

عذرا ہاشمی کی تنقید گزہ موڑ سے "یقین ہو گیا کہ واقعی چینی، نکتہ چینی میں ہر کسی کا خط بلاتفریق و امتیاز شائع ہو سکتا ہے۔ اپنی محفل میں راج صاحب، جعفر حسین، تصور العین، ماہا ایمان اور کبیر عباسی کے تبصرے بہت شان دار تھے۔ جن جن احباب کو ہمارا تبصرہ پسند آیا، ان کا پیشگی شکریہ اور ادارے کا شکریہ کہ ہمارے خط کو اس قابل سمجھا۔ ماہا ایمان آپ کو حج بیت اللہ کی پیشگی مبارک باد اور منظر امام کے بارے میں ہماری رائے بھی آپ سے ملتی جلتی تھی لیکن اب یہ رائے بدل رہی ہے۔ اس ماہ کی ان کی تحریر اس بات کا ثبوت ہے۔ ماہ تاب گل رانا آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا اور آپ تو ویسے بھی ہماری نند کے سسرالی شہر سے ہیں۔ ہم عنقریب چند روز کے لیے آپ کے شہر آنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس ماہ ہماری پیش گوئی سچ ثابت ہو گی۔ نیا کردار باروندا جیکی کھل کر سامنے آیا۔ اس کی دکھ بھری کہانی نے بہت مغموم کیا۔ چھوٹے سرکار کی خفیہ پشت پناہی سے کہانی میں طاقت کا توازن قائم ہو گیا۔ مغل صاحب! اگر آپ تابش کو جیکی سے تربیت دلوا کر عمران کی جگہ فرسٹ ہیرو کے طور پر لانا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن ہماری گزارش اپنی جگہ قائم و دائم ہے اور وہ ہے عمران کی واپسی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ گرداب میں اسما قادری صاحبہ کرداروں سے خوب انصاف کر رہی ہیں اور لائقِ داد و تحسین ہیں۔ گرداب اس بار للکار سے بھی نمبر لے گئی۔ میری ذاتی رائے کے مطابق گرداب بہت لمبی چلنے والی ہے اور اس کا پلاٹ بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔ نیشِ عشق بہت پسند آئی لیکن اینڈ میں شاید صفحات کی کمی کی وجہ سے مصنف نے کہانی کو بہت جلدی میں سمیٹ ڈالا۔ باقی کہانیوں میں عامر خاں پاکستانی کی سرگزشت گمشدہ کل پہلے نمبر پر رہی۔ دوسرے نمبر پر زر، زن، زمین رہی۔ پرانا موضوع ہونے کے باوجود ریاض صاحب کے قلم اور بہن کے پیار نے اپنا سحر قائم رکھا۔ دو کہانیاں مشترکہ طور پر تیسرے نمبر پر ہیں۔ سیلاب کے بعد اور دماغ فروش۔ سیلاب کے بعد میں مولوی شہاب الدین کی حسرت ناک موت نے خاصا دکھی کر دیا۔ دماغ فروش میں کریگن کا قابلِ تعریف کردار پڑھ کر دل سے بے ساختہ خواہش دعا بن کر نکلی کہ کاش کریگن جیسے پولیس آفیسر ہمیں بھی نصیب ہوتے۔ ایسے آفیسرز موجود تو ہیں لیکن ان کو کوئی کام کرنے دے تب نا۔ تحریک، چاہ کن، قاتل گھنٹی، بہروپیا اور چالاک احمق بہت اچھی تو نہیں لگیں صرف اچھی لگی ہیں۔ پورے ڈائجسٹ میں صرف کٹھ پتلی بالکل اچھی نہیں لگی۔ کاشف زبیر صاحب، پیشگی معذرت کے ساتھ کہ اگر ہمیں اس طرح کی کہانیاں ہی پڑھنی ہیں تو فلمیں کیوں نہ دیکھ لیں جن میں مناظر ہوتے ہیں، الفاظ کی صورت میں منظر کشی نہیں اور ہمیں پختہ یقین ہے کہ ہماری یہ تنقید ہمارا خط شائع ہونے کی صورت میں حذف کر لی جائے گی جس کا ہمیں شدید صدمہ بھی ہو گا۔"

محسن آفریدی کی پسندیدگی بالاکوٹ سے "اس مرتبہ جاسوسی خلافِ معمول 4 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر موجود دلکش حسینہ نے آنکھوں کے راستے دل میں جگہ بنائی۔ دراز میں موجود ڈریکولا نما آدمی پستول لیے جانے کس کو تلاش کر رہا تھا۔ ساتھ موجود آدمی شاید ڈر کے مارے چلّا رہا تھا، ہمیں تو کم از کم یہی لگا۔ اس ماہ ٹائٹل بے انتہا خوب صورت تھا۔ پرواز کرتے ہوئے اپنی محفلِ دوستاں میں پہنچے۔ اپنے نامے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور اپنا نام پا کر ہم پر شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کرسیِ صدارت پر عذرا ہاشمی اپنے طویل تبصرے کے ساتھ موجود تھیں جسے پڑھتے ہوئے یقیناً سب کے سر میں درد ہو گیا ہو گا۔ بہرحال، مبارک باد دینا رسمِ دنیا ہے اس لیے مبارکاں ہی مبارکاں۔ ماہا ایمان، تصور العین، ہر خوب صورت لڑکی کیا آپ کو ہی دیکھتی ہے؟ ماہا ایمان ہمارے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ دلنشین جی! آپ نے بہت جلد میدان چھوڑ دیا۔ شہزادہ کو ہسار جی! آپ کے دیکھنے سے جو بجلیاں اس پر گریں ان کے تاثرات تو اس کے چہرے سے ہی عیاں تھے، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ نومی اے، آسیہ خان کہاں ہیں؟ مرزا صاحب کوئی بات نہیں برداشت کر لیں گے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس ماہ للکار کچھ خاص نہیں تھی۔ عمران کے بغیر کہانی مزہ نہیں دے رہی۔ انکل جی! عمران کو واپس لائیں پلیز... اس کے بعد گرداب پڑھی۔ آخر کار ماہ بانو شہریار تک پہنچ ہی گئی۔ افضل کا کردار بہت پسند آیا۔ دوست ہو تو ایسا۔ کاشف زبیر کے قلم کا ایک اور شاہکار کٹھ پتلی پڑھی۔ میں ایما کو ہی قاتل سمجھ رہا تھا لیکن قاتل کلارا نکلی۔ یہی جاسوسی کی شان ہے، جو سوچو ہوتا نہیں۔ رنگوں میں پہلا رنگ کچھ خاص نہیں تھا۔ دوسرا رنگ شان دار تھا۔ منظر نگاری اور کردار نگاری بھی خوب صورت تھی۔ احمد اقبال لاجواب قلم کار ہیں۔ چالاک احمق ایک دلچسپ تحریر تھی۔ زیادہ عقل مندی بھی اچھی نہیں ہوتی۔

باقی سب قلم کاروں نے بہترین کہانیاں لکھیں۔"

ہمایوں سعید راج بنوں سے لکھتے ہیں "اس دفعہ جاسوسی سے نگاہیں ملائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ولن ٹائپ گنجا ڈاکٹر پستول سمیت وارڈ میں داخل ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کا یہ روپ دیکھ کر ملیریا اور ہیپاٹائٹس سے بے حال عابد جان پر سکتہ طاری ہو گیا ہے اور اب وہ منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے آنے والے ڈاکٹر کو دیکھ رہا ہے۔ دوسری طرف شفاف چہرے اور خوب صورت ہونٹوں والی حسینہ بے تاثر اور سپاٹ چہرہ لیے بڑی بے نیازی سے یہ کارروائی دیکھ رہی ہے۔ عذرا ہاشمی اپنی داستانِ حیات سمیت حاضر تھیں۔ اپنی نجی زندگی کی خوش گوار یادوں کا تڑکا لگا کر آپ نے چینی، نکتہ چینی کو ذائقے دار بنا دیا۔ صرف یہ سمجھ نہیں آیا کہ ان کے "بہن جی رونگ نمبر" کہنے سے آپ کے گھر میں قیامت کیوں آ گئی؟ ماہا ایمان ایڈوانس میں دیدارِ کعبہ مبارک ہو۔ پلیز، اپنے راج بھیا کے لیے خصوصی دعا کرنا۔ ولی عہد عباسی صاحب! آپ کے جاوید شیخانہ انداز نے تو بہت سے دلوں پر بجلیاں گرا دیں۔ محسن صاحب! ہم جولیٹ کے لیے رومیو، سمرن کے لیے راج، شیریں کے لیے فرہاد، ہیر کے لیے رانجھا اور لیلیٰ کے لیے مجنوں بننے میں ایک سیکنڈ نہیں لگاتے۔ دلنشین کے لیے کڑا فکریہ۔ سلیم شبلی اپنی بے تابی کی تاب نہ لاتے ہوئے سیلابی ریلے کے مانند ٹیکسلا کے کھنڈرات میں اضافہ کرنے، ٹیکسلا میں داخل ہونے والے ہیں۔ زاہد صاحب! کوئی برسوں تک جاسوسی کا قاری ہو، ناممکن۔ رانا صاحب! ہاجمولا استعمال کریں، سب کچھ ہضم ہو جائے گا۔ مرزا فیملی! آپ سے کس نے کہا کہ ٹرپل ایس کو برداشت کیا جا رہا ہے؟ ارے وہ تو ہماری آنکھ کا تارا ہے۔ اختر صاحب! اب وضاحت کیوں کر رہے ہو یار! راج کا دل بہت بڑا ہے، چلو معاف کیا۔ یمنی جی! راج کو اعتراض ہے کوئی بھی خاتون دوسری خاتون کو ناز و ادا سے نہیں دیکھتی، نیور۔ اسامی کی ناقابلِ فراموش داستان گرداب بہت کامیاب جا رہی ہے۔ اسامی بڑی خوب صورتی سے اِدھر اُدھر بکھری کہانی کو سمیٹ رہی ہیں۔ مہتاب اور بچوں کی موت افضل کے کسی رقیب کے سر تھوپ دی، نہ جانے کیوں؟ حالانکہ چودھری کے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تخفیف سے نامۂ اعمال کی سیاہی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کم و بیش ایک سال بعد ماہ بانو اور شہریار کی ملاقات ہوئی، اچھا لگا۔ نیشِ عشق سلیم فاروقی کی شاہکار کہانی ثابت ہوئی جس میں دو دلوں کا چٹانوں سے ٹکرانا، عشق، دوستوں کی لازوال قربانی، بھائی کی جذباتی محبت، دولت، جائداد اور حسب نسب پر کھڑی نام نہاد ان کی عمارتیں، نفرت اور محبت کے سنگم پر کھڑے والدین اور ان کے جذباتی فیصلے غرض سب کچھ اپنی مثال آپ تھے۔ زر، زن، زمین کے خونی تکون پر مشتمل تنویر ریاض کا پہلا رنگ زبردست رہا۔ مسکان خونی رشتے کی محبت سے سرشار اپنے بھائی کو جہنم سے نکالنے کے لیے نبرد آزما ہوئی اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ احمد اقبال کے گمشدہ کل نے 8 اکتوبر کے زلزلے کا ذکر کر کے ہمارے زخم تازہ کر دیے اور ساتھ یہ بھی باور کرا دیا کہ ہماری فطرت اس سانپ کی سی ہے جو پہلے اسی کو کاٹتا ہے جو اسے دودھ پلاتا ہے۔ عامر خاں پاکستانی سے زیادہ اس کے ضمیر صاحب نے متاثر کیا۔ منظر امام کی سیلاب کے بعد نام پڑھ کر جو امیج ہمارے ذہن میں بن چکا تھا، وہ کہانی اس پر پوری نہیں اتری۔ بہرحال، اچھی کہانی تھی۔ چاہ کن تو حد سے زیادہ پسند آئی۔ اتنے غیر یقینی انجام کی واقعی توقع نہیں تھی۔ قاتل گھنٹی، گھنٹی سے الرجک ایک رائٹر کی دلچسپ کہانی تھی۔ الرجی جان لیوا ہوتی ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر ثابت بھی ہو گیا ہے۔ رائٹر صاحب نے پولیس کو فون کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار دی۔ آصف ملک کی چالاک احمق بہت اچھی لگی۔ ویسے وہ دونوں اپنی حماقت کے باعث نہیں بلکہ موڈی کی ذہانت کی وجہ سے پکڑے گئے اور موڈی گروپ پولیس کی ذہانت کے باعث پکڑا گیا۔ یعنی ان ڈائریکٹلی دونوں احمقوں کی جوڑی پولیس کی مستعدی کی وجہ سے زندہ بچ گئی۔"

اعجاز احمد کی یادیں اور باتیں ساہیوال سے "ماہ اکتوبر میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نہ جانے کیوں دلِ ویراں کا موسم اس ماہ کیوں بدل جاتا ہے۔ گزرے ماہ و سال یادِ ماضی بن کر دل کی تڑپ بڑھا دیتے ہیں۔ (ایسی بھی کون سی یادیں ہیں...) بہرحال، ماہ اکتوبر کا شمارہ 6 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق پر کسی کی یادوں میں کھوئی کھوئی معصوم صورت حسینہ اور اس کی گال سے بچ ہوتی عمارت بھلی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی پسٹل کی نمائش کرتا گنجا بدمعاش نما آدمی، خوف سے چلاتا ایب نارمل بندہ، سرورق اچھا لگا۔ سب سے پہلے اپنی محفل میں حاضری دی۔ عذرا ہاشمی کی داستانِ جاسوسی پسند آئی۔ میری طرف سے دلی مبارک باد۔ محفل میں اٹکھیلیاں کرتا ہمایوں سعید اچھا لگا۔ تصور العین صاحبہ! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ماہا ایمان جی! آپ سے درخواست ہے کہ بندۂ ناچیز کے لیے خصوصی دعا کریں۔ سلیم شبلی کی باتیں اچھی لگیں۔ فہیم تبسم لگتا ہے آپ کو خوشبو سے الرجی ہے۔ ماہ تاب گل رانا نہ جانے کیوں ہر لڑکی اپنے آپ کو حسینۂ عالم تصور کر لیتی ہے۔ عابد جان کی گل افشانی پسند آئی۔ بہرحال، محفل میں آمنہ پٹھانی اور چودھری سسٹرز کی کمی محسوس ہوئی۔ نیشِ عشق پڑھی سلیم فاروقی صاحب نے اس دفعہ اپنی روٹین سے ہٹ کر لکھا۔ نہ جانے کیوں یہ ظالم سماج ازل سے محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ دونوں خاندان اپنی اپنی انا کے خول سے نکل کر کچھ سوچ لیتے۔ للکار پڑھی، محبتوں کے نقیب میرے حبیب مغل صاحب کہانی کو زبردست طریقے سے ہینڈل کر رہے ہیں۔ جیکی کے بارے میں جان کر دکھ ہوا، اسے بھی سزائے محبت ملی۔ پلیز مغل صاحب! جیکی اور شکنتلا کو ایک دفعہ ملا دیں۔ سرنگ کے دہانے پر پانڈے کی موجودگی تابی اور اس کے دوستوں کے لیے چیلنج ثابت ہو گی۔ گرداب میں اسما قادری صاحبہ ہر کردار کی خصوصیت اچھے طریقے سے بیان کر رہی ہیں۔ شہریار کی فرض شناسی و ایمان داری، آفتاب و کشور کی داستانِ الفت ہو یا افضل کی وفاداری، چودھرائن کا ظلم و ستم ہو یا رانی کی جاں نثاری... ماہ بانو کی جدوجہد ہو یا مشتاق بیرم خان کی تابع داری، چودھری کی انا پرستی اور جاگیرداری، بالے کی مارا ماری، قانون کے رکھوالوں کی ناپاسداری۔ غرض کہ ڈیوڈ کی عیاری اور بلنڈا کی مکاری ہر کردار اپنی جگہ فٹ ہے۔ بہرحال، میجر ذیشان کا ثابت قدم رہنا اور افضل کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ پہلا رنگ ٹرپل زیڈ یعنی زر، زن، زمین پڑھا۔ یہ سچ ہے کہ کائنات میں یہ چیزیں باعثِ شر ہیں لیکن ان کے بغیر بندہ بے کار ہے۔ بہرحال حد سے زیادہ لالچ و ہوس بھی آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ گمشدہ کل احمد اقبال نے لکھا۔ عامر خاں کو اپنی ثابت قدمی کی وجہ سے اپنے گمشدہ کل کا نعم البدل مل گیا جبکہ عافیہ کو اس کی انا پرستی لے ڈوبی۔ مختصر کہانیوں میں سیلاب کے بعد پڑھی۔ شہاب الدین کی شگفتہ سے ایک ملاقات اس کو محبت کے سیلاب میں ڈبو گئی۔ دماغ فروش میں کریگن نے اپنی حاضر دماغی سے انسانی زندگیوں سے کھیلتے دولت کے پجاریوں کے گروہ کا خاتمہ کیا۔ چاہ کن میں سلطان کی سہل پسندی اس کی زندگی کا چراغ گل کر گئی۔ بہتر تھا، وہ تعزیت نامے پڑھ لیتا۔ چالاک احمق، قاتل گھنٹی اور بہروپیا اچھی لگیں۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا لگا۔"

اختر عباس تمراج کی کبیر والا سے تعریفیں "اس بار جاسوسی 5 تاریخ کو کبیر والا کامرس کالج سے واپسی پر لیا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو ایک دلکش حسینہ

نے مدہوش کر دیا لیکن ساتھ نظر پڑتے ہی ساری مدہوشی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے محفلِ دوستاں میں پہنچے۔ عذرا ہاشمی کی داستانِ جاسوسی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ عذرا صاحبہ! یہی تو جاسوسی کی خاصیت ہے۔ جو ایک بار پڑھتا ہے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمایوں سعید راج صاحب! آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ یہی تو کائنات کی خوب صورتی اور محفل کا رنگ ہے۔ جعفر حسین صاحب! کس خوش فہمی کی بات کر رہے ہیں آپ...؟ ذرا وضاحت تو کریں۔ ماہا ایمان! میں نے تو محض آپ کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ اگر آپ نے گانا پڑھایا ہے تو گانے کا شوق بھی ہوگا۔ جس طرح آپ نے صنفِ کرخت کے بارے میں اپنی رائے قائم کر رکھی ہے اور سب مردوں کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ اگر آسیہ خان نے رومیو کی تعریف کر دی ہے تو آپ اسے ایسے کیوں ڈانٹ رہی ہیں؟ اس کے علاوہ حج بیت اللہ کی پیشگی مبارک باد۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ گرداب بہت اچھی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ افضل اور اس کے بیوی بچوں کی موت کا دکھ بھی ہوا۔ ماہ بانو شہر یار سے بالآخر مل گئی۔ ماسٹر آفتاب کا کردار پسند آ رہا ہے۔ کہانی سسپنس پر اختتام پذیر ہوئی۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ للکار ایک بار پھر دلچسپ ہو رہی ہے۔ تابش اسٹرونگ بننے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہے اور اس میں عمران کا رنگ نظر آ رہا ہے۔ جیکی توقع کے برعکس نکلا۔ تابش کو ایک اچھے استاد کی سہولت میسر آگئی ہے۔ انجام کافی سنسنی خیز تھا۔ اگلی قسط کا بے تابی سے انتظار ہے۔ سلیم فاروقی کی نیشِ عشق بہت پیاری کہانی تھی۔ نامیہ اور مراد نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا اور آخر کار مل گئے۔ اس کے ساتھ مراد کی موت نے افسردہ بھی کیا۔ بہرحال یہ کاوش بے حد پسند آئی۔ احمد اقبال کی گمشدہ کل بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ عافیہ نے عامر کے ساتھ بے وفائی کی مگر فخر النسا نے عامر کے ساتھ شادی کر کے اس کا ازالہ کر دیا۔ اس ماہ کا جاسوسی بے حد پسند آیا۔"

خالد شوکت سیال کی جھنگ سے آمد" ماہ ستمبر کے آغاز میں ہم کان کے ایک سیریس آپریشن کے سلسلے میں لاہور اسپتال میں داخل تھے۔ آپریشن کے بعد ہوش میں آتے ہی جاسوسی کے لیے دہائی ڈال دی۔ بھائی نے جب ماہ ستمبر کا جاسوسی لا کر دیا تو اپنے آپ کو مسندِ صدارت پر تشریف فرما پا کر خوف صورت نرسوں کا دکھ بھول گئے۔ پورا ماہ صدارت کے نشے میں جھومتے گزرا۔ چنانچہ جب اکتوبر کے جاسوسی میں عذرا ہاشمی صاحبہ کو مسندِ صدارت پر پایا تو یہ نشہ اترا اور ہم نے احبابِ اقتدار کو بے قصور جانا۔ کرسی چیز ہی ایسی ہے جب چھن جاتی ہے تو ہوش آتا ہے۔ بہرحال، دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ عذرا ہاشمی صاحبہ کا تبصرہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے ٹاپ پر جگہ ملتی۔ حسبِ روایت للکار پر ہماری پہلی بریک لگی۔ مغل صاحب نے وہ راز افشا کیا جس کے باعث تابش فیصل آباد کے بازاروں میں بھٹک جانے والا اجنبی بنا ہوا تھا۔ جس سائڈ سے لگتا تھا، حکم جی کے آدمیوں کو گھنا گھر کی طرح سامنے پاتا تھا۔ پوری قسط غار میں چھپے گزر گئی۔ اس ساری اسٹوری میں ہم عمران کو تابش کی طرح مس کرتے ہیں۔ اگر وہ دوبارہ آجائے تو للکار کو چار کیا چالیس چاند لگ جائیں۔ دوسری بریک گرداب تھی۔ اسما قادری صاحبہ نے شاید ڈاکٹرز سے کوئی کمیشن وغیرہ لیا ہوا ہے۔ پچھلی قسط میں شہر یار اسپتال سے فارغ ہوا ہے تو انہوں نے اس قسط میں باری باری سارے کرداروں کو اسپتال بھیج دیا ہے۔ مشا بریم خان، کشور، آفتاب، افضل سارے ہی اسپتال کی فضاؤں میں ہیں۔ ماہ بانو البتہ پاؤں کی انگلی کٹوا کر کم از کم اسپتال جانے سے محفوظ رہی۔ بہرحال، یہ قسط خاصی تیز رفتار تھی۔ اب بنتِ یہود بلنڈا خود میدان میں اتر آئی ہے۔ دیکھیں کیا کرتی ہے۔ سرورق کے دونوں ہی رنگ زبردست تھے۔ تنویر ریاض صاحب نے بہت محنت سے اپنی کہانی کا پلاٹ بنایا تھا مگر اینڈ ایک دم ہی آدھے صفحے کے اندر اندر ہی کر گئے۔ ایسا لگا جیسے آزاد پھرتی اسٹوری کو ایک دم ٹوکرا ڈال کر قید کر دیا گیا ہو۔ احمد اقبال جی کی کیا ہی بات ہے۔ دوسرے رائٹر حقیقت کے قریب لکھتے ہیں مگر احمد اقبال حقیقت کے اندر لکھتے ہیں۔ گمشدہ کل میں انہوں نے ایک بار پھر 8 اکتوبر کے زلزلے کی یاد تازہ کروائی۔ عامر خاں پاکستانی نے بڑی تکنیک سے حرام کا پیسا حلال کی راہ پر خرچ کیا۔ نیشِ عشق ایک تیز رفتار کہانی تھی۔ اینڈ پر مراد کا مرنا کوئی خاص لازمی تو نہیں تھا مگر فاروقی صاحب نے اس کا جھٹکا کرنا خوامخواہ مناسب سمجھا۔ قاتل گھنٹی آلات کے ہاتھوں کھلے ہوئے احساسِ مروت کے حامل شخص کی داستان تھی جو پسند آئی۔ چور کی ماں کا محاورہ تو خوب سنا تھا، سپاہی کی ماں دماغ فروش میں نظر آئی۔ سراغ رسانی پر مشتمل زبردست کہانی تھی۔ چاہ کن اور سیلاب کے بعد مختصر ہونے کے باوجود متاثر کن تھیں۔"

سید محی الدین اشفاق کی خواہش فتح پور سے" جاسوسی چار تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل گرل بالکل ایشوریا رائے جیسی تھی۔ انکل! یہ ٹائٹل گرل کی عمر نہیں بڑھتی، یہ گرل ہی کیوں ہے؟ معراج انکل کے انٹرویو کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اب انتظار ہے سسپنس کا۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ بارو بندا کا جیکی ثابت ہونا اچھا لگا۔ اس کردار کو چلانا چاہیے۔ آخر میں رنجیت پانڈے کا آنا ایکشن کو بڑھائے گا۔ پہلا رنگ تنویر ریاض کی زر، زن، زمین پڑھی۔ آج کل لوگ دولت کی ہوس میں اقدار اور رشتے کو بھول چکے ہیں۔ دوسرا رنگ احمد اقبال کی گمشدہ کل بڑی اچھی تحریر تھی۔ ملک پاکستان کی پولیس پر اعتبار کم ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر فخر النسا اور عامر خاں پاکستانی کا ملنا اچھا لگا۔ گرداب کی قسط میں افضل عین ہماری سوچ کے مطابق بیوی، بچوں کی موت دیکھ چکا ہے۔ میجر ذیشان بھی گوروں کا شکار ہو چکا ہے۔ ماہ بانو کی زندگی میں کچھ تبدیلی تو آئی ہے۔ نیشِ عشق عام سی تحریر تھی۔ اس مرتبہ نمبرون کاشف زبیر کی تحریر کٹھ پتلی تھی۔ کہانی میں خوب سنسنی تھی۔ نوواک اور شیزی کی کوششوں کی بدولت کلارا کا خطرناک چہرہ بے نقاب ہوا۔ اب آتے ہیں تبصروں کی طرف۔ عذرا ہاشمی مبارک باد۔ جاسوسی ہے ہی دیوانہ کر دینے والا۔ بھائی ہمایوں جی! میں آپ کو ایکٹر ہمایوں سعید سمجھتا رہا۔ ویسے آپ کی شکل ان سے ملتی ہے کیا؟ آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ جعفر حسین صاحب! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کم از کم کرسیِ صدارت پر تو آ چکے ہیں۔ پھر بلیک لسٹ میں جانا اتنا برا نہیں لگنا چاہیے۔ ماہا جی مبارک باد کہ آپ ایک اعلیٰ دینی فریضہ ادا کرنے جا رہی ہیں، ہمارے لیے بھی دعا کریں۔ تصور العین! آپ کا نام کس نے رکھا تھا؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ کبیر عباسی یار! آپ نے کیا خوب اپنی تعریف کر دی ہے۔ عابد جان! آپ نے واقعی درست کہا کہ صنفِ نازک کو اچھا اور صنفِ وجاہت کو برا پینٹ کیا جاتا ہے ٹائٹل پر۔ کیا خیال ہے انکل جی! انجم سووی، سووی انکل اور غلام قادر کی واپسی کب ہوگی؟"

ایس ایس ناز کی عجلت ملتان سے" پچھلے کئی ماہ سے ہم جاسوسی کی محفل سے غیر حاضر رہے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ کچھ مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ ہم جاسوسی کو کچھ عرصے کے لیے بھول گئے۔ اب کچھ ٹائم ملا تو ہم نے سوچا کہ محفل میں انٹری دی جائے۔ جن دوستوں نے ہمیں یاد رکھا، ان سب کا شکریہ۔ جو ہم کو بھول گئے ان کی خدمت میں سلام۔ اکتوبر کے شمارے میں عذرا ہاشمی کو بہت اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک باد۔ ہمایوں سعید راج صاحب! آپ نے آسیہ خان کا

دل دکھایا جس سے ہمیں تکلیف ہوئی۔ عبدالسلام صدیقی صاحب! آپ کہاں چلے گئے ہیں؟ آپ کے کہنے پر ہم واپس آگئے ہیں۔ محمد سلیم شبلی صاحب! آپ ہمارے کالج میں کیسے پہنچ گئے؟ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ آپ میرا پیچھا کرتے ہوئے میرے کالج تک بھی آگئے ہیں۔ بعد میں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ آپ اپنے دوست کے داخلے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے، آپ کی آسانی کے لیے آپ کا حلیہ بیان کر دیتے ہیں۔ لمبے لمبے بال سفید کاٹن کے کلف لگے کپڑے اور پاؤں میں کالے جوگر... اور رہ گئی یہ بات کہ ہم نے آپ کو کیسے پہچانا تو یہ بات اگر ہم نے آپ کو بتا دی تو آپ میرا بھی پتا چلا سکتے ہیں۔ اب یہ آپ کی ذہانت پر منحصر ہے کہ آپ ہم کو کس طرح پہچان سکتے ہیں۔ دلنشین بلوچ! آپ نے سلیم شبلی کے خلوص کا مذاق اڑایا۔ آپ اس بار ملتان تو آئیں، میں خود آپ کو لینے ریلوے اسٹیشن آ جاؤں گی۔ تصور العین آپ کا تبصرہ بہت زبردست ہوتا ہے۔ تمام بلیک لسٹ دوستوں سے اظہارِ ہمدردی۔ سلیم فاروقی کی نیشِ عشق اور احمد اقبال کی گمشدہ کل ہی پڑھی ہے۔ نیشِ عشق کی کہانی بہت پسند آئی ہے۔ مراد کی موت کا بہت افسوس ہوا جبکہ گمشدہ کل میں عامر خاں پاکستانی کا کردار بہت پسند آیا۔ عافیہ نے عامر کو چھوڑ کر بہت غلطی کی۔ آخر میں اس کو سزا بھی مل گئی جبکہ بقیہ شمارہ اور پچھلے شمارے پڑھنے کے بعد اگلے شمارے کے لیے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔"

شیخ محمد سجاد ثانی کا تاخیر نامہ آزاد کشمیر سے" 10 ستمبر کو جاسوسی کی آمد ہوئی جس میں اپنی تحریر نہ پا کر مایوسی ہوئی مگر ہم کشمیری ہی کہاں جو ہار مان کر خاموش بیٹھ جائیں۔ ایک تو رسالہ ہمارے پاس دیر سے پہنچتا ہے اور جب تک مکمل مطالعہ نہ کر لیں، ہم رائے دینا پسند نہیں کرتے۔ سب سے پہلے للکار کا مطالعہ کیا۔ شکر ہے طاہر جاوید صاحب کے قلم نے تیزی سے حرکت شروع کر دی ہے۔ اب تو تابش میاں گل پر گل کھلا رہے ہیں۔ گرداب اللہ خیر کرے ماسٹر صاحب کی۔ ماہ بانو اور مشا بریم خان کی مشکلات اپنی جگہ لیکن ہمیں کشور اور ماسٹر آفتاب کی بڑی فکر ہے۔ باقی تحریریں بھی تقریباً کچھ کچھ بہتر تھیں۔"

محمد نعمان پیارے کی پیاری باتیں نامعلوم جگہ سے" 6 تاریخ کو ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی دل فرطِ جذبات سے پھل پھول گیا مگر ساری خوشی فوراً ہی دور ہوگئی۔ جی ہاں، اپنا نامناسب سا تبصرہ پایا۔ یہ حالت تو ہونی ہی تھی۔ ہمارا نشان تو ایسے مٹا کہ بلیک لسٹ نے بھی قبول نہ کیا۔ ٹائٹل پر ایک کم سن اور خوب صورت دوشیزہ کی نگاہیں کسی اجنبی کا تعاقب کرتی نظر آئیں۔ حسینہ کے ساتھ والی تصاویر میں جو دو شخص نظر آ رہے تھے، ان کے درمیان حسینہ کو پانے کی خاطر جنگ ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ پستول والا شخص بازی لے گیا اور ساتھ والا اپنی ہار پر حیرت سے منہ کھولے نظر آ رہا تھا۔ اشتہارات کو نظر انداز کر کے محفل کی جانب لپکے اور عذرا ہاشمی مسکراتی ہوئی نظر آئیں۔ عذرا جی! آپ کو مبارک باد۔ محفل کو بائے بائے کر کے سب سے پہلے عفان آزاد کی تحریک پر ہاتھ صاف کیا۔ سچ پوچھیں تو یہ ہمارے پلے ہی نہ پڑی۔ ارے اتنی سی کہانی اور اتنے سارے کردار۔ ایک کا نام یاد کریں تو دوسرا بھول جائے۔ دوسرے نمبر پر دماغ فروش پر دماغ لڑایا۔ کہانی کی شروعات سست تھی مگر آگے جا کر اچھی کہانی پڑھنے کو ملی۔ کریکن کا کردار پسند آیا۔ اس کے بعد اپنی پسندیدہ للکار میں تابش جی کی للکار پر لبیک کہا اور میدان میں کود پڑے۔ ہمارے تابی سر میں ایک عدد چپ لیے گھوم رہے ہیں اور دشمن لوکیشن سے ان کو جا لیتے ہیں۔ چاہ کن مختصر مگر پراثر کہانی تھی۔ سلطان کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ منظر امام صاحب کی سیلاب کے بعد ایک کرب ناک کہانی تھی۔ شہاب الدین کا افسوس ہوا۔ حق یہ ایک کہانی مگر حقیقت کے قریب تر نظر آئی۔ قاتل گھنٹی اوسط درجے کی کہانی رہی۔ کاشف زبیر کی کٹھ پتلی دل کو لگی، لاجواب کہانی تھی۔"

راؤ بہادر علی کا تعریفی انداز اوکاڑہ سے" خط تحریر کرنے کا محرک محترمہ عذرا ہاشمی اور ماہا ایمان کے مکتوبات ہیں۔ پہلے تو اول الذکر محترمہ کو فاتحِ محفل بننے پر پیغامِ تہنیت۔ ویسے عذرا صاحبہ! اگر آپ کے سنگیتر موصوف نے آپ کو بہن جی کہہ دیا تھا تو آپ کو اتنا گراں کیوں گزرا؟ بہرحال آپ کے ذوقِ مطالعہ اور معاملہ فہمی کے لیے دادِ تحسین کہ آپ نے ایڈوانس میں ہی طاہر جاوید مغل صاحب کا تخلیق کردہ تجسس مائیکرو چپ متعارف کر کے تہ و بالا کر ڈالا۔ ورنہ ہم سے کج فہم لوگ تو کسی جادوئی یا غیر مرئی طاقت پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ ماہا ایمان کے ملک حجاز کے سفر کا سنا۔ ساتھ ہی انہوں نے دوستوں کے لیے عمرے کرنے کا عندیہ بھی دیا۔ بندہ چونکہ عرصہ دراز سے جاسوسی کا خاموش قاری ہے تو سوچا خط لکھ کر اپنے آپ کو محترمہ کی فہرستِ دوستاں میں رقم کروا لوں۔ ماہا ایمان صاحبہ! عمرہ کرتے وقت بندۂ ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ سرورق پر نظر دوڑائی تو زاکر انکل کے تخیلاتی حسن سحر آفریں کو ترچھی نظروں سے کسی عاشقِ دل گیر پر تیر اندازی میں معروفِ عمل پایا اور ساتھ کھڑے ہوئے موصوف کا زخمی گنجا سر یقیناً محترمہ کے حسنِ جہاں سوز کی مشقِ تیر اندازی کا نتیجہ تھا۔ کہانیوں میں کہانیوں کی دیوی للکار کی پرواز اس دفعہ سست روی کا شکار رہی۔ جیکی کا کردار تحیر انگیز تھا۔ احمد اور جیکی کی فائٹ دلچسپ رہی۔ جیکی نے اس خستہ حالی میں بھی احمد کو گویا ناکوں چھولے (چنے) چبوا دیے۔ اسما قادری کی گرداب میں فسوں کاری لاجواب رہی۔ کہانی کے بارے میں جہاں شہریار اور چودھری کا ذکر ہوتا ہے وہاں شہریار کے نہایت زیرک، مستعد اور فرض شناس پی اے عبدالمنان کے کردار کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ خاص طور پر نازک حالات میں اس کے شہریار کو دیے گئے مشورے لائقِ ستائش ہیں۔ کاشف زبیر کی کٹھ پتلی خاصی پُرتحیر تحریر تھی۔ آخری لمحے تک کہانی کا تجسس عروج پر رہا۔ کہانی میں دیے گئے حالات و واقعات و کردار خاصے فسوں خیز رہے۔ کاشف زبیر صاحب! کافی عرصے سے آپ کا کردار جلیل الرماں غائب ہے۔ امید ہے آپ جلد متوجہ ہوں گے۔ ہمیں انتظار رہے گا۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی کی نیشِ عشق واجبی سی کہانی تھی۔ وہی عشق، وہی ظالم سماج، وہی دو متوالوں کا گھر سے فرار، وہی خوفناک انجام۔ مختار آزاد کی دماغ فروش دلچسپ اور منفرد اسٹوری تھی۔ کہانی کا پلاٹ اور گرفت مضبوط تھی۔ منظر امام کی سیلاب کے بعد دل گداز تحریر تھی۔ سرینا راش کی قاتل گھنٹی انسانی نفسیات کی عکاس پُراثر تحریر تھی۔ قاتل کی روم فریشنر کے استعمال کی معمولی غلطی اس کی گرفتاری کا باعث بنی۔ سرورق کے رنگوں میں زر، زن، زمین عامیانہ سی کہانی تھی۔ کہانی میں تجسس اور انفرادیت کا فقدان تھا۔ احمد اقبال کی گمشدہ کل سنجیدہ موضوع پر مزاحیہ انداز میں تحریر کی گئی کہانی تھی۔ کہانی میں احمد اقبال کی استعمال کردہ مزاحیہ تراکیب خوب تھیں۔"

آمنہ پٹھانی کی شمولیت فتح پور لیہ سے" 3 ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضرِ خدمت ہیں۔ وطنِ عزیز میں آنے والے ریکارڈ تباہ کن سیلاب نے جہاں بستیوں کی بستیاں اور شہروں کے شہر اجاڑ کر رکھ دیے، وہیں ہماری سیکڑوں ایکڑ زرعی اراضی بھی سیلابی ریلوں کا لقمہ بن گئی۔ فخریہ طور پر نہیں، تحدیث بالنعمت اور اظہارِ تشکر کے طور پر کہتی ہوں کہ گو ہم خود متاثرین میں سے ہیں مگر پھر بھی اسلامی احکامات اور خاندانی روایات کی تعمیل میں 5، 6 تباہ حال خاندانوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ انہی متذکرہ مجبوریوں کی بنا پر تبصرہ کرنے سے معذور رہی۔ عذرا ہاشمی! دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا آپ کا تبصرہ بہت

پسند آیا۔ محمد سلیم شبلی! ابھی تک تو میں کسی ڈگری کی حامل نہیں ہوں۔ پھر جعلی کیسی بے ایمان آدمی۔ سید محی الدین نے میرے شہر سے انٹری دی، خوش آمدید۔ آسیہ خان، انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، اعجاز احمد، اختر عباس آپ سب نے میری کمی محسوس کی، تہ دل سے شکریہ۔ انشاء اللہ آئندہ ماہ سے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گی۔''

ایم اے صدیقی واہ کینٹ سے اپنے مخصوص انداز میں رقم طراز ہیں ''5 اکتوبر کو دیدار جاسوسی نصیب ہوا۔ دل کو تسکین آمیز راحت نصیب ہوئی۔ دوستوں کی محفل چینی، نکتہ چینی میں عذرا ہاشمی تختِ طاؤس کی علمبردار تھیں، مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ کی داستان بہت عبرت ناک ہے۔ آپ سالانہ ایک عدد کالے بکرے کا صدقہ کیا کریں، نحوست کے سائے سے محفوظ رہیں گی۔ ہمایوں سعید! آپ اوور کانفیڈنس کا شکار ہیں۔ خدانہ کرے کہ آپ ناکام ہوں محتاط رہیں۔ ماہا ایمان! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ نوسو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی ہے۔ اور ہاں، ذرا یہ تو بتایئے کہ آپ کی دُم کی کتنی لمبائی ہے؟ تصور العین صاحبہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔ یہ آپ کی خوش فہمی ہے کہ حسیں مہ جبیں ہیں۔ مقابلۂ چڑیلوں میں آپ نمبرون ہوں گی۔ محمد سلیم صاحب! یہ آپ کی خوش فہمی ہے کہ آپ شہزادہ سلیم ہیں۔ ذرا دوبارہ سے آئینہ دیکھنا۔ ماہ تاب گل! ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ عابد جان صاحب! آپ ادارے کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں، ایسا نہ ہو کہ ادارہ آپ کے خلاف توہین کا مقدمہ کر دے اور نتیجتاً آپ واک آؤٹ ہو جائیں۔ تمام نیو انٹریز کو ویلکم۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار کے درشن کیے۔ جیکی کی عبرت ناک داستان نے بہت دکھی کیا۔ عشق انسان کو لازوال بھی کرتا ہے اور بعض اوقات پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ ماریا کی صورت میں ترپ کا پتا تابش اینڈ کمپنی کے پاس ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اس سے کتنا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ گرداب اس بار سلو اینڈ فاسٹ کا مجموعہ تھی۔ دہشت گردوں کا کیمپ تباہ کرنا مشابرم کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ افضل کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ رقابت کی خاطر ایک ہنستے بستے گھر کو تباہ کر دیا گیا۔ ابتدائی صفحات کی کہانی نیشِ عشق محبت کی لازوال تحریر تھی۔ مراد اور تانیہ کی محبت نے غرور، جاگیرداری اور فرعونیت کو شکست سے دوچار کیا۔ نواز خان اور شہباز خان بے غیرت اور بزدل انسان تھے۔ تحریک جاسوسی ٹایپ کی اچھی تحریر تھی۔ دماغ فروش معاشرے کے ناسوروں اور دولت کے پجاریوں کی کہانی تھی۔ کریگن کی جدوجہد قابلِ تحسین ہے۔ مسز میلری اسی انجام کی مستحق تھی۔ چاہ کن ایک چالاک شخص کی داستان تھی۔ تقدیر نے اس کے تمام فیصلوں کو ناکام کر ڈالا۔ قاتل کٹھنی، بہروپیا اور چالاک احمق بھی خوب صورت تحریریں تھیں، خوب انجوائے کیا۔ کٹھ پتلی پراسرار اسٹوری تھی۔ کلارا ایک نفسیاتی مریض تھی۔ والدہ سے کیے گئے سلوک نے اسے سراپا انتقام بنا ڈالا۔ نوواک کی دلیری نے کلارا کا پلان ناکام کیا۔ پہلا رنگ زر، زن، زمین معاشرے کی اٹل حقیقت کا عکس تھا۔ گل زماں اور عادل لالچی انسان تھے۔ حیدران لوگوں کا محسن تھا مگر وہ محسن کش انسان تھے۔ مسکان کی حکمتِ عملی اور بہادری نے گل زمان اور عادل کے ارادوں کو شکستِ فاش دی۔ دوسرا رنگ گمشدہ کل ایک باہمت انسان کی آپ بیتی تھی۔ عامر خاں ایک دردمند انسان تھا۔ عافیہ بدقسمت تھی جو کہ حقیقت کو پہچان نہ سکی۔ فخر النسا کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا۔ عامر نے اس سے شادی کر کے انسانیت کی خدمت کی۔''

دلنشین بلوچ کی ٹیکسلا سے شمولیت ''پیارا دوست جاسوسی 3 تاریخ کو میرے حسین ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل ایشوریا کے حسین مکھڑے سے سجا۔ لڑکی کے چہرے پر ڈھیروں معصومیت لیکن گنجے ولن نے پھر بھی خطرناک انداز میں پستول تان رکھا ہے۔ سائڈ پر کھڑا ہیرو چیخ کے لڑکی کو خبردار کر تو رہا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑا۔ ڈرتے ڈرتے چینی، نکتہ چینی میں قدم رکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ خط غائب، بلیک لسٹ سے رسید بھی نہ ملی کہ کچھ تو بے قراری دل کو قرار آتا، ایسا کیوں ہوا جبکہ پوسٹ کر کے میں نے فون کر کے محکمۂ ڈاک کی عید کی چھٹیاں معلوم کی تھیں۔ ابھی 5 دن باقی تھے۔ امید تھی کہ خط پہنچ جائے گا۔ معلوم نہیں کیا خطا ہوئی۔ خیر، ٹوٹے پھوٹے دل سے باقی دوستوں کا حال پڑھا۔ عذرا ہاشمی صدر بننے پر ڈھیروں مبارک قبول ہو۔ ہمایوں سعید! اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ بھی مان جاؤ نا کہ وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ۔ سلیم شبلی کی وجہ سے آگئی ہوں۔ جعفر حسین اتنے جلے بھنے کیوں رہتے ہو؟ ماہا ایمان! عمرے کی مبارک باد، دعاؤں میں یاد رکھنا۔ محی الدین اتنے مشورے دینے کے بجائے خود کوئی ڈائجسٹ نکال لو، اس کا نام رکھو مشورہ ڈائجسٹ۔ کبیر عباسی دلچسپ تبصرے لے کر آئے۔ محسن آفریدی! ٹائٹل پر اتنا غور نہ کیا کرو۔ دیکھو کیوں اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو، خدانخواستہ... سلیم شبلی! ڈائجسٹ کی بلیک لسٹ کی مہربانی سے آپ کو معلوم نہ ہو سکا شاید۔ ورنہ ہم تو آپ کے شہر آئے۔ سسپنس ستمبر میں میرا تبصرہ دوبارہ پڑھو۔ آپ کا شدت سے انتظار ہے۔ ویلکم۔ ہاں میں نے نشانی تو بتا دی ہے نا، مجھے ڈھونڈ لینا۔ ماہ تاب پیاری کیسی ہو۔ لوبی اے اب آپ نے خود بتا دیا کہ چڑیلوں والا تجربہ آپ کو ہو چکا ہے۔ انفال اینڈ صبا بہت دلچسپ باتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ آپ یونہی فکرمند نہ ہو جایا کرو۔ کہانیوں میں سلیم فاروقی کی نیشِ عشق کیا کہنے۔ تانیہ، مراد آتشِ عشق میں جذبۂ صادق لے کر کود پڑے۔ ساری رکاوٹوں کو عبور کرتے منزلِ مقصود پر پہنچے تو پھر بھی نامراد ٹھہرے۔ دو دلوں کے کٹھن راستوں پر سفر کی داستان، گرداب تیزی سے رواں دواں ہے۔ افضل کے بیوی بچوں کا بہت دکھ ہوا۔ ماہا نو مہرین کے روپ میں لگتا ہے اب باقی ایام سکون سے گزارے۔ چودھری کی چالاکیاں، لنڈا کی مکاریاں، ڈیوڈ کی ہوشیاریاں عروج پر رہیں۔ شہریار کی خودساختہ پابندیوں پر بے ساختہ پیار آگیا۔ بابر نعیم کی بہروپیا، جرم کو معمولی سمجھنے کی غلطی ہم سب سے ہو جاتی ہے۔ معلوم اس وقت ہوتا ہے جب سنگین صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ خامے کی چیز کاشف زبیر لائے۔ کٹھ پتلی لمحہ بہ لمحہ اسرار و تجسس میں ڈوبی تحریر جس کی سطر سطر نے شدید سسپنس میں گھیرے رکھا۔ گمشدہ کل پُرمزاح تحریر عامر خاں پاکستانی کی باتوں نے بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ آصف ملک کی چالاک احمق نے تو ہنسا ہنسا کے برا حال کیا۔ یہ اسٹوری ان دو دوستوں کو پکڑ کے سنائی جو ڈیرک اور شارپ کی مؤنث ہیں۔ دماغ فروش نے دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ شکر ہے ہم مغرب میں نہیں رہتے ورنہ اپنے بزرگوں کی حفاظت یہ سوچ کے کرنی پڑتی کہ کوئی ان کا دماغ نہ نکال لے، باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔''

محمد سلیم شبلی کی تمنا تحصیل وضلع ملتان سے ''ماہ اکتوبر کا شمارہ 5 تاریخ کو لاہور کے اردو بازار میں نظر آگیا۔ بعض ذاتی مصروفیات کی بنا پر ابھی تک ہم لاہور میں ہی ہیں۔ ٹائٹل اب کی بار پسند نہیں آیا۔ گنجے، خوفناک شکل و صورت اور ہاتھ میں پسٹل تھامے آدمی کو دیکھ کر ٹائٹل گرل بھی سہمی سہمی دکھائی دی اور مدد طلب نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ (کسی کی مدد کرنا اچھی بات نہیں کیا؟) پہلے تو ہم نے اس کی مدد کا سوچا پھر خیال آیا کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اس لیے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ چینی، نکتہ چینی سے مستفید ہونے کے بعد محفل میں داخل ہوئے تو عذرا ہاشمی لیڈر آف دی اپوزیشن بن کر لمبی تقریر جھاڑ رہی تھیں۔ بہرحال، مبارک وصول کر لیں۔ ہمایوں سعید یار! کیا پٹی پڑھا دی تم نے دلنشین بلوچ کو؟ اگر وہ میری وجہ سے پردہ نشین ہو گئی ہے تو تم کم از کم مجھ سے رابطہ تو کرے۔ جعفر حسین! جو صورتِ حال آپ کے ساتھ پیش آئی، وہ سب کے ساتھ پیش آتی ہے۔ دل برداشتہ نہ ہوا کریں۔ ماہا ایمان! آپ کو پیشگی عمرے کی مبارک باد، ہم جیسے گناہ گار دوستوں کو بھی دعاؤں میں خاص طور پر یاد رکھنا۔ کبیر عباسی! ذرا آرام سے، مجلس کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں۔ انفال اینڈ صبا مرزا لگتا ہے آپ کی آپس میں لڑائی ہو گئی ہے اسی وجہ سے لگ رہا ہے کہ غصے میں بھری بیٹھی ہو۔ آسیہ خان! کہیں آمنہ پٹھانی کی طرح غائب ہونے کا ارادہ تو نہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے سلیم فاروقی کی نیشِ عشق پڑھی۔ مراد اور تانیہ کی لازوال محبت بہت پسند آئی مگر آخر میں مراد کی موت نے افسردہ کر دیا۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ یہ قسط کافی بور سی لگی۔ جیکی کی کہانی بہت دلچسپ لگی مگر سلطانہ کا کوئی ذکر نہیں ہوا مگر ہیرو بھائی کی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ گرداب کی یہ قسط کافی سنسنی خیز رہی۔ افضل کی بیوی اور بچوں کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ شہریار نے جس طرح الٹے طریقے سے آفتاب کو چودھری کے چنگل سے چھڑوایا، اسی طرح کے الٹے طریقے اب شہریار کو استعمال کرنا ہی پڑیں گے۔ جو آئندہ بھی شہریار کے کام آسکتا ہے اور ماہ بانو کا شہریار کو مل جانا بھی اچھا لگا۔ شہریار کو ماہ بانو کے ان الفاظ پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ تنویر ریاض کی زر، زن، زمین بھی اچھی کہانی تھی۔ گمشدہ کل میں عامر خاں پاکستانی کی تو لاٹری نکل آئی۔ عافیہ نے اس کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ یہ کہانی اپنے ہلکے پھلکے مزاج کی وجہ سے پسند آگئی۔ چالاک احمق میں ڈیرک اور شارپ تو تھے ہی بے وقوف مگر موڈی بھی بے وقوف بن بیٹھا۔ منظر امام کی سیلاب کے بعد اچھی تحریر تھی۔ وہ لڑکی کاش اپنے محسن شہاب الدین سے ہی شادی کر لیتی تو کتنا اچھا تھا۔ شہاب الدین جیسا ایمان افروز کردار بہت پسند آیا۔ دماغ فروش میں اگر کریگن جیسے پولیس آفیسر ہمارے ملک میں موجود ہوں تو ہمارے ملک میں بھی جرائم کی شرح ختم ہو سکتی ہے۔ کاش! کریگن جیسا ایک لیڈر ہی ہمیں میسر ہو جائے، کاش!''

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کی ذہنی مشقتیں ''جاسوسی اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر 7 تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ کو دیکھ کے ایسا لگا جیسے آئینہ دیکھ لیا جبکہ سائڈ پر موجود ولن ٹائپ افراد کو دیکھ کے سارا موڈ بیکار ہو گیا۔ پھر بھی ذاکر انکل کو خوب داد دی اور اگلے اسٹاپ بزمِ یاراں میں داخل ہوئی۔ مسندِ شاہی پر ایک بالکل نئی نویلی تبصرہ نگار کو اپنے دلچسپ تبصرے کے ساتھ براجمان پایا۔ تبصرہ پڑھ کر خوب ہنسی آئی یعنی کہ موصوف تو کچھ زیادہ ہی محبِ جاسوسی ہیں۔ تبصرہ تھا بھی کرسیِ صدارت کے قابل۔ کرسیِ وزارت پر ہمایوں سعید رومیو ''ہم تو رومیو ہی کہیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے'' کو زبردستی قبضہ کیے پایا۔ حالانکہ یہ ماہا ایمان کا حق تھا۔ خیر کرسیِ وزارت کی آدھی ادھوری مبارک باد قبول کیجیے۔ ماہا ایمان! آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ بہت بڑی سعادت حاصل کرنے جا رہی ہیں۔ مری کے شہزادے صاحب! آپ کو سرورق کے لیے ذاکر انکل کو دوش نہیں دینا چاہیے۔ آپ نے شاید یہ نوٹ نہیں کیا کہ ذاکر انکل آج کل تبصرہ نگاروں پر سرورق بنا رہے ہیں۔ اب یہ قسمت کی بات ہے کہ جب حسن کی دولت بانٹی گئی تھی تو صنفِ نازک نے اپنے ذہین ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ دولت خوب سمیٹی جبکہ صنفِ کرخت یاد جاہت بے چارے عقل نہ ہونے کے باعث چھلنی لے کر چلے گئے تو اب ظاہری سی بات ہے کہ ایسی ہی شکلیں بنتی تھیں۔ محفل سے بڑی مشکل سے جان چھڑا کر للکار تک پہنچی۔ جیکی کی کہانی سن کے بہت افسوس ہوا۔ ویسے فی زمانہ ایسا پیار ناپید ہے۔ رنجیت پانڈے غالباً مستقبل میں ریاض ہٹلر کا کردار ادا کرنے والا ہے۔ مغل انکل اپلیز چینج لائیں۔ گرداب میں موساد اور را کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کی خوشی ادھوری رہی کیونکہ اگر یہی کام منظم طریقے سے ہوتا تو اور ہی بات تھی۔ ماہ بانو بے چاری ابھی اپنی آزادی اور محبوب کی سنگت سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہوئی کہ ایک مرتبہ پھر اس کی عافیت خطرے میں پڑ گئی کیونکہ لنڈا جب میجر ذیشان تک پہنچ گئی تو اس تک رسائی کیا مشکل ہے۔ اب بات ہو جائے نیشِ عشق کی جو اچھی تحریر تھی۔ تحریک بھی محمد عفان آزاد کی اچھی کاوش تھی۔ میرا تو پہلا شک ہی لارین پر گیا تھا جو درست ثابت ہوا۔ کٹھ پتلی پڑھ کے تو دماغ ہی چکرا گیا۔ اف خدایا! اتنا گھناؤنا کھیل۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ عورت جب انتقام پر اترتی ہے تو اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ احمد اقبال دو ماہ غیر حاضری کے بعد پھر حاضر ہوئے اور جرمانے کے طور پر گمشدہ کل لے کر آئے جو کہ ان کے ہلکے پھلکے اندازِ تحریر کے ساتھ زبردست رہی لیکن ایک تشنگی تو بہرحال رہ ہی گئی۔ اصغر علی اور سارہ کا کردار واضح نہیں کیا گیا کہ ان کا کیا کاروبار تھا۔ وہ چالیس لاکھ کیسے تھے؟ اگر اس کی وضاحت بھی کر دیتے تو اچھی بات تھی۔ عبدالرب بھٹی کی چاہ کن پڑھ کے اس کہاوت کا یقین آگیا کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے خود اس میں گرتے ہیں۔ دماغ فروش پڑھ کے تو میرے دماغ کی چولیں ہی ہل گئیں کہ انسانی مسیحا یہ سب کر سکتے ہیں تو پھر عام انسان سے کیا توقع رکھیں؟''

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا چکوال سے وضاحت کرتی ہیں ''اس ماہ میں تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ یعنی صبا... انفال مصروف ہے اس لیے یہ تھوڑا سا مشکل کام میرے ذمے ہے۔ جاسوسی صاحب آٹھ اکتوبر کو ہمارے آشیانے میں تشریف لائے۔ ذاکر انکل نے ٹائٹل کسی ہالی ووڈ کی فلم کا بنایا۔ ذرا ہمیں بھی بتائیں کون سی فلم کا ہے؟ محفل میں داخل ہوئے تو پہلا صفحہ انرجی سیور کی طرح روشن تھا کیونکہ محترمہ عذرا ہاشمی ٹاپ آف دی لسٹ میں جو تھیں، بہت مبارک باد۔ محمد سلیم! جب تک ہم کسی کام میں دل شامل نہ کریں تو اس وقت تک کام میں اپنایت کا مزہ نہیں آتا۔ اور ہاں، آپ بے فکر رہیں ہم نے اپنے دل کو بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہونے دیتے۔ سلیم فاروقی کی عشق کے موضوع پر لکھی گئی تحریر سے آغاز کیا۔ عشق تو ماضی کا حصہ ہے۔ اب تو کتابوں، فلموں، ڈراموں میں ملے تو ملے، اس دور میں صرف ٹائم پاس اور کچھ نہیں۔ اینڈ کا پہلے سے پتا تھا بس یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمیں رلانے کے لیے کتنے صفحوں سے کام لیا جائے گا یا پھر ایک دو لائنوں پہ ہی گزارہ ہو جائے گا۔ رشتوں پر لکھی گئی تحریر زر، زن، زمین پر ہم بھی ایک بات کہتے ہیں کہ سوتیلے رشتے اتنے بُرے نہیں ہوتے جتنے سمجھیں جاتے ہیں۔ کہانی پڑھ کر نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ انتہائی گہرا اور ذاتی تجربہ ہے۔ گم شدہ کل کی باری آئی تو محسوس ہوا کہ عامر خاں پاکستانی کو جو محنت سے نہیں ملا، وہ تقدیر سے مل گیا اچھی کہانی تھی۔ مختصر کہانیوں میں دماغ فروش، چالاک، احمق، کٹھ پتلی پڑھی ہیں... جس میں مختار آزاد کی کہانی بے حد پسند آئی۔ کاشف زبیر کی کہانی فرضی لگی جیسے کہ کوئی انگلش موی ہو۔ احمقوں کی تو کیا ہی بات، مشکل کام کے لیے جتنی عقل کی ضرورت ہے اس کے ساتھ ساتھ تقدیر کی مہربانیاں ہونی چاہئیں، تب بات بنتی ہے۔ سلسلے وار کہانیوں میں طاہر انکل اب دلچسپی کے ساتھ للکار لکھنے بیٹھے ہیں تو ہماری بھی دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔ گرداب میں لنڈ سے کا مال یعنی لنڈا میجر ذیشان کو اپنے جال میں پھنسانے میں کوشاں ہیں شاید۔ اللہ خیر ہی کرے۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

چودھری محمد سرفراز، جتوئی۔ محمد زاہد اعوان، لاہور۔ شان احمد گشکوری، محمد پور دیوان۔ دانش اظہار، ابوظہبی۔ میمونہ عزیز، کراچی۔ سرور حماد، لاہور۔ جاوید احمد، کراچی۔

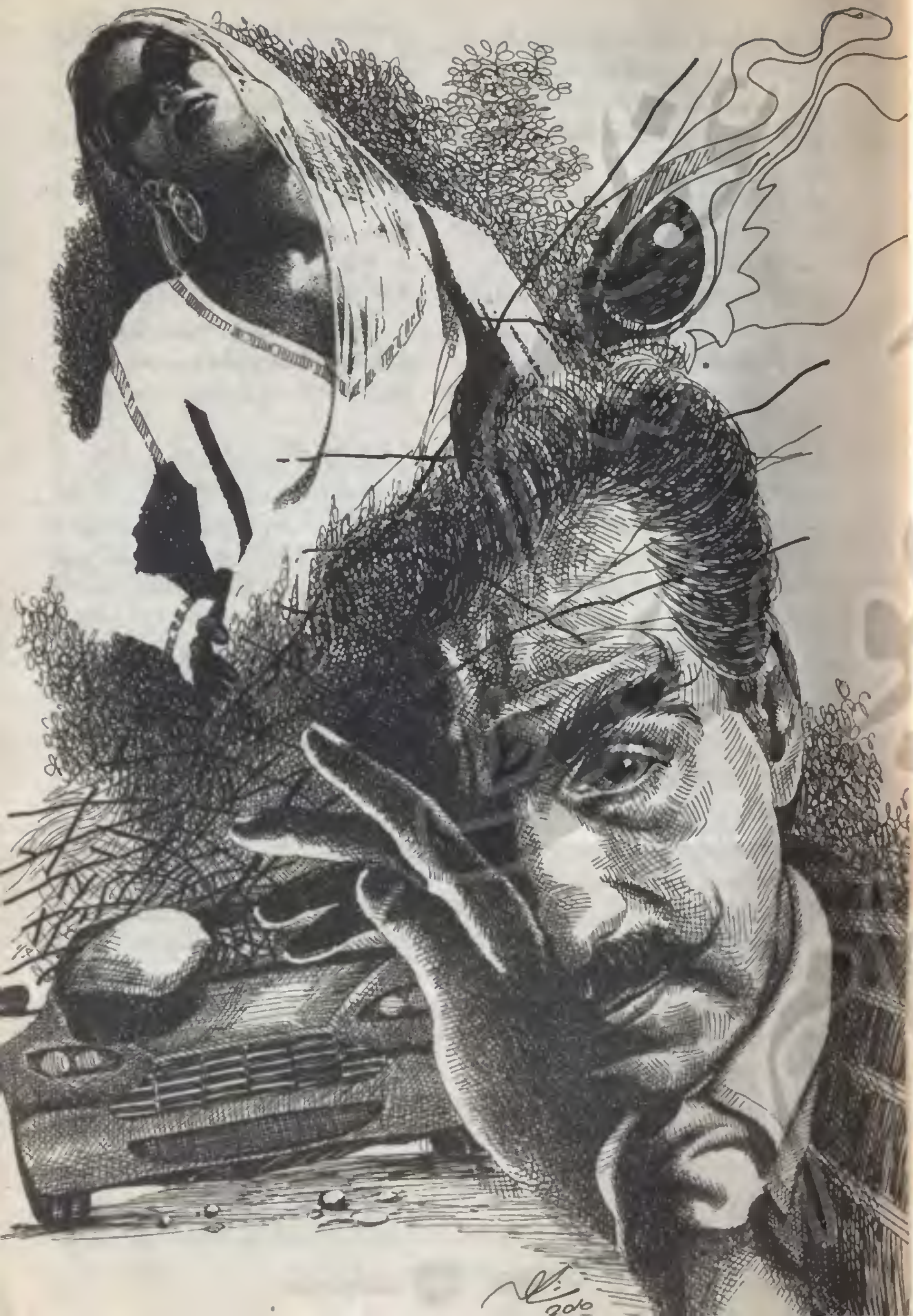

تارِ عنکبوت

ایچ اقبال

بھوک کا سوال روٹی اور اس کا جواب بھی روٹی ہوتا ہے. جو بالآخر مجبور کے دل میں جاں سے گزر جانے کی ہمت پیدا کردیتا ہے...... بھوک کی ارزانی ہو اور روٹی کی گرانی...... تو پھر اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے والے صاحبانِ حیثیت کی کمی نہیں رہتی...... اپنی خواہشات کو مجبوری کے کندھے پر رکھی بندوق سے نشانہ بنانے والوں کے لیے مجبوروں کی مجبوری نعمتِ غیر مترقبہ کے مانند ہوتی ہے...... ماضی کی راکھ میں دبی نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل ہو یا پھر دل میں بھڑکتی انتقام کی آگ سرد کرنے کا معاملہ...... طاقت اور دولت رکھنے والے ہر جرم کے باوجود اپنے ہاتھ صاف رکھنے کا ہُنر خوب جانتے ہیں.

آتشِ انتقام کو سرد کرنے کی کوشش میں جرم کی راہ اختیار کرنے والے نوجوان کی سرگزشت

متوسط طبقے کی ایک بستی میں رہنے والا ضیغم کیسا آدمی تھا؟ اسی گز کے کوارٹر جیسے مکانوں کی اس بستی کے لوگ اس سے قطعی بے خبر تھے۔ وہ سال بھر پہلے اس بستی میں آکر آباد ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی صرف بیوی تھی، بچے نہیں تھے حالانکہ ان دونوں کی عمریں اچھی خاصی تھیں۔ ضیغم کی عمر چالیس کے قریب تھی اور اس کی بیوی افروز بھی پینتیس سال سے کم کی نہیں ہوگی۔ وہ قبول صورت عورت، بہت سیدھی سادی نظر آتی تھی۔

اس قسم کی بستیوں میں رہنے والے اپنی گلی کی حد تک تو عموماً ایک دوسرے سے خاصے گھل مل جاتے ہیں۔ عورتوں میں تو خاصی گاڑھی بھی چھننے لگتی ہے لیکن افروز کا کسی سے بھی میل جول نہیں تھا۔ کسی سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ مسکراہٹ یا علیک سلیک پر اکتفا کرتی تھی۔ تن تنہا اس کا گھر سے نکلنا ہی بہت کم ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر ضیغم کے ساتھ ہی کہیں آتی جاتی تھی۔

البتہ ضیغم وہاں رہنے والوں سے بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑا بہت ضرور گھل مل گیا تھا۔ اسی کی زبانی لوگ اتنا جان سکے تھے کہ وہ ڈیفنس کے علاقے کی کسی اسٹیٹ ایجنسی میں ایجنٹ کی حیثیت سے کمیشن پر کام کرتا ہے۔ اسے ایجنسی سے ماہانہ تنخواہ نہیں ملتی تھی لیکن اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ایجنسی نے اسے موٹر سائیکل دلا دی تھی۔ بہ قول ضیغم کے موٹر سائیکل ملنے کے بعد اس کی آمدنی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

ضیغم ہی کے بہ قول اس کی شادی کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا لیکن قدرت نے اسے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔

اس بارے میں اگر بستی کا کوئی شخص اس سے ہمدردی کے دو ایک لفظ کہہ بیٹھتا تو ضیغم وہ باتیں ہنسی میں اڑا دیا کرتا۔

''اس گلی کے بچے بھی تو میرے بچے ہیں۔'' وہ یہ بات کہہ کر اس موضوع کو آگے بڑھنے سے روک دیتا۔

بستی کے لوگ اسے کوئی بُرا آدمی نہیں سمجھتے تھے، تاہم کسی طرح اس کے بارے میں یہ تاثر قائم ہوگیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے معاملے میں شکی مزاج ہے اسی لیے اس نے افروز کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ تنہا گھر سے نہ نکلا کرے اور نہ ہی کسی سے زیادہ میل جول رکھے۔

غرض یہ کہ بستی کی اس گلی میں ضیغم کے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے بستی کے ایک قریبی پارک کی بینچ پر اداس بیٹھے ہوئے اظہر نے اس بات کو بالکل اہمیت نہیں دی کہ کچھ فاصلے پر دوسری بینچ پر بیٹھا ہوا ضیغم بڑے غور

سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

انصر کی عمر اس وقت سولہ سال سے کچھ کم تھی۔ وہ معمولی شرٹ، پتلون اور چپل پہنے بینچ پر اداس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی اداسی کا سبب اس کے گھر کے ناگفتہ بہ حالات تھے۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ دھوپ ابھی خاصی تھی لیکن موسم کچھ ایسا تھا کہ دھوپ نیالی سی لگ رہی تھی۔

انصر نے دو تین بار محسوس کیا کہ ضیغم اسے غور سے دیکھ رہا تھا لیکن انصر اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دے سکا کیونکہ اس کا دماغ اپنے گھر کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ گھنٹا بھر پہلے ہی اس کی ماں زیب النسا اس سے کہہ چکی تھی۔

''اب صفیہ کے ہاتھ میں یہ ایک انگوٹھی ہی رہ گئی ہے انصر! صبح اسے بازار لے جا کر بیچ آنا ورنہ کل تو گھر میں فاقہ ہی ہوگا۔''

انصر اس سوچ میں گم تھا کہ وہ انگوٹھی بیچ کر بھی گھر کا خرچ کتنے دن چل سکے گا؟ گھر میں چار افراد تھے۔ ایک وہ خود، ایک اس سے دو سال بڑی بہن صفیہ، ایک اس کی چھوٹی بہن عارفہ اور چوتھی اس کی ماں! مستزاد بڑھتی ہوئی مہنگائی کا دیو! سونے کی ایک انگوٹھی آخر کتنے دن تک ان چار افراد کے پیٹ کا جہنم بھر سکتی تھی؟

انصر ان خیالات سے اس وقت چونکا جب ضیغم اس کے بالکل قریب آ کھڑا ہوا۔ انصر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ضیغم کو ''انکل ضیغم'' کہہ کر سلام کیا۔ اس گلی میں انصر یا اس سے کچھ بڑے یا چھوٹے لڑکے ضیغم کو انکل ضیغم ہی کہتے تھے۔

''بیٹھو!'' ضیغم نے سلام کا جواب دینے کے بعد انصر کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''آج تم بہت مغموم نظر آ رہے ہو۔ شاید آج تمہیں اپنے والد بہت زیادہ یاد آ رہے ہیں۔''

معاملہ یہ نہیں تھا لیکن باپ کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا باپ دو ماہ قبل شہر میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ میں دنیا سے سدھار گیا تھا۔

''صبر کرو انصر!'' ضیغم نے ہمدردی سے کہا۔ ''قدرت کو یہی منظور تھا۔''

انصر نے آستینوں سے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں خشک کیں اور باپ کی یاد سے جذباتی ہو جانے کے باعث گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''آپ مجھے کہیں نوکری دلوا سکتے ہیں؟''

''نوکری!'' ضیغم نے فکرمندی سے کہا۔ ''میاں انصر! آج کل جو چیز سب سے زیادہ نایاب ہے، وہ نوکری ہی ہے۔ پھر تمہاری عمر بھی کم ہے اور تمہارے پاس کوئی ڈگری بھی نہیں۔''

انصر نویں جماعت سے دسویں جماعت میں پہنچا تھا کہ اس کا باپ اس سانحے کا شکار ہو گیا۔

ضیغم کہتا رہا۔ ''اور میاں ڈگری کا بھی یہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔''

''میں کسی اچھی نوکری کی بات نہیں کر رہا انکل ضیغم! چھوٹے موٹے ہوٹلوں میں میری عمر کے لڑکے بھی کام کرتے ہیں۔''

ضیغم سوچ میں ڈوبا نظر آنے لگا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے میاں انصر! دیکھو، میں اِدھر اُدھر کہیں بات کرتا ہوں۔''

انصر بولا۔ ''میرے پاس کوئی ڈگری نہیں لیکن میں اچھی خاصی انگریزی بول لیتا ہوں۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔'' ضیغم نے سر ہلا کر کہا۔ ''تمہارے والد کو خدا غریق رحمت کرے، ان کی خواہش تو یہی تھی کہ تمہیں اچھی سے اچھی تعلیم دلائیں۔ انگریزی اسکول میں پڑھا ہے تم نے! ان کی ساری توجہ تم پر تھی۔ اپنی کم آمدنی کے باوجود وہ تمہیں مہنگے اسکول میں پڑھا رہے تھے۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس وقت بھی گھر میں تم لوگوں کی گزر بسر تنگی ترشی سے ہو رہی ہوگی۔ اگر انہوں نے کچھ پس انداز کیا ہوتا تو تم لوگوں کو اتنی جلدی زیادہ پریشانی میں نہیں پڑنا پڑتا۔''

انصر نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں کہ ضیغم کو الگ تھلگ رہنے کے باوجود یہ ساری معلومات تھیں اور اس نے اندازے بھی بالکل ٹھیک لگائے تھے۔

''اچھا یہ تو بتائیں انکل ضیغم!'' انصر بولا۔ ''آپ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جو سونے کی چیزیں گروی رکھتا ہو؟''

''کیا رکھوانا ہے؟'' ضیغم نے چونک کر پوچھا۔

انصر کی پلکیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اماں کے پاس تو زیور تھا ہی بہت کم... وہ سب بھی بک چکا ہے۔ اب بس باجی کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی رہ گئی ہے۔ پہلے تو اماں خود ہی جا کر بیچ آیا کرتی تھیں۔ آج ان کی طبیعت کچھ خراب ہے اور انہیں خیال ہے کہ شاید کل تک بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی اسی لیے انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ کل جا کر انگوٹھی بیچ آؤں لیکن مجھے بجیا کی انگوٹھی بیچتے ہوئے بہت دکھ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کہیں گروی رکھوا کر کچھ رقم لے لوں۔''

''پھر اسے چھڑاؤ گے کیسے؟''

''شاید کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل ہی جائے۔ تب چھڑا لوں گا۔''

''چھوٹی موٹی نوکری میں تو گزر بسر ہی مشکل سے ہوتی ہے، انگوٹھی کیسے چھڑاؤ گے؟ سود الگ بڑھتا رہے گا؟''

''میں بجیا کی انگوٹھی بیچنا نہیں چاہتا انکل ضیغم!'' انصر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ''بھائی تو اپنی بہنوں کے لیے زیور بنواتے ہیں۔''

ضیغم نے شفقت آمیز انداز میں انصر کا شانہ تھپکا اور بولا۔ ''اچھا میں کل کچھ کروں گا لیکن کسی کو بتانا مت کہ میں اس معاملے میں تمہاری کسی قسم کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کل تم دوپہر کو انگوٹھی لے کر نمائش کے بس اسٹاپ پر آ جانا۔ میں تم کو وہیں ملوں گا۔ نمائش کا بس اسٹاپ دیکھا ہے نا؟''

انصر نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ضیغم نے ایک بار پھر اس کا شانہ تھپکا اور جانے لگا۔ جاتے جاتے اس نے کہا۔ ''کوشش کرنا کہ بس ایک بجے تک پہنچ جاؤ۔''

اس وقت بھی انصر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

اگلے دن دوپہر کو ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب انصر بس سے اترا اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ضیغم اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ انصر نے بے ساختہ وقت دیکھنے کے لیے اپنی کلائی اٹھائی اور پھر گرا دی۔ اپنی گھڑی وہ کافی دن پہلے ہی بیچ چکا تھا لیکن اب بھی کچھ بے خیالی میں یہ حرکت کر بیٹھتا تھا۔

وہ فٹ پاتھ پر ایک کھمبے کے قریب کھڑا ضیغم کا انتظار کرنے لگا۔ مایوسی میں لوگ عموماً منفی انداز میں سوچتے ہیں۔ انصر بھی سوچنے لگا کہ شاید ضیغم کسی کام میں پھنس جانے کی وجہ سے نہ آ سکے۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ٹھیک ایک بجے ضیغم کی موٹر سائیکل اس کے قریب آ کے رکی۔ انصر نے سکون محسوس کیا۔

''میاں انصر! یہاں سے کچھ دور تک تمہیں پیدل چلنا پڑے گا۔ اس طرف ایک ہوٹل ہے۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔ ''وہاں پہنچو... ڈبل سواری پر پابندی ہے ورنہ میں خود تمہیں لے چلتا۔'' اس نے وضاحت سے اس ہوٹل کا محل وقوع بتایا۔

''لیکن... ہوٹل...'' انصر الجھ کر بولا۔ ''مجھے تو انگوٹھی...''

''تم چل کر ہوٹل میں بیٹھو... میں آتا ہوں وہاں، بتاؤں گا۔'' ضیغم نے کہا پھر پوچھا۔ ''ہوٹل دیکھا ہے نا تم نے؟''

''مل ہی جائے گا۔ ڈھونڈ لوں گا۔''

''اچھا میں موٹر سائیکل آہستہ آہستہ چلاتا ہوں۔ تم پیچھے پیچھے آؤ۔''

اس طرح وہ دونوں اس ہوٹل تک پہنچ گئے جسے صرف چائے خانہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ چار پانچ ہی میزیں اور کرسیاں تھیں۔ ان میں سے بھی تین میزیں خالی پڑی تھیں۔ ضیغم، انصر کے ساتھ ایک ایسی میز پر جا بیٹھا جو بالکل کونے میں تھی۔ اس نے ویٹر سے چائے منگوائی اور پھر انصر سے بولا۔ ''ذرا وہ انگوٹھی تو دکھاؤ۔''

انصر نے پتلون کی جیب سے چھوٹی سی مخملی ڈبیا نکال کر ضیغم کو دی۔ ضیغم نے اپنے ہاتھ میز کے نیچے کر کے ڈبیا

بے پر کی

برطانیہ کی شہد کی مکھیوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جلد ہی اسٹرائیک پر چلی جائیں گی کیوں کہ پھول کم ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ شہد کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

وہ ان لوگوں میں سے ہے کہ جب دروازے پر کامیابی کی دیوی دستک دیتی ہے تو وہ شور کی وجہ سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور چلا کر کہتے ہیں: ''خدا کے لیے یہاں سے جاؤ، شور مت کرو۔''

****

اسکاٹ لینڈ کے ایک اخبار میں ضرورتِ رشتہ کا ایک اشتہار چھپا: ''ایک نوجوان کسان جس کے پاس پچاس ایکڑ اراضی زمین ہے، وہ ایک ایسی نوجوان لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے پاس ٹریکٹر موجود ہو۔ ازراہِ کرم شادی کی درخواست کے ساتھ ٹریکٹر کا تازہ فوٹو بھی ارسال کریں۔''

xxxxxxxxxxxx

''میرا منگیتر ساری دنیا میں شیخیاں بگھارتا پھر رہا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے حسین ترین لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔''

''مگر میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ تم ہی سے شادی کرے گا۔''

ایک لڑکی: ''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میری عمر تیس سال کی نہیں ہوگی میں شادی نہیں کروں گی۔''

دوسری لڑکی: ''میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میری شادی نہیں ہوگی میں تیس سال کی نہیں ہوں گی۔''

کھولی۔ ڈبیا سے انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں لی، اس کے وزن کا اندازہ لگایا اور پھر انصر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ زیادہ سے زیادہ چار ہزار کی بک سکتی ہے۔''

''اماں نے بھی یہی کہا تھا لیکن مجھے تو یہ گروی رکھنا ہے انکل ضیغم!''

''گروی رکھنے والے تو اتنے پیسے بھی نہیں دیں گے۔ تین ہزار سے زیادہ ملنا مشکل ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں اماں سے جھوٹ بول دوں گا کہ اتنے ہی میں بکی ہے۔''

''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لو، چائے پیو۔''

چائے خانے کا ملازم دو پیالیاں لیے ان کی طرف آرہا تھا۔

''یہاں سے کہاں چلنا ہوگا انکل ضیغم!'' انصر نے چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔

''چائے ختم کرلو، پھر بتاؤں گا۔''

یہ جواب انصر کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن وہ کوشش کرنے لگا کہ جلدی سے چائے ختم کرلے۔

ضیغم بولا۔ ''میں نے تمہاری ملازمت کے بارے میں کچھ سوچا ہے۔''

''کیا؟'' انصر نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں جس اسٹیٹ ایجنسی میں کام کرتا ہوں، اس کا مالک ہے تو ذرا اکل کھرا لیکن کسی سے خوش ہوجائے تو اس پر مہربان بھی بہت ہوتا ہے۔ ایک اچھے گھر میں رہتا ہے لیکن شہر کے حالات ایسے ہیں کہ کسی کو ملازم نہیں رکھتا۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ تم ایک شریف اور پریشان گھرانے کے لڑکے ہو اور وہ تمہیں ملازم رکھ سکتا ہے۔ اس وقت تو وہ بس ہوں ہاں کر کے ٹال گیا لیکن مجھے امید ہے کہ میں اس سے بات منوالوں گا۔ بس کسی موقع پر اسے خوش کرنا ہوگا۔ تم کرلوگے اس کے گھر کی ملازمت؟''

''کرلوں گا انکل ضیغم! کتنی تنخواہ مل جائے گی؟''

''چار ساڑھے چار ہزار تو وہ دے ہی سکتا ہے لیکن تمہیں صبح سے رات کے کھانے تک اس کے گھر میں رہنا ہوگا۔ اس کی کار اور گھر کو صاف ستھرا رکھنا ہوگا۔ سودا سلف لانا ہوگا۔ تم کرلوگے یہ نوکری؟''

''کرلوں گا۔'' انصر نے جواب تو دے دیا لیکن اس کا دل بھر آیا۔ اس کے باپ نے ہمیشہ یہ خواب دیکھے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کو اتنا پڑھا لکھا دے کہ وہ کسی اچھے منصب پر براجمان ہوسکے۔

اس دوران میں چائے ختم کرلی گئی۔

''اب کہاں چلنا ہے انکل ضیغم؟'' انصر نے بے تابی سے پوچھا۔

''کہیں نہیں، ذرا ہاتھ میز کے نیچے کرو۔ میں تمہیں کچھ دے رہا ہوں۔ خاموشی سے لے لو۔''

انصر کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ ضیغم اس طرح اسے کیا دینا چاہتا ہے لیکن اس نے اپنے ہاتھ نیچے کردیے۔ اس کے ہاتھ ضیغم کے ہاتھوں سے ٹکرائے۔ ضیغم کے ہاتھوں میں کچھ کرارے کاغذ تھے۔

''لو!'' ضیغم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''ہاتھ میز کے نیچے ہی رکھنا۔'' اس کے لہجے میں تاکید تھی۔

انصر نے وہ ضیغم کے ہاتھ سے لے لیے اور دیکھا کہ وہ ہزار ہزار کے چار نوٹ تھے۔

''یہ... یہ... کیوں؟''

''سمجھ لو کہ وہ انگوٹھی میں نے اپنے پاس گروی رکھ لی ہے۔'' ضیغم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب تمہیں اپنی والدہ سے جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور جب بھی تم اس قابل ہوجاؤ کہ انگوٹھی مجھ سے واپس لے سکو تو میں ان روپوں کا سود نہیں لوں گا۔ دیکھو انکار مت کرنا۔ مجھے بہت افسوس ہوگا۔ میں کوئی ایسا انسان نہیں ہوں کہ اپنے پڑوس کے ایک گھر کا دکھ درد محسوس نہ کروں۔ اگر میں کسی قابل ہوتا تو تم لوگوں کے لیے بہت کچھ کرتا۔''

انصر کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ اس مرتبہ وہ تشکر کے آنسو تھے۔

☆☆☆

چار ہزار کی وہ رقم ایسی نہیں تھی کہ اس مہنگائی کے دور میں زیادہ دن چل سکتی۔ جلد ہی صرف ایک ہزار باقی رہ گئے۔

''چند دن بعد کیا ہوگا اماں؟'' صفیہ نے پوچھا۔ اس وقت اس کی چھوٹی بہن عارفہ اس کی گود میں لیٹی ہوئی تھی۔

''انتظار کررہی ہوں۔'' زیب النسا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بھائی صاحب کو خط تو لکھ چکی ہوں۔''

''کب تک کروگی انتظار!'' اٹھارہ سالہ صفیہ نے تلخی سے کہا۔ ''ماموں کو اگر ہم لوگوں سے کوئی لگاؤ ہوتا تو ابا کے انتقال پر تو آتے۔ وہ تو چہلم پر بھی نہیں آئے۔ ملتان یہاں سے ہزاروں میل دور تو نہیں ہے۔''

''دو تین دن اور دیکھتی ہوں۔'' زیب النسا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''پھر وہی کروں گی جو بتا چکی ہوں تمہیں۔''

انصر جو ایک طرف خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا، جلدی سے بول پڑا۔ ''کیا کروگی اماں؟''

زیب النسا نے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

صفیہ نے انصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ پیچھے جو کچی آبادی ہے۔ وہاں کئی ماسیاں رہتی ہیں۔ ان میں سے دو ایک تو ڈیفنس کے بنگلوں میں کام کرتی ہیں۔ ان سے ملیں گی اماں کہ وہ انہیں بھی کہیں کام دلادیں۔''

''اماں!'' انصر جیسے تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم ماسی کا کام کروگی؟''

''تو اور کیا کروں گی؟'' زیب النسا کے آنسو نکل پڑے۔ ''اب فاقوں کی نوبت آنے والی ہے۔ گھر میں اب کوئی ایسی چیز نہیں جو بیچ کر چار دن بھی گھر میں کچھ پک سکے۔''

''تم یہ نہیں کروگی اماں!'' انصر نے کہا اور تیزی سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اب اسے ضیغم کی تلاش تھی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن ضیغم کبھی کبھی جلدی بھی اپنے گھر لوٹ آتا تھا۔

گزرے ہوئے دنوں میں دوسرے تیسرے دن اس کی ملاقات ضیغم سے ہوتی رہی تھی۔ ضیغم اس کی ملازمت کے سلسلے میں مایوسی کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن ایک دن پہلے اس نے جو باتیں کی تھیں، وہ عجیب ہی تھیں۔

ضیغم کے بہ قول اس کی اسٹیٹ ایجنسی کے مالک مراد کی کار کا ایک ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ وہ اس کے بنگلے کے قریب ہی کی ایک ایسی سڑک تھی جہاں ٹریفک برائے نام ہوتا تھا۔ وہاں وہ اپنی کار کا پہیا بدلنے کے لیے گاڑی سے اترا ہی تھا کہ پیچھے سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار کار اس کی کھڑی ہوئی کار کے پچھلے حصے سے ٹکراتی ہوئی گزر گئی۔ اس ٹکر سے مراد کی کار کی ٹیل لائٹ ٹوٹ گئی۔ ٹکر مارنے والی کار ٹکر مارنے کے بعد اور زیادہ تیز رفتاری سے نکل چلی گئی۔ مراد نے اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا تھا اور اسے پہچان بھی گیا تھا۔ وہ داور اسٹیٹ ایجنسی کے مالک داور کا بیٹا تھا۔ مراد نے بعد میں داور کو فون کر کے اس سے کہا تھا کہ اس کے نوعمر لڑکے نے جس کے پاس شاید ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں ہوگا، اناڑی پن میں اس کی کار کو ٹکر ماردی ہے جس سے اس کی کار کی ٹیل لائٹ ٹوٹ گئی ہے۔

مراد اتنے پیسے والا آدمی تھا کہ اس نقصان کی اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن بہ قول ضیغم، وہ کیونکہ اکل کھرا تھا اس لیے اس نے نہ صرف داور سے نقصان کی تلافی کرنے کے لیے کہا بلکہ داور کا جواب سنے بغیر دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر نقصان کی تلافی نہیں کی گئی تو وہ پولیس میں رپورٹ کر کے داور کے بیٹے کو گرفتار کرادے گا۔ اس کی ان باتوں پر داور کو غصہ آگیا اور اس نے جواب دیا کہ مراد جو چاہے کرے، اس کے نقصان کی تلافی نہیں کی جائے گی۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ رشوت دے کر اپنے بیٹے کا ڈرائیونگ لائسنس بنوا چکا ہے۔ اس جواب سے مراد بہت تلملایا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ داور کی گاڑیوں کو نقصان پہنچاتا رہے گا۔

داور کے پاس تین گاڑیاں تھیں۔ ایک خود اس کے پاس رہتی تھی۔ دوسری اس کی بیٹی کی تھی۔ اپنے پندرہ سالہ بیٹے کے لیے اس نے تیسری کار خریدی تھی۔ مراد چاہتا تھا کہ دو ایک ایسے لڑکے تلاش کیے جائیں جنہیں جب بھی موقع ملے، وہ ان کاروں پر بڑا سا پتھر مار کر بھاگ لیا کریں۔ کبھی کوئی شیشہ توڑ دیں اور شیشہ نہ توڑ سکیں تو گاڑی پر ''ڈینٹ'' ہی پڑ جائے۔ اس نے دو ایک ایسے لڑکے تلاش کرنے کی ذمے داری ضیغم کو سونپی تھی کیونکہ وہ اپنی ایجنسی میں کام کرنے والوں میں اس پر سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔

''میں ان لڑکوں کو ایک ڈینٹ ڈالنے کے عوض پانچ سو روپے اور شیشہ توڑنے کے عوض ایک ہزار روپیا دیا کروں گا۔'' ضیغم کے بہ قول مراد نے اس سے کہا تھا۔

یہ کہانی ضیغم نے ایک دن پہلے ہی انصر کو سنائی تھی اور انصر جو مستقل پریشان رہنے لگا تھا، یہ سب کچھ سن کر ہنس پڑا۔

''کیا آپ کا مالک پاگل ہے انکل ضیغم؟'' اس نے کہا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ وہ بہت سنکی ہے۔''

''تو آپ اس کے لیے ایسے لڑکے تلاش کریں گے؟''

''کرنا ہی پڑیں گے میاں انصر! میں ہر قیمت پر اپنے مالک کو خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ ہاں اگر تم چاہو تو یہ کام تم بھی کر سکتے ہو۔ ذرا سے کام کے بدلے میں ہزار پانچ سو مل سکتے ہیں۔''

''نہیں انکل ضیغم!'' انصر نے جلدی سے کہا تھا۔ ''اس قسم کے کام میں نہیں کرسکتا۔''

ضیغم نے بھی ہنس کر جواب میں کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ کام نہیں کروگے۔ بس ایسے ہی ذکر کردیا میں نے... دراصل مجھے خیال آیا تھا کہ اگر مراد تم سے خوش ہوگیا تو تمہیں

تعارف

ایک محفل میں غیر رسمی ملاقات کے بعد لڑکے نے لڑکی سے کہا،
'اپنا فون نمبر تو دیتی جائیں۔'
'ڈائریکٹری میں دیکھ لینا۔'
'تو نام ہی بتا دیں۔'
'وہ بھی اسی کے ساتھ ہوگا۔'

ج۔ ایچ۔ کراچی

اپنے گھر میں ملازم بھی رکھ لے گا۔ خیر چھوڑو۔ میں نے تمہاری ملازمت کے لیے دو ایک جگہ اور بھی بات کی ہے۔ امید ہے، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ہاں البتہ اس میں دیر ضرور لگ سکتی ہے۔''

اس موضوع پر بات یہیں ختم ہو گئی تھی۔

انصر کا مزاج ایسا تھا ہی نہیں کہ وہ لوگوں کی گاڑیوں پر پتھر مارتا پھرتا لیکن صرف ایک رات اور ایک دن بعد اس نے اپنی ماں کا ارادہ جانا تو اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو لوگوں کے گھروں کی ماسی تو ہرگز نہیں بننے دے گا، خواہ اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔

اس نے پارک کا رخ کیا۔ ضیغم نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے گھر کبھی نہ آئے جب بھی ملنا چاہے، پارک میں آجائے۔ ضیغم رات کو جب بھی اپنے گھر لوٹتا تھا تو کھانے سے پہلے پارک میں آ کر آدھ پون گھنٹے چہل قدمی ضرور کیا کرتا تھا۔

پارک میں انصر کو ایک گھنٹے تک ضیغم کا انتظار کرنا پڑا۔

''کیا حال ہیں میاں انصر؟'' اس نے معمول کے مطابق پوچھا۔ ''مجھے خیال نہیں تھا کہ تم آج بھی یہاں ہو گے۔''

''میں آپ سے ہی ملنے آیا تھا۔''

''کیوں؟ سب خیریت تو ہے نا؟''

انصر نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر پوچھا۔ ''آپ نے اپنے مالک کے لیے وہ لڑکے تلاش کر لیے؟''

''نہیں ابھی تو نہیں کر سکا۔ آج کام بہت زیادہ تھا۔ فرصت ہی نہیں ملی مگر تمہیں یہ پوچھنے کا خیال کیوں آیا؟''

''میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں انکل ضیغم!''

''کیا اب تم مجھ سے مذاق بھی کیا کرو گے؟'' ضیغم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''یہ بالکل مذاق نہیں ہے انکل ضیغم! میں یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں اپنی ماں کو لوگوں کے گھروں کی نوکرانی تو نہیں بننے دوں گا۔'' انصر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ باپ کی موت کے بعد سے وہ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ کوئی چھوٹی موٹی تکلیف دہ بات بھی اس کی آنکھوں میں آنسو لے آتی تھی لیکن ماں کا ماسی بننا تو اس کے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ اس نے ضیغم کو ساری بات بتا دی۔ وہ کچھ ہی دنوں میں ضیغم سے بہت اپنایت محسوس کرنے لگا تھا۔

زیب النسا کے ارادے سے باخبر ہونے کے بعد ضیغم نے انصر سے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا۔ ''چلو اچھا ہوا کہ تم اس بہانے یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دراصل مجھے بہت زیادہ امید ہے کہ مراد صاحب خوش ہو کر تمہیں اپنے پاس ملازم رکھ لیں گے۔ تمہارا ذکر تو میں ان سے کر ہی چکا ہوں۔''

''یہ کام مجھے کس طرح کرنا ہوگا انکل ضیغم؟'' انصر نے پوچھا۔

''کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا دیا کروں گا جہاں سے داور کی یا اس کے بیٹے یا بیٹی کی کار گزرنے والی ہوگی۔ داور کی کار پر پتھر مارنے کے لیے تو رات کے دس بجے کا وقت بہت مناسب ہے۔ میں تمہیں اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر گلیوں گلیوں ہوتا، تمہیں اس جگہ تک پہنچا دوں گا جہاں سامنے ہی داور کا بنگلا ہے۔ وہ اس وقت کلب جاتا ہے۔ جیسے ہی اس کی کار بنگلے سے نکل کر سڑک پر مڑے، تم پیچھے سے اس کی کار پر پتھر مارنے کے بعد دوڑ کر قریب کی گلی میں آجانا۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔ تم میری موٹر سائیکل پر بیٹھ جانا... میں پلک جھپکتے میں تمہیں اتنی دور لے جا کر چھوڑ دوں گا کہ کسی کے فرشتے بھی تمہیں نہیں پا سکیں گے۔''

''اور اس کے بیٹے بیٹی کی کاریں؟''

''بیٹی کالج جاتی ہے اور بیٹا اسکول جاتا ہے۔ وہ دسویں میں پڑھ رہا ہے۔ کل میں ان دونوں کے آنے جانے کا راستہ اور وقت معلوم کر لوں گا۔ پھر کل رات ہی تمہیں بتا دوں گا کہ پرسوں تم کس جگہ پہنچو۔''

''ان دونوں کی کاروں پر دن میں پتھر مارنا ہوں گے۔'' انصر کچھ پریشان ہوا۔ ''اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا اور میں پکڑا گیا؟''

''کیا میں تمہارا دشمن ہوں انصر میاں! ارے بہت دیکھ بھال کر ہوگا یہ کام اور اس دن موقع نہیں ملے گا تو اس سے اگلے دن دیکھا جائے گا۔ ایسی باتوں کی بالکل فکر نہ کرو۔ میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''پیسے کب ملیں گے؟''

''میں کل مراد صاحب سے بات کر لوں گا۔ ان سے ایک ہزار روپے بھی لے لوں گا۔ اگر تم شیشے پر پتھر مارنے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں ایک ہزار روپے دے دوں گا ورنہ پانچ سو تو تمہیں ملیں گے ہی۔''

''مراد صاحب کے گھر میں نوکری مل جائے گی اس طرح؟''

''امید تو مجھے بہت ہے بلکہ یقین سمجھو۔ میں جانتا ہوں نا ان کا مزاج... وہ اس بات سے بہت خوش ہوں گے مگر ان کی ملازمت مل جائے گی تو تمہیں ایک بات کا بہت خیال رکھنا پڑے گا۔ وہ جس کام کو بھی کہیں، اس سے انکار مت کرنا۔ وہ بس ایسے ہی آدمی ہیں۔ بعض اوقات بڑے بے تکے کام کرنے کے لیے کہہ بیٹھتے ہیں۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے انکل ضیغم! مجھے ابھی تو بس یہ

یقین دلا دیں کہ کاروں پر پتھر مارنے کے پیسے مجھے ضرور مل جائیں گے؟''

''ہاں... ہاں... کیوں نہیں؟''

اس بات چیت کے کچھ دیر بعد انصر اپنے گھر پہنچا تو زیب النسا نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''اتنی تیزی سے کہاں چلے گئے تھے تم؟''

''میں ملازمت کے لیے کوششوں میں لگا ہوا ہوں اماں!'' انصر نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی سنانا شروع کی۔ ''میرے ایک اسکول ٹیچر بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ بیس دن ہوئے وہ مجھے ایک جگہ مل گئے تھے۔ کہنے لگے، فیس نہ دینے کی وجہ سے اسکول سے تمہارا نام کاٹ دیا گیا، کیا تم اب پڑھنا نہیں چاہتے؟ ان کی اس بات پر مجھے رونا آگیا اور پھر میں نے انہیں اپنے گھر کے سارے حالات بتا دیے۔ وہ بہت افسوس کرنے لگے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے کہیں نہ کہیں ملازمت دلوا دیں گے۔ میں دو دو، تین تین دن بعد ان کے گھر جا کے پوچھتا رہا۔ وہ مجھے ہر بار یہی بتاتے تھے کہ ابھی کچھ نہیں ہوا۔ آج جب تم نے بتایا کہ تم گھروں میں ملازمت کرو گی تو میں ہی کسی ہوٹل میں جا کر بیرا بن جاتا ہوں۔ بس میں یہی کہنے کے لیے اپنے ٹیچر کے گھر گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اچھا ہوا تم آج آگئے۔ انہوں نے میرے لیے کچھ کام ڈھونڈ لیے ہیں۔''

''کئی کام؟'' زیب النسا نے حیرت سے کہا۔

''ہاں اماں!'' انصر نے جواب دیا۔ ''جوتا مارکیٹ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ وہاں بعض لوگ اچھا خاصا بڑا کاروبار کرتے ہیں مگر انہیں لکھنا لکھانا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنے لیجر تیار کرنے کے لیے کسی کو گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا کام کرنے پر رکھ لیتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ وہ پارٹ ٹائم جاب ہوتا ہے۔''

''یہ لیجر کیا ہوتا ہے؟'' زیب النسا نے پوچھا۔

''حساب کتاب کے رجسٹر ہوتے ہیں اماں!''

زیب النسا نے کچھ خوش ہو کر پوچھا۔ ''کتنی تنخواہ ملے گی؟''

''دو جگہ سے ڈھائی تین ہزار تو مل ہی جایا کریں گے اور شاید تیسری جگہ بھی کام بن جائے۔ ہر جگہ شام کو بس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے جانا ہوگا۔ کل رات نو بجے کے بعد مجھے جا کر بات کرنا ہوگی۔''

زیب النسا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تمہارے ابا تو تمہیں جانے کیا بنانا چاہتے تھے لیکن مقدر میں یہ لکھا تھا۔''

''حالات سنبھلنے کے بعد میں پرائیویٹ امتحانات دینا شروع کر دوں گا اماں! ابا جو چاہتے تھے نا، میں وہی بننے کی کوشش ضرور کروں گا۔''

زیب النسا نے اداسی کی حالت میں انصر کو اپنے گلے لگا لیا۔

انصر کا دوسرا دن بڑی بے چینی میں گزرا۔ اسے یہ بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ آج رات اسے کسی کار پر پتھر مارنا ہے جس کے عوض اسے پانچ سو یا ایک ہزار روپے ملیں گے۔ اس خیال کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ شخص مراد یقیناً ایک ایب نارمل شخص ہے جس نے یہ حرکت کروانے کے لیے ضیغم سے دو ایک لڑکوں کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔

جہنم میں جائے، انصر نے اپنا سر جھٹکا۔ ایسے ہی دو چار پاگل اور مل جائیں تو اس کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو سکتا ہے۔

رات کا کھانا کھا کر وہ گھر سے روانہ ہوا۔ زیب النسا نے صفیہ سے کہا۔ ''میں نے تو نفل مانے ہیں۔ اگر انصر کو کام مل گیا تو...''

صفیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کام مل بھی گیا اماں تو اس سے کیا ہوگا۔ تنخواہ تو مہینے بھر بعد ملے گی۔ پورا مہینا ہم کیسے گزاریں گے؟ اب ایک ہی ہزار تو بچے ہیں۔''

صفیہ کی یہ فکرمندی قدرتی بات تھی لیکن یہ فکر اس وقت ختم ہو گئی جب ساڑھے دس بجے کے قریب انصر واپس لوٹا۔ اس نے پانچ سو کا ایک اور سو سو کے پانچ نوٹ ماں کی گود میں ڈال دیے۔

''لو اماں! دو جگہ کام بھی مل گیا۔ دونوں جگہ سے پانچ پانچ سو روپے ایڈوانس بھی مل گئے۔ یہ میرے ٹیچر صاحب کی مہربانی ہے۔ انہی کی سفارش سے کام بھی ملا ہے اور ایڈوانس بھی! کل ایک جگہ اور بھی کام ملنے کی امید ہے۔ دونوں جگہ کی ملازمت دو دو ہزار کی ہے۔ ہر جگہ گھنٹا بھر یا اس سے کچھ کم وقت دینا پڑے گا۔ کام شام ہی کا ہوگا.... دن بھر کا حساب کتاب لکھنا ہوگا نا! گھر سے چار بجے نکلا کروں گا اور آٹھ بجے واپس آیا کروں گا۔ اگر تیسری جگہ بھی کام مل گیا تو نو بجے واپسی ہوا کرے گی۔'' انصر جیسے ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

صفیہ نے بڑی محبت سے انصر کی پیشانی چوم لی اور کہا۔ ''پیارے بھیا! تم نے اماں کو ماسی بننے سے بچا لیا۔''

انصر کو اس رات خاصی دیر سے نیند آئی۔ اس نے جو حرکت کی تھی، اسے یاد کر کے وہ بار بار مسکراتا رہا۔ اسے اس کام میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ضیغم نے اتنے بڑے پتھر کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا جو ہلکا تو نہیں لیکن اتنا زیادہ بھاری بھی نہیں تھا کہ انصر وہ کھینچ کر مار نہ سکتا۔ کار پر پتھر مار کر

وہ بھاگتا ہوا گلی میں گھسا تھا اور ضیغم نے اسے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر بڑی تیزی سے کافی دور پہنچا دیا تھا۔

اسے ضیغم کی اس یقین دہانی پر بھی یقین آ گیا تھا کہ ان کاموں کے بعد اسے مراد کے گھر کی ملازمت ضرور مل جائے گی۔

عام حالات میں انصر ایک گھریلو ملازم بننا ہرگز گوارا نہیں کرتا لیکن وہ یہ ملازمت بہ خوشی قبول کرنے کے لیے یوں تیار تھا کہ اس طرح اس کی ماں کو لوگوں کے گھروں میں کام نہیں کرنا پڑتا۔

باپ کی موت کے بعد وہ پہلی رات تھی جب اس کے دماغ میں گھریلو پریشانیوں کے بجائے دوسرے خیالات بھی آئے ....اسے اپنا اسکول بھی یاد آیا اور اسکول یاد آیا تو ساتھ پڑھنے والوں میں سے وہ اداس اور سہمی سہمی سی نظر آنے والی لڑکی گیتی بھی یاد آگئی۔

گیتی خوب صورت نقش و نگار کی دلکش لڑکی تھی جو نہ جانے کیوں اداس اور ڈری ڈری سی نظر آتی تھی۔ ٹیچرز کا کہنا تھا کہ ایسی کشادہ پیشانی اور چمکیلی آنکھوں والے تو بہت ذہین ہوتے ہیں لیکن گیتی پڑھائی کے معاملے میں پیچھے ہی رہتی تھی۔

گیتی بس پاسنگ مارکس لایا کرتی تھی۔ شاذ و نادر ہی کسی سبجیکٹ میں اسے چالیس اکتالیس نمبر مل جاتے تھے۔ وہ خاموش طبع بھی بہت تھی۔ غیر فطری حد تک چپ رہنے والی... ساتھ پڑھنے والوں میں سے کوئی بھی اس کا دوست نہیں تھا، نہ کوئی لڑکا، نہ لڑکی... کلاس میں موجود طلبہ کو اس کی آواز سننے کا موقع عموماً اس وقت ملتا تھا جب وہ کسی ٹیچر کے سوال کا جواب دیتی تھی۔ اسے مغرور اس لیے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اگر کوئی ساتھی طالب علم یا طالبہ اس سے بولتی تھی، تو وہ مختصر سا جواب ضرور دیتی تھی۔

انصر کبھی کبھی بے خیالی میں خاصی دیر تک اسے تکا کرتا تھا۔ وہ اسے اچھی ہی نہیں، بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بات کی بھی تھی لیکن باتیں نہیں کر سکا تھا۔ وہ ایک ہی بات کا نہایت مختصر لیکن اتنا جامع جواب دیتی تھی کہ مزید کچھ بولنے کا جواز ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ اس کا ایسا مکمل جواب بھی اس کی ذہانت کی غمازی کرتا تھا مگر امتحانات میں اس کی ذہانت نہ جانے کہاں رخصت ہو جاتی تھی۔

انصر کو اس کی یاد آئی تو وہ دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر کسی وقت اسے نیند آ گئی۔

☆☆☆

اگلے دو دنوں میں انصر نے مزید دو کاروں پر پتھر مارے۔ دونوں مرتبہ اس کی کوشش رہی کہ پتھر شیشوں پر پڑیں لیکن اس مقصد میں وہ ایک ہی مرتبہ کامیاب ہو سکا۔ دوسری کار پر وہ صرف ڈینٹ ہی ڈال سکا۔ معاوضے میں اسے ڈیڑھ ہزار روپے ملے۔ اس نے پانچ سو روپے یہ کہہ کر ماں کو دے دیے کہ اسے تیسری جگہ بھی ملازمت مل گئی ہے اور پانچ سو ایڈوانس وہاں سے بھی مل گئے تھے۔ وہ باقی ایک ہزار بھی ماں کو دینا چاہتا تھا لیکن وہ کوئی ایسی مناسب بات نہیں سوچ سکا کہ زیب النسا مطمئن رہتی کہ وہ پیسا کسی غلط ذریعے سے نہیں آ رہا۔

ضیغم نے ہنس کر انصر سے کہا۔ ”آج تو اخباروں میں بھی آ گیا ہے کہ شہر میں کوئی پاگل کاروں پر پتھر مارتا پھر رہا ہے۔ پولیس نے بھی اس کا نوٹس لے لیا ہے لیکن تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اب تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ اخباروں میں خبر آ جانے سے مراد صاحب بہت خوش ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ آج شام ہی اس لڑکے کو لے کر میرے بنگلے پر آؤ۔ اب تو تمہیں سو فیصد یقین کر لینا چاہیے کہ تمہیں ملازمت مل جائے گی۔“

انصر واقعی خوش ہو گیا۔ اگر چار ہزار روپے ماہانہ بھی ملتے تو فی الحال جیسے تیسے گھر کا خرچ چلانے کی سبیل ہو جاتی۔ وہ مکان کیونکہ انصر کے والد نے شادی سے پہلے ہی بنوا لیا تھا اس لیے اس کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔

شام ساڑھے پانچ کے درمیان انصر اس بنگلے میں تھا جہاں ضیغم اسے لے گیا تھا۔ اس نے انصر کو لان میں بیٹھے ہوئے ایک پختہ عمر شخص کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس آدمی کی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہیں تین اور کرسیاں بھی پڑی تھیں۔

”یہ ہیں صاحب!“ ضیغم نے انصر سے کہا۔

انصر نے سلام کیا۔ مراد نے سر کی جنبش سے جواب دینے کے بعد سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔

”تم بیٹھو ضیغم!“ اس نے کہا۔

ضیغم بیٹھ گیا۔ انصر کھڑا رہا۔

”اسے انگریزی بھی آتی ہے صاحب!“ ضیغم نے کہا۔ ”بس والد کی موت کی وجہ سے پڑھائی چھوڑنا پڑی اسے۔ اب گھر والے بڑی پریشانی میں ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں گھر کی ہر چیز بک چکی ہے۔“

مراد نے سر ہلایا اور پھر انگریزی ہی میں انصر سے اس کے گھر کے افراد کے بارے میں پوچھا۔ انصر نے انگریزی میں جواب دیا۔

”اچھا ایک کام کرو۔“ مراد نے انگریزی ہی میں کہا۔ ”وہ جو بیری کا درخت ہے نا!“ اس نے لان کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں تک دوڑتے ہوئے جاؤ۔ بیری سے ایک کانٹا توڑ لاؤ۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ تم کتنا تیز دوڑ سکتے ہو۔“

انصر سے ایک بے تکا کام کرنے کے لیے کہا گیا لیکن انصر کو ضیغم کی بات یاد تھی کہ مراد سنکی اور اکل کھرا ہے لہٰذا اسے اس کے بے تکے احکام پر بھی عمل کرنا ہو گا۔

انصر پوری طاقت سے دوڑتا ہوا گیا اور بیری سے ایک کانٹا توڑ لایا۔

”گڈ!“ مراد نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ”خاصا تیز دوڑ لیتے ہو۔ اچھا اب یہ کانٹا اپنی جیب میں رکھ لو۔ یہاں پھولوں پر کچھ تتلیاں اڑتی پھر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ تتلی پکڑ کر لاؤ۔“

انصر اس کام کے لیے بھی حرکت میں آ گیا۔ ملازمت کے لیے یہ دنیا کا ایک نہایت اچھوتا انٹرویو تھا، اگر اسے انٹرویو کہا جا سکے۔

انصر ایک تتلی پکڑ لایا۔

”اب یہیں بیٹھ جاؤ۔“ مراد نے گھاس کی طرف اشارہ کیا۔

انصر بیٹھ گیا۔

مراد بولا۔ ”اب اس کانٹے کو تتلی کے جسم میں چبھو ڈالو...“

انصر کی روح لرز گئی۔ اس کے خیال میں وہ ایک ظالمانہ فعل ہوتا۔ معصوم تتلی کو شاید تڑپنے کی بھی مہلت نہیں ملتی اور وہ دم توڑ دیتی لیکن انصر یہ بھی کر گزرا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن عارفہ کو فاقوں سے دم توڑتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس نے مراد کا حکم بجا لا کر تتلی سے فوراً نظر ہٹا لی۔

”شاباش!“ اس مرتبہ مراد اردو میں بولا۔ ”تم انٹرویو میں کامیاب رہے ہو۔ میری خواہش کے عین مطابق ہو۔ ضیغم نے تمہیں کام تو بتا ہی دیا ہو گا۔ وہ سب کر لو گے نا؟“

”جی صاحب!“

”میں تم سے بہت خوش ہوا ہوں... تمہاری تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ ہو گی۔ تمہیں کل سے کام پر آنا ہے۔ صبح سات بجے آ جانا۔ ناشتا یہیں کرنا۔ دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھانا۔ رات نو بجے اپنے گھر واپس چلے جانا... کھانا کھا کے جانا یا اپنے ساتھ اتنا کھانا لے جانا کہ تمہارے گھر کے سب لوگ بھی کھا سکیں... اور ہاں! رات کو کبھی کبھی زیادہ دیر تک بھی رکنا پڑ سکتا ہے۔ جب بھی تم رکو گے، تمہیں اس دن دو سو روپے دیے جائیں گے۔ اس کا تمہاری تنخواہ سے کوئی تعلق نہیں ہو گا... منظور ہے تمہیں؟“

”منظور ہے صاحب!“ انصر نے کہا۔ اس کے لیے وہ کوئی معمولی ڈیوٹی نہیں تھی۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا اور پھر رات دس بجے واپسی ہوتی۔ یہ اس کے لیے چودہ گھنٹے کی مصروفیت تھی لیکن فی الحال اس کے سامنے کوئی ایسا دوسرا راستہ نہیں تھا جس پر چل کر وہ اپنے گھر والوں کو فاقوں سے بچا سکتا۔

گھر واپس جا کر اس نے اپنی ماں اور بڑی بہن سے یہ بہانہ بنایا کہ اسے ایک بڑے ہوٹل میں پانچ ہزار روپے ماہانہ کی ملازمت مل گئی ہے۔

”اور جن لوگوں سے ایڈوانس لے چکے ہو؟“ زیب النسا بولی۔

”وہ تنخواہ ملنے کے بعد تین مہینے میں واپس کر دیا جائے گا۔“ انصر نے جواب دیا۔ ”میرے ٹیچر نے ان لوگوں سے بات کر لی ہے۔“

”چودہ گھنٹے گھر میں نہیں رہو گے تم؟“ صفیہ افسردگی سے بولی۔

”مہینے میں پانچ ہزار بھی تو ملیں گے بجیا! کبھی کچھ دیر ہو گی تو اس کے الگ سے دو سو روپے ملیں گے۔ گھر کا کام اتنا تو ہو گا نہیں کہ ہر وقت مصروف رہوں۔ دو چار دن بعد میں موقع دیکھ کر اپنی کتابیں بھی وہاں لے جا کر چھپا دوں گا۔ جب وقت ملے گا تو پڑھ لیا کروں گا۔ پرائیویٹ امتحان تو دینا ہے نا!“

”امتحان دینے کے لیے چھٹی مل جائے گی؟“

”امتحانوں کے دنوں میں بیماری کا بہانہ کر دیا کروں گا۔“

انصر نے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر والوں کو سمجھا بجھا دیا۔

دوسری صبح وہ چھ بجے گھر سے روانہ ہوا اور سات بجے سے کچھ پہلے مراد کے گھر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے اس کے لیے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا۔

ضیغم نے انصر کو بتا دیا تھا کہ مراد کے گھر میں دو ہی ملازم تھے۔ ایک چوکیدار اور دوسرا خانساماں!

چوکیدار بڑا خرانٹ قسم کا آدمی تھا۔ وہیں انصر نے ایک اور آدمی کو بھی دیکھا۔ وہ بہت سیدھا سادہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ خانساماں تھا۔ اس دن اس کو یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ انصر کو اپنے ساتھ کچن میں لے جائے۔ اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ بنگلا انصر کا دیکھا بھالا نہیں تھا۔

خانساماں نے اسے کچن میں لے جا کر ناشتا کرایا اور پھر گھریلو استعمال کے کچھ سامان کی لسٹ کے ساتھ ایک ہزار کا نوٹ بھی دیا۔ انصر نے محسوس کیا کہ وہ خاصی حد تک خاموش طبع انسان ہے۔

مارکیٹ قریب ہی تھی جو شبنم نے الفر کو گزشتہ روز ہی دکھا دی تھی۔ الفر وہاں سے سامان خرید لایا جو ایک ہزار روپے سے کچھ کم کا تھا۔ جب وہ سامان لے کر گھر کے قریب پہنچا تو پھاٹک سے ایک کار نکل کر دوسری طرف مڑی۔ الفر اس میں بیٹھے ہوئے فرد یا افراد کو نہیں دیکھ سکا۔

جب اس نے بنگلے کے برآمدے میں مراد کو آرام کرسی پر بیٹھا دیکھا تو سمجھ گیا کہ کار میں جانے والا کوئی اور تھا۔ ابھی اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں۔

''گڈ!'' مراد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم وقت سے پہلے آ گئے تھے۔ مجھے وقت کی پابندی کرنے والے بہت پسند ہیں۔ جا کے خانساماں کو یہ سامان دو اور گھر کی صفائی شروع کردو۔''

الفر کچن میں پہنچا۔ اس نے خانساماں سے پوچھا کہ گھر کی صفائی کرنے کا سامان کہاں ہے؟ خانساماں نے اسے اسٹور دکھا دیا جہاں ویکیوم کلینر، کپڑے کی جھاڑن اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔

ویکیوم کلینر الفر نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا لیکن اسے اس کی بک لیٹ مل گئی۔ اسے پڑھ کر اس نے ویکیوم کلینر کا استعمال بھی سمجھ لیا۔ اس نے گھر کی صفائی شروع کی ہی تھی کہ اس نے اسکرٹ میں ملبوس ایک پختہ عمر کی عورت کو اپنے قریب کھڑا پایا۔ وہ اپنا کام روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چوکیدار کی طرح وہ بھی خاصی خرانٹ معلوم ہو رہی تھی۔

''تمہارا نام الفر ہے؟'' اس کا لہجہ درشت تھا۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''یس میڈم!'' الفر نے جواب دیا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم انگریزی بول سکتے ہو ورنہ مجھے دشواری پیش آ سکتی تھی۔ میں بہت کم اردو جانتی ہوں۔ تم محنتی بھی معلوم ہو رہے ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اس گھر میں تمہاری زندگی بن جائے گی۔''

اس نے الفر کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور ایک طرف بڑھتی چلی گئی۔ الفر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جلد ہی وہ کسی طرف مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کام جاری رکھتے ہوئے الفر کو اندازہ ہوا کہ اس بڑے سے بنگلے کی جھاڑ پونچھ غالباً کئی دن سے نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر تک مصروف رہنے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی نصف کام سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا۔ اس وقت تک کسی کمرے کی صفائی کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

ایک بجے تک وہ خاصا تھک گیا۔ خانساماں نے اس سے کہا کہ وہ ایک بجے کچن میں آ کر کھانا کھا لے چنانچہ اس نے ادھر کا رخ کیا۔ خانساماں اسی کا منتظر تھا۔ اس نے الفر کے ساتھ خود بھی کھانا شروع کیا۔

الفر نے اس سے پوچھا۔ ''اس بنگلے میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟''

''آہستہ آہستہ خود ہی جان لوگے۔''

''ابھی تک میں نے صرف ایک خاتون کو دیکھا ہے جو اس گھر کی ملازمہ نہیں معلوم ہوتیں۔ وہ غالباً کرسچین ہیں۔''

''ہاں، وہ ریٹا میڈم ہیں۔''

''وہ ہیں کون؟''

''آہستہ آہستہ سب کچھ خود جان لوگے۔''

الفر نے محسوس کیا جیسے خانساماں باتیں کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ خیال دماغ میں آیا تو الفر نے خاموشی اختیار کرلی پھر کھانے کے اختتام تک خاموشی ہی رہی۔ خانساماں کا انداز ایسا رہا جیسے وہ اکیلا ہی بیٹھا کھانا کھا رہا ہو۔

''ابھی میرے لیے خاصا کام ہے۔'' کھانے کے بعد الفر نے جان بوجھ کر کہا۔ وہ خانساماں کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

خانساماں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور برتن سمیٹنے لگا۔

الفر پھر بولا۔ ''ابھی تو کمروں کی صفائی کی نوبت بھی نہیں آئی ہے... معلوم ہوتا ہے، یہاں کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی ہے۔''

خانساماں اب بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ برتن سمیٹ کر ''سنک'' کی طرف چلا گیا۔

یہ کیا معاملہ ہے؟ الفر سوچتا ہوا کچن سے نکل آیا اور جہاں سے اس نے صفائی کا کام چھوڑا تھا، وہیں سے پھر شروع ہو گیا۔ اسے اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی پراسرار سے گھر میں آ گیا ہو۔ اس احساس کے بعد اس کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات چکرانے لگے۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے اس کے عقب میں کوئی ہو۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اسکول میں جس سہمی ہوئی لڑکی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، وہ اسے اس بنگلے میں نظر آئے گی۔

وہ گیتی تھی اور اس وقت بھی اس کے چہرے پر اداسی اور خوف کا تاثر موجود تھا۔

''الفر!'' وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ''تم نے اسکول آنا چھوڑ کر یہ معمولی سی ملازمت کیوں کرلی؟''

''تم یہاں کیسے؟'' الفر نے بے اختیار پوچھا۔

''میری بات کا جواب دو۔'' گیتی مضطرب ہو گئی۔ ''میں زیادہ دیر تک تمہارے قریب نہیں رہ سکتی۔ تم نے اسکول کیوں چھوڑ دیا؟''

''میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔'' الفر کی آواز بھرا گئی۔ ''وہ جیسے تیسے مجھے اس مہنگے اسکول میں پڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد میرے گھر کے حالات ایسے ہو گئے کہ میں ملازمت کرنے پر مجبور ہوں۔''

کسی اونچی ایڑی کے جوتوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ الفر کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ جب ریٹا میڈم اس سے بات کر کے گئی تھی تو ایسی ہی آواز اس کے اونچی ایڑی کے جوتوں سے ہوئی تھی۔

آواز ابھی کہیں دور ہی تھی لیکن گیتی کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ اس نے وہ آواز سن لی ہے اور چونک گئی تھی۔

''میں تم سے دوبارہ بات کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہوں گی۔'' گیتی نے تیزی سے لیکن دھیمی آواز میں کہا اور مڑ کر اس طرح وہاں سے بھاگی جیسے اس نے کسی آسیب یا کسی چڑیل کے قدموں کی آہٹ سن لی ہو۔ وہ اس وقت ننگے پیر تھی اور پنجوں کے بل بھاگی تھی، جیسے اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کی ایڑیوں سے ہونے والی خفیف سی دھمک بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

الفر سولہ سال کی عمر میں بھی بزدل نہیں تھا لیکن دو تین بظاہر معمولی سی باتوں نے اس پر کچھ ایسا اثر کیا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

اونچی ایڑی کی ''کھٹ کھٹ'' قریب ہوتی جا رہی تھی۔ الفر تیزی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جب ریٹا میڈم اس کے قریب آ کر رکی تو اس کے کام کی رفتار کچھ سست ضرور ہو گئی لیکن اس نے ہاتھ نہیں روکے۔

''بہت اچھے جا رہے ہو۔'' وہ بولی۔ ''میں نے ابھی سارے بنگلے کا جائزہ لیا ہے۔ تم نے بڑی حد تک کام مکمل کرلیا ہے۔ اب تمہیں روزانہ اتنی محنت نہیں کرنا پڑے گی۔''

الفر بولا۔ ''ابھی کمروں کی صفائی تو باقی ہے۔''

''کمروں کی صفائی تمہیں نہیں کرنا۔'' اس مرتبہ ریٹا میڈم کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''اس گھر میں جو جس کمرے میں رہتا ہے، وہ اپنے کمرے کی صفائی خود کر لیتا ہے۔ تم بس کمروں کے علاوہ باقی گھر صاف رکھنے کی فکر کیا کرو۔ جب صاحب آ جائیں تو ان کی گاڑی کی صفائی کر دینا۔ بے بی کی گاڑی کی صفائی اس کا شوفر کرتا ہے۔ تمہیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔ دو تین روز بعد لان کی گھاس کاٹ دیا کرنا۔ گھاس کاٹنے کی مشین لان میں موجود ہے۔ ایک خیال یہ بھی رکھنا کہ خانساماں یا چوکیدار سے زیادہ باتیں مت کرنا۔''

اس موقع پر بھی میڈم ریٹا نے الفر کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

کھٹ کھٹ کی آواز معدوم ہوئی تو الفر ایک دیوار کے سہارے فرش پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

گیتی اس عورت کے جوتوں کی آواز سن کر خوف زدہ ہوئی تھی اور بھاگ نکلی تھی۔ اب الفر کو بھی یہی محسوس ہونے لگا جیسے میڈم ریٹا کوئی عورت نہیں کوئی بدروح ہے جو اس بنگلے میں چکراتی رہتی تھی۔

☆☆☆

شام کے پانچ بجے الفر بنگلے کے برآمدے میں تھا کہ اس نے پھاٹک سے ایک کار اندر آتے دیکھی۔ جب وہ برآمدے کے سامنے آ کر رکی تو الفر نے دیکھا کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مراد تھا۔ وہ انجن بند کر کے کار سے اترا اور الفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری گاڑی کی گرد صاف کردو۔ ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے کپڑا رکھا ہے۔''

''اچھا صاحب!''

''اور ہاں!'' مراد نے اندر جاتے جاتے کہا۔ ''کار کی صفائی کر کے ڈرائنگ روم میں آنا۔''

''اچھا صاحب!''

الفر کو کار کی صفائی کرنے میں بیس منٹ لگ گئے پھر وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ مراد وہاں موجود تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کر کے وہاں آیا ہوگا۔

''آج بہت تھک گیا ہوں۔'' مراد نے تپائی پر اپنی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''ذرا میرے پیر تو دباؤ۔''

الفر نیچے بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگا۔ اس وقت پھر اس خیال نے اسے آب دیدہ کر دیا کہ اگر اس کے باپ کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو آج وہ خود کو کسی کے پیر دبانے پر مجبور نہیں پاتا۔

''الفر!'' مراد نے اسے مخاطب کیا۔

''جی صاحب!'' الفر نے جواب تو دیا لیکن نظریں نہیں اٹھائیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مراد اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھے۔

مراد نے یکایک اپنی دونوں ٹانگیں تپائی سے ہٹائیں اور صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

الفر نے جلدی سے اپنی آنکھیں خشک کرنے کے لیے اپنی آستین استعمال کی۔

''تم بہت کام کے لڑکے ثابت ہو رہے ہو الفر!''

مراد نے کہا۔ ''ریٹا نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ تم نے آج بڑی محنت سے کام کیا ہے۔''

''یہ میڈم ریٹا کون ہیں صاحب؟'' انصر کو سوال کرنے کا موقع مل گیا۔

مراد نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ میری سوتیلی بہن ہے۔ میرے باپ نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی دوسری بیوی ایک کرسچین خاتون تھیں۔ انہوں نے ریٹا کو بھی عیسائیت سے ہٹنے نہیں دیا۔ ان کا انتقال ہوئے چند ہی سال گزرے ہیں۔ ان کے مرنے کا ریٹا پر بہت اثر ہوا۔ وہ کچھ ایب نارمل ہو گئی ہے۔ اسے اب اس کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے کہ بنگلے میں اِدھر اُدھر چکراتی پھرے۔ اسے ان ملازمین سے سخت نفرت ہے جو کام کرنے کے بجائے گپ شپ میں وقت گزارتے ہیں۔ وہ ان کو بہت بری طرح ڈانٹ دیتی ہے اسی لیے ملازمین میرے گھر میں ٹک کر کام نہیں کرتے۔ کچھ ہی دن میں بھاگ جاتے ہیں۔ تم پہلے ملازم ہو جس کی اس نے مجھے فون کر کے تعریف کی۔''

ان باتوں سے انصر نے کچھ سکون محسوس کیا۔ میڈم ریٹا ایک ایب نارمل عورت تھی، کوئی بدروح نہیں تھی لیکن اس کی ایب نارملٹی ہی کی وجہ سے ملازمین اس سے ڈرتے تھے لیکن...

انصر کو گیتی کا خیال آیا۔ وہ اس گھر کی ملازمہ نہیں تھی۔ میڈم ریٹا نے ''بے بی'' کہہ کر غالباً اسی کا ذکر کیا تھا۔ وہ اس گھر کی ملازمہ نہ ہوتے ہوئے بھی میڈم ریٹا سے ڈرتی تھی اور صرف گھر میں رہتے ہوئے ہی نہیں، گھر کے باہر بھی ڈری رہتی تھی۔ اسکول میں بھی اسے ''سہمی ہوئی لڑکی'' کہتے تھے یا سمجھتے تھے۔

''صاحب!'' انصر نے ہمت کر کے کہا۔ ''میڈم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی کے کمرے کی صفائی نہ کروں۔''

''یہ بھی اس کا ایک خبط ہے۔'' مراد نے جواب دیا۔ ''کہتی ہے کہ ملازمین چور ہوتے ہیں۔ انہیں کمروں میں داخل نہیں ہونے دینا چاہیے۔''

''وہ شاید آپ سے چھوٹی ہیں۔'' انصر نے پھر ہمت کی۔

''ہاں۔'' مراد نے کہا۔ ''لیکن میں اس کا خیال بہت رکھتا ہوں۔ سوتیلی سہی لیکن میری بہن تو ہے۔''

''میڈم نے کسی بے بی کا ذکر بھی کیا تھا۔'' انصر جلد از جلد بہت کچھ معلوم کر لینا چاہتا تھا۔

یکایک مراد کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ انصر کو تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ انصر نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

''یہ عجیب بات ہے۔'' وہ کھا جانے والے انداز میں بولا۔ ''ملازمین سے ذرا نرمی سے بات کرو تو وہ سر پر سوار ہونے لگتے ہیں۔ تم نے تو مجھ سے اس طرح باتیں شروع کر دیں جیسے اسی گھر کے فرد ہو۔'' ذرا سا رک کر اس نے حکم دیا۔ ''چلو ٹانگیں دباؤ۔'' اس نے ٹانگیں پھر آگے تپائی پر پھیلا دیں۔

انصر نے دوبارہ اس کے پاؤں دبانا شروع کر دیے۔ ضیغم کی یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی کہ مراد ایک سنکی آدمی تھا اور سنکی لوگوں کا مزاج پل میں تولہ، پل میں ماشہ ہوتا ہے۔

دوبارہ پیر دباتے وقت انصر جذباتی نہیں ہوا کیونکہ دن بھر ہونے والی باتوں کے علاوہ اس کے دماغ میں وہ سب کچھ بھی چکرانے لگا جو مراد نے اس سے کہا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے اس کی وہ گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی جو دوپہر کے بعد اس پر طاری ہوئی تھی۔ اب اس کے دماغ سے یہ نکل گیا تھا کہ میڈم ریٹا کوئی بدروح تھی...... لیکن یہ سوال اس کے دماغ میں اب بھی چبھتا رہا کہ گیتی آخر اتنی زیادہ سہمی ہوئی کیوں رہتی تھی۔

☆☆☆

رات کو انصر جب اپنے گھر پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ٹفن تھا۔ خانساماں نے اس میں اس کے گھر والوں کے لیے کھانا دیا تھا۔ کھانا بھی اتنا زیادہ تھا کہ دوسرے دن بھی کام آ جاتا۔

انصر پاس پڑوس کے دوستوں سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلا۔ دراصل وہ ضیغم سے ملنے اور اسے دن بھر کے واقعات بتانے کے لیے بے چین تھا، تاہم نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ گیتی کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

رات اتنی ہو چکی تھی کہ پارک میں ضیغم کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا، پھر بھی انصر نے اپنی بے چینی کی وجہ سے وہاں کا بھی ایک چکر لگا لیا۔ توقع کے مطابق ضیغم وہاں نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد انصر نے ضیغم کے گھر کے قرب و جوار میں بھی اس توقع پر دو تین چکر لگائے کہ شاید ضیغم کسی کام سے باہر نکلے مگر ایسا نہیں ہوا، پہلی مرتبہ انصر کو ضیغم کی یہ تاکید بہت کھلی کہ وہ اس کے گھر کے دروازے پر کبھی قدم نہیں رکھے۔

دوسرے دن وہ اپنی ملازمت پر پہنچ گیا۔ خانساماں کے ساتھ ناشتا کرنے کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس دن خانساماں نے اسے سودا لینے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ گیتی سے ملے۔ وہ گزشتہ روز کیونکہ خاصی محنت سے صفائی کر چکا تھا اس لیے اس دن اسے زیادہ مصروفیت نہیں تھی۔ وہ برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ کیونکہ خود اسی اسکول میں پڑھتا تھا جہاں گیتی پڑھتی تھی' اس

لیے اسے اندازہ تھا کہ گیتی اسکول جانے کے لیے کس وقت روانہ ہو گی۔

برآمدے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سامنے ایک کار کھڑی تھی' ایک باوردی شوفر بھی وہیں کھڑا تھا۔ انصر نے کار اور شوفر، دونوں ہی کو پہچان لیا۔ گیتی اسی کار میں اسکول آیا جایا کرتی تھی۔

برآمدے کے سامنے کار کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ اب گیتی گھر سے نکلنے والی ہے۔ شوفر کی وجہ سے انصر تذبذب میں پڑ گیا۔ شوفر کی وجہ سے اس کا گیتی سے مخاطب ہونا شاید مناسب نہ ہوتا۔

جب گیتی برآمدے میں آئی تو یقیناً اس کی نظر بھی انصر پر پڑی ہو گی لیکن اس نے انصر کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ وہ برآمدے سے نکل کر کار کی طرف بڑھی تو شوفر نے اس کے لیے کار کا عقبی دروازہ کھولا۔ اس وقت انصر نے یہ بھی دیکھا کہ چوکیدار بنگلے کا پھاٹک کھول رہا تھا۔ گیتی کی کار حرکت میں آئی۔ اس کی رفتار آہستہ آہستہ کچھ بڑھی اور پھر وہ پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

چوکیدار پھاٹک بند کرنے لگا۔ انصر اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ چوکیدار پھاٹک بند کرنے کے بعد اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے فاصلے سے اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے جا سکتے تھے، تاہم انصر نے محسوس کیا کہ چوکیدار کو اس کی وہاں موجودگی پسند نہیں آئی۔

اس خرانٹ چوکیدار کے بارے میں انصر نے پہلی ہی بار کوئی اچھا تاثر نہیں لیا تھا۔ اسے چوکیدار کی آنکھیں ڈراؤنی سی لگی تھیں۔

انصر اندر آ گیا۔ اسی وقت کسی طرف سے کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگی۔ اب انصر اس آواز سے بالکل نہیں گھبرایا اور ایک وزنی گل دان کی صفائی کرنے لگا۔

میڈم ریٹا اس کے قریب آئی اور رکے بغیر گزرتی چلی گئی۔ اس وقت اس نے ضرورت نہیں محسوس کی ہو گی کہ انصر سے کچھ کہے۔

اس دن انصر نے مراد کو بھی گھر سے جاتے دیکھا۔ سوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں ایک بریف کیس لیے وہ بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ انصر اس وقت ایسی جگہ تھا کہ مراد کی نظر اس پر نہیں پڑی ہو گی۔ انصر نے ذرا ہی دیر بعد کار اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی سنی۔

دوپہر کو انصر نے خانساماں کے ساتھ کھانا کھایا اور جان بوجھ کر کچھ نہیں بولا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ خانساماں اس سے مخاطب ہوتا ہے یا نہیں۔

کھانا کھانے کے بعد خانساماں برتن سمیٹ کر سنک کی طرف چلا گیا۔ اس نے انصر سے کوئی بات نہیں کی۔ گویا اسے میڈم ریٹا کا یہ حکم خوب یاد تھا کہ... ملازمین آپس میں زیادہ بات نہ کیا کریں۔

انصر کچن سے نکل آیا۔ اس دن اس نے کوئی ایسی جگہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کی جہاں بیٹھ کر وہ نصاب کی کتابیں پڑھ سکے اور میڈم ریٹا کسی طرف سے بھی آئے، اسے فوراً نہ دیکھ سکے اور مدھم سی کھٹ کھٹ سنتے ہی وہ اپنی کتابیں کسی جگہ چھپا دے۔

بنگلا خاصا بڑا تھا۔ اس نے ایک محفوظ سی جگہ کا انتخاب کر لیا۔ یہ خیال اسے پہلے ہی تھا کہ وہ ساری کتابیں ایک ساتھ نہیں لا سکتا۔ وہ چوکیدار کی نظر میں آ جاتیں۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ تھا کہ وہ روزانہ ایک کتاب یا ایک کاپی اپنے لباس میں چھپا کر لاتا رہتا۔

گیتی کے اسکول سے واپس آنے کا وقت قریب تھا اس لیے انصر ایک ایسی جگہ جا کر صفائی میں مصروف ہو گیا جہاں سے وہ گزرتی۔

کچھ دیر بعد اس نے باہر کار رکنے کی آواز سنی پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔ انصر کے دل کی دھڑکنیں اس خیال سے کچھ تیز ہو گئیں کہ وہ گیتی سے بات کرے گا۔

لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ گیتی اس طرف سے گزری ضرور اور انصر نے اس کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا لیکن گیتی نے اپنی رفتار زیادہ تیز کر دی۔ وہ گزرتی چلی گئی۔ انصر کو اتنی ہمت نہیں ہو سکی کہ اسے اس کا نام لے کر روکنے کی کوشش کرتا۔

ایک خیال اس کے دماغ میں ابھرا کہ وہ دبے قدموں اس طرف جائے جدھر گیتی گئی تھی۔ اس طرح وہ گیتی کا کمرا دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس خیال نے اس کے دماغ میں ہی دم توڑ دیا کیونکہ کسی جانب سے کھٹ کھٹ کی مدھم آواز آ رہی تھی۔

یہ تو واقعی اس بنگلے پر کسی آسیب کی طرح چھائی ہوئی ہے، انصر سوچے بغیر نہیں رہ سکا۔

میڈم ریٹا اس کے قریب نہیں آئی۔ وہ کسی اور طرف مڑ گئی تھی۔ کھٹ کھٹ کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

اسی دن انصر ایک جگہ بیٹھ کر سستا رہا تھا کہ گیتی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ ننگے پیر تھی اور پنجوں کے بل چلتی ہوئی تیزی سے اس کے قریب آئی۔

''دیکھو انصر!'' وہ تقریباً سرگوشی کے انداز میں بولی۔

’’مجھے تمہارے گھریلو حالات جان کر افسوس تو ہوا ہے لیکن میں ہمدردی کا اظہار کرنے کے لیے تمہارے قریب زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ میں کیونکہ تمہیں بہت اچھا سمجھتی ہوں اس لیے ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ پہلے جو ملازم آتے رہے، ان کی میں نے پروا نہیں کی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی بھی بہانے سے یہ ملازمت چھوڑ کر چلے جاؤ۔ کوئی اس سے بھی بدتر ملازمت کر لو مگر یہاں نہ رہو۔‘‘

وہ اس وقت بھی سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔

’’مگر کیوں گیتی؟‘‘ انصر بولا۔

’’میں تم سے زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی۔‘‘ گیتی نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ... چلے جاؤ انصر!‘‘ آخری فقرہ کہتے ہوئے اس کا انداز خاصا تاکیدی ہو گیا۔ ’’اور مجھے امید ہے، تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔‘‘

انصر کو مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں ملی۔ گیتی مڑ کر پنجوں ہی کے بل تیزی سے چلتی ہوئی انصر کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

انصر ذرا دیر تک سکتے کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ گیتی جو باتیں کہہ گئی تھی، وہ اس کے لیے خاصی پریشان کن تھیں۔ اس نے اسے اس گھر سے چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ انصر یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ گیتی ایسا کیوں چاہتی ہے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوا تھا کہ انصر سے پہلے بھی وہاں لوگ ملازمت کرنے آتے رہے تھے لیکن گیتی کو ان لوگوں کی پروا نہیں تھی۔ اس نے خاص طور سے انصر ہی کو یہ مشورہ دیا تھا کیونکہ وہ اسے اچھا سمجھتی تھی۔

انصر کے لیے گیتی کی ان باتوں میں ایک خوش گوار پہلو یہ تھا کہ وہ اسے اچھا سمجھتی ہے۔

انصر کے دل کی دھڑکنیں مسرور کن انداز میں تیز ہو گئیں۔ اس نے ڈراموں اور فلموں میں دیکھا تھا کہ بچپن یا نوجوانی کی ایسی باتیں آگے چل کر اس دھارے پر چل پڑتی ہیں جسے محبت کہتے ہیں۔

انصر سوچنے لگا کہ اگر وہ وہاں سے چلا گیا تو پھر شاید گیتی کو کبھی نہ دیکھ سکے۔ گیتی تو اسے اسکول کے زمانے میں بھی اچھی لگتی تھی اور اب اس نے انصر کے لیے بھی اچھے جذبات کا اظہار کیا تھا تو وہ اسے اور زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ ملازمت چھوڑنا انصر کو یوں بھی مشکل نظر آرہا تھا کہ اس کے گھر میں پھر فاقوں کی نوبت آجاتی اور اس کی ماں کا ماسی بننے کا ارادہ عملی جامہ پہن لیتا۔

گیتی نے اسے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر سکتا۔

انصر کا وہ دن زیادہ تر اس الجھن میں گزرا کہ گیتی نے اسے وہاں سے چلے جانے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ اگر وہ اس گھر میں کام کرتا رہتا تو اس پر آخر کیسی مصیبت ٹوٹ پڑتی جس سے گیتی اسے بچانا چاہتی تھی۔

اس دن مراد گزشتہ روز کی بہ نسبت کچھ دیر سے گھر لوٹا۔ انصر نے اس کی کار کے انجن کی آواز سن لی تھی۔ وہ باہر نکلا تو برآمدے کے سامنے مراد کی کار کھڑی دکھائی دی لیکن مراد اندر جا چکا تھا۔

انصر نے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے کپڑا نکالا اور کار کی صفائی کرنے لگا۔ اسے گزشتہ روز معلوم ہو چکا تھا کہ یہ اس کی ڈیوٹی ہے۔

وہ کار کی صفائی سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مراد باہر آتا نظر آیا۔

’’صفائی کر دی؟‘‘ اس نے انصر سے پوچھا۔

’’جی ہاں صاحب!‘‘

’’میرے ساتھ آؤ۔‘‘

انصر اس کے پیچھے چل پڑا۔ مراد کا رخ لان کی طرف تھا۔ وہ لان میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھا۔ انصر جب ضیغم کے ساتھ آیا تھا تو مراد اس وقت اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

انصر اس کی کرسی کے قریب مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔

’’کل میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی اور بات چھڑ گئی تھی۔‘‘ مراد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’کل جب تم میری ٹانگیں دبا رہے تھے تو رونے لگے تھے... کیوں؟‘‘

’’وہ... وہ کچھ نہیں صاحب!‘‘ انصر نے جلدی سے کہا۔ ’’شاید میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا تھا۔‘‘

’’جھوٹ مت بولو۔‘‘ مراد نے کہا لیکن اس کا لہجہ نرم تھا۔

انصر چپ رہا۔

’’میں یقین سے بتا سکتا ہوں کہ تم کیوں روئے تھے۔‘‘ مراد نرمی سے بولتا رہا۔ ’’تمہیں اس وقت احساس ہوا ہو گا کہ زندگی نے..... تمہارے ساتھ کیا کیا ہے... کہ تمہیں دوسروں کے پاؤں دبانے پڑ رہے ہیں۔ تمہارے دل میں اس وقت میرے لیے نفرت بھی جاگی ہو گی۔‘‘

انصر نے کچھ کہنا چاہا لیکن مراد نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لیے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ’’تم نے سوچا ہو گا کہ یہ دولت مند لوگ غریبوں کے جذبات کا بالکل خیال نہیں رکھتے اور انہیں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ

نہیں سمجھتے۔‘‘ وہ یہ کہہ کر انصر کو غور سے دیکھنے لگا۔

انصر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ’’اب میں کچھ کہوں صاحب؟‘‘

’’بولو... لیکن جھوٹ نہیں بولنا۔‘‘

’’میں جھوٹ نہیں بولوں گا صاحب!‘‘ انصر کی آواز بھرا گئی۔ ’’آپ کی ایک بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کے پیر دباتے وقت مجھے اپنے والد یاد آگئے تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو مجھے یہ ملازمت نہ کرنا پڑتی۔ اسی خیال سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ لیکن مجھے آپ سے نفرت نہیں ہوئی تھی۔‘‘

’’کیوں نہیں ہوئی تھی؟‘‘ مراد بگڑ گیا۔ ’’کیا تم بے حس لڑکے ہو؟‘‘

انصر ہکا بکا رہ گیا۔ مراد کا اس بات پر بگڑنا اس کے لیے غیر متوقع بات تھی۔

مراد کرسی سے اس طرح کھڑا ہوا جیسے اسے خاصا غصہ آگیا ہو۔ وہ بولا۔ ’’تمہیں یہ خیال آنا چاہیے تھا کہ یہ امیر لوگ... یہ دولت مند لوگ بہت مغرور ہوتے ہیں اور مجبور غریبوں سے اس طرح اپنی خدمت کرواتے ہیں جیسے وہ ان کے غلام ہوں... کیا ملازم اور غلام میں فرق نہیں ہوتا؟‘‘

’’ہوتا ہے صاحب!‘‘ انصر نے نظریں جھکا لیں۔

’’تو پھر تمہیں مجھ سے نفرت محسوس ہونا چاہیے تھی۔‘‘ مراد نے کہا۔

انصر خاموش کھڑا رہا۔ وہ مراد کی ان باتوں سے خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

’’کبھی میرے والد بھی بہت غریب تھے۔‘‘ مراد ٹہلتے ہوئے کہنے لگا۔ ’’تمہاری طرح انہیں بھی مجبوراً ایسی ملازمت کرنا پڑی تھی اور وہ ملازمت کرتے ہوئے ان کے دل میں امیروں سے نفرت بڑھتی چلی گئی۔ میرے والد نے جس شخص کی ملازمت کی تھی، وہ دولت مند اور نہایت کمینہ شخص تھا۔ وہ میرے باپ سے اس طرح پیش آتا کہ میرے والد اپنی بے بسی پر چھپ چھپ کر رویا کرتے۔ آخر ایک دن انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ملازمت چھوڑ دیں گے، خواہ انہیں سڑک پر پتھر کوٹنا پڑیں یا سر پر اینٹیں اٹھانے کی مزدوری کرنا پڑے، یا فاقے ہی کیوں نہ کرنا پڑیں۔ انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور...‘‘ وہ یکا یک خاموش ہو گیا اور ٹہلتے ٹہلتے انصر کے سامنے آرکا۔ اس نے انصر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جب انسان کچھ کر گزرنے کی ٹھان لے تو قدرت اس کی مدد ضرور کرتی ہے۔ میرے باپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ قدرت ان پر مہربان ہوتی چلی گئی۔ قسمت کے دروازے ان پر کھلتے چلے گئے۔ ان پر پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ ایک لمبی کہانی ہے کہ انہوں نے کیا کچھ کیا۔ میں تمہیں بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے انہوں نے میرے لیے اور میرے ایک بھائی کے لیے بہت کچھ چھوڑا۔ میرا بھائی نوجوانی ہی میں مر گیا۔ شادی کے صرف ایک سال بعد اس کی موت ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے باپ کے بعد ان کی اس مہم کو آگے بڑھایا کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ امیر بننے کی کوشش کرنا چاہیے ورنہ بہتر ہے کہ وہ ذلت کی زندگی گزارنے کے بجائے خودکشی کر لے۔ تمہیں میرے رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں اب کتنا امیر آدمی ہوں۔ میرے بہت سے کاروبار ہیں۔ صرف ایک اسٹیٹ ایجنسی کا مالک اتنا دولت مند نہیں ہو سکتا۔‘‘

اس وقت انصر کو خیال آیا کہ یہ بات اس کے ذہن میں آئی ضرور تھی کہ اسٹیٹ ایجنسی کا مالک اتنا امیر کیسے ہو سکتا ہے مگر نہ جانے کیوں وہ اس پہلو پر زیادہ سوچ بچار نہیں کر سکا۔

’’اب میں تمہیں ایک بات اور بتاؤں۔‘‘ مراد کچھ رک کر بولا۔ ’’میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنے ملازموں کو اپنا غلام نہ سمجھوں لیکن میں نے آزمایا ہر ایک کو ہے۔ ہر ایک سے ابتدا میں ایسی خدمت کروائی ہے کہ وہ خود کو ذلیل ہوتا ہوا محسوس کرے لیکن اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ اسی طرح میں تمہیں بھی آزما رہا تھا۔ کل تم رو پڑے تو میں نے تمہارے احساسات سمجھ لیے۔ یقیناً تم ایک غیور لڑکے ہو۔ اب میں تم سے کوئی ایسا کام نہیں لوں گا کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو آجائیں۔‘‘

انصر کو یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی بہت ہی اچھے انسان کی باتیں سن رہا ہو۔

’’انصر!‘‘ مراد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ’’اب تم سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جائے گا کہ تم ذلت محسوس کرو۔‘‘

’’شکریہ صاحب!‘‘ انصر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔

’’لیکن...‘‘ مراد فوراً بولا۔ ’’تمہارے دل میں ان امیروں کے لیے نفرت ضرور ہونا چاہیے جو اپنی دولت کے بل بوتے پر غریبوں کو ذلیل کرتے ہیں۔‘‘

انصر کہنا چاہتا تھا کہ امیروں سے نفرت کر کے اسے کیا حاصل ہو جائے گا لیکن مراد کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس نے یہ بات اپنی زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھا۔

’’اگر کوئی غریب ہو۔‘‘ مراد پھر بولا۔ ’’تو وہ اپنی زندگی صرف اسی صورت میں سنوار سکتا ہے جب اسے امیروں سے نفرت ہو۔ میرا اشارہ ان امیروں کی طرف ہے

جو اپنی امارت کے باعث فرعون بن جاتے ہیں۔ تم ان غریبوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سوچا کرو جو دولت مندوں کی ٹھوکروں میں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تم جتنا ان لوگوں کے بارے میں سوچو گے، امیروں سے تمہاری نفرت بڑھتی چلی جائے گی۔''

''جی... جی صاحب!'' انصر کے منہ سے کچھ اور نہ نکل سکا۔

مراد کا ہاتھ اب بھی مشفقانہ انداز میں انصر کے شانے پر تھا۔ ''کل تم آؤ گے تو دیکھو گے کہ تمہاری زندگی بدل گئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام نہیں کرو گے۔ کل سے تمہاری ذمے داری کچھ اور ہوگی۔''

''وہ کیا ہوگی صاحب؟'' انصر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ وہ اس خیال سے خوش ہو گیا کہ اس پر مراد کی کسی مہربانی کا دروازہ کھلنے والا ہے۔

مراد نے اس کے شانے سے ہاتھ ہٹا لیا اور بولا۔ ''یہ تمہیں کل ہی معلوم ہوگا... اور ہاں! اب تک تم نے اس گھر میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا، اس کا ذکر تم کسی سے بھی نہیں کرو گے۔ ضیغم سے بھی نہیں۔ سمجھ گئے؟''

''جی صاحب!''

مراد نے اپنے پرس سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر انصر کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اب آج تم چھٹی کرو۔ کل اتوار ہے۔ اتوار کو تمہیں آدھے دن کی چھٹی ملا کرے گی۔ ایک بجے تک آجایا کرنا۔ کل سے کھانا بھی تم خانساماں کے ساتھ نہیں، میرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ گے لیکن کل دس بجے تک آجانا۔''

''آجاؤں گا صاحب!'' انصر نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے شکریے کی۔'' مراد نے ہنس کر کہا اور مڑ کر بنگلے کی طرف جانے لگا۔

مراد پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں لیے اس کو جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس دن انصر جلدی گھر پہنچا تو چھوٹی بہن عارفہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ زیب النسا اور صفیہ اس کی جلدی آمد پر حیران تھیں۔ زیب النسا کے چہرے پر کچھ تشویش بھی تھی۔ وہ بولی۔ ''خیر تو ہے نا بیٹا! کیا تمہاری ملازمت...'' کسی پریشان کن خیال سے وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکی۔

''نہیں اماں! میری ملازمت نہیں چھوٹی۔'' انصر نے عارفہ کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میری ترقی ہونے والی ہے۔''

''کیسے؟''

انصر نے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر ماں اور بڑی بہن کو مطمئن کر دیا۔ مراد نے جو باتیں کہی تھیں، وہ نہیں بتائیں۔ مراد نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اس گھر کی کوئی بات کسی کو نہ بتائے، حتیٰ کہ ضیغم کو بھی نہیں۔

رات کو انصر سونے کے لیے لیٹا تو دیر تک مراد، گیتی اور میڈم ریٹا کے بارے میں سوچتا رہا۔ مراد اس کے لیے ایک مہربان آدمی ثابت ہو رہا تھا لیکن گیتی چاہتی تھی کہ انصر اس گھر سے چلا جائے۔ آخر کیوں؟

انصر نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے سوچا، وہ غالباً میڈم ریٹا سے بہت زیادہ خائف ہے اور میڈم ریٹا کو صرف ''ایب نارمل'' نہیں بلکہ مکمل پاگل سمجھتی ہے شاید اس کا خیال ہو کہ میڈم ریٹا سے انصر کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

دوسرے دن انصر دس بجے مراد کے گھر پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم میں مراد کے ساتھ ایک ٹیلر ماسٹر بھی تھا۔ اس نے مراد کی ہدایت پر انصر کے جسم کا ناپ لیا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔'' مراد نے ٹیلر ماسٹر سے کہا۔

ٹیلر ماسٹر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ انصر حیران کھڑا رہا۔

''کل تمہارے لیے اچھے قسم کے تین بش کوٹ سوٹ سل کر آجائیں گے۔'' مراد نے کہا۔ ''اس کے بعد اچھے قسم کے گھریلو کپڑے اور تین چار سوٹ بھی سل کر آجائیں گے۔ اچھے قسم کے جوتے تم خود بازار جا کر خرید لینا۔''

''لیکن صاحب...'' انصر کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔

''یہاں آؤ، میرے ساتھ آکر بیٹھو۔'' مراد نے کہا۔

انصر تذبذب کا شکار تھا۔ مراد نے خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ وہ پہلی مرتبہ اس گھر کے کسی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ کسی کرسی پر بھی بیٹھنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اب تمہاری زندگی بدل جائے گی۔'' مراد نے کہا۔ ''آج سے تم میرے گھریلو سیکریٹری اور میری عدم موجودگی میں اس گھر کے سپروائزر ہو۔''

''میں یہاں کیا سپروائز کروں گا صاحب؟''

''صاحب نہیں، آج کے بعد تم مجھے صرف سر کہو گے۔'' مراد نے کہا۔ ''میرے سیکریٹری کی حیثیت سے تمہیں کیا کرنا ہوگا اور تم کیا سپروائز کرو گے، یہ آہستہ آہستہ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔ تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔''

انصر الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ مراد کے ساتھ چل دیا۔ مراد کسی جانب قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میں

یہاں کے شوٹنگ کلب کا ممبر تھا لیکن وہاں مغرور قسم کے امیر لوگ آیا کرتے تھے جن سے مجھے نفرت ہے اس لیے میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ اپنا شوق پورا کرنے کا بندوبست میں نے گھر ہی میں کر لیا ہے۔''

''وہ کیسے صا... میرا مطلب ہے... سر!''

مراد نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ ''یہ میرا بیڈ روم ہے۔''

وہ کمرا قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ آرائش کی چیزیں بھی قیمتی تھیں۔ ایک طرف کتابوں کی الماری بھی تھی۔ مراد سیدھا الماری کی طرف گیا۔ اس نے کتاب نکال کر اس خلا میں ہاتھ ڈالا جو کتاب نکال لینے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ وہاں اس نے انگلیوں سے نہ جانے کیا حرکت کی کہ وہ الماری آہستہ آہستہ ایک طرف سرکنے لگی۔

انصر حیرت سے الماری کی حرکت دیکھنے لگا۔ مراد مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انصر کے دیکھتے ہی دیکھتے الماری اس حد تک ایک طرف سرک گئی کہ آدمی بڑی آسانی سے دوسری طرف جا سکتا تھا۔ الماری جیسے ہی ایک جگہ رکی تھی، دوسری طرف کا اندھیرا روشنیوں سے بقعۂ نور بن گیا۔

''آؤ۔'' مراد نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھا۔

انصر نے قدم بڑھائے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اچانک بہت تیز ہو گئی تھیں۔ اس وقت ایک پُراسرار بات اس کے سامنے آئی تھی۔

وہ سنگی زینے تھے جن سے مراد نیچے اتر رہا تھا۔ انصر بھی اس کے ساتھ تہ خانے میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی تیز روشنی تھی۔ تہ خانے میں کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ صرف ایک بڑا سا بورڈ ایک جانب کی دیوار میں لگا ہوا تھا جس پر چھوٹے بڑے سرخ دائرے بنے ہوئے تھے۔

جیسے ہی انصر کے قدم فرش پر لگے تھے، اوپر الماری کی جگہ کا خلا بند ہو گیا۔

''یہ ہے میرا ذاتی شوٹنگ کلب۔'' مراد نے کہا اور اپنی جیب سے ایک ریوالور نکالا۔ ''یہاں میں نشانہ بازی کرتا ہوں۔ یہاں سے گولی چلنے کی آواز اوپر نہیں جاتی۔''

مراد بورڈ کی مخالف سمت دیوار کی طرف چلا گیا۔ ریوالور سے اس نے بورڈ کے کسی دائرے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

انصر نے زندگی میں پہلی بار اپنے قریب گولی چلنے کا دھماکا سنا تھا۔ اس کے کانوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

''ابھی تک میرا نشانہ بس اتنا ہی ہوا ہے۔'' مراد بولا۔ ''اس سے چھوٹے دائرے پر ابھی نشانہ صحیح نہیں لگتا۔''

مراد نے پھر گولی چلائی۔ اس مرتبہ قدرے چھوٹے دائرے کی لکیر نشانہ بنی۔

''آپ کو یہ شوق کب سے ہے سر؟'' انصر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''کافی عرصے سے ہے لیکن مشق کرنے کا موقع کم ملتا ہے اس لیے ابھی میں زیادہ سچا نشانہ نہیں لگا سکتا۔''

انصر چپ رہا۔ مراد بورڈ کے دائروں پر گولیاں چلاتا رہا۔ جب اس کا ریوالور خالی ہو گیا تو اس نے اپنی جیب سے گولیاں نکال کر ریوالور میں بھریں اور پھر مشق شروع کر دی۔

ان پے در پے دھماکوں سے انصر کا دماغ بھاری ہونے لگا۔ دوسری بار ریوالور خالی کرنے کے بعد اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

''بس اتنی ہی دیر مشق کر پاتا ہوں میں۔'' مراد نے ریوالور جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی مجھے ایک کام سے جانا ہے۔''

انصر، مراد کے ساتھ خواب گاہ سے نکلا۔

''اب مجھے تو ایک جگہ جانا ہے۔'' مراد نے کہا۔ ''تم ایک بجے تک رکو... کھانا کھا کر اور اپنے گھر والوں کے لیے کھانا لے کر چلے جانا۔ آج تمہارے لیے اور کوئی کام نہیں ہے۔''

''ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے سر!'' انصر نے کہا۔ ''میں اتنی دیر تک کیا کروں؟''

''ٹی وی لاؤنج میں چلے جاؤ۔ بیٹھ کر ٹی وی کا کوئی پروگرام دیکھو۔''

''میں... میں... وہاں...'' انصر اپنی بات پوری کرتے ہوئے ہچکچا گیا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں!'' مراد نے کہا۔ ''اب تم گھر کی صفائی کرنے والے ملازم نہیں ہو۔ وہاں تمہارے بیٹھنے پر اب کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ میں ریٹا کو بتا چکا ہوں کہ اب تمہاری حیثیت تبدیل ہو چکی ہے۔ گھر کے کام کاج کے لیے کوئی اور ملازم رکھ لیا جائے گا۔''

انصر کے چہرے پر اب بھی تذبذب کے تاثرات تھے جس پر مراد نے شاید توجہ ہی نہیں دی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جلد ہی اس کی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

انصر دو تین منٹ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا اور پھر تذبذب کے عالم میں ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھا۔ لاؤنج میں سناٹا تھا۔ وہ ہچکچاتا ہوا ٹی وی کی طرف بڑھا جو بند تھا۔ ریموٹ اس کے اوپر ہی رکھا ہوا تھا۔ انصر نے وہ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔ اس کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے کے ایک صوفے پر جا

بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھی ہوئی تھیں۔ مراد نے اسے اطمینان دلایا تھا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ مادام ریٹا اس طرف نکل آئی تو کیا ہوگا۔

ٹی وی پر جو چینل لگا ہوا تھا، انصر وہی دیکھتا رہا۔ دیکھتا کیا رہا، بس اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں، ذہن کہیں اور تھا۔

دیوار گیر کلاک نے مدھم اور مترنم سی آواز میں ایک بجنے کا اعلان کیا تو انصر چونکا۔ اس نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کیا اور اٹھ کر تیزی سے کچن کی طرف...... بڑھ گیا۔

یکایک کسی جانب سے گیتی اس کے سامنے آگئی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو ہمیشہ رہتے تھے۔ اسے سامنے پاکر انصر ٹھٹک کر رک گیا۔

''انصر!'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں بار بار تم سے بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ آج کے بعد میں تمہارے سامنے آنے سے بھی بچوں گی۔ اس وقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ تم نے بہت جلدی ترقی کی ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم اتنی ہی جلدی تباہی کی طرف بھی بڑھو گے۔ کاش تم یہاں سے چلے جاتے۔ کاش!''

اس نے انصر کے کچھ بولنے کا انتظار نہیں کیا۔ وہ جتنی تیزی سے سامنے آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے کسی طرف غائب بھی ہوگئی۔

کچھ دیر بعد انصر خانساماں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی الجھن اب اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ گیتی کی باتیں اسے خوف کی طرف دھکیل رہی تھیں اور دوسری طرف وہ اپنے گھریلو حالات کے باعث بھی فکرمند تھا۔ اب تو اس کی غیر معمولی ترقی بھی ہوگئی تھی۔ مراد نے اس کے لیے اچھے کپڑے بھی سلوائے تھے اور اگلے روز اسے پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

پانچ ہزار انصر کے لیے بہت بڑی رقم تھی!

☆☆☆

اپنے گھر واپسی پر بھی انصر کے دماغ میں یہی خیالات گردش کررہے تھے۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس نے ایسی خاموشی دیکھی جیسے وہاں کوئی سانحہ ہوگیا ہو۔ چھوٹی بہن عارفہ تو ایک طرف گڑیا سے کھیل رہی تھی لیکن اس کی ماں اور بڑی بہن بہت چپ اور کچھ پریشان یا اداس سی تھیں۔ انہیں انصر سے یہ پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا کہ وہ آج اتنی جلدی کیسے لوٹ آیا تھا۔

''کیا بات ہے اماں؟'' انصر نے کھانے کا ٹفن ایک طرف رکھ کر پوچھا۔ ''تم اور بجیا اتنی چپ چپ کیوں ہو؟''

زیب النسا نے اسے جواب دینے کے بجائے صفیہ سے کہا۔ ''ٹفن لے جاکے باورچی خانے میں رکھ دو۔''

صفیہ خاموشی سے اٹھی اور ٹفن اٹھا کر کمرے سے چلی گئی۔

زیب النسا نے انصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سبزی یا گھر کا اور سودا لینے کے لیے میں صفیہ کو بھیج دیتی تھی مگر اب نہیں بھیجوں گی۔ خود ہی جایا کروں گی۔''

''آخر بات کیا ہے اماں؟''

''زمانہ بُرے سے بُرا ہوتا جارہا ہے۔ پہلے تو چھوٹے موٹے لچے بدمعاش اس قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے، اب بڑے لوگ بھی شہدے پن پر اتر آئے ہیں۔''

''آخر ہوا کیا ہے اماں؟'' انصر اپنا سوال دہراتا رہا۔

زیب النسا کچھ سوچتی رہی، پھر بولی۔ ''صفیہ آج سبزی لینے گئی تھی۔ واپس آنے لگی تو ایک کار اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا۔ اس نے صفیہ کو ہزار کا نوٹ دکھایا اور مسکرانے لگا۔ صفیہ گھبرا کر تیز چلنے لگی تو اس کم بخت نے بھی کار کی رفتار بڑھا دی اور بولا کہ وہ ایک نوٹ کا اضافہ بھی کرسکتا ہے۔ اس پر صفیہ نے غصے میں اسے بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ جب وہ چیخنے لگی اور آس پاس کے لوگ اس طرف دیکھنے لگے تو وہ تیزی سے کار لے کر بھاگ گیا۔''

انصر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''ہم غریب لوگ ہیں نا!'' زیب النسا پھر بولی۔ ''یہ امیر لوگ ہمیں بکاؤ سمجھتے ہیں۔''

انصر تلملا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اب ہم غریب نہیں رہیں گے اماں! اب بہت جلد ہمارے حالات بدلنے والے ہیں۔ ہمارے مالک کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں انگریزی بول سکتا ہوں تو انہوں نے مجھے اپنا سیکریٹری بنا لیا ہے۔ کل وہ پانچ ہزار روپے بھی دیں گے تاکہ...''

''پانچ ہزار... یک مشت؟'' زیب النسا چونکی۔

''ہاں اماں! پہلے تو میں ان کے گھر میں کسی وجہ سے ڈرا ڈرا سا رہتا تھا لیکن اب مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ وہ اچھے آدمی ہیں۔''

''یک مشت پانچ ہزار ہے تو بڑی رقم لیکن اس سے ہمارے حالات تو نہیں بدل جائیں گے۔'' زیب النسا نے کہا۔

''مجھے اب خاصی امید ہوگئی ہے اماں! آگے چل کر حالات بدل بھی سکتے ہیں۔''

''خدا کرے۔'' زیب النسا نے ٹھنڈی سانس لی، پھر کہا۔ ''خوشی کی بات ہے بیٹا کہ تمہیں اتنی جلدی ترقی مل رہی ہے لیکن آج جو بات ہوئی ہے، وہ سن کر میں تو بہت دیر تک روتی رہی۔ صفیہ بہت غصے میں تھی۔ اس نے اس کار کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تم اس کار والے کے خلاف رپورٹ کرو تھانے میں لیکن اس سے کچھ نہیں ہوگا بیٹا! پولیس بھی امیروں کا ساتھ دیتی ہے۔ ہم غریب لوگ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔''

''اس کار کا نمبر کیا ہے اماں؟''

''صفیہ کے پاس ہے، کیوں؟ رپورٹ کراؤ گے؟''

''نہیں اماں! میں مراد صاحب کو دوں گا وہ نمبر... ساری بات بھی بتاؤں گا۔ ان کے ذریعے سے رپورٹ کرائی جائے گی تو کوئی نتیجہ ضرور نکلے گا۔ اس کمینے آدمی کو اپنی حرکت کی کچھ سزا تو ملنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ مراد صاحب میرا ساتھ دیں گے۔''

''لے لو صفیہ سے نمبر۔'' زیب النسا نے کہا۔

''تم بجیا سے نمبر لے کر مجھے دے دینا۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا بجیا سے نمبر مانگنا۔'' انصر نے کہا اور کمرے میں جاکر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے دماغ میں مراد کا یہ جملہ گونجنے لگا۔

''تمہارے دل میں ان امیروں کے لیے نفرت ضرور ہونا چاہیے جو اپنی دولت کے بل بوتے پر غریبوں کو ذلیل کرتے ہیں۔''

اس دن پہلی مرتبہ انصر کے دل میں مغرور اور بدمعاش امیروں کے لیے نفرت کا شعلہ لپکا۔

دوسرے دن وہ مراد کے بنگلے پر پہنچا تو خود کو خاصا بدلا ہوا محسوس کررہا تھا۔ اس میں ایک امنگ پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مراد کے دل میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنائے اور زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔ وہ خوف اس کے دل سے بالکل نکل چکا تھا جو گیتی کی باتوں سے پیدا ہوا تھا۔ اب اس کے خیال کے مطابق گیتی صرف میڈم ریٹا سے ڈری ہوئی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ انصر کو میڈم ریٹا سے کوئی نقصان پہنچے۔

کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، انصر نے سوچا، جب مراد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہے تو وہ ایب نارمل عورت اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

اسی اطمینان کے ساتھ وہ مراد سے ملا۔

''کل کا دن کیسا گزرا انصر؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے آرام تو ملا لیکن گھر پر ایک ایسی بات ہوگئی کہ میں بہت غصے اور پریشانی میں رہا۔'' انصر نے جواب دیا۔

''کیا ہوگیا؟'' مراد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

انصر پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا لہٰذا اس نے سارا واقعہ بیان کردیا۔ مراد نے سب کچھ سن کر سر ہلایا۔ ''یہ اس اعتبار سے اچھا ہوا کہ تمہیں اس کا تجربہ بھی ہوگیا۔ اب تمہارے دل میں ان مغرور دولت مندوں کی نفرت ضرور جاگے گی جو غریبوں کو ذلیل کرتے بھی ہیں اور ذلیل سمجھتے بھی ہیں۔ مجھے نمبر دو اس کار کا۔''

انصر وہ نمبر لے کر آیا تھا۔ اس نے وہ کاغذ مراد کو دیا جس پر نمبر لکھا ہوا تھا۔ ''کیا آپ اس کی رپورٹ کراسکتے ہیں سر؟''

''رپورٹ کرانے سے اصل آدمی ہاتھ لگنا مشکل ہوگا۔'' مراد نے جواب دیا۔ ''بعض گھروں میں کار ایک ہوتی ہے اور اسے استعمال کئی افراد کرتے ہیں۔ معلوم یہ ہونا چاہیے کہ وہ کار اس وقت کون چلا رہا تھا جب تمہاری بہن کے ساتھ بدتمیزی کی گئی۔''

''یہ کیسے معلوم ہوگا سر؟''

''معلوم ہوجائے گا۔'' مراد نے جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے علاقے کا ڈی ایس پی میرا جاننے والا ہے۔ وہ اپنے طور پر اس بارے میں چھان بین کرالے گا۔'' یہ سب کچھ کہتے ہوئے مراد نے کوئی نمبر ملایا۔ اس نے موبائل کان سے لگالیا۔

''ہاں سلمان خان!'' مراد نے کہا۔ ''ایک معاملے میں مجھے تمہاری ضرورت پڑگئی ہے۔ تمہیں اپنے طور پر کچھ چھان بین کرنا ہوگی۔ میں تمہیں ایک کار کا نمبر دے رہا ہوں، لکھو...'' مراد کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی محکوم سے بات کررہا ہو۔ اس نے کار کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ ''یہ تو تم معلوم کرہی لوگے کہ اس کار کا مالک کون ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کل صبح دس ساڑھے دس بجے کے درمیان یہ کار کون چلا رہا تھا؟''

دس ساڑھے دس بجے کا وقت انصر ہی نے اسے بتایا تھا۔ یہی وقت اسے اپنی ماں سے معلوم ہوا تھا۔

مراد نے موبائل پر بات ختم کرنے کے بعد انصر سے کہا۔ ''شام تک معلوم ہوجائے گا۔ پھر تم اس شخص کے خلاف جو کچھ بھی کرنا چاہو، وہ مجھے بتا دینا۔ جیسا تم چاہو گے، ویسا ہو

گا۔'' پھر اس نے انصر کا جواب سنے بغیر کہا۔ ''چلو... آج تمہیں ایک تماشا دکھاتا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔''

مراد اسے لے کر اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ اس نے ایک دراز سے ریوالور نکال کر اپنے گاؤن کی جیب میں ڈالا اور پھر کتابوں کی الماری کی طرف بڑھا۔

جلد ہی انصر اور مراد تہ خانے میں تھے۔

''آج میں شوٹنگ کی مشق نہیں کروں گا۔'' مراد بولا۔ ''آج بس تمہیں تماشا دکھاؤں گا۔ وہ تماشا میں اکثر کرتا ہوں اور اس سے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔'' مراد نے فرش کا ٹائل دبایا جس کے دبنے سے کسی میکنزم کے ذریعے دیوار کا ایک ٹائل اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

انصر نے وہاں سے ایک خرگوش کو نکلتے دیکھا۔

''یہ اندھیرے میں رہتے رہتے گھبرا جاتا ہے۔'' مراد کا اشارہ خرگوش کی طرف تھا۔ ''اس لیے جب میں اس کا راستہ کھولتا ہوں تو یہ فوراً ادھر نکل آتا ہے۔''

انصر خرگوش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تہ خانے کا جائزہ لینے کے بعد ایک طرف بیٹھ کر مراد اور انصر کو دیکھنے لگا۔

معاً کھٹکے کی آواز ہوئی۔ انصر نے اس طرف دیکھا جہاں سے خرگوش نکلا تھا۔ دیوار کا وہ ٹائل اب اپنی جگہ واپس آچکا تھا جس نے اپنی جگہ سے ہٹ کر خرگوش کو ادھر آنے دیا تھا۔

خرگوش یکایک بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

''اب یہ خوف زدہ اور پریشان ہے۔'' مراد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب دیکھنا کہ جب اس کی واپسی کا راستہ بند ہوتا ہے تو یہاں کیا صورتِ حال بنتی ہے۔''

''کیا صورتِ حال بنتی ہے سر؟'' انصر نے پوچھا۔

''یہ خرگوش غربت کی علامت ہے۔ اب یہاں ایک اور جانور آئے گا۔ اسے میں نے امارت کی علامت قرار دیا ہے۔''

مراد نے اپنے عقب کی دیوار کا ایک ٹائل دبایا۔ اس کے ساتھ ہی انصر نے دیکھا کہ اس کی دائیں جانب کی دیوار کے چار ٹائل اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ ان کے ہٹتے ہی خرگوش اور زیادہ بے چین نظر آیا۔ اب اس کے منہ سے آوازیں بھی نکلنے لگیں۔

انصر نے کبھی کوئی خوف زدہ خرگوش نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ جان لیتا کہ اس وقت وہ خرگوش خاصا خوف زدہ ہے۔

انصر ایک بار پھر چونکا جب اس نے غراہٹ کی آواز سنی۔ وہ غراہٹ کسی کتے کی سی تھی۔ اس نے دیوار کے خلا سے ایک کتے کو نکلتے دیکھا۔

''یہ کل سے بھوکا ہے۔'' مراد بولا۔ ''اب دیکھو تم تماشا۔''

انصر بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ اس کے سامنے جو کچھ تھا، وہ اسے ان انگریزی فلموں جیسا لگا جو اس نے کبھی کبھی دیکھی تھیں۔

خرگوش اب ایک کونے میں سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ وہ کتے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کتے کی نظریں بھی اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے نکلنے والی غراہٹ تیز ہوتی جارہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں پیر آگے پھیلائے اور اپنا جسم فرش سے چپکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ایک لمبی جست لگائی۔ وہ ایک ہی ہلے میں خرگوش کو دبوچ لینا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ خرگوش نے چیختے ہوئے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔

انصر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ کتا بار بار خرگوش پر لپک رہا تھا اور خرگوش اپنی زندگی بچانے کے لیے بار بار جست لگا کر اس کی زد سے نکل رہا تھا۔

''دیکھ رہے ہو؟'' انصر کو مراد کی آواز کہیں دور سی آتی محسوس ہوئی۔ ''یہ مغرور امیر اس غریب کو پھاڑ کھانا چاہتا ہے۔''

''وہ مرا۔'' یہ الفاظ انصر کے منہ سے چیخ کی طرح نکلے تھے۔ اس وقت اسے محسوس ہوا تھا کہ اس مرتبہ خرگوش اپنے آپ کو بچانے میں ناکام رہے گا۔

اسی وقت تہ خانے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ انصر نے کتے کو ہوا میں تھوڑا سا اچھلتے اور پھر فرش پر گرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے جسم کے ایک حصے سے خون بہہ رہا تھا۔

اس کے بعد پے در پے دھماکے ہونے لگے۔ مراد کے ریوالور کی ساری گولیاں کتے کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور وہ فرش پر پڑا آہستہ آہستہ.... پیر چلانے لگا۔ اس کا دم نکل رہا تھا۔

انصر کے مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا۔ وہ اس کے لیے ایک خوفناک منظر تھا۔

''امیر مغروروں کو میں اسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہوں۔'' اس مرتبہ مراد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

انصر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

خرگوش ایک کونے میں اب بھی سہما ہوا بیٹھا تھا اور بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

''تم اس غریب کی حالت دیکھ رہے ہو؟'' مراد نے انصر سے کہا۔ ''غریبوں کو اپنی زندگی بچانے کے لیے اتنی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مراد نے.... نہ جانے کیا کیا کہ وہ راستہ کھل گیا جدھر سے خرگوش آیا تھا۔ خرگوش نے اسے اپنے لیے غنیمت جانا اور دوڑتا ہوا اس خلا میں غائب ہوگیا۔ مراد نے اسی ٹائل کے ذریعے راستہ بند کردیا۔

کتا اب بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے خون کی دھاریں کئی اطراف میں بہہ گئیں۔

''یہ گندگی... سر!'' انصر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''سب صاف ہو جائے گا۔'' مراد نے جواب دیا۔ ''جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو جس طرف سے یہ کتا آیا تھا، ادھر ہی سے پانی کا ایک ریلا آئے گا جو اس مغرور امیر کی لاش بھی بہا لے جائے گا اور فرش سے اس کی گندگی بھی صاف کردے گا۔'' مراد نے بڑی نفرت سے کہا۔

''اب ہم یہاں سے چلیں سر؟'' انصر کو گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔

''نہیں۔'' مراد اچانک خوش گوار موڈ میں نظر آنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم شوٹنگ سیکھو، سکھانا میری ذمے داری ہے۔ اچھا ہوگا اگر یہ کام آج ہی سے شروع کردیا جائے۔''

''لل... لیکن... سر!'' انصر ہکلا گیا۔

مراد کے چہرے سے یکایک ایسا لگا جیسے اسے غصہ آگیا ہو۔

''ڈرتے ہو؟'' وہ بگڑ کر بولا۔

''نہیں... نہیں سر!'' انصر نے جلدی سے کہا۔

''تو پھر یہاں آؤ... میرے قریب! میں تمہیں سکھاؤں گا۔'' مراد کے لہجے میں سختی تھی۔

انصر کو اس وقت بھی ضیغم کی بات یاد آگئی کہ مراد کی کسی بات کے جواب میں انکار نہ کرنا۔

اور اب تو حالات اتنے امید افزا تھے کہ انصر کسی صورت میں مراد کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مراد کے قریب چلا گیا۔ مراد اس وقت ریوالور میں گولیاں بھر رہا تھا جو اس نے اپنے گاؤن کی جیب میں کب رکھی تھیں، یہ انصر نہیں دیکھ سکا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں تہ خانے سے نکل آئے۔ مراد نے اپنی جیب سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر مراد کو دیے اور بولا۔ ''اپنے لیے جوتے، شرٹس اور جو بھی ضروری سمجھو، آج ہی جا کے خرید لو۔ شام کو یہاں ایک چکر لگا لینا۔ تمہارے کپڑے بھی سل کر آجائیں گے، آ کر وہ کپڑے لے جانا۔ کل جب تم آؤ تو تمہارا حلیہ قطعی بدلا ہوا ہو۔ اور ہاں، شام تک یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری بہن سے بدتمیزی کس شخص نے کی تھی۔''

انصر کے اس ہاتھ میں خفیف سی لرزش تھی جس میں وہ ہزار ہزار کے پانچ نوٹ پکڑے ہوئے تھا۔

مراد کے دفتر جانے کے بعد انصر بھی بنگلے سے نکل آیا۔ وہ خوش بھی تھا اور اس کی کیفیت کچھ ہیجانی بھی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے ریوالور جیسا خطرناک ہتھیار اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور مراد کی ہدایت کے مطابق گولیاں بھی چلائی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور سے نکلی ہوئی کوئی گولی بھی کسی دائرے کو نشانہ نہیں بنا سکی تھی لیکن مراد.... اس کی ہمت بندھاتا رہا کہ وہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

مگر کیوں؟ وہ کیوں اسے ریوالور چلانا سکھانا چاہتا تھا؟ کیا ضیغم نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ سنکی ہے؟

انصر ذہنی طور پر اتنا پختہ نہیں تھا کہ اس بارے میں زیادہ آگے تک کچھ سوچ سکتا۔ اس کے دماغ پر کچھ خمار ان پانچ ہزار روپوں کا بھی تھا جو اس کی جیب میں تھے۔

بازار سے اس نے اپنے لیے ایک اچھے جوتے کے علاوہ بہت کم خریداری کی۔ زیادہ تر پیسے اس نے اپنی ماں اور بہنوں کے کپڑوں کی خریداری پر خرچ کردیے۔

گھر پر اس کی ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے جب اس نے وہ سب چیزیں دیکھیں۔

شام کو انصر پھر بنگلے پر پہنچا۔ مراد موجود تھا۔

''اس شخص کا پتا چل گیا ہے جس نے تمہاری بہن سے بدتمیزی کی تھی۔'' مراد نے سب سے پہلی بات یہی کی۔ ''وہ یہاں کے ایک دولت مند آدمی کا بھتیجا ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ لاہور میں رہتا ہے۔ وہ یہاں دو تین روز کے لیے آیا تھا۔ آج دوپہر کی فلائٹ سے وہ بیرونِ ملک چلا گیا ہے۔ کچھ مہینوں بعد اس کی واپسی ہوگی۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ جیسا تم کہو گے، ویسا ہی ہوگا۔''

''آپ ہی بتایئے سر... کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔ وہ اب یہاں ہے بھی نہیں۔''

''اگر وہ یہاں ہوتا بھی تو میں تمہیں کم از کم یہ مشورہ ہرگز نہیں دیتا کہ اس کے خلاف رپورٹ درج کراؤ۔ یہ پولیس والے...'' مراد نے بڑی نفرت سے کہا۔ ''یہ اپنے باپ کے بھی نہیں ہوتے۔ یہ صرف پیسوں کے ہوتے ہیں۔ تمہارے علاقے کا ڈی ایس پی سلمان خان کوئی بھی خواہ نہیں

ہے میرا... وہ میری انگلیوں کے اشارے پر اس لیے ناچتا ہے کہ میں اسے بیش قیمت تحائف بھیجتا رہتا ہوں۔"

الصر کے دماغ میں یہ سوال نہیں ابھرا کہ وہ کسی پولیس والے کو تحائف کیوں بھجواتا ہے؟

"سر!" الصر نے کہا۔ "جیسا آپ کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔"

"لاہور میں ہی اسے کچھ غنڈوں سے اچھی طرح پٹوا دو۔"

"یہ میں کیسے کرسکتا ہوں سر؟"

"غنڈوں کو پیسے دے کر۔"

"میرے پاس اتنے پیسے کہاں سر؟"

"میں بندوبست کروادوں گا اس کا... میں خرچ کروں گا پیسے۔ ان دولت مند بدمعاشوں کو سزا دینے کے لیے میں کچھ بھی خرچ کرسکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس کے سوا کوئی جواب الصر کے دماغ میں آ نہیں سکا۔

"بس تو کچھ دن انتظار کرو۔ میری ایک بات اپنی گرہ میں باندھ لو۔ پولیس کبھی کسی غریب کے کام نہیں آتی۔ یہ لوگ صرف دولت مندوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ یہ دنیا شاید صرف دولت مندوں ہی کے لیے بنی ہے۔ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ جب تک وہ غریب رہے، زندگی ان کے لیے بہت کٹھن رہی۔ خیر، اب اس وقت یہ باتیں چھوڑو۔ وہ جو صوفے پر پیکٹ رکھے ہیں، وہ اٹھالو اور اپنے گھر جاؤ۔ پندرہ بیس منٹ بعد مجھے بھی ایک ضروری میٹنگ کے لیے کہیں جانا ہے۔"

الصر نے صوفے کے قریب جا کر وہ پیکٹ اٹھالیے۔

"اور ہاں... سنو!" مراد نے اندرونی حصے کی طرف جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ "اب کیونکہ تم میرے سیکریٹری ہو اس لیے اب تمہاری ماہانہ تنخواہ بیس ہزار روپے ہوگی۔"

الصر جیسے غریب لڑکے کے لیے بیس ہزار تو اتنی بڑی رقم تھی کہ اس کے دماغ کے ساتھ شاید اس کے جسم کو بھی جھٹکا لگا۔ کپڑوں کے پیکٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچے۔

مراد اس کی طرف دھیان دیے بغیر اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ الصر سوچ میں ڈوبا ہوا بنگلے سے نکلا۔

☆☆☆

اس طرح الصر کی زندگی میں انقلاب کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسرے دن مراد نے اسے ایک کمرے میں لے جا کر کمپیوٹر کے سامنے بٹھا دیا۔ "یہ سیکھنا پڑے گا تمہیں۔" مراد نے کہا۔ "اس کے بغیر تم میرے سیکریٹری کی حیثیت سے کام نہیں کرسکتے۔ تمہیں یہ سب کچھ ریٹا سکھائے گی۔"

ریٹا کا نام سنتے ہی الصر کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی لیکن اب یہ اس کے لیے بالکل ناممکن ہو چکا تھا کہ وہ مراد سے کچھ بھی کہہ سکتا۔

"ریٹا تمہیں روزانہ ایک گھنٹا دیا کرے گی۔ اس کے بعد دو تین گھنٹے تک تم خود مشق کیا کرنا۔ جب تک تم کمپیوٹر سے کام لینا نہ سیکھ جاؤ، صبح سے تمہارا آنا بے کار ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر آجایا کرنا۔ جب کمپیوٹر سے تھک جاؤ تو کچھ دیر آرام کرلیا کرنا۔ اس کے بعد ہم تہ خانے میں جایا کریں گے۔ میں تمہیں بہت اچھا نشانہ باز بنادوں گا الصر!"

"ٹھیک ہے سر!" الصر نے کہا۔

اسی دن سے وہ میڈم ریٹا کے ساتھ ایک گھنٹا گزارنے لگا۔ اس کا انداز ویسا ہی رہا کہ چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ہوتے تھے۔ ابتدائی دو تین روز تک الصر خوف زدہ سا رہا لیکن پھر اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس دوران میں مراد اسے اپنے ساتھ تہ خانے میں لے جاتا رہا۔ الصر کی ریوالور چلانے کی مشق جاری رہی۔

کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا، جب الصر کو کیتی کا خیال نہ آتا ہو۔ وہ سہمی ہوئی لڑکی اسے اچھی ہی اتنی لگتی تھی لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے الصر سے کہہ بھی دیا تھا کہ اب وہ کبھی اس سے کچھ کہنے نہیں آئے گی۔

جب اسکول سے اس کے آنے کا وقت ہوتا تھا تو میڈم ریٹا الصر کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس وقت وہ کیتی کو صرف دیکھنے کے لیے بھی برآمدے کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔

اس طرح دو مہینے گزر گئے۔

"اب میں کمپیوٹر پوری طرح سمجھ گیا ہوں سر!" ایک دن الصر نے مراد سے کہا۔ "اب آپ مجھ سے کام لینا شروع کیجیے۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" مراد نے اس سے کہا۔

وہ الصر کو اپنی خواب گاہ میں لایا۔ الصر سمجھا کہ اب مراد اسے تہ خانے میں لے جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مراد نے الصر سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹی وی اور سی ڈی پلیئر آن کردیا۔ الصر کی نظر ٹی وی اسکرین پر چلی گئی۔ اسکرین پر چند لمحے جھلملاہٹ رہی، پھر ایک کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا۔ الصر کو وہ منظر کسی فلم کا محسوس ہوا۔ ٹی وی اسکرین پر دکھائی دینے والے کمرے میں چار آدمی ایک

آدمی کو بُری طرح زدوکوب کررہے تھے۔ پٹتے پٹتے وہ شخص بُری طرح لہولہان ہو کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹی وی کی اسکرین بلینک ہوگئی۔ مراد نے ٹی وی اور سی ڈی پلیئر بند کردیے۔

"یہ کسی فلم کا حصہ تھا سر؟" الصر نے پوچھا۔

"نہیں۔" مراد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پرسوں شام کو یہ سارا واقعہ لاہور میں ہوا ہے۔ جس آدمی کو پیٹا گیا تھا، اسے یہ چاروں آدمی اغوا کر کے اس کمرے میں لائے تھے۔ بعد میں اسے لاہور کی ایک ویران سڑک پر پھینک دیا گیا تھا۔ اس کی اتنی مرمت ہوئی ہے کہ یہ اب تک اسپتال میں ہے۔ میں نے ہدایت کردی تھی کہ اس سارے منظر کی سی ڈی بنالی جائے۔ یہ سی ڈی مجھ تک آج ہی پہنچی ہے۔"

"مگر کیوں سر؟ اس آدمی کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا؟"

"غریبوں کو اپنے دل پر لگنے والا زخم کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔" مراد نے تلخ لہجے میں۔ "یہ وہ شخص تھا جس نے تمہاری بہن کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔"

"اوہ!" الصر چونکا۔ "یہ وہ تھا۔" اس کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور مراد کے قریب جا کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیے۔ "آپ بہت عظیم ہیں سر! میں واقعی بھول گیا تھا لیکن آپ نہیں بھولے۔ آپ نے میرے لیے یہ سب کچھ کروا ڈالا۔"

"میں کسی کے لیے بھی یہ سب کچھ کروانے کے لیے تیار رہتا ہوں، اگر زیادتی کرنے والا کوئی دولت مند بدمعاش ہو۔"

"آپ بہت عظیم ہیں سر!" الصر نے اپنی بات دہرائی پھر کہا۔ "آج سے آپ مجھے اپنا بندۂ بے دام سمجھیے... اب اگر کبھی آپ مجھے کسی کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا حکم دیں گے تو میں اس حکم کے مطابق ہی کروں گا۔"

"یاد رکھنا اپنی یہ بات!"

"میں ہرگز نہیں بھولوں گا سر!" الصر نے مراد کے ہاتھ چھوڑ دیے جو وہ اب تک بڑی عقیدت سے اپنے ہاتھوں میں لیے رہا تھا۔

مراد نے مسکرا کر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور بولا۔ "میں نے پہلے کبھی نہیں پوچھا۔ آج پوچھ رہا ہوں۔ تم نے اپنے گھر کے حالات کس حد تک سنبھالے؟"

"سر!" الصر نے کہا۔ "بیس ہزار ہمارے لیے بے شک بہت بڑی رقم ہے، پھر بھی دو مہینے میں گھر کے لیے کچھ زیادہ تو نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ اب آسودگی سے زندگی گزر رہی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اس سال اپنی چھوٹی بہن کو اسکول میں داخل کرادوں گا۔"

"اور بڑی بہن کو؟"

"میں تو چاہتا تھا کہ بجیا کم از کم میٹرک کرلیں لیکن اماں اس واقعے سے بہت ڈر گئی ہیں۔ وہ بجیا کو گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ وہ اب بس کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے اتنا جمع کرلینا چاہتی ہیں کہ بجیا کی شادی کردیں۔"

"اگر تمہاری والدہ میری بات کا بُرا نہ مانیں تو ان سے کہہ دینا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے کوئی اچھا رشتہ جلد از جلد تلاش کرلیں۔ شادی کے سارے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔"

"سر!" الصر کے منہ سے نکلا۔

مراد نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ الصر کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔

☆☆☆

لیکن صفیہ کی شادی نہیں ہوسکی۔ ایک رات کچھ لوگ الصر کے گھر میں گھسے اور صفیہ کو اٹھا لے گئے۔ الصر نے مزاحم ہونا چاہا لیکن بہن کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے چہرے پر، ہاتھوں پر اور سر پر کچھ زخم بھی آئے۔ بے چاری زیب النسا تو چیختی ہی رہ گئی۔ الصر کی چھوٹی بہن عارفہ تو بُری طرح سہم کر رہ گئی۔

زیب النسا کی چیخ پکار سے آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سے دو ایک نے بعد میں پولیس کو بتایا کہ وہ پانچ آدمی تھے جو صفیہ کو ایک کار میں ڈال کر فرار ہو گئے۔ اندھیرے کی وجہ سے ان کی شکلیں کسی کو نہیں دکھائی دی تھیں اور کوئی بھی کار کا نمبر بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔

الصر کو پولیس ہی نے اسپتال پہنچایا تھا جہاں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی تھی اور اس کے بعد سے وہ اپنی ماں کے پاس رہا تھا جو اسی اسپتال میں تھی اور اس کی دیکھ بھال کی جارہی تھی۔ وہ بار بار بے ہوش ہورہی تھی۔ اسے ہوش میں لایا جاتا تو وہ "صفیہ... صفیہ" کہتے ہوئے پھر بے ہوش ہوجاتی۔

پڑوس کے دو میاں بیوی بھی اسپتال آگئے۔ الصر کی چھوٹی بہن عارفہ کو انہوں نے ہی سنبھال رکھا تھا۔

اچانک الصر نے مراد کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

"سر!" اس کے منہ سے نکلا۔

مراد نے افسردگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

کہا۔ ’’مجھے ضیغم نے موبائل فون پر اطلاع دی تھی۔‘‘

’’سر!‘‘ الفر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ’’میری بہن...‘‘

مراد نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مراد کے سینے سے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

’’ہمت رکھو الفر! ہمت رکھو۔‘‘ مراد نے کہا۔ ’’اپنی بہن کو تلاش کرنے کے لیے تمہیں اپنا حوصلہ بلند رکھنا ہوگا۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ پولیس سے تو تم ذرا بھی توقع نہ رکھو۔ نہ وہ تمہاری بہن کو تلاش کر سکیں گے اور نہ اغوا کرنے والوں کو۔‘‘

بیس دن گزرنے تک مراد کی بات درست رہی۔ پولیس نہ صفیہ کا پتا لگا سکی اور نہ اسے اغوا کرنے والوں کا کوئی سراغ ملا تھا۔ زیب النسا، الفر اور عارفہ اب گھر ہی میں تھے۔ زیب النسا کا اب بھی یہ حال تھا کہ زیادہ تر روتی رہتی لیکن ایک ایسی ماں کی دل جوئی کوئی آسان بات نہیں تھی جس کی جوان بیٹی کو اغوا کرلیا گیا ہو۔

عارفہ کو پڑوس ہی کی ایک لڑکی سنبھالے رہتی۔

مراد ابتدا ہی میں الفر کو دس ہزار روپے دے گیا تھا تاکہ گھر کے اخراجات میں کوئی تنگی نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس نے الفر کو ایک موبائل فون بھی لا دیا تھا تاکہ بہ وقتِ ضرورت وہ کسی سے بھی رابطہ کر سکے۔

مہینے بھر بعد زیب النسا کی حالت کچھ سنبھلی تو الفر مراد کے بنگلے پر صبح ہی صبح پہنچ گیا تاکہ مراد سے ملاقات ہو سکے۔ اس نے اتنے دن کی غیر حاضری پر مراد سے معذرت کی۔

’’معذرت اس وقت کی جاتی ہے جب کوئی خطا ہوئی ہو۔‘‘ مراد نے کہا۔ ’’تم تو ایک سانحے سے گزرے ہو الفر!‘‘

’’میری بہن کا اب تک پتا نہیں چلا سر!‘‘ الفر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

مراد بولا۔ ’’میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ غریبوں کے لیے پولیس کچھ نہیں کرتی۔ خاص طور سے اس جرم میں جس میں کسی دولت مند کا ہاتھ ہو۔‘‘

’’دولت مند!‘‘ الفر نے حیرت سے کہا۔ ’’کیا میری بہن کو کسی...‘‘

’’ہاں الفر!‘‘ مراد نے ٹھنڈی سانس لے کر الفر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’کم از کم میں اس معاملے سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ میں چھان بین کرواتا رہا ہوں۔ میرے اپنے بھی تو کچھ ذرائع ہیں۔ پھر یہ کہ مجھے شبہ بھی تھا۔‘‘

’’کس بات کا شبہ سر؟‘‘ الفر نے بے تابی سے پوچھا۔

’’اس بات کا کہ تمہاری بہن کو شاید اسی نے اغوا کروایا ہو جس نے تمہاری بہن کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اور جسے میں نے پٹوایا تھا۔‘‘

’’اسی نے اغوا کروایا ہے میری بہن کو؟‘‘ الفر چونکا۔

’’خود اس نے تو نہیں لیکن یہ کام اس کے بھائی نے کروایا ہے۔ دراصل اس نے اپنے بھائی کو سارا واقعہ بتایا تھا جو بہت سے غلط دھندوں میں ملوث ہے۔ تمہاری بہن کو چھیڑنے والے نے اسے بتایا تھا کہ اسے پیٹنے والے اسے وارننگ دے چکے تھے کہ آئندہ کسی لڑکی کو چھیڑا تو اس سے زیادہ بُرا حشر کیا جائے گا۔ پھر اس نے اپنے بھائی کے استفسار پر بتایا کہ اس نے کراچی میں ایک لڑکی سے کچھ بات کرنا چاہی تھی۔ اس پر اس کے بھائی نے کہا کہ اسے پٹوانے والا کوئی ایسا شخص ہوگا جو اس لڑکی کو چاہتا ہو۔ اس نے اپنے آدمی کراچی بھیجے تاکہ وہ تمہارے محلے میں رہنے والی اس لڑکی کا پتا لگائیں... جب اسے معلوم ہوگیا کہ وہ تمہاری بہن ہے تو اس نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے اسے اغوا کروا لیا۔‘‘

’’اتنا کچھ معلوم کرلیا ہے آپ نے؟‘‘ الفر کے منہ سے نکلا۔

’’اس سے بھی کچھ زیادہ۔‘‘ مراد نے کہا۔ ’’تمہیں سن کر صدمہ تو ہوگا لیکن بے عزت ہو جانے سے مر جانا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔‘‘

’’صاف صاف بتائیے سر!‘‘ الفر نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ غصے میں بھی تھا۔

مراد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ’’اس سے پہلے کہ وہ تمہاری بہن کی عزت لوٹتا، تمہاری بہن نے اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی سے کود کر اپنی جان دے دی۔‘‘

’’آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں سر؟‘‘ الفر کی آواز بھرا گئی۔ ’’میری بہن اب اس دنیا میں نہیں؟‘‘

’’تمہیں اس بات پر کچھ مطمئن ہونا چاہیے الفر کہ تمہاری بہن نے اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دی اور اپنی جان دے دی۔‘‘

لیکن الفر فوری طور پر اس بات سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ بہن کی موت اس کے لیے ایک صدمہ تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

مراد نے اسے رونے دیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ الفر اچھی طرح رو لے تاکہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

کچھ دیر بعد اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ کمی آئی اور پھر وہ یک لخت کھڑا ہو کے بڑے غصے سے بولا۔ ’’مجھے اس کا نام پتا بتائیے سر! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے سینے میں گولیاں اتار دوں گا۔ مجھے ریوالور استعمال کرنا اب آہی گیا ہے۔‘‘

مراد نے اسے غور سے دیکھا۔ ’’شاید تم سوچ سمجھ کر نہیں بولے ہو۔‘‘

الفر نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور سوچنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹ کانپے اور چہرے پر بے بسی کا تاثر ابھرا۔ ’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!‘‘ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’میں یہ سوچے بغیر بول پڑا کہ جب اس قتل کے جرم میں مجھے پھانسی ہوگی تو میری ماں اور میری چھوٹی بہن کا کیا ہوگا؟‘‘

’’بس... صرف یہی ایک رکاوٹ محسوس کر رہے ہو؟‘‘

’’جی سر!‘‘

’’لیکن مجھے بہت خوشی ہوگی اگر تم جیسا نوجوان اس بدمعاش دولت مند کو موت کے گھاٹ اتارے۔‘‘ مراد نے کہا۔ ’’اس بات کی ضمانت میں لیتا ہوں کہ تمہیں پھانسی نہیں ہوگی... بلکہ تم گرفتار بھی نہیں ہوگے۔‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہے سر؟‘‘ الفر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’اگر مجھ پر اعتماد ہے تو یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔‘‘

’’آپ سے زیادہ اعتماد تو مجھے کسی پر بھی نہیں ہے مگر...‘‘

’’اگر مگر چھوڑو۔‘‘ مراد نے اس کی بات کاٹی۔ ’’فی الحال تم نشانہ بازی کی مشق کرو۔ ابھی تمہارا نشانہ کچا ہے۔ اگر تمہارا پہلا فائر نشانے پر نہ بیٹھا تو دوسرا فائر کرنے کی مہلت تمہیں پھنسوا دے گی۔ پھر میرے لیے بھی دشوار ہوگا کہ تمہیں کیسے بچاؤں۔ تمہارا نشانہ اتنا سچا ہونا چاہیے کہ پہلی گولی ہی کام کر جائے۔‘‘

’’میں بہت جلدی اتنی مشق کرلوں گا۔‘‘ الفر پُرجوش ہوگیا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ مراد نے کہا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن سے الفر نے تہ خانے میں مشق شروع کردی۔ وہاں مراد نے گولیوں کا بہت بڑا ذخیرہ کروا دیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ دن بھر کے لیے پانی کی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ انتقام کے شعلے اور جنون نے الفر کے دل و دماغ میں آگ بھر دی تھی۔ اس نے ایک

ہالی وڈ کی ایک فلم ایکٹریس اپنے ڈائریکٹر سے یہ کہتے ہوئے سُنی گئی۔ ’’میں نے گزشتہ شب فیصلہ کیا ہے کہ تم سے شادی کرنا مناسب نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم میرے اور اپنے ہنی مون والے منصوبے کو تبدیل کردو۔‘‘

■■■■■■

بار بھی نہیں سوچا کہ ایک آدمی کو قتل کروانے کے لیے مراد اس کی اتنی مدد کیوں کر رہا ہے؟ اس بارے میں اس کے دماغ میں کوئی خیال آتا تھا تو صرف یہ کہ مراد کو دولت مند بدمعاشوں سے نفرت ہے۔

اس مشق کے دوران میں مراد وہاں نہیں ہوتا تھا۔ صبح وہ الفر کو تہ خانے میں پہنچا کر اوپر سے تہ خانہ بند کر کے چلا جاتا تھا۔ پھر اس کی صورت شام ہی کو نظر آتی تھی۔ ایک دن وہ دیر تک الفر کی مشق دیکھتا رہا... پھر اس کا کندھا تھپک کر کہا۔ ’’چلو اب بس کرو۔ تم بہت تیزی سے قادر ہوتے جا رہے ہو۔ تمہیں اپنا مقصد حاصل کرنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔‘‘

مراد کا یہ خیال سو فیصد درست ثابت ہوا۔ ساتویں روز اس نے بورڈ کے سب سے چھوٹے سوراخوں کو نشانہ بنایا تھا اور اس کی چلائی ہوئی ہر گولی نشانے پر بیٹھی تھی۔ اس دن مراد نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خوش ہو کر بولا۔ ’’اب تم سچے نشانے باز بن گئے ہو۔ میں تمہیں کل ہی کی فلائٹ سے لاہور بھجوا دیتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میرا ایک خاص آدمی بھی ہوگا۔‘‘

’’کسی دوسرے آدمی کی کیا ضرورت ہے سر؟‘‘ الفر نے کہا۔

’’تم نے لاہور دیکھا ہے؟ کبھی لاہور گئے ہو؟‘‘

’’میں کبھی نہیں گیا سر!‘‘

’’اس آدمی کو پہچانتے ہو جس کو نشانہ بنانا ہے؟‘‘

’’کیا آپ کسی طرح اس کی ایک تصویر مہیا نہیں کر سکتے؟‘‘

’’تصویر سے کام نہیں چلے گا الفر! تمہیں وہاں قدم قدم پر کسی کے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ میں اپنے ایک بہت ذہین آدمی کو تمہارے ساتھ بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہی تمہیں لاہور سے بہ حفاظت واپس بھی لے آئے گا۔‘‘

”لیکن گولی میں ہی چلاؤں گا۔“ انصر کے لہجے میں ضد تھی۔

مراد ہنسا۔ ”بے شک! یہ کام تو تم ہی کرو گے۔ باقی معاملات تم اس آدمی پر چھوڑ دینا جسے میں تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے سر!“

”گھر پر اپنی ماں کو کیا بتاؤ گے؟“

”انہیں میں نے اب تک کچھ نہیں بتایا ہے کہ میں کیا کررہا ہوں۔ یہ بات انہیں بتائی بھی نہیں جاسکتی۔ میں ان سے بس یہ کہوں گا کہ آپ مجھے کسی کام سے دو تین دن کے لیے لاہور بھیج رہے ہیں۔“

مراد اسے تہ خانے سے اوپر لے آیا اور بولا۔ ”اب تم اپنے گھر جاؤ اور لاہور جانے کی تیاری کرو..... تمہارے ساتھ زیادہ سامان نہیں ہونا چاہیے۔ بس ایک بیگ میں کپڑوں کا ایک جوڑا اور ضروریات کی کچھ چیزیں رکھ لینا۔“ پھر اپنی جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر انصر کو دیے۔

”لاہور میں تمہاری جیب خالی نہیں ہونا چاہیے۔ کسی وقت بھی کسی چیز کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اول تو یہ روپے کم نہیں پڑیں گے لیکن اگر تم ضرورت محسوس کرو تو اس آدمی سے کہہ دینا جو تمہارے ساتھ جائے گا۔“

”شکریہ سر!“ انصر کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ ”آپ نے میرے ساتھ اتنا کیا ہے جیسے آپ میرے اپنے ہوں۔“

”ہاں انصر! میں تمہارا اپنا ہی ہوں۔“ مراد نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس وقت انصر یہ نہیں دیکھ سکا کہ مراد کے ہونٹوں پر اس وقت ایسی مسکراہٹ تھی جیسے اس نے کوئی بہت بڑی مہم سر کی ہو۔

انصر کو رخصت کرنے کے بعد مراد اپنی خواب گاہ میں آکر لیٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہیں سے ایک تصویر نکالی۔ وہ انصر کی ماں زیب النسا کی تصویر تھی۔

”زیب النسا بیگم!“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”پرسوں تک تم مکمل شکست کھا چکی ہوگی! یہ فتح حاصل کرنے کے لیے مجھے بیس سال انتظار کرنا پڑا ہے... اور اس فتح کے بعد...“ مراد خاموش ہوگیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی لیکن وہ تصویر اس کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھ سکتی تھی، نہ محسوس کرسکتی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح انصر تیار ہوکر مراد کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ انصر نے اس کے ساتھ چالیس بیالیس سال کے ایک شخص کو دیکھا۔ نہایت اچھے کپڑوں میں ملبوس وہ چہرے مہرے سے کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مراد نے انصر کو بتایا کہ وہی آدمی اس کے ساتھ جائے گا۔ اس آدمی کا نام شاید تاج دار ہو لیکن مراد نے اسے تاجی کہا تھا۔

انصر تاجی کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا۔ وہ اس وقت نہایت قیمتی بش کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ پیروں میں جوتے بھی اچھے تھے۔ تین ماہ پہلے تک وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اتنی جلدی اس کی زندگی اتنی بدل جائے گی۔ وہ اپنی اس وضع قطع سے بے حد خوش ہوتا لیکن اس کے دل و دماغ پر بہن کی موت کا صدمہ طاری تھا اور اس کے وجود میں انتقام کے شعلے بھی بھڑک رہے تھے۔

جب وہ طیارے میں سوار ہوا تو بھی اس نے کوئی تفاخر محسوس نہیں کیا حالانکہ وہ زندگی میں پہلی بار ہوائی سفر پر روانہ ہورہا تھا۔

لاہور میں تاجی نے ایک شان دار ہوٹل میں ڈبل بیڈ کا ایک روم لیا۔

”چائے پی کر ہم باہر نکلیں گے۔“ تاجی نے انصر سے کہا۔

”اس آدمی کا نام کیا ہے؟“ انصر کے ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی۔

”جسے تم گولی مارو گے؟“ تاجی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”پیرزادہ تابش۔“

انصر نے زیر لب یہ نام دہرایا جیسے وہ نام یاد رکھنا بھی اس کے لیے ضروری ہو۔

تاجی نے چائے کمرے میں منگوائی۔ چائے پیتے وقت اس نے موبائل فون پر کسی سے بہت مختصر بات کی۔

”تمہیں میرے آنے کی اطلاع بھی مل گئی ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”اور یہ بھی بتادیا گیا ہوگا کہ میں کس ہوٹل میں ہوں۔ بیس منٹ میں کار یہاں پہنچ جانی چاہیے۔“

جب تاجی نے موبائل فون بند کردیا تو انصر نے اس سے پوچھا۔

”کار کس سے منگوائی ہے؟“

”صاحب کی کمپنی کی ایک برانچ یہاں بھی ہے۔“ تاجی نے جواب دیا۔ ”وہیں سے ایک آدمی کار لے کر آئے گا۔“

انصر سمجھ گیا کہ ’صاحب‘ سے تاجی کی مراد کیا ہوگی۔ یہاں تک پھیلا ہوا ہے ان کا بزنس، انصر نے بس اتنا

ہی سوچا...

پندرہ منٹ میں وہ چائے پی کر فارغ ہوچکے تھے۔

”اب چلتے ہیں۔“ تاجی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”کار پہنچنے ہی والی ہوگی۔“

”میرے پاس ریوالور نہیں ہے۔“

”مناسب نہیں کہ تم ہر وقت ریوالور اپنے پاس رکھو۔ جب وقت آئے گا تو وہ تمہیں مل جائے گا۔“

انصر پھر کچھ نہیں بولا۔

نیچے آنے کے بعد تاجی نے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دی، پھر وہ دونوں لابی سے گزرتے ہوئے بیرونی دروازے تک پہنچے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے تاجی نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور بڑبڑایا۔ ”گاڑی کو اب تک پہنچ جانا چاہیے۔“

جب وہ دروازے سے باہر نکلے تو ایک کار ان کے سامنے آکر رکی۔

”گڈ!“ تاجی نے کہا اور کار کی طرف بڑھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوش پوش شخص بیٹھا ہوا تھا۔ تاجی نے کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور انصر کو کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انصر کے بعد وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ بیٹھتے بیٹھتے اس نے دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ ہی کار حرکت میں آگئی۔

”اسے کہتے ہیں وقت کی پابندی۔“ تاجی نے انصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہم جس کام کے لیے آئے ہیں، اس میں وقت کی پابندی اتنی ہی سختی سے کی جاتی ہے۔ ایک سیکنڈ کی بھی گڑبڑ ہوجائے تو سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ یہ سبق اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔“

انصر کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ یہ سبق کیوں ذہن نشین کرے لیکن وہ اپنے دماغ میں ابھرنے والا یہ سوال اپنی زبان پر نہیں لایا۔

پھر پانچ چھ منٹ کے لیے کار میں خاموشی چھا گئی۔ ڈرائیونگ کرنے والا خوش پوش شخص تو ایک بار بھی نہیں بولا تھا۔

پانچ منٹ بعد کار ایک سڑک کے کنارے رکی۔ اس سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ تاجی نے کار سے اترتے ہوئے انصر سے کہا۔ ”آؤ۔“

انصر بے تابی کے ساتھ کار سے اترا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وقت اب قریب آچکا ہے جب وہ اپنی بہن کی موت کے ذمے دار کو اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور سے ہلاک کرے گا۔ اس کی جنونی کیفیت نے اسے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ شاید تاجی اسے گرفتار ہونے سے نہ بچاسکے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا خوش پوش شخص بھی کار سے اتر آیا تھا۔

”اب تم جاؤ۔“ تاجی نے اس سے کہا۔ ”ٹھیک تین گھنٹے بعد تم لکشمی چوک پر ملنا۔“

خوش پوش شخص نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی، منہ سے کچھ نہیں بولا۔

”اب تم میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھو گے۔“ تاجی نے انصر سے کہا اور کھلے ہوئے دروازے سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

انصر کار کے آگے سے گھوم کر دوسری طرف پہنچا اور ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی تاجی نے کار چلادی۔ انجن پہلے ہی سے اسٹارٹ تھا۔

”پیرزادہ تابش ہمیں کہاں ملے گا؟“ انصر نے بے چینی سے پوچھا۔

تاجی نے ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جیسے انصر کو خاموش رکھنا چاہتا ہو۔

انصر خاموش تو ہوگیا لیکن اس کی بے چینی بڑھ گئی۔

نہ جانے کن راستوں سے ہوتی ہوئی کار ایک جگہ پہنچ کر رکی۔ تاجی نے انصر کو اترنے کا اشارہ کیا اور خود بھی انجن بند کرکے اتر گیا۔ انصر کے اترنے کے بعد اس نے کار لاک کردی۔

”وہ دیکھو!“ تاجی نے مسکراتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”شاہی مسجد۔“

انصر کی نظر پہلے ہی مسجد پر پڑ چکی تھی کیونکہ اس نے شاہی مسجد کی تصویریں دیکھی تھیں اس لیے پہچان بھی گیا تھا۔ وہ جھنجلا سا گیا۔ وہ لاہور اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ وہاں کے تاریخی مقامات دیکھتا پھرے۔

لیکن وہ مجبور تھا کہ تاجی کی بات مانتا رہے۔ اس نے مراد پر اعتماد کیا تھا لہٰذا ضرورت تھی کہ وہ تاجی پر بھی اعتماد کرے۔

شاہی مسجد کے بعد تاجی نے شاہی قلعے کا رخ کیا۔ اب وہ انصر سے ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا اور ہر چیز کے بارے میں بتاتا جارہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بہت دھیرے سے بولا۔ ”تم بھی مسکراؤ۔ چہرے سے ظاہر کرو کہ ہم یہاں تفریح کرکے بہت لطف اندوز ہورہے ہیں۔ میں اس بات کو

نظرانداز نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری نگرانی کی جارہی ہو۔"

الصر کا دل دھڑک اٹھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ ان کی نگرانی کون کرتا اور کیوں کرتا؟

یہ سوال کرنے کا موقع اسے شاہی قلعے میں ملا جب ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

تاجی نے جواب دیا۔ "ملک کے حالات آج کل ٹھیک نہیں ہیں۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے اور کچھ عرصے رک کر پھر شروع ہو جاتی ہے۔ کئی خودکش حملے بھی ہو چکے ہیں۔ خفیہ ایجنسیاں بہت چوکس ہوں گی۔ ممکن ہے کہ ہر شہر میں یا کم از کم ہر بڑے شہر میں نوواردوں کی نگرانی کی جاتی ہو۔"

"پھر تو ہم ہمیشہ خطرے میں رہیں گے۔" الصر نے تشویش ظاہر کی۔

"نہیں، یہ ضروری نہیں ہے۔" تاجی نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ ہماری نگرانی صرف آج کی جائے، یا کل تک کی جائے۔ اس کے بعد وہ ہماری طرف سے مطمئن ہو جائیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پیرزادہ کو میں آج ہلاک نہیں کرسکوں گا؟"

"صحیح سمجھے۔" تاجی نے کہا۔ "ہمیں بہت محتاط رہنا ہے۔ یہ میری ذمے داری ہے کہ میں تمہیں بہ حفاظت کراچی واپس پہنچاؤں اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم ہنستے مسکراتے رہو۔ اگر کوئی ہماری نگرانی کررہا ہوگا تو سمجھ لے گا کہ ہم یہاں تفریحاً آئے ہیں۔"

بات الصر کی سمجھ میں آگئی۔ وہ اپنے چہرے پر خوش گوار تاثرات لے آیا مگر اسے اس خیال سے بہت مایوسی ہوئی کہ وہ اسی روز پیرزادہ کو ہلاک نہیں کرسکے گا۔

شاہی قلعہ دیکھنے میں خاصا وقت صرف ہوا۔ پھر وہ باہر نکل کر کار میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

تاجی نے اپنی گھڑی دیکھی۔ "ہم بالکل صحیح وقت پر لکشمی چوک پہنچیں گے۔"

الصر کچھ نہیں بولا۔ وہ مایوس ہی نہیں، دل برداشتہ بھی ہوگیا تھا۔

لکشمی چوک پر وہ سفید پوش شخص مل گیا جو کار لے کر ہوٹل آیا تھا۔ لکشمی چوک سے الصر اور تاجی پچھلی نشست پر بیٹھے اور ڈرائیونگ سیٹ اس خوش پوش شخص نے سنبھالی۔

ان دونوں کو ہوٹل کے دروازے پر چھوڑ کر کار چلی گئی۔

کمرے میں پہنچ کر تاجی نے کہا۔ "آج تو میں نے تمہیں وہ مقام نہیں دکھایا جہاں تم پیرزادہ کو گولی کا نشانہ بناؤ گے۔ ہمیں بہت احتیاط کرنا ہوگی۔ جب تک مجھے اطمینان نہ ہو جائے ہم اس مقام کے قریب سے بھی نہیں گزریں گے۔"

"تو زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں؟" الصر نے پژمردگی سے پوچھا۔

"ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کتنے دن لگیں گے۔"

"مطمئن ہو جانے کے بعد پیرزادہ کا قتل کیا جائے گا تو اس کے بعد بھی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"ان سب لوگوں کو چیک کیا جاسکتا ہے جو ان چند دنوں میں کسی دوسرے شہر سے یہاں آئے ہوں۔"

"ہاں، اس کا امکان ہے لیکن اس وقت ہماری پوزیشن پر کوئی حرف نہیں آسکے گا۔" تاجی نے جواب دیا۔ "صاحب کی یہاں کی برانچ کا جنرل منیجر ہمارے اس بیان کی توثیق کرے گا کہ جس وقت پیرزادہ کا قتل ہوا، ہم اس کے گھر پر اس کے ساتھ صبح کا ناشتا کررہے تھے۔ جنرل منیجر اس شہر کا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے اور پھر ہمارے صاحب بھی کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہیں۔ ایک ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل سے بھی ان کے تعلقات ہیں۔"

"تم نے صبح کے ناشتے کی بات کیوں کہی؟"

"تم پیرزادہ کو صبح ہی کے وقت قتل کرو گے۔ صبح وہ جوگنگ کے لیے ایک پارک میں جاتا ہے۔ وہ پارک میں تمہیں ایک دن پہلے دکھادوں گا۔ اس کی کار بھی ایک مخصوص جگہ پر پارک ہوتی ہے۔ جس وقت وہ کار سے اترے گا، اسی وقت تمہیں اس پر فائر کرنا ہے۔ اس کے ساتھ دو باڈی گارڈز بھی ہوتے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھلیں، ہم دور نکل چکے ہوں گے۔"

الصر سوچنے لگا کہ اگر یہاں زیادہ دن گزارنا پڑے تو اس کی ماں پریشان ہو جائے گی۔ اس نے تاجی کو اپنی اس پریشانی سے آگاہ کیا۔ تاجی نے کچھ سوچا اور پھر اپنے موبائل پر مراد سے رابطہ کرکے اس سے بات کی۔ پھر اس نے الصر سے کہا۔ "دو گھنٹے کے اندر اندر تمہاری والدہ کو ایک موبائل فون بھجوادیں گے۔ اس کا نمبر وہ میسج کے ذریعے بھیج دیں گے۔ اگر یہاں زیادہ دن لگیں تو تم ان سے بات کرسکتے ہو بلکہ جب چاہو بات کرسکتے ہو اور وہ بھی تم سے رابطہ کرسکتی ہیں۔"

اس طرح الصر کی پریشانی دور ہوگئی۔ دو گھنٹے کے بجائے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی اسے اس موبائل فون کا نمبر مل گیا جو

مراد نے کسی ذریعے سے اس کے گھر بھجوادیا تھا۔

الصر سوچنے لگا کہ وہ مراد کی ان مہربانیوں کو زندگی بھر فراموش نہیں کرسکے گا۔

☆☆☆

الصر کا یہ خیال ٹھیک ہی ثابت ہوا کہ وہ دو تین دن میں کراچی واپس نہیں جاسکا۔ اگلے دو دن بھی تاجی اور الصر نے لاہور کے تاریخی مقامات دیکھنے اور شاپنگ کرنے میں گزارے۔ تیسرے دن وہ ڈھائی تین بجے تک گھومتے رہے۔ ڈرائیونگ تاجی ہی کررہا تھا۔ اس نے الصر سے کہا۔

"پانچ منٹ بعد ہم اس پارک کے قریب سے گزریں گے جہاں پیرزادہ تابش جوگنگ کے لیے آتا ہے۔ ہم وہاں رکیں گے نہیں۔ میں تمہیں اشارے سے وہ جگہ دکھادوں گا جہاں پیرزادہ تابش اپنی کار پارک کرتا ہے۔"

الصر خوش ہوگیا۔ "تو کیا کل صبح ...؟"

"ہاں۔" تاجی نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ پہلے اور دوسرے دن ہماری نگرانی کی گئی تھی۔ کل وہ سلسلہ ختم ہوگیا لیکن میں نے احتیاط کے طور پر ایک دن اور گزارلیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ ہماری نگرانی کی گئی تھی؟"

تاجی دھیرے سے ہنس دیا۔ اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

جلد ہی تاجی بولا۔ "اب ہم اس پارک کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ پارک تمہیں دکھائی دے رہا ہے نا؟"

"ہاں۔" الصر نے کہا۔

"جب ہم اس کے سامنے سے گزریں گے تو میں تمہیں بتادوں گا کہ پیرزادہ تابش اپنی کار کس جگہ پارک کرتا ہے۔"

الصر نے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس کی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے کسی فلم کا کردار ہو۔

پارک کے سامنے سے گزرتے ہوئے تاجی نے اشارے سے الصر کو وہ جگہ دکھائی جس کے لیے وہ اس طرف آئے تھے۔

"اس کی کار کا رنگ چاکلیٹی ہے۔" تاجی نے بتایا۔ "وہ عموماً ڈرائیور کے برابر میں اگلی سیٹ پر بیٹھا کرتا تھا لیکن کچھ دنوں سے اس نے اپنے اس معمول میں تبدیلی کرلی ہے۔ وہ کبھی پچھلی سیٹ پر بھی بیٹھ جاتا ہے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ کل وہ پچھلی سیٹ پر ہوگا یا اگلی سیٹ پر لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں اس پر گولی تو اسی وقت چلانا ہے جب وہ کار سے اترے گا۔"

"مجھے ابھی تک تم نے اس کی تصویر نہیں دکھائی اور نہ میرے پاس ریوالور ہے۔" الصر نے کہا۔

"ہم معمول کے مطابق شام ہی کو ہوٹل کا رخ کریں گے۔ وہاں پہنچ کر میں تمہیں اس کی کئی تصویریں دکھادوں گا۔ انہیں تم دیر تک دیکھتے رہنا۔ اس کا چہرہ اچھی طرح ذہن نشین کرلینا۔ سونے سے پہلے ہم وہ تصویریں جلا دیں گے۔ ریوالور تمہیں کل صبح... بلکہ اس وقت ملے گا جب ہم یہاں سے روانہ ہوچکے ہوں گے۔"

الصر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

مقررہ وقت پر ان کی کار لکشمی چوک پہنچی۔ گزشتہ دنوں میں بھی ان کا یہی معمول رہا تھا۔ یہاں سے اسی شخص نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی جو ان کے لیے کار لے کر ہوٹل آیا کرتا تھا۔

جب وہ دونوں ہوٹل پہنچے تو اندھیرا پھیلنے لگا۔

تاجی کے ہاتھ میں براؤن لفافہ تھا جو اسے کار کے خوش پوش ڈرائیور نے دیا تھا۔ تاجی نے وہ لفافہ الصر کو دیا۔

"اس میں پیرزادہ تابش کی تصویریں ہیں۔" اس نے کہا۔ "سونے سے پہلے تک تم ان تصویروں کو اچھی طرح دیکھتے رہو۔"

الصر نے بڑے اشتیاق سے وہ تصویریں نکالیں، یہ آٹھ تصویریں تھیں جن میں پیرزادہ تابش کے کلوز اپ مختلف زاویوں سے تھے۔ ایک تصویر ایسی بھی تھی جس میں اسے چاکلیٹی رنگ کی ایک کار سے اترتے دکھایا گیا تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ کر الصر کا دوران خون تیز ہوگیا۔

"میری بہن کے قاتل!" الصر نے ایک تصویر پر نظر جماتے ہوئے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا۔ "کل تم اپنی زندگی کا آخری سورج دیکھو گے۔"

ان دونوں نے رات کا کھانا نو بجے کھایا۔ اس کے بعد تاجی گیارہ بجے تک ٹی وی دیکھتا رہا۔ الصر تصویریں دیکھتا رہا۔

"اب ہمیں سونا چاہیے۔" تاجی نے الصر سے کہا۔ "تم نے تصویریں اچھی طرح دیکھ لیں؟"

"ہاں۔" الصر نے کہا۔ اس نے تصویریں لفافے میں رکھ کر تاجی کو واپس کردیں۔

تاجی نے واش روم میں جاکر وہ تصویریں اچھی طرح جلائیں اور ان کی راکھ فلیش میں بہادی۔

دوسری صبح وہ معمول کے خلاف جلدی اٹھے اور روانگی کے لیے تیار ہوئے۔ تیار ہونے کے بعد تاجی نے موبائل پر

کسی سے رابطہ کیا اور بولا۔ ''میری گھڑی سے اپنی گھڑی ملا لو۔'' اس نے اپنی گھڑی دیکھ کر وقت بتایا، پھر کچھ رک کر بولا۔ ''باقی لوگوں سے بھی رابطہ کرو۔ ان کی گھڑیوں میں بھی یہی وقت ہونا چاہیے۔''

رابطہ منقطع کرنے کے بعد اس نے انصر سے کہا۔ ''آؤ چلیں۔''

انصر نے کھڑے ہو کر اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کار آ گئی ہو گی؟''

''پہنچنے ہی والی ہو گی۔'' تاجی نے جواب دیا۔ ''کل سارا پروگرام طے ہو چکا ہے۔ اب گھڑیاں بھی ملا لی گئی ہیں۔ وقت کا فرق ہو جائے تو کھیل بگڑ جاتا ہے۔''

''آج ہم نے ناشتا نہیں کیا۔'' انصر نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم سیدھے جنرل منیجر کے گھر جائیں گے اور ناشتا وہیں کریں گے۔''

وہ دونوں نیچے پہنچے۔ کار آ چکی تھی۔ وہ دونوں اس میں سوار ہوئے اور کار چل پڑی۔

دو منٹ بعد تاجی کے موبائل پر ایک کال آئی۔ تاجی نے دوسری طرف کی بات سننے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''پیرزادہ تابش کی کار اس کے گھر سے روانہ ہو چکی ہے۔''

انصر کچھ نہیں بولا۔ اس وقت اس کا دورانِ خون خاصا تیز ہو چکا تھا۔

تاجی نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد ڈرائیونگ کرنے والے سے کہا۔ ''رفتار تھوڑی سی بڑھاؤ ورنہ ہمیں تین منٹ کی تاخیر ہو سکتی ہے۔''

ڈرائیونگ کرنے والے نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد کار کی رفتار میں کچھ اضافہ کیا۔

انصر کے چہرے پر اس وقت گہری سوچ بچار کے تاثرات تھے۔ اب اس کے ذہن میں ایسے خیالات آنے لگے جو اس سے پہلے نہیں آئے تھے۔ وہ ان خیالات سے اس وقت باہر آیا جب گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور تاجی اس کا ہاتھ پکڑ کر سرعت کے ساتھ کار سے اترا۔ ''یہ دستانے پہن لو۔'' اس نے انصر سے کہا..... وہ خود پہلے ہی دستانے پہن چکا تھا۔

ایک ویران گلی میں کار روک دی گئی، وہیں ایک خالی کار بھی کھڑی تھی۔ تاجی انصر کا ہاتھ پکڑے تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''تم میرے برابر میں ہی بیٹھو گے۔'' تاجی نے انصر کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔

دوسری طرف سے انصر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس نے دستانے پہن لیے تھے۔ پلک جھپکتے میں انجن اسٹارٹ ہوا اور کار بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ اس گلی سے نکل کر ایک بڑی سڑک پر پہنچ گئی۔

''ہم شاید پارک کے قریب پہنچ رہے ہیں۔'' انصر نے راستہ پہچان کر کہا۔

''اچھی یادداشت ہے تمہاری۔'' تاجی نے کہا۔ ''اب ڈیش بورڈ کھولو۔ اس میں ریوالور رکھا ہو گا۔ وہ نکال کر تم اپنی ران پر اس طرح رکھ لو کہ وہ تمہارے بش کوٹ کے نیچے چھپ جائے۔''

انصر نے ڈیش بورڈ کھولا۔ ریوالور موجود تھا۔ انصر نے تاجی کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔

''ہم آج ہی کراچی واپس چلے جائیں گے نا؟'' اس نے تاجی سے پوچھا۔

تاجی نے اس وقت موبائل اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ ''رپورٹ؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا پھر کچھ سننے کے بعد ''ٹھیک ہے'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''پیرزادہ تابش کی کار تین منٹ میں اپنی منزل پر پہنچ جائے گی۔'' اس نے انصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم بالکل صحیح رفتار سے چل رہے ہیں۔ ہاں' تم نے کچھ پوچھا تھا مجھ سے؟''

انصر نے اپنا سوال دہرایا۔

''نہیں۔'' جواب میں تاجی نے کہا۔ ''ہم دو دن بعد جائیں گے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس قتل کے فوراً بعد لاہور چھوڑ دیں۔''

اب پارک دکھائی دینے لگا۔

''ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لو۔''

انصر کی گرفت پہلے ہی مضبوط تھی۔ وہ گولی چلانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات بھی چکرائی تھی کہ آج اس کے کھولتے ہوئے خون کو ٹھنڈک نصیب ہو جائے گی۔

''دیکھو' سامنے سے وہ کار آ رہی ہے اس کی۔'' تاجی نے کہا۔

''میں دیکھ چکا ہوں۔'' انصر نے جواب دیا۔ ''تم نے

اس کار کا رنگ بتا دیا تھا مجھے۔''

اس وقت تاجی نے کار کی رفتار کم کی اور بولا۔ ''مجھے اس وقت اپنے تجربے سے کام لینا ہے۔ اندازے کے مطابق ٹھیک اس وقت ہماری کار وہاں پہنچنا چاہیے جب پیرزادہ تابش کار سے اتر رہا ہو۔''

انصر کچھ نہیں بولا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے اعصاب میں تناؤ نہ آنے پائے۔ صحیح نشانہ لینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر ہیجان کا شکار نہ ہو۔

جس وقت چاکلیٹی کار رکی، تاجی کی کار اس سے کچھ فاصلے پر تھی اور تاجی اسے یکساں رفتار سے چلا رہا تھا۔

تاجی کا اندازہ داد طلب تھا۔ چاکلیٹی کار سے دونوں باڈی گارڈز کے ساتھ پیرزادہ تابش کار سے اتر آیا جب تاجی اور انصر کی کار اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

تاجی کو انصر سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انصر کے ریوالور سے نکلنے والی گولی پیرزادہ تابش کی کھوپڑی پر پڑی تھی۔

''گڈ!'' تاجی کے منہ سے نکلا اور اس نے یک لخت رفتار بڑھا دی۔

انصر نے پیچھے ہاتھ کر کے تین فائر مزید کر... دیے۔ اس فائرنگ کی وجہ سے پیرزادہ تابش کے باڈی گارڈز کو پوزیشن لینے میں جو وقت لگا، اتنی دیر میں تاجی اور انصر کی کار دو فرلانگ آگے نکل چکی تھی۔

بریکوں کی چیخیں گونجیں۔ تاجی نے بڑے ماہرانہ انداز سے اسے ایک گلی میں موڑ کر ایک جھٹکے سے روک دیا۔

بڑی تیزی سے وہ دونوں وہاں کھڑی ہوئی ایک خالی کار میں منتقل ہو گئے۔ اسے بھی تاجی نے بڑی تیزی سے دوڑایا۔

''ریوالور اسی گاڑی میں چھوڑ دینا۔'' اس نے انصر سے کہا۔

جلد ہی وہ کار بھی ایک گلی میں رک گئی۔ یہاں انصر نے وہ کار کھڑی دیکھی جو روزانہ ان کے استعمال میں رہتی تھی اور اس دن بھی وہ ہوٹل سے اسی کار میں روانہ ہوئے تھے۔

تاجی اور انصر اس کار میں بیٹھ کر تیزی سے روانہ ہوئے۔ شاہراہ پر پہنچ کر تاجی نے کار کی رفتار کم کر دی۔

''اب ہم خطرے سے نکل آئے ہیں۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''میں تمہارے نشانے کی داد ضرور دوں گا۔ تم نے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا۔ بعد میں بھی تم نے کئی فائر کر کے اچھا کیا۔ باڈی گارڈز کو سنبھلنے میں کچھ وقت لگ گیا۔''

''جہنم رسید کر دیا میں نے اسے۔'' انصر نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں گلبرگ کے ایک بنگلے میں بیٹھے، اس بنگلے کے مکین کے ساتھ ناشتا کر رہے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات میں اس قتل کی خبر شائع ہوئی جس سے انصر نے جانا کہ پیرزادہ تابش ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کا بیٹا تھا۔ اخبارات میں تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں جن میں سے ایک تصویر میں پیرزادہ تابش کے بھائی کو سوگوار دکھایا گیا تھا۔ انصر نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی تھا جس کو مراد نے چار غنڈوں سے پٹوایا تھا۔

تاجی اور انصر نے لاہور میں دو دن اور گزارے۔ انہوں نے اپنا بیشتر وقت تفریحات میں گزارا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ کسی سراغ رساں ایجنسی نے پیرزادہ تابش کے قتل کے سلسلے میں تاجی اور انصر سے رابطہ کیا ہو۔

دو دن بعد وہ کراچی لوٹ آئے۔ دوپہر کو انصر، مراد کے گھر پہنچا تو مراد نے انصر کو گلے لگا لیا اور پھر ایک چابی اسے دیتے ہوئے بولا۔

''یہ تمہارا انعام ہے۔''

''یہ کیا ہے سر؟ اور کس بات کا انعام؟'' انصر نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ اپارٹمنٹ کی چابی ہے۔ اپارٹمنٹ باغبان ٹیرس میں ہے۔ یہ انعام اس بات کا ہے کہ تم نے میرا انتقام بھی لے لیا۔ میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا تھا۔ دراصل پیرزادہ تابش ایک ایسا شخص تھا جس نے بھی میرے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ میں اس کے قتل سے اتنا ہی خوش ہوں کہ تمہیں تمہارا منہ مانگا انعام بھی دے سکتا تھا۔ تم اس اپارٹمنٹ کے علاوہ بھی اگر مجھ سے کچھ مانگو گے تو میں انکار نہیں کروں گا۔''

''شکریہ سر! یہ اپارٹمنٹ بھی میرے لیے کوئی کم انعام نہیں ہے۔''

''تمہیں ایک بات یاد ہے انصر! تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو؟''

''مجھے یاد ہے سر!''

''تو پھر اب تمہیں کچھ اور قتل بھی کرنے ہوں گے۔''

''جی!'' انصر چونکا۔

''ہاں انصر!'' مراد نے کہا۔ ''میرے پاس کچھ لوگوں کی ایک فہرست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے ملک کو گھن کی

طرح چاٹ رہے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو میں مغرور دولت مند کہتا ہوں۔ میں اپنے ملک سے ان بدمعاشوں کا خاتمہ چاہتا ہوں۔ میں نے اس کام کے لیے کچھ مشاق لوگوں کی خدمات بھی حاصل کی ہیں مگر ان میں شاید کوئی بھی تم جیسا سچا نشانے باز ہو۔ تم نے تو چلتی کار سے پیرزادہ تابش کی کھوپڑی ہی اڑا دی۔ تم اتنے اچھے نشانے باز .... اتنی جلدی بنے ہو کہ لوگ یقین نہیں کر سکتے لیکن میں جان سکتا ہوں کہ تم نے یہ مشق بڑے جنون اور جذبات کی شدت سے کی تھی۔ اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے تم اتنے ہی بے تاب تھے کہ اس عالم میں انسان کوئی بھی بڑے سے بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔''

انصر نے یہ ساری باتیں خاموشی سے سنیں۔

''تم میرا یہ کام کرو گے نا انصر؟'' مراد نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے سر! میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اب آپ کا غلام ہوں، آپ کا بندۂ بے دام ہوں۔ مجھے کبھی آپ کی کسی بات سے انکار نہیں ہوگا۔''

''شاباش انصر! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب تم گھر جاؤ۔ اپنی ماں اور بہن کو اس اپارٹمنٹ میں لے جاؤ۔ اس اپارٹمنٹ کے لیے ساز و سامان خریدو۔ میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دے رہا ہوں۔'' مراد نے اپنی بات ختم کر کے ایک موٹا سا لفافہ انصر کو دیا اور بولا۔ ''یہ اتنی رقم ہے کہ اپارٹمنٹ کا ساز و سامان خریدنے میں تمہیں کسی قسم کی دشواری نہیں ہو گی۔''

''سر!'' لفافہ لیتے ہوئے انصر کی آواز کانپ گئی۔ ''میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کی وجہ سے میری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آجائے گا۔''

''میں نے بھی تمہیں ملازم رکھتے وقت نہیں سوچا تھا کہ تم میرے لیے اتنا کچھ کر سکو گے۔''

مراد سے رخصت ہو کر انصر ایک ٹیکسی میں اپنے گھر روانہ ہوا۔ اس نے ابتدا میں بہت سی باتیں نہیں سوچی تھیں لیکن پیرزادہ کے قتل کی واردات کے دوران میں اور اس کے بعد پُرسکون ہو کر بہت کچھ سوچا تھا کہ مراد نے ایسے لوگ خاصی تعداد میں رکھے ہوئے ہیں جو اس قسم کے کاموں میں مہارت رکھتے ہیں۔ تاجی نے جس طرح پیرزادہ تابش کے قتل کی منصوبہ بندی کی تھی، وہ کسی عام آدمی سے ممکن ہی نہیں تھا۔

لاہور میں ہی انصر نے سوچا تھا کہ وہ اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے نہ صرف ایک قاتل بنا ہے بلکہ شاید ایک جرائم پیشہ گروہ کا رکن بن گیا ہے۔

مگر اب مراد سے باتیں کرنے کے بعد اسے خیال آرہا تھا کہ مراد نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ اپنے وطن کو بُرے لوگوں سے پاک کر سکے۔ غالباً مراد پر بھی یہی جنون طاری تھا کہ وہ اس قسم کے لوگوں سے انتقام لے سکے جو غریبوں سے ذلت آمیز برتاؤ کرتے ہیں اور جنہوں نے اس کے باپ کو بھی ذلیل کیا تھا۔

ایسے لوگوں کو ختم ہونا ہی چاہیے، انصر نے جذباتی انداز میں سوچا، ان لوگوں کی وجہ سے اس جیسے نہ جانے کتنے بھائیوں کی بہنوں کو بے آبرو کیا جاتا ہے یا وہ موقع مل جانے پر اپنی جان دے دیتی ہیں۔

انصر کی یہ سوچ اس لیے بھی تھی کہ ابھی وہ ایک ناپختہ ذہن کا لڑکا تھا، دوسرے اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات بھی ہوگی کہ اس طرح وہ ایک نہایت آسودہ زندگی کی طرف بڑھ آیا ہے اور آئندہ وہ اس سے بھی زیادہ آسودگی حاصل کر سکے گا۔

زیب النسا کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اب اس پس ماندہ بستی کے اس معمولی مکان سے ایک خوب صورت اپارٹمنٹ میں منتقل ہو جائے گی لیکن انصر نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس نے لاہور کے دورے میں مراد کے لیے اتنا بڑا کام کیا ہے جس سے اسے ڈیڑھ کروڑ روپے سے زیادہ کا فائدہ ہوا ہے۔ اسی لیے اس نے یہ سب کچھ اسے انعام میں دیا ہے۔

انصر نے تین دن اپارٹمنٹ کے ساز و سامان اور اس کی آرائش کی چیزوں کی خریداری میں گزارے۔ چوتھے دن وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا۔ اس کی چھوٹی بہن عارفہ اس گھر میں آکر بہت خوش ہوئی۔

اس دوران میں انصر موبائل فون پر مراد سے رابطے میں رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے کے بعد بھی اس نے مراد سے بات کی۔

''میں بہت تھک گیا ہوں سر!''

''دو دن آرام کرو۔'' مراد نے کہا۔ ''اور اب تم میرے گھر نہیں آؤ گے۔ اب تمہیں میرے دفتر میں کام کرنا ہے۔ میں تمہیں اپنے دفتر کے ایک شعبے کا انچارج بنا رہا ہوں۔ تمہاری تنخواہ اب پچاس ہزار روپے ماہانہ ہو گی۔''

''سر!'' انصر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ حیرت اور خوشی سے شل ہونے لگا ہو۔

''ہاں۔'' مراد نے مزید کہا۔ ''دفتر کی طرف سے تمہیں ایک کار بھی ملے گی۔ غالباً تمہیں ڈرائیونگ نہیں آتی ہو گی اس لیے جب تک تم ڈرائیونگ نہیں سیکھ لیتے اور تمہارا ڈرائیونگ لائسنس نہیں بن جاتا، ایک شوفر تمہارے ساتھ رہے گا۔ اسے تم رات نو بجے تک چھٹی دے دیا کرنا۔ دو دن بعد وہ شوفر وہی کار لے کر تمہیں لینے آئے گا جو اب تمہارے ہی استعمال میں رہے گی۔''

انصر اس وقت خوشی سے گنگ ہو کر رہ گیا۔

پچاس ہزار تنخواہ!

یہ گویا آسودگی کی طرف انصر کی ایک اور جست تھی۔

''اب تم صرف آرام کرو گی اماں!'' انصر نے اسی دن زیب النسا سے کہا۔ ''اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ایک دو ملازم رکھ سکیں......''

زیب النسا اپنے بیٹے کی اتنی جلدی ترقی سے بہت خوش تھی لیکن وہ ابھی اپنی جوان بیٹی صفیہ کے صدمے سے پوری طرح باہر نہیں آسکی تھی۔

دو دن بعد ایک کار اسے لینے آئی۔ وہ دفتر پہنچا۔ وہ دفتر جو کسی اسٹیٹ ایجنسی کا نہیں، کسی کمپنی کا تھا۔ اسے خود مراد نے سمجھایا کہ اسے کس شعبے میں کیا کام کرنا ہے۔

''آج تم صرف اپنا کام سمجھ لو۔'' مراد نے کہا۔ ''کل سے ڈیوٹی پر باقاعدہ آنا۔ اور ہاں! تمہاری والدہ بہت خوش ہیں نا!''

''بہت تو نہیں ہیں سر!'' انصر نے کچھ افسردگی سے کہا۔ ''دراصل ابھی وہ بجیا کو بھولی نہیں ہیں۔''

''آہستہ آہستہ سب زخم مندمل ہو جاتے ہیں انصر!''

''یہ تو ہے سر!'' انصر نے کہا۔ ''میں نے بھی اب بجیا کے لیے صبر کر لیا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ میں نے اپنی بہن کا انتقام لے لیا ہے۔''

''تم ایک دو ملازم رکھ لو۔'' مراد نے کہا۔ ''اب تمہاری ماں کو آرام ملنا چاہیے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے سر! لیکن گھر میں میرے علاوہ کوئی مرد نہیں ہے اس لیے ملازم نہیں بلکہ ملازمائیں رکھنا پڑیں گی۔''

''ایک ملازمہ اور بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا رکھ لو۔'' مراد نے مشورہ دیا۔ ''گھر کے کام کاج عورت کر لیا کرے گی۔ بازار سے سودا سلف یا باہر کے دوسرے کام وہ لڑکا کر لیا کرے گا۔ میں کسی سے کہہ کر اس کا بندوبست کروا دوں گا۔''

''آپ یہ کام بھی کروا دیں گے سر تو بہت اچھا ہو گا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہر وقت گھر میں رہنے والی ایک ملازمہ کس طرح مل سکے گی۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ۔ پرسوں تک اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ آئندہ بھی تم کسی مشکل سے دوچار ہو تو مجھے بتا دیا کرنا۔''

''شکریہ سر!''

پھر انصر کے دو گھنٹے اس کام کو سمجھنے میں گزرے جو اسے سونپا گیا تھا۔ انگریزی سے واقفیت کے باعث وہ کام انصر کے لیے کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

دو گھنٹے بعد وہ گھر چلا آیا۔

دو دن بعد ان کے گھر میں ایک ملازمہ اور ایک ملازم لڑکا آگیا۔ ملازمہ کوئی بیوہ عورت تھی جس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا لہٰذا وہ ہر وقت گھر میں رہ سکتی تھی، البتہ لڑکا شام کے بعد اپنے گھر چلا جاتا۔

انصر نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ چار بجے اس کی واپسی ہو جاتی تھی۔ رات کے وقت اسے ملی ہوئی کار اپارٹمنٹ کے احاطے میں پارک رہتی تھی۔ شوفر بھی نو بجے تک موجود رہتا اور پھر اپنے گھر چلا جاتا۔ انصر شام کو گھر آکر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ماں اور بہن کو لے کر کار میں کہیں نہ کہیں تفریحاً نکل جاتا۔

کچھ دن بعد عارفہ کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

ان حالات نے صدمے کے باوجود زیب النسا پر اچھا اثر ڈالا۔ پس ماندگی کی زندگی نے اسے خاصا مرجھا دیا تھا۔ اب اس کی صحت بھی بہتر ہونے لگی۔

انصر کو کبھی کبھی گیتی کی یاد آتی اور اسے دیکھنے کے لیے وہ مراد کے گھر جانے کا بہانہ ڈھونڈتا رہتا لیکن اسے موقع نہیں مل سکا۔

''اب تم رائفل وغیرہ چلانا بھی سیکھ لو۔'' ایک دن مراد نے اس سے کہا۔

''کیا اسی تہ خانے میں؟'' انصر خوش ہوا۔

''نہیں۔'' مراد کے جواب نے اسے مایوس کیا۔ ''وہ تہ خانہ خاصا کشادہ سہی لیکن وہاں بڑے ہتھیاروں کی مشق نہیں کی جا سکتی۔ تمہیں یہ مشق تاجی کرایا کرے گا۔ تم اس کے ساتھ میرے فارم ہاؤس چلے جایا کرنا۔ دو ایک دن میں تمہیں اسلحہ رکھنے کا لائسنس بھی دلوا دوں گا۔''

''سر!'' انصر نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ مجھ جیسے کم عمر لوگوں کو لائسنس نہیں ملتے۔''

مراد ہنسا۔ ''تم نہ جانے کس دنیا میں رہتے ہو الصر! یہاں... کم از کم ہمارے ملک میں سب کام قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔ میں تو تمہیں بھاری اسلحہ رکھنے کا لائسنس بھی دلوادوں گا۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ صرف دو دن بعد الصر کو لائسنس مل چکا تھا۔ اس کے اگلے دن سے الصر نے مراد کے فارم ہاؤس جانا شروع کر دیا۔

بہت کم عرصے میں اس نے کلاشنکوف جیسا ہتھیار استعمال کرنے کی مشق بھی کر لی۔

چھ ماہ بعد تو اس کے نشانے کا یہ عالم تھا کہ وہ اڑتی چڑیا کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔

''شاباش الصر!'' مراد نے کہا۔ ''اب وقت آگیا ہے کہ تم صرف میرے لیے ایک کام کرو گے۔ منصوبہ بندی مکمل ہے۔ تاجی تمہاری راہنمائی کرے گا۔ تم قانون کی زد پر نہیں آسکو گے۔''

''کسی کو قتل کرنا ہے سر؟''

''ہاں... ایک بہت کمینے آدمی کو۔''

☆☆☆

اور تیسرے دن اس آدمی کو قتل کر دیا گیا۔

پھر دو سال گزر گئے۔ ان دو سالوں میں الصر نے تین قتل اور کیے۔ اس دوران میں اس کی تنخواہ بڑھ کر اسی ہزار تک پہنچ گئی۔ اس نے اپنی زندگی کا پانچواں قتل ایک دور مار رائفل سے کیا جس پر خوش ہو کر مراد نے اس کی تنخواہ میں یک لخت بیس ہزار کا اضافہ کیا۔ اب اس کی تنخواہ ایک لاکھ روپے تھی۔ وہ ایک شان دار زندگی گزار رہا تھا۔ ڈرائیونگ اس نے سیکھ لی تھی، اب ڈرائیونگ خود کیا کرتا تھا۔ اس نے ہلکی ہلکی مونچھیں رکھ لی تھیں تاکہ اس کی عمر کچھ زیادہ معلوم ہو۔

اتنے قتل کرنے کے بعد اب وہ ذہنی طور پر اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ پانچویں قتل کی منصوبہ بندی اس نے خود کی لیکن اس منصوبہ بندی سے مراد کو آگاہ رکھا تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو مراد معاملات کو سنبھال سکے اور قانون کے ہاتھ الصر تک نہ پہنچ سکیں۔

تین ماہ اور گزرے تھے کہ مراد نے اسے ایک اور شخص کے قتل کی ذمے داری سونپی۔ وہ شخص اسلام آباد میں رہتا تھا۔ الصر نے اس کے مکمل کوائف مراد ہی سے حاصل کیے اور مراد نے اس کی تصاویر بھی الصر کو دکھا دیں۔

الصر نے منصوبہ بندی خود کی۔ اس منصوبے میں اسے دو آدمیوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ مراد نے اسے دو تجربہ کار آدمی سونپ دیے۔ الصر کی ہدایت پر ان میں سے ایک آدمی صبح کی فلائٹ سے اور دوسرا دوپہر کی فلائٹ سے اسلام آباد چلا گیا۔ ان دونوں کو الصر نے ہدایت کی تھی کہ وہ الگ الگ ہوٹل میں قیام کریں اور ایک دوسرے سے ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہ ملیں۔

دوسرے دن دوپہر کی فلائٹ سے الصر بھی اسلام آباد پہنچ گیا۔ اب اسلام آباد اس کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں رہی تھی۔ گزشتہ سوا دو سالوں میں وہ دو مرتبہ چھٹی لے کر اپنی ماں اور بہن کو راولپنڈی، لاہور اور اسلام آباد کی سیر کرانے لا چکا تھا۔ یہ دونوں مواقع وہ تھے جب اس کی چھوٹی بہن عارفہ کے اسکول کی سالانہ چھٹیاں تھیں۔

الصر نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ وہیں سے اس نے ان دونوں آدمیوں سے موبائل فون پر یکے بعد دیگرے بات چیت کی۔ انہیں کچھ ہدایات دیں، اس کے بعد وہ کرائے کی ایک کار میں اسلام آباد کی سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس سیر میں یہ مقصد بھی شامل تھا کہ وہ اس شخص کی قیام گاہ اور دفتر بھی دیکھ لے جسے قتل کرنے کے لیے وہ اسلام آباد آیا تھا۔ اس نے وہ راستے بھی دیکھے جہاں سے عموماً اس شخص کی آمد و رفت رہتی تھی۔

وہ رات کے نو بجے تک گھومتا رہا پھر ہوٹل لوٹ آیا۔ موبائل پر اس نے ان دونوں آدمیوں سے یکے بعد دیگرے پھر بات کی۔

''کل صبح دس بجے میری آخری ہدایات کا انتظار کرنا۔'' اس نے ان دونوں سے گفتگو کے خاتمے پر یہی جملہ کہا۔

رات کا کھانا اس نے اپنے کمرے میں ہی منگوا کر کھایا۔ اس کے بعد لیٹ گیا۔ کئی گھنٹے گھوم کر وہ خاصا تھک گیا تھا۔ پھر وہ اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس وقت کسی نے دروازے پر دستک دی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے خیال کے مطابق دستک دینے والا ویٹر ہو سکتا تھا۔ الصر کو اس پر بہت غصہ آیا۔ اس نے ویٹر کو ہدایت کر دی تھی کہ کھانے کے برتن وہ صبح آکر لے جائے اور جاتے جاتے دروازے پر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا کارڈ بھی لٹکا دے۔

''کیوں آئے ہو؟'' الصر نے غصے میں بلند آواز سے کہا۔

''دروازہ کھولو الصر... جلدی!'' باہر سے آواز آئی۔

الصر نہ صرف چونکا بلکہ حیران رہ گیا۔ وہ آواز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

☆☆☆

الصر کی ماں زیب النسا نے کھانے کے بعد عارفہ سے کہا۔ ''اب تم جا کر تھوڑی دیر پڑھ لو پھر سو جانا۔''

''میں بھیا کے کمرے میں جا کے پڑھوں گی اماں!'' عارفہ نے کہا۔

زیب النسا نے اسے گھور کر دیکھا اور کہا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھو گی۔''

''وہ تو دیکھوں گی اماں!'' عارفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے پڑھوں گی پھر ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو جاؤں گی۔ بھیا تو آج آئیں گے نہیں۔''

''ہاں، وہ تو پرسوں آئے گا۔''

''تو پھر میں کل بھی بھیا کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھوں گی۔'' عارفہ نے خوش ہو کر کہا۔

''اچھا جاؤ۔''

ایک ٹی وی زیب النسا کے کمرے میں بھی تھا لیکن اسے ٹی وی کے پروگرام اچھے ہی نہیں لگتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ خبریں سن لیتی تھی اسی لیے جب وہ سونے کے لیے لیٹتی تھی تو عارفہ کو ٹی وی نہیں کھولنے دیتی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ الصر نے اس کی خواب گاہ کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت اور آرام دہ بنایا تھا۔ زیب النسا اپنے مرحوم شوہر دانش نظام کی ایک تصویر ہمیشہ اپنے سرہانے رکھتی تھی۔ ابتدا میں اس نے اپنی بیٹی صفیہ کی تصویر بھی رکھنا چاہی لیکن الصر نے ضد کر کے اسے ایسا نہیں کرنے دیا اور بعد میں وہ تصویر کہیں چھپا ہی دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تصویر کی وجہ سے اس کی ماں کو ہر وقت اپنی بیٹی کا خیال آتا رہے۔

اپنے بستر پر بیٹھ کر اس نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''دانش! کاش آپ زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ آپ کے بیٹے نے کتنی کم عمری میں اتنی ترقی کر لی ہے۔ ہاں، البتہ آپ کو میری طرح اپنے دل پر یہ داغ نہیں لینا پڑا کہ آپ کی جوان بیٹی اغوا کر لی گئی۔''

وہ کبھی کبھی دانش کی تصویر سے باتیں کیا کرتی تھی۔ ابتدا میں صفیہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ جایا کرتی تھیں لیکن اب اسے صبر آچکا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتی تھی کہ کاش صفیہ مر ہی گئی ہو۔

وہ بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی دیر میں اسے نیند آ گئی پھر اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب اس نے کسی قسم کی آواز سنی۔

''جاگ گئیں زیب النسا!'' اس نے آواز سنی۔

اس نے آواز کی سمت دیکھا اور نہ صرف چونکی بلکہ جلدی سے بستر سے اٹھ گئی۔

''تم... نثار؟'' اس کے منہ سے نکلا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔ ''تم میرے کمرے میں کیسے آگئے؟''

''کمرے میں تو دروازے ہی سے آیا ہوں اور تمہاری پہلی بات کے جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے اپنا نام بدل لیا ہے۔ اب تو میرے شناختی کارڈ پر بھی میرا نیا نام مراد لکھا ہے۔'' مسکرا کر جواب دیا گیا۔

''مراد؟'' زیب النسا اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر بری طرح چکرا گئی۔

''ہاں، مراد۔'' مراد نے جواب دیا۔ ''تمہارا بیٹا میری ہی کمپنی میں ملازم ہے۔ میں نے ہی اسے اسلام آباد بھیجا ہے۔''

''تمہیں میرے گھر میں... اور میرے کمرے میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' زیب النسا نے غصے سے کہا اور پھر بلند آواز سے پکارا۔ ''سلیمن!''

مراد ہنسا۔ ''اس نے تمہاری آواز سن کر اپنے کان بند کر لیے ہوں گے۔ الصر اسے جتنی تنخواہ دیتا ہے اس سے زیادہ تو میں ہی اسے دیتا ہوں۔ میں نے ہی اسے تمہارے گھر میں ملازم رکھوایا تھا۔ وہ میرا حکم مانے گی، نہ کہ تمہارا۔ ذرا سوچو! میں کوئی روح تو نہیں ہوں کہ بند دروازے سے اندر آجاؤں۔ میرے لیے دروازہ سلیمن ہی نے کھولا ہے۔ اب وہ الصر کے کمرے میں عارفہ کے پاس ہو گی تاکہ اگر وہ کسی وجہ سے جاگ جائے تو وہ اسے سنبھال سکے۔''

''کیوں آئے ہو؟'' زیب النسا اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''دو باتیں ہیں...'' مراد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میں تمہیں ماضی یاد دلانے آیا ہوں۔''

''میں وہ سب کچھ بھول چکی ہوں۔''

''بھولی تو نہیں ہو گی لیکن اگر بھول گئی ہو تو میں نے کہا نا کہ میں تمہیں ماضی یاد دلانے آیا ہوں۔''

''نکل جاؤ یہاں سے۔'' زیب النسا تیزی سے دروازے کی طرف گئی۔ وہ دروازہ کھول کر اسے اپنے کمرے سے نکال دینا چاہتی تھی لیکن وہ دروازہ نہیں کھول سکی۔

''وہ باہر سے مقفل ہے۔'' مراد نے ہنس کر کہا۔ وہ زیب النسا کے بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ ''سلیمن نے میری ہدایت پر عمل کیا ہے۔''

زیب النسا کا چہرہ فق پڑ گیا۔ ''مقصد؟'' وہ مراد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز کی سختی ختم ہو گئی تھی۔

''مقصد تمہیں بتا چکا ہوں۔ ماضی میرے دل کا ایک ایسا زخم ہے کہ اب بھی مندمل نہیں ہو سکا زیب النسا۔''

''بھابی کہو مجھے۔'' زیب النسا نے ڈپٹ کر کہنا چاہا لیکن اس کے برخلاف اس کی آواز لرز گئی۔

مراد پھر ہنسا۔ ''تم بھائی صاحب کے کان بھرا کرتی تھیں کہ میرا میل جول اچھے لوگوں سے نہیں ہے اور وہ بُری صحبت مجھے بگاڑ دے گی۔ تمہارے کہنے پر بھائی صاحب مجھ پر بگڑا کرتے تھے اور میں ان سے کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں سے میل جول رکھ کر میں کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہوں کہ جیب میں چار پیسے آئیں اور ہمیں غربت کی زندگی نہ گزارنا پڑے۔ اس پر تم لقمہ دیا کرتیں کہ اس طرح میں بُرے راستے پر نکل جانا چاہتا ہوں لیکن میرا موٴقف یہ تھا کہ آج کے دور میں انسان کو خوش حال زندگی گزارنے کے لیے کسی کام سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر تم نے کہا تھا کہ تمہیں غربت زیادہ عزیز ہے، بہ نسبت بُری یا غلط راہوں پر چلنے کے۔ یاد ہے نا؟''

''یقیناً یاد ہے اور میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

''لیکن میرا جواب بھی یاد ہے نا کہ غربت ہی انسان کو غلط راہوں پر چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔''

''اور میں نے یہ بات نہیں مانی تھی۔''

''لیکن اب مان لو گی۔'' مراد نے کہا۔ ''مجھے بتا سکتی ہو کہ تم آج جو آسودہ زندگی گزار رہی ہو، وہ کس کی وجہ سے گزار رہی ہو؟''

''میرے بیٹے میں اتنی صلاحیت ہے کہ تم اسے اتنی تنخواہ دینے پر مجبور ہوئے ہو گے۔''

''تم جانتی ہو تمہارا بیٹا میرے لیے کیا کام کرتا ہے؟''

''وہ تمہاری کمپنی میں کوئی اچھا ہی کام کرتا ہو گا جو تم اسے اتنی تنخواہ دیتے ہو لیکن تم نے وہ کمپنی کوئی اچھا کام کر کے نہیں بنائی ہو گی۔''

''میں تمہاری بات رد نہیں کروں گا۔'' مراد نے بستر پر بیٹھے بیٹھے اطمینان سے کہا۔ ''لیکن تمہارے بیٹے کو میں نے اپنی کمپنی میں اس لیے رکھا تھا کہ اس کی آسودہ حالی کا ایک جواز لوگوں کے سامنے رہے۔ میں النصر سے جو کام لیتا ہوں، وہ کچھ اور ہے۔''

''وہ کیا کام ہے؟'' زیب النسا کچھ پریشان ہوئی۔

''پہلے میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا غربت ہی کی وجہ سے میرے جال میں کیسے پھنسا۔'' مراد نے کہا اور پھر اس وقت سے بتانا شروع کیا جب اس نے کھنگم کے ذریعے النصر سے کاروں پر پتھر پھنکوائے تھے۔ وہ بولا۔ ''اس طرح میں اسے پیسے کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا تھا، جب اسے اہمیت کا احساس ہونے لگا تو میں نے اسے اپنے گھر میں ملازم رکھ لیا۔'' مراد نے اس کے بعد کی باتیں بتانا شروع کیں۔ وہ بڑے مزے لے لے کر سب کچھ بیان کر رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں نے اسے گولی چلانا کیوں سکھائی تھی؟''

زیب النسا کچھ نہیں بولی۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑی کھڑی مراد کی باتیں سنے جا رہی تھی۔

وہ خاموش رہی تو مراد بولا۔ ''میں اسے قاتل بنانا چاہتا تھا اور اسے بنا چکا ہوں۔''

''جھوٹ ہے یہ۔'' زیب النسا چیخ پڑی۔ ''میرا بیٹا قاتل نہیں بن سکتا۔''

''وہ بن چکا ہے۔ اس کے لیے مجھے پہلی چال یہ چلنا پڑی کہ میں نے صفیہ کو اغوا کروایا۔''

''تم نے!'' زیب النسا کی آواز لرز گئی۔ ''تم نے!''

''ہاں، میں نے۔''

''کہاں ہے میری بیٹی؟'' زیب النسا کی سانس چڑھنے لگی۔ ''اور تمہیں بالکل شرم نہیں آئی ایسا کرتے ہوئے؟ وہ تمہاری بھتیجی...''

''مجھے یاد ہے کہ وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔'' مراد نے زیب النسا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اور میں نے اسے اغوا کروانے کے علاوہ اس کے ساتھ صرف یہ زیادتی کی ہے کہ اسے ایک جگہ قید رکھا ہے۔ قید میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جاتی۔ اس کے کھانے پینے کا ہر طرح خیال رکھا جاتا ہے۔''

''مجھے میری بیٹی واپس دے دو نثار!'' زیب النسا کا انداز اس مرتبہ ایسا تھا جیسے وہ التجا کر رہی ہو۔

''مل جائے گی وہ تمہیں۔'' مراد نے کہا۔ ''لیکن پہلے کچھ اور باتیں کر لو۔ میں نے النصر کو کسی طرح یقین دلا دیا کہ اس کی بہن کو اغوا کروانے والا لاہور کا ایک شخص پیرزادہ تابش ہے۔''

مراد نے بعد کے واقعات بیان کرنا شروع کیے۔ یہ کہانی اس نے پیرزادہ تابش کے قتل پر ختم کی پھر بولا۔ ''اس کے بعد سے اب تک میں النصر سے چار قتل اور کروا چکا ہوں۔''

''جھوٹ... جھوٹ ہے یہ سب کچھ۔'' زیب النسا نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ثبوت ہے۔'' مراد نے کہا۔ ''پانچواں قتل النصر نے اپنی منصوبہ بندی سے کیا تھا لیکن اس سے پہلے کے قتل میری منصوبہ بندی سے ہوئے تھے۔ اس میں، میں نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ النصر کی اس وقت کی ویڈیو ضرور بنائی جائے جب وہ کسی کو قتل کرے۔ اس نے جس کار سے پیرزادہ تابش پر گولی چلائی تھی، وہ کار اس واردات سے ذرا ہی دیر پہلے کسی سے چھینی گئی تھی۔ میرا آدمی تاجی اور النصر اگلی سیٹوں پر تھے لیکن پیچھے میرا ایک اور آدمی بھی چھپا ہوا تھا۔ اس کے پاس ویڈیو کیمرا تھا اس نے بڑی خوب صورت فوٹو گرافی کی تھی۔ اس ویڈیو میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ النصر کی چلائی گئی گولی پیرزادہ تابش کے سر میں پیوست ہوئی تھی۔''

زیب النسا کا چہرہ اپنا رنگ کھونے لگا۔ غالباً وہ محسوس کر رہی تھی کہ مراد اس سے جھوٹ نہیں بول رہا۔

''اور۔'' مراد نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس کے بعد جو تین قتل کیے گئے، ان کی ویڈیو بھی بنائی گئی۔ اگر تم چاہو گی تو میں کسی وقت تمہیں وہ ویڈیو بھی دکھا دوں گا۔ فی الحال میں اس ویڈیو کی کچھ تصاویر لے آیا ہوں۔ یہ دیکھ لو۔''

مراد نے ایک بڑا سا لفافہ زیب النسا کی طرف اچھال دیا۔ وہ لفافہ زیب النسا کے قدموں میں جا کر گرا۔ وہ تیزی سے جھکی۔ لفافہ اٹھا کر اس نے اس میں سے تصویریں نکالیں، یہ خاصے بڑے سائز کی ایک درجن تصویریں تھیں۔ وہ دیکھتے ہوئے زیب النسا کے دونوں ہاتھ کانپنے لگے اور پھر وہ تصویریں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ادھر اُدھر بکھر گئیں۔

''دیکھا تم نے؟'' مراد مسکراتا رہا۔ ''غربت بھی انسان کو لوگوں کے قتل تک لے جا سکتی ہے۔ آج تم کو شکست ہو گئی ہے زیب النسا! درست وہی ثابت ہوا جو میں نے کہا تھا اور یہ شکست تو تم دو سال پہلے کھا چکی تھیں لیکن تمہیں یہ سب کچھ بتانے کے لیے میں نے دو سال انتظار ایک خاص وجہ سے کیا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ تمہاری شکایت پر بھائی صاحب نے مجھے گھر سے نکالا تھا۔''

''تم نے حرکت ہی ایسی گھٹیا کی تھی۔'' زیب النسا نے کہا لیکن اس کے تصور میں وہ تصاویر لہراتی رہیں جو اس نے اس وقت دیکھی تھیں۔

''اگر وہ حرکت گھٹیا تھی تو اس کی ذمے دار بھی تم تھیں۔ جب بھائی صاحب تمہیں بیاہ کر لائے تھے تو تم بلا کی خوب صورت تھیں۔ ایسے میں اگر میرے قدم نہ بہکتے تو یہ بڑی غیر فطری بات ہوتی زیب النسا! لیکن میں ایک شام بھائی صاحب کی عدم موجودگی میں بھی تمہیں اپنے قابو میں نہیں لا سکا۔ میں نے تمہیں دبوچ لیا تھا لیکن تم میرے ہاتھ پر کاٹ کر کمرے سے بھاگ نکلی تھیں اور ایک پڑوسن کے گھر چلی گئی تھیں۔ مجھے یہ تو یقین ہے کہ تم نے پڑوسن کو کچھ نہیں بتایا ہو گا لیکن جب بھائی صاحب گھر آئے تو تم بھی پڑوسن کے گھر سے آ گئی تھیں۔ تم نے بھائی صاحب کو سب کچھ بتا دیا تھا اور انہوں نے غصے میں آ کر مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔'' مراد ہنسا۔ ''لیکن اس کے بعد میں نے اپنی زندگی بنائی۔ میں ایسے راستوں پر چلا کہ مجھ پر دولت کی بارش ہونے لگی۔ اس بارش کے بعد بہت سی عورتیں میری آغوش میں آئیں لیکن میں تمہیں نہیں بھولا۔''

ماں

صبح سے آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ اسکول میں چھٹی ہوئی تو اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بچہ بارش میں بھیگتا، بستہ سنبھالتا ہوا گھر پہنچا تو اسے اس حال میں دیکھ کر بڑا بھائی برہمی سے بولا ''کیا حلیہ بنا لیا ہے ...... راستے سے کوئی پلاسٹک شیٹ یا بوری لے کر سر پر نہیں اوڑھ سکتے تھے؟''

بڑے بیٹے کی آواز سن کر بیمار باپ بھی اپنے کمرے سے نکل آیا اور قدرے ملامت کے ساتھ بچے کو تادیب کی ''صبح سے گھٹا چھائی ہوئی تھی تو تمہیں چھتری لے کر جانا چاہیے تھا۔ کپڑے اور کتابیں تو نہ بھیگتیں!''

بہن بولی ''کچھ دیر اسکول میں ہی رک کر بارش تھمنے کا انتظار کر لیتے!''

ماں کو کپڑوں اور کتابوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے لختِ جگر کو بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اپنے دوپٹے سے اس کے چہرے اور بالوں سے پانی صاف کرتے ہوئے بڑبڑائی ''بھگو دیا میرے لال کو...... یہ نگوڑی بارش ذرا سی دیر بعد شروع ہوتی تو کیا بگڑ جاتا ...میرا بچہ بھیگنے سے تو بچ جاتا''۔

اسلام آباد سے خرم کی پسند

''شرم کر نثار!'' زیب النسا کو پھر غصہ آنے لگا۔ ''میں رشتے ہی میں نہیں، عمر میں بھی تجھ سے دو سال بڑی ہوں۔''

''چاہت عمر نہیں دیکھتی زیب النسا!'' مراد نے کہا۔ ''تمہیں حاصل کرنے کی خواہش مجھے ہمیشہ رہی۔ جب صفیہ کے اغوا کے بعد تم اسپتال میں تھیں تو میں وہاں آیا تھا۔ تم مجھے نہیں دیکھ سکی تھیں کیونکہ تمہیں تو اپنا ہی ہوش نہیں تھا لیکن میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ درماندگی نے تمہاری جوانی کو بہت گہنا دیا تھا۔ تمہارے چہرے پر ہڈیاں ابھرنے لگی تھیں اسی لیے میں نے دو سال انتظار کیا۔ آسودگی ملی تو تمہاری صحت پھر بہتر ہوتی چلی گئی۔ اب تمہیں دیکھ کر کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا کہ تم اٹھارہ سال کے ایک بیٹے اور بیس سال کی ایک بیٹی کی ماں ہو... تمہارا جسم پھر گداز ہو گیا ہے۔ نقش و نگار تو بدلتے بھی نہیں ہیں، اگر آسودگی کی زندگی میسر آجائے۔ بس اب اتنا فرق پڑا ہے کہ ان خوب صورت نقش و نگار میں پختگی آگئی ہے جو اس وقت مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ چوالیس سال کی خوش حال عورت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔'' مراد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ''آؤ... میری آغوش میں آجاؤ۔''

''نثار!'' زیب النسا کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

مراد بڑے سکون سے اپنے جوتے اتارنے لگا۔ جوتے اتار کر اس نے اپنا کوٹ بھی اتار کر ایک طرف ڈال دیا اور بستر پر لیٹ کر مسکراتا ہوا زیب النسا کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کمرا باہر سے بند ہے زیب النسا!'' وہ بولا۔ ''تم میرا ہاتھ کاٹ کر کہیں بھاگ نہیں سکو گی۔ مجھے اچھا بھی نہیں لگے گا کہ میں تمہارے ساتھ زبردستی کروں۔ میری خواہش ہے کہ تم اپنی خوشی سے میری آغوش میں آجاؤ اور تمہیں ایسا تو کرنا پڑے گا۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا نثار!'' زیب النسا کی آواز پھر کانپ گئی۔

''یہ ہوگا۔'' مراد یکایک سنجیدہ ہوا۔ ''ورنہ تمہیں دو صدمے برداشت کرنا پڑیں گے۔ ایک صدمے سے تو تم گزر چکی ہو لیکن اب جبکہ تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری بیٹی زندہ ہے تو اب تمہیں پھر اس کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اب تک اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے، لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر... میں فوری طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کا کیا حشر کرواؤں گا... دوسرے یہ کہ میں تمہارے بیٹے کو بھی پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا ہوں۔ یہ ڈیڈیوز تمہارے بیٹے کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں اور یقین کرو، میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمہارا بیٹا عدالت میں میرے خلاف جو کچھ کہے گا، اسے ثابت نہیں کر سکے گا۔ میں اب بہت بارسوخ ہوں زیب النسا! بہت بڑی بڑی ہستیاں ایسی ہیں جو مجھ پر کوئی آنچ آتے نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کے بہت سے مفادات مجھ سے وابستہ ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ حکومت کے بڑے بڑے لوگ کیا کیا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں ان کے ان کھیلوں کا حصہ رہا ہوں۔ کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن اگر تم نے میری خواہش پوری نہیں کی تو سوچ لو کہ تمہارے بیٹے اور تمہاری بیٹی کا کیا انجام ہوگا؟''

''نہیں نثار!'' زیب النسا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''ایسا مت کرنا۔ تم ان کے چچا ہو نثار!'' زیب النسا کا لہجہ بھی بدل گیا۔

''ہاں۔'' مراد مسکرایا۔ ''میں ان کا چچا ہوں لیکن تم تو ماں ہو ان کی۔ اگر تم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں تو مجھے ان کا خیال کیوں آئے گا۔''

''نہیں نثار!'' زیب النسا کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔ ''میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔''

''تو پھر ان کا انجام جاننے کے لیے تیار رہنا۔'' مراد نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر اپنے جوتے پہننے لگا۔

''نہیں نثار، نہیں!'' زیب النسا گڑگڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور مراد کے قدموں میں گر پڑی۔ ''میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا، اس کے لیے مجھے معاف کر دو۔''

یہ ایک ماں کی بے بسی تھی جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کسی بُرے انجام تک جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ نثار کے پیر چومتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔''

مراد نے بڑے اطمینان سے جھک کر اسے اس کے بازوؤں سے پکڑا اور کھڑا کر دیا۔ وہ خود بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''نہیں زیب النسا!'' وہ بولا۔ ''ان آنکھوں میں آنسو مجھے اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔'' اس نے اپنے ہونٹ آگے بڑھائے اور آنسوؤں کو پی گیا لیکن آنسو تو اب بڑی شدت سے بہنے لگے تھے۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی پڑی جا رہی تھی لیکن جیسے ہی مراد نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھائے، وہ تڑپ کر اس کی آغوش سے نکل گئی۔

''تم یہاں سے بھاگ نہیں سکو گی زیب النسا!'' مراد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

زیب النسا کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی اس طرح کانپ رہی تھی جیسے کوئی چڑیا کسی باز کے پنجے سے چھوٹ جانے کے باوجود خوف زدہ ہو۔

☆☆☆

گیتی کی کار جس وقت کراچی ائرپورٹ سے روانہ ہوئی، اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ اس وقت ڈرائیونگ سیٹ

پر انصر تھا۔ گیتی اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''گیتی!'' انصر لرزتی سی آواز میں بولا۔ ''طیارے میں تم نے مجھے اس لیے تفصیل نہیں بتائی کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ سن لیں گے اور اسلام آباد کے ہوٹل میں بھی مختصراً ہی بتایا تھا کہ مراد آج رات کیا ارادہ رکھتا ہے۔ جب ہم ہوٹل سے چلے تھے تو تم ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے خاموش رہی تھیں لیکن اب تو تم مجھے بتا سکتی ہو۔''

''تم کار بہت تیز چلا رہے ہو انصر!'' گیتی بولی۔ ''ایکسیڈنٹ ہو سکتا ہے۔''

''ہونے والے جس حادثے کی خبر تم نے مجھے دی ہے، کار ایکسیڈنٹ اس سے بڑا حادثہ نہیں ہو سکتا۔ میں کسی اور ایکسیڈنٹ سے اتنا خوف زدہ نہیں ہو سکتا لیکن تمہیں شاید ڈر ہوگا کہ ایکسیڈنٹ میں میرے ساتھ تم بھی مر سکتی ہو۔''

''نہیں انصر!'' گیتی نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''اگر مرنے کے بعد کوئی خوش ہو سکتا ہے تو مجھے بھی خوشی ہوگی کہ میں تمہارے ساتھ مری۔ تم نہیں جانتے انصر کہ میں تو تمہیں اسکول ہی کے زمانے سے چاہتی رہی ہوں۔ بس میرے حالات ایسے تھے کہ میں تم پر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکی۔ ہاں جب تم بنگلے میں آگئے تب میں نے یقیناً چاہا کہ تم وہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں تباہی کی طرف بڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔''

اگر عام حالات ہوتے تو گیتی کے جذبات جان کر انصر چونک جاتا مگر اس وقت اس کے دماغ میں صرف ایک بات تھی کہ وہ بروقت پہنچ کر اپنی ماں کو بے آبرو ہونے سے بچا لے۔

گیتی نے اسے بتایا۔ مراد ایک بہت بڑا گینگ چلا رہا ہے اور اس کی پشت پناہی کوئی مغربی طاقت کر رہی تھی۔ مراد کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ ملک بھر میں انتشار پھیلاتا رہے۔ ٹارگٹ کلنگ میں بھی اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کا ہاتھ تھا۔ حکومت میں بھی اس مغربی طاقت کے کچھ گرگے یا تو خود موجود تھے یا حکومت کے لوگوں سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا۔

اپنے گروہ سے کام کروانے کے ساتھ ساتھ وہ نوجوانوں کو بھی جرائم کے راستے پر دھکیل رہا تھا۔ پہلے وہ کسی نوجوان کو اپنے گھر میں ملازم رکھتا اور پھر کسی نہ کسی منصوبہ بندی سے انہیں قتل و غارت گری کی راہ پر لے آتا۔ گیتی کے علم میں انصر ایسا تیسرا لڑکا تھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اب میں تمہیں اپنے بارے میں بھی بتا دوں۔ جسے لوگ میرا چچا سمجھتے ہیں اور جو خود بھی دوسروں سے یہی کہتا ہے، وہ دراصل میرا باپ ہے اور میں اس کی ناجائز اولاد ہوں۔ جن کو تم میڈم ریٹا کہتے ہو،

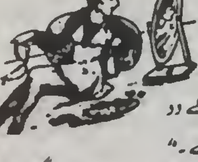

نوبیاہتا لڑکی اپنی سہیلی کے کندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔ "شادی کر کے میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ ہنی مون سے واپس آنے کے بعد آج تک ہمزی نے مجھ سے پیار کے دو لفظ تک نہیں کہے۔"

سہیلی کو یہ سُن کر دلی صدمہ پہنچا۔ کہنے لگی "ایسے ظالم شخص سے جتنی جلدی ہو سکے، طلاق لے لو۔"

نوبیاہتا لڑکی کے منہ سے گہری آہ نکل گئی۔ "افسوس تو یہی ہے کہ میں اس سے طلاق نہیں لے سکتی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ہمزی میرا شوہر نہیں ہے۔"

مجھے شبہ ہے کہ وہی میری ماں ہیں۔''

یہ انکشاف بہت ہی زیادہ چونکا دینے والا تھا۔

گیتی مراد کی ناجائز اولاد تھی۔ مراد نے ریٹا کو کہیں دیکھا تھا تو وہ اسے اچھی لگی۔ اس نے اسے اغوا کر کے اپنے پاس قید کر لیا اور وہ اس کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی۔ اس جبر کے باعث ہی اس نے اپنا دماغی توازن کھو دیا تھا۔ اسی حالت میں اس نے مراد کی ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام گیتی رکھا گیا۔

دماغی توازن کھو دینے کے بعد ریٹا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ مراد کی غلام ہو۔ وہ اس کے اشارے پر روبوٹ کی طرح متحرک رہتی تھی۔ دماغی توازن کھو دینے کے بعد اس نے کبھی چاہا نہیں کہ اس بنگلے سے باہر نکلے۔ وہ بس بنگلے میں گھومتی رہتی اور جب تھک جاتی تو اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیتی۔ مراد نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ریٹا اس کے لیے بے ضرر ہو چکی ہے اس لیے وہ ریٹا کے سامنے بھی موبائل پر اپنے مغربی آقاؤں یا اپنے گروہ کے لوگوں سے بات کر لیا کرتا تھا۔ کمپیوٹر پر ریٹا کے سامنے ہی وہ ''میل'' بھی دیکھ لیا کرتا تھا اس لیے ریٹا مراد کے بارے میں سب کچھ جان گئی تھی۔ اسے ایک خبط تھا کہ رات کو وہ اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی جس کا علم مراد کو نہیں تھا۔ گیتی دس سال کی عمر تک خاصی شرارتی تھی اس لیے کبھی کبھی ریٹا کے کمرے میں جھانک لیا کرتی تھی۔ متجسس ہو کر ایک دن وہ چپکے سے ریٹا کی گزشتہ سال کی

ڈائری چرا کر اپنے بیڈروم میں لے گئی۔۔ ڈائری پڑھنے سے اس پر عجیب عجیب انکشافات ہوئے تھے اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے ریٹا کی ہر سال کی ڈائریاں چرا چرا کر پڑھنا شروع کر دیں۔ کیونکہ ریٹا مراد کی تمام ''کارگزاریوں'' سے واقف تھی اس لیے وہ ڈائری میں وہ سب کچھ بھی لکھا کرتی تھی۔ انہی ڈائریوں کے اندراجات سے گیتی نے مراد کے بارے میں سب کچھ جانا اور بعض اندراجات پڑھ لینے کی وجہ سے دہشت زدہ بھی ہوگئی۔

ریٹا ڈائری میں مراد کو اپنا ''آقا'' لکھا کرتی تھی۔ گیتی نے اس کی کسی ڈائری میں ایک جگہ پڑھا تھا۔ ''آقا نے مجھے حکم دیا کہ گیتی کو کبھی کسی ملازم سے بات نہ کرنے دیا کروں۔ آقا نے خود بھی گیتی کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ وہ کسی ملازم سے کبھی بات نہ کیا کرے۔ اگر میں نے کبھی گیتی کو کسی ملازم سے بات کرتے دیکھ لیا تو میرا فرض ہوگا کہ میں آقا کو آگاہ کر دوں۔ میں نے کبھی آقا کو موبائل پر کسی سے باتیں کرتے سنا ہے، اس سے مجھے علم ہوا ہے کہ گیتی آقا کی ناجائز بیٹی ہے۔ اس کی ماں کا نام بھی ریٹا تھا۔ شاید آقا نے میرا نام اسی لڑکی کی یاد میں رکھا ہے۔ شاید آقا کو اس سے بہت زیادہ محبت ہوگی۔''

گیتی نے اس قسم کے کئی اندراجات پڑھے تھے جن سے اس کی دہشت بڑھتی چلی گئی... اس دہشت کے تاثرات اس کے چہرے پر ہمہ وقت رہنے لگے۔ صرف مراد کے سامنے وہ خود کو خوش و خرم ظاہر کیا کرتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ کسی کو بھی یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اسے ڈر لگتا۔ اس نے ریٹا کا یہ اندراج پڑھا تھا۔

''آقا اپنے اصولوں کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ اگر کبھی گیتی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تو وہ گیتی کو مار ڈالیں گے۔''

یہ تحریر گیتی کی دہشت کا سب سے بڑا سبب تھی۔

''کل میں نے اتفاق سے انہیں موبائل پر کسی سے کہتے سن لیا کہ وہ تمہیں آج اسلام آباد بھیج رہے ہیں جس کے بعد ان کی برسوں پرانی ایک خواہش پوری ہو جائے گی۔''

گیتی نے اس سے زیادہ کچھ نہیں سنا لیکن وہ بے چین ہوگئی کیونکہ اس بات کا تعلق انصر سے تھا جس کو وہ اسکول کے زمانے سے چاہتی رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو، اسے ریٹا کی اس رات کی ڈائری ضرور پڑھنا چاہیے۔ اسے خیال تھا کہ اگر اس بارے میں ریٹا کو کچھ معلوم ہوا تو وہ ڈائری میں ضرور لکھے گی۔ اس نے خطرہ مول لے کر ریٹا کی ڈائری پڑھ لی۔

''وہ سب کچھ پڑھ کر میری جان نکل گئی تھی۔'' گیتی نے کہا۔

ریٹا نے لکھا تھا۔ ''کل انصر اسلام آباد چلا جائے گا۔ آقا دو سال انتظار کرنے کے بعد اپنی برسوں پرانی خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں۔ آقا کو اپنے بڑے بھائی کی بیوی بہت پسند تھی جسے وہ حاصل نہیں کر سکے تھے۔ ان کے بھائی نے ان کی نیت جاننے کے بعد انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ اب کل رات آقا اس کے فلیٹ پر جا کر اپنی خواہش ضرور پوری کریں گے کیونکہ اس عورت کا بیٹا گھر پر نہیں ہوگا۔''

گیتی نے کہا۔ ''یہ پڑھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی تائی کو بے آبرو ہونے سے ضرور بچاؤں گی۔ میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تم سے کس طرح رابطہ کروں۔ مجھے نہ تو تمہارا گھر معلوم تھا، نہ موبائل نمبر...... رات بڑی بے چینی میں گزری۔ صبح مجھے کالج بھی جانا پڑا کیونکہ مجھے شوفر لے جاتا ہے۔ میں مسلسل سوچتی رہی کہ تمہارا پتا کیسے لگاؤں۔ اسکول سے گھر لوٹنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اسلام آباد پہنچ کر تمہیں تلاش کروں۔ میں نے ڈیڈی پر ظاہر کیا کہ گزشتہ رات نہ جانے مجھے کیوں نیند نہیں آسکی تھی اس لیے میں شام کو جلدی کھانا کھا کر سو جاؤں گی۔ میں نے فون کر کے اسلام آباد جانے والی فلائٹس کے بارے میں معلوم کر لیا تھا اور فون پر ہی ایک فلائٹ میں اپنا ریزرویشن کرانے کے ساتھ ساتھ اسلام آباد سے کراچی آنے والی ساڑھے دس بجے کی فلائٹ میں بھی دو سیٹیں ریزرو کروالی تھیں۔ دراصل اس ائرلائن کے ایک آفیسر سے میرے ناجائز باپ کا کچھ تعلق ہے اس لیے میرا یہ کام آسانی سے ہو گیا۔ مجھے بس یہ ڈر لگا رہا کہ وہ شخص یہ بات میرے باپ کو نہ بتا دے۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ کراچی سے میری روانگی تک میرا یہ راز نہیں کھلا تھا۔ میں چوری چھپے اپنے کمرے ہی سے نہیں، اپنے بنگلے سے بھی نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ میں ایک ٹیکسی کر کے اپنے کالج کی ایک دوست کے گھر گئی اور اس سے اس وعدے پر یہ کار لے لی کہ میں یہ اسے رات گئے کسی وقت واپس کر دوں گی۔ سال بھر پہلے میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اس لیے خود ہی ائرپورٹ پہنچی۔ فلائٹ نے مجھے ساڑھے آٹھ بجے اسلام آباد پہنچا دیا تھا۔ یہ کار میں نے یہیں ائرپورٹ پر چھوڑ دی تھی۔ اسلام آباد پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی کی اور ہوٹلوں کی خاک چھاننا شروع کی۔ یہ بات یقینی تھی کہ تم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوگے، وہاں تم نے اپنا نام ضرور لکھوایا ہوگا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا کیونکہ مجھے تمہارے ساتھ واپسی کے لیے ساڑھے دس بجے کی فلائٹ بھی پکڑنا تھی۔ اسے خوش قسمتی کہہ لو کہ مجھے دو ہوٹلوں کے بعد تیسرے ہوٹل کے ریسیپشن سے معلوم ہو گیا کہ تم یہیں مقیم ہو۔ انصر کسی اور کا نام بھی ہو سکتا تھا مگر تم آج ہی اس ہوٹل میں پہنچے تھے اس لیے میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ تم ہی ہوگے۔ میرے دل کی یہ گواہی درست بھی ثابت ہوئی۔''

انصر طوفانی انداز میں کار دوڑاتا رہا۔ اس نے گیتی کی ساری باتیں سنی تھیں لیکن اس کے دماغ میں ان باتوں کا ایک ہلکا سا خاکہ ہی رہ گیا کیونکہ اس کا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ اسے اپنی ماں کی عزت بچانا تھی۔

گیتی کی باتیں ختم ہونے کے پانچ منٹ بعد اس نے کار اس عمارت کے احاطے میں روکی جہاں اس کا اپارٹمنٹ تھا۔

لفٹ کے ذریعے وہ دونوں اوپر پہنچے۔ انصر ہوا کی طرح اڑ رہا تھا۔ گیتی اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپنے لگی۔

انصر اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر مراد سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو بڑی تیزی سے باہر نکلا تھا۔ وہ انصر کو دیکھ کر چونکا۔ پھر اس کی نظر گیتی پر بھی گئی۔ گیتی نے خوف زدہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔

''اندر چلو۔'' انصر نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر مراد کے سینے سے لگا دیا۔

سوا دو سال کے عرصے میں انصر نے پہلی مرتبہ مراد کا رنگ فق پڑتے دیکھا۔ اسے انصر کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی تھی۔

رات اتنی گزر چکی تھی کہ اس فلور کا کوئی مکین یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی سلیمن بھی نظر آئی جو شاید اس لیے دہشت زدہ ہوگئی کہ انصر کے ریوالور کی نال اس کے آقا کے سینے پر تھی۔

''تم نے میری ماں کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی مراد؟'' انصر نے غصے سے پوچھا۔

''نہیں۔'' مراد تقریباً ہکلا گیا۔

اور مراد کا یہ جواب غلط نہیں تھا۔ غیرت مند زیب النسا نے کمرے میں موجود پھل کاٹنے کی چھری اپنے سینے میں عین دل کے مقام پر گھونپ لی تھی جس کے بعد مراد نے بڑی سراسیمگی کی حالت میں وہاں سے نکل جانا چاہا تھا۔ وہ بعد میں اپنے آدمیوں کے ذریعے زیب النسا کی لاش یقیناً غائب کروا دیتا لیکن اس رات اس کا ستارہ گردش میں آچکا تھا۔

''ماں!'' زیب النسا کی لاش دیکھ کر انصر کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر ریوالور کے ٹریگر پر اس کی انگلی دبتی چلی گئی۔ ساری گولیاں مراد کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ انصر نے آخری گولی اس کے سر پر چلائی تھی۔

ممکن نہیں تھا کہ گولیاں چلنے کی آوازیں اپارٹمنٹس میں رہنے والوں کے کانوں تک نہ پہنچتیں، اور اگر نہ پہنچتیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انصر فرار ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پولیس آئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔

گیتی ایک طرف بیٹھی نہ صرف خود رو رہی تھی بلکہ روتی ہوئی عارفہ کو سنبھالنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

انصر اور گیتی کے بیانات کی وجہ سے پولیس نے مراد کے گھر پر چھاپا مارنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ وہاں سے مراد کے خلاف ثبوت ملنے کے ساتھ ساتھ تہ خانے میں قید صفیہ بھی مل گئی۔

ایک دن بعد کے اخبارات بڑے سنسنی خیز تھے۔ ایک بہت بڑے گروہ کی گرفتاری عمل میں آئی تھی جو مراد کے احکام کی روشنی میں ٹارگٹ کلنگ اور اسی قسم کی دہشت گردی میں ملوث تھا۔

صفیہ ان سلاخوں سے سر ٹکرا رہی تھی جن کے پیچھے اس کا بھائی قید تھا۔ گیتی اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی بہن کو زندہ سلامت دیکھ کر انصر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔

انصر، مراد کا آلۂ کار سہی لیکن اس نے قتل تو بہرحال کیے تھے، تاہم مقدمہ چلنے کے بعد اسے عمر قید کے بجائے پندرہ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اس کے ساتھ یہ رعایت اس لیے کی گئی کہ وہ نوعمری میں مراد کی منصوبہ بندی کا شکار رہا تھا۔

جیل میں انصر سے آخری ملاقات کے وقت گیتی نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ''جب تم جیل سے رہا ہوگے تو ایک پختہ مرد بن چکے ہوگے جیل میں تم صفیہ اور عارفہ کے لیے پریشان نہیں رہنا.... میری تایازاد بہنیں میری سگی بہنوں کی طرح رہیں گی اور جب تم جیل سے رہا ہوگے تو جیل کے باہر تمہارا استقبال کرنے والوں میں صفیہ اور عارفہ کے ساتھ میں بھی ہوں گی۔ میں جو ایک مجرم کی ناجائز اولاد ہوں۔''

اور پھر وہ روتی ہوئی جیل سے باہر آگئی۔

اس وقت میڈم ریٹا بنگلے میں چکراتی پھر رہی تھی اور بڑبڑائے جا رہی تھی۔ ''میرے آقا کہاں چلے گئے؟''

اس کا آقا اسے اب کہاں مل سکتا تھا۔ اپنا تارِ عنکبوت اجڑنے سے پہلے اس نے خود ہی دنیا چھوڑ دی تھی۔

وش کنیا

منظر امام

نشہ کسی بھی قسم کا ہو...... زہر کی صورت اختیار کر کے انسانی ذہن و دل کو بالکل کھوکھلا کر دیتا ہے...... رگوں میں زہر پالنے والی ایک ایسی ہی نشیلی حسینہ کا فسانۂ دل پذیر جس کی اُلفت نے کسی کو اپنا اسیر بنالیا تھا۔

موت سے محبت کرنے والے محبوب کی کہانی، موت اسے زندگی دان کر گئی تھی

وہ بہت عجیب لڑکی تھی۔

اس سے میری ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ وہاں میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ اس کا رنگ اگرچہ سانولا تھا لیکن اس کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے ان میں انگارے دہک رہے ہوں۔

ان آنکھوں میں ایسی ہی مقناطیسی کشش تھی۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی اس کا جسم بھی بہت سبک سا تھا۔ میں نے ایسی کشش بہت کم لڑکیوں میں دیکھی تھی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے اپنے میزبان انور سے پوچھا۔

"اوہ۔ یہ...... شہلا نام ہے اس کا۔" میزبان نے جواب دیا۔ "لیکن تم اس کے چکر میں مت پڑنا۔ یہ بہت خطرناک لڑکی ہے۔"

"خطرناک...... وہ کس طرح۔"

"یہ تم میری بیوی سے معلوم کرو۔" میزبان نے کہا۔ "وہ تمہیں تفصیل سے بتا دے گی۔ یہ دونوں دوست ہیں۔ زینب کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔"

اس لڑکی میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے میں اس طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا ورنہ زندگی میں نہ جانے کتنی لڑکیوں کو میں نے دیکھا ہوگا لیکن کسی میں ایسی بات نہیں تھی۔ اس میں جو کچھ بھی تھا، وہ ایک انجانی سی قوت تھی یا شاید کسی قسم کی حیوانی کشش......

اس تقریب کے بعد انور کی بیوی زینب سے بات کرنے کا موقع ایک ہفتے بعد ملا۔ میں انور کے گھر اسی مقصد کے لیے گیا تھا۔ "زینب، یہ ندیم اس لڑکی کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔" انور نے کہا۔

"کس لڑکی کے بارے میں؟"

"ارے وہی شہلا۔"

"خدایا۔ آپ بھی اس کے چاہنے والوں میں شامل ہو گئے۔" زینب مسکرا کے بولی۔ "نہ جانے اب تک اس کے بارے میں کتنے لوگ مجھ سے معلومات حاصل کر چکے ہیں۔"

"تو چلیں ایک میں بھی سہی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک خطرناک لڑکی ہے۔" زینب نے کہا۔

"یہی بات تمہارے شوہر نے بھی کہی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح خطرناک ہو سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں ایک خاص قسم کی کشش ضرور ہے۔"

"اور وہ... کشش دیکھنے والوں کو پاگل کر دیتی ہے۔"

"یہ تو ایک الگ... بات ہے لیکن وہ خطرناک کیسے ہو گئی؟"

"اس پر کسی جن کا سایہ ہے۔" زینب نے بتایا۔

"کیا......!" میں نے حیران ہو کر زینب کی طرف دیکھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ جن کا سایہ آپ بھی ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟"

"پہلے میں یقین نہیں رکھتی تھی لیکن جب سے اس کے ساتھ حادثات رونما ہوتے رہے تو یقین کرنا پڑا۔"

"کیسے واقعات؟"

"جو بھی شخص اس کے قریب ہوتا ہے، وہ مر جاتا ہے۔" زینب نے بتایا۔ "اب تک اس کے دو منگیتر مر چکے ہیں اور ایک شوہر شادی کی پہلی رات ہی مر گیا تھا۔"

"خدا کی پناہ، کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ۔ اس کا کوئی جاننے والا لڑکا اس کے قریب نہیں ہوتا۔" زینب نے کہا۔ "بس دور دور سے سلام دعا کر لیتے ہیں۔"

"یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔" میں نے جرح کی۔

"لیکن یکے بعد دیگرے...... ایسے اتفاق کو تم کیا کہو گے۔"

"اور ان لڑکوں کی اموات کس طرح ہوئیں......؟"

"نامعلوم وجوہات۔" زینب نے بتایا۔ "بے چارے شوہر کا تو پوسٹ مارٹم بھی ہوا تھا لیکن کوئی بات سامنے نہیں آئی۔"

"اسی لیے اس کی آنکھوں میں ایسی وحشیانہ چمک ہے۔"

"ہاں وہ چمک اپنی طرف کھینچتی بھی ہے اور خوفزدہ بھی کرتی ہے۔" زینب نے کہا۔ "تسلی ہو گئی تمہاری؟"

"یہ سب کچھ میں بھی جانتا تھا۔" انور نے کہا۔ "لیکن میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ تم مذاق سمجھتے۔"

"کچھ بھی ہو بھابی۔ میں اس لڑکی سے ملنا چاہوں گا۔ کیا آپ اس سے میری ملاقات کروا سکتی ہیں۔"

"کیوں۔ کیا مرنے کا ارادہ بن گیا ہے۔" انور نے پوچھا۔

"یار موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن ذرا اس سے مل کر دیکھوں تو سہی۔"

"اوکے۔ یہ ایسی کوئی مشکل بات نہیں ہے، میں اسے بلا لیتی ہوں۔" زینب نے کہا۔ "میرے کہنے پر وہ ضرور آئے گی۔ لیکن اپنے آپ کو بچا کر اس سے دوستی کرنا۔"

چار دن کے بعد زینب کا فون آیا۔ اس نے شہلا کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ اور مجھ سے کہا کہ میں اس طرح آؤں کہ شہلا کو احساس نہ ہو کہ اس میں کسی قسم کی پلاننگ تھی۔

میں جس وقت پہنچا، اس وقت شہلا وہاں موجود تھی۔ اسی انداز میں۔ اپنی اس پُراسرار کشش کے ساتھ۔ زینب نے

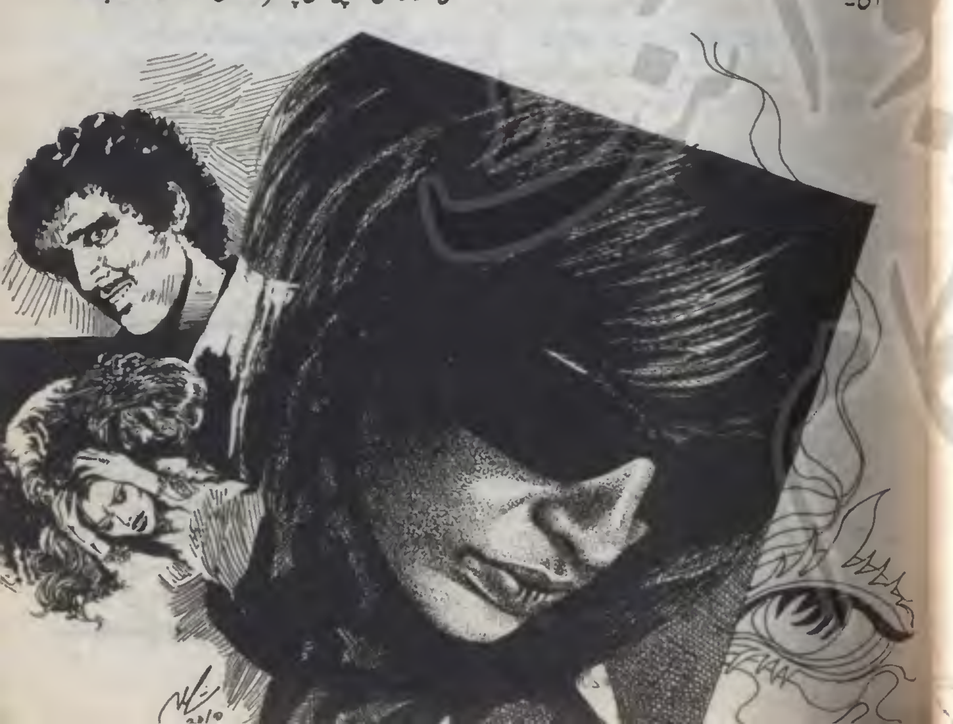

ہم دونوں کا تعارف کروادیا۔
شہلا ایک زندہ دل لڑکی تھی۔ اس کی ہنسی میں کھنک اور باتوں میں ذہانت تھی۔ ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ زینب ہمارے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

"شہلا، ندیم تم سے بہت متاثر ہیں۔" زینب نے اچانک بات چھیڑ دی۔ "یہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔"
"ارے نہیں ندیم صاحب۔" شہلا اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ "میرے لیے ایسی خواہش نہ کریں تو بہتر ہے۔ میں ایک بدقسمت لڑکی ہوں۔ مردوں کو میری دوستی راس نہیں آتی۔"

"یہ تو آپ کی سوچ ہے نا۔ ہوسکتا ہے کہ صورتِ حال آپ کی سوچ کے برعکس ہو۔"
"نہیں یہ سوچ نہیں، حقیقت ہے۔" اس کے لہجے میں بہت درد تھا۔ "میں اب کسی اور دوست کے کم ہونے کا رسک نہیں لے سکتی۔ ہاں جس طرح مل رہے ہیں اسی طرح ملتے رہیں۔ آپس میں سلام دعا ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"
"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"
"لیکن کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "آپ کو اس شہر میں اور بھی لڑکیاں مل جائیں گی۔ کیا ضروری ہے کہ اسی سے دوستی کریں جس سے کہانیاں وابستہ ہوں۔"
"کیا واقعی ایسی صورتِ حال ہے؟"
"ہاں۔ اب تک دو منگیتر اور دو شوہر مر چکے ہیں۔" اس نے کہا۔
"دو شوہر!" زینب چونک گئی۔
"ہاں ایک بے چارہ ہمارے خاندان کا غریب نوجوان تھا۔" شہلا نے بتایا۔ "اس بے چارے کی موت چھپائی گئی ہے۔ اسی لیے تمہیں معلوم نہیں ہوسکا۔ آج بتا رہی ہوں۔"
کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اتنی اچھی اور خوبصورت لڑکی گمبھیر صورتِ حال سے دوچار تھی۔
"ایک بات بتاؤ۔ آپ کے ساتھ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میں اسے اپنی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "خیر چھوڑیں۔ کوئی اور بات کریں۔ مجھے تو اب ساری زندگی اسی طرح رہنا ہے۔"
"اگر میں یہ خواہش کروں کہ میں آپ سے ملتے رہنا چاہتا ہوں تو کیا ایسی صورت میں مجھے نقصان نہیں پہنچے گا۔" میں نے پوچھا۔
"ارے نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "اب ایسا بھی نہیں ہے کہ مجھ سے بات کرنے والے مرتے چلے جائیں ورنہ اب تک کتنی لاشیں اٹھ چکی ہوتیں۔"
"تو پھر کیا میں امید رکھوں کہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔"
"لیکن کیوں؟ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"یونہی۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی اس خواہش کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ آپ سے ملتا رہوں اور کوشش کروں کہ آپ کے ساتھ جو پریشانی ہے، وہ ختم ہو جائے۔"
"یہ بہت مشکل ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے ساری زندگی اسی خوف کے سائے میں گزارنی ہے۔ میرے لیے تو کچھ بھی نہیں رہا اب۔"
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کیا رہ گیا تھا اس کے لیے۔ وہ کسی سے دوستی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس سے دوستی یا شادی کرنے والا موت کے گھاٹ اتر جاتا تھا۔ اب کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کے قریب جانے کی خواہش کرتا لیکن میں نہ جانے کیوں بے چین ہو رہا تھا۔
میرے ایک دوست تھے عالم صاحب ان کے والد ایک باعامل باعمل تھے۔ وہ بہت روحانی طاقت کے مالک تھے۔ میں چونکہ ان کے بیٹے کا دوست تھا اس لیے مجھ پر بھی مہربانی فرمایا کرتے تھے۔
میں ان کے پاس شہلا کا مسئلہ لے کر پہنچ گیا۔
"جناب، آپ رہنمائی فرمائیں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی دوسری مخلوق اس طرح کسی پر عاشق ہو جائے... کہ وہ کسی اور کا وجود برداشت نہ کرسکے؟"
"ہاں ایسا ممکن ہے۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن اس میں دو باتیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لو کہ ملاپ ناممکن ہے۔ یعنی یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی جن کسی عورت پر عاشق ہو کر اس سے شادی کر لے۔ کیونکہ ان دونوں کا خمیر مختلف ہے۔ انسان خاک سے بنا ہے اور وہ آگ سے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے لیکن کچھ شرپسند پریشان ضرور کرتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ وہ کسی اور انسان کو اس کے قریب نہیں آنے دیتے جسے وہ پسند کرنے لگیں۔ اس کی زندگی کے درپے ہو جاتے ہیں۔"
"تو یہ فرمائیں کیا وہ لڑکی زندگی بھر اسی طرح رہتی رہے گی؟" میں نے پوچھا۔ "کیا اس کا کوئی حل یا علاج نہیں ہے؟"
"ہے کیوں نہیں۔ خدا کی طاقت کے آگے کون سر اٹھا سکتا ہے۔ اس کے کلام میں اتنی تاثیر ہے کہ ہر طرح کے مسائل یوں حل ہو جاتے ہیں۔"
"تو پھر آپ اس لڑکی کے لیے کچھ کریں۔"

"اس طرح نہیں۔ اس مخلوق سے گفتگو کرنی ہو گی۔ دیکھیں تو سہی کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ کیا ارادے ہیں۔ اس لڑکی کی معرفت بات کرنی ہو گی یعنی اس کی موجودگی ضروری ہے۔"
"ٹھیک ہے جناب۔ میں اسے لانے کی کوشش کرتا ہوں۔"
شہلا کے گھر کا پتا میں نے زینب ہی سے معلوم کرلیا تھا۔
بہت بڑا اور خوبصورت مکان تھا اس کا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا... کہ ان لوگوں کے پاس سب کچھ تھا اس کے باوجود وہ ایک انجانی طاقت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔
شہلا گھر پر ہی تھی اور اس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ اپنے والدین سے بھی میرا تعارف کروایا وہ دونوں بھی بہت معقول اور مہذب ثابت ہوئے۔
اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر شہلا کسی کام سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کے والد سے کہا۔ "انکل شہلا کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اگرچہ آپ لوگوں کا ذاتی مسئلہ ہے لیکن مجھے نہ جانے کیوں اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی ہے۔"
"محبت ہے تمہاری۔" اس کی ماں نے کہا۔
"میں نے اس سلسلے میں ایک بزرگ سے بات کی ہے۔" میں نے بتایا۔ "اور میرا خیال ہے کہ ان کے پاس اس مسئلے کا حل موجود ہے۔"
"بکواس ہے۔" اس کے باپ نے برا سا منہ بنایا۔ "اس مسئلے کا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔"
"ایسا نہ کہیں۔ ایک سے ایک روحانی عامل موجود ہیں۔"
"ہوں گے لیکن اب ہم شہلا کو مزید تماشا نہیں بنوانا چاہتے۔" اس بار اس کی ماں نے کہا۔ "جو کچھ ہو چکا ہے وہی بہت ہے۔"
"تو کیا وہ ساری زندگی اسی طرح گزار دے گی۔"
"ہاں یہ اس کی مجبوری ہے۔"
"کمال ہے۔" میں حیران رہ گیا۔ "میں تو یہ سمجھا تھا کہ یہ خبر سن کر آپ لوگ خوش ہو جائیں گے کہ شہلا کی بہتری کے لیے کوئی راستہ نکل آیا ہے لیکن......"
"پلیز یہ ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔" شہلا کے باپ نے کہا۔ "ہم اسے دنیا بھر کے عاملوں کو دکھا چکے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم نے یوں ہی رہنے دیا ہو گا۔ اب ہم تھک چکے ہیں اور ہم نے اس طرف دھیان دینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"
میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں مایوسی کی انتہا پر تھے اسی لیے وہ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ جھلائے ہوئے انسانوں کی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ بہرحال میں نے پھر ان پر زور نہیں دیا لیکن میں نے حتمی فیصلہ کرلیا تھا کہ شہلا کو اس پر راضی کر لوں گا۔ آخر اس کی بھی تو یہی خواہش ہو گی۔ کون لڑکی ایسا چاہے گی کہ کوئی اس کی زندگی کا ساتھی نہ بنے۔
کئی دنوں کے بعد جب شہلا سے میری ملاقات ہوئی تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے تذکرہ چھیڑ دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "شہلا تم ایک بار میرے ساتھ ان کے پاس چلو......"
"تم کیا سمجھتے ہو کہ میرے اس دکھ کا علاج تمہارے ان بزرگ کے پاس ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں، دعاؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔
"نہیں کسی کے پاس میرے دکھ کا علاج نہیں ہے۔" اس کا لہجہ بہت افسردہ تھا۔ "وہ صاحب کچھ نہیں کرسکیں گے؟"
"کیوں نہیں کرسکیں گے۔"
"اس لیے کہ مجھ پر کوئی آسیب وآسیب نہیں ہے۔" اس نے کہا۔
"اگر نہیں ہے تو پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے تمہارے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔
"اس لیے کہ ان کو میں خود ہی مار دیتی ہوں۔" اس نے بتایا۔
"کیا......!" یہ سن کر میں حیران رہ گیا...... "تم خود مار دیتی ہو؟"
"ہاں۔ میں ہی ان کی قاتل ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں ہی مار دیتی ہوں انہیں......"
"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"
"یہ بہت طویل اور بھیانک داستان ہے۔" شہلا نے کہا۔ "میں نے اب تک کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا لیکن اب برداشت کی حد ہو گئی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو ظاہر کر دینا چاہتی ہوں۔ کیا تم میں اتنا حوصلہ ہے؟"
"ہاں حوصلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے بتاؤ کیا صورتِ حال ہے۔" "میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ میں پھر بھی تمہارے کام آسکوں۔"
"اسی لیے تو تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"تو پھر بتاؤ۔"
"پھر سوچتی ہوں کہ یہ سب سن لینے کے بعد نہ جانے

تمہارا رویہ کیسا ہو؟''

''سب ٹھیک ہوگا۔ کم از کم یہ تو پتا چل جائے گا کہ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ تمہاری شخصیت کے گرد یہ کیسا اسرار ہے؟''

''یہ کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں صرف نو یا دس سال کی تھی۔'' شہلا نے بتانا شروع کیا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں وہ آہستہ آہستہ بولتی چلی گئی۔ ''بہت پیسے والے تھے میرے والدین۔ سب کچھ تھا ان کے پاس اور ابھی تک ہے لیکن صرف ایک چیز نہیں تھی۔ اولاد کی محبت...... میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں لیکن میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ ان کی اپنی مصروفیات ہوا کرتی تھیں اور ان میں سب سے خطرناک مصروفیت میری ممی کی تھی۔ وہ ڈرگز کی عادی تھیں۔''

''اوہ ......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔'' اس لیے ان کے لہجے میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''ہاں، ان کی زبان مستقل طور پر لڑکھڑانے لگی ہے۔'' شہلا نے بتایا۔ ''میں انہیں چھپ چھپ کر ڈرگز لیتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ خدا جانے کون کون سے نشے انہوں نے استعمال کیے ہیں۔ پیتھاڈرین، چرس، شراب، مارفین، ہیروئن، راکٹ اور نہ جانے کیا کیا؟''

''اور تمہارے ڈیڈ، وہ منع نہیں کرتے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کیونکہ یہ ساری شان و شوکت یہ دولت صرف ممی ہی کی تھی۔ ان کے والدین دے کر گئے تھے جب کہ ڈیڈ ایک غریب فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے میں بھی بہت بے رحمی سے یہ بھی کہہ رہی ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ خود ڈیڈ یہ نہ چاہتے ہوں کہ ممی اس بلا سے چھٹکارا پائیں۔''

''وہ کیوں؟''

''سامنے کی بات ہے دولت کس کے پاس جاتی......''
اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہاں سب چلتا ہے۔ اسی طرح ہوتا ہے۔ رشتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی ہے خیر تو میں ممی کا حال بتا رہی تھی۔ نشہ ان کی رگوں میں اتر کر رہ گیا تھا۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ میں نے خود ان کو بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ خدا جانے ان میں یہ عادت کہاں سے آگئی تھی۔ یہ راز مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ بہرحال ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کوئی ڈرگ ان کے لیے کارآمد نہیں رہی۔ خطرناک سے خطرناک ڈرگ کا ان پر اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔''

''ہاں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔ ''جب کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔''

''وہ انتہائی خطرناک دور تھا۔'' شہلا نے کہا۔ ''میں ممی کو شور کرتے، چیختے چلاتے ہوئے دیکھا کرتی اور سہم کر ایک طرف چلی جاتی پھر انتہا اس وقت ہوئی جب ممی نے خود کو سانپوں سے ڈسوانا شروع کر دیا۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' میں حیران رہ گیا۔ ''میں نے ایسی باتیں صرف کہانیوں میں پڑھی تھیں۔''

''یہ حقیقت ہے ندیم صاحب۔'' شہلا نے کہا۔ ''آپ نے ایسی لڑکیوں کے بارے میں یہ ضرور سنا ہوگا جنہیں بچپن ہی سے سنکھیا دیا جاتا ہے تاکہ وہ پوری طرح زہریلی ہو جائیں۔''

''ہاں اتنا تو میں جانتا ہوں کہ ایسی لڑکیاں مخالفین کی خدمت میں پیش کر دی جاتی ہیں اور لڑکیوں کے زہریلے اثرات کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو جاتی اور ایسی لڑکیوں کو وش کنیا میں کہا جاتا تھا۔''

''خوب۔'' وہ مسکرا دی۔ ''تم اتنا تو جانتے ہو تو وہی حالت ممی کی تھی۔ ماہر ترین ڈاکٹرز کی نگرانی میں ان کے جسم میں زہر پہنچایا جاتا بہت ہلکی مقدار میں...... انجکشن کے ذریعے۔ پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ اپنے نشے کی تسکین کے لیے ہر قسم کے تجربات کر سکتی تھیں جب ان کی حالت غیر ہونے لگتی ڈاکٹرز انہیں سنبھال لیتے۔''

''یہ تم حیرت انگیز کہانی سنا رہی ہو شہلا؟''

''زندگی کے حقائق ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' شہلا نے کہا۔ ''کہانیوں سے زیادہ حیرت انگیز۔ تم نے شاید ابھی اس طرح کے مشاہدے نہیں کیے۔ پاگل ہو کر رہ جاؤ گے کہ یہاں کیا کیا نہیں ہوتا......''

''حیرت ہے...... چلو مان لیا کہ تمہاری ممی کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''میں خود بھی وش کنیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا......!''

''ہاں یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی ایک آستین اوپر کر دی۔ ''غور سے دیکھو پورا ہاتھ انجکشن کے نشان سے چھدا ہوا ہے۔ میں بھی ممی کے نقشِ قدم پر چل نکلی تھی۔ کس طرح...... یہ بھی ایک حیرت بھری داستان ہے۔ یوں سمجھو کہ ممی خود مجھے اس راستے پر لے آئی تھیں۔''

''کیا۔'' میری حیرت اور بڑھ گئی۔

''جی جناب۔ کیونکہ میں نے ایک ہنگامہ مچا کر رکھ دیا تھا۔ میں یہ سب کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ دولت مند لوگ تھے۔ بہت بڑی بڑی سوشل گیدرنگ ہوا کرتیں...... میں دھمکیاں دیتی تھی کہ میں سب کو بتا دوں گی کہ ممی یہ سب کچھ کرتی ہیں۔''

''خدا کی پناہ اور تمہاری زبان بند رکھنے کے لیے انہوں نے تمہیں بھی اس کا عادی بنا دیا۔ انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی اولاد کے ساتھ کر رہی ہیں۔''

''نشہ چیز ہی ایسی ہوتی ہے ندیم صاحب۔ انسان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتی ہے۔'' شہلا نے کہا۔ ''اس کے لیے انسان اپنی عزت اور اپنا ایمان تک فروخت کر دیتا ہے۔ ممی کو یہ ڈر تھا کہ معاشرے کے معزز لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا تو وہ انہیں کن نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔

''اس کے بعد میرا بھی نشے کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ ہلکے ڈوز، پھر کچھ اور چیزیں۔ وہ تمام مراحل جن سے ممی گزرتی رہی تھیں۔ ستم یہ ہوا کہ میں ممی سے کئی ہاتھ آگے نکل گئی۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تیرہ برس کی عمر تک میرا پورا جسم انجکشن سے چھلنی ہو چکا تھا اور وہی کیفیت تھی جو ممی کی ہوا کرتی تھی یعنی کسی بات کا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔''

شہلا کی داستان اگرچہ نئی نہیں تھی۔ اس ملک کی نہ جانے کتنی لڑکیاں اور لڑکے اس انداز سے تباہ ہو رہے ہیں لیکن اس کی کہانی کی ابتدا بہت مختلف تھی۔

''وہ دن بھی آ گیا جب میں مکمل طور پر ممی کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔'' شہلا نے بتانا شروع کیا۔ ''وہی زہر میری رگوں میں بھی اتارا جا رہا تھا جس زہر نے ممی کو اس حال تک پہنچایا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے سانپوں کا زہر؟''

''ہاں۔ وہی سانپوں کا زہر۔ بالکل وہی انداز جس انداز سے ممی کا سفر شروع ہوا تھا۔ ان کی نگرانی میں وہ زہر میری رگوں میں اتارا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ قطرہ قطرہ...... میں زہریلی ہوتی جا رہی تھی۔''

''یہ تو بہت بھیانک تصویر کشی کی ہے تم نے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن نہ جانے کیوں۔ ابھی تک یقین نہیں آتا کہ اس دور میں بھی کوئی اس طرح سانپوں کا زہر استعمال کر کے زہریلا بن سکتا ہے؟''

''اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''کاش ایک سال پہلے تم مجھ سے ملے ہوتے تو تمہیں خود اندازہ ہو جاتا کہ میں کیا ہوں۔''

''کیوں ایک سال پہلے کیا ہوا تھا؟''

''تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ گزشتہ ایک سال سے میں نے کسی قسم کا نشہ استعمال نہیں کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''خود ڈاکٹرز بھی حیران ہیں کہ اس اسٹیج پر پہنچ کر کوئی اپنے آپ کو کس طرح روک سکتا ہے لیکن میں نے یہ بھی کر کے دکھا دیا ہے۔ جبران کی موت نے میری دنیا بدل دی ہے۔''

''کون جبران؟''

''وہ...... جس سے میری شادی ہوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''شادی سے پہلے میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے اپنی موت کو دعوت نہ دے لیکن وہ مجھے خوشیاں دینا چاہتا تھا اس لیے میرے منع کرنے کے باوجود اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ شادی کی پہلی رات اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''شہلا ہوسکتا ہے کہ تم سے شادی کے بعد واقعی مجھے موت آ جائے لیکن میری موت کے بعد اگر تم نے میری آخری خواہش پوری کر دی تو میری روح کو سکون مل جائے گا اور وہ آخری خواہش یہ ہے کہ تم اپنی پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر اس نحس عادت سے نجات حاصل کر لینا۔''

''اور ندیم صاحب میں نے اس کی بات کی لاج رکھ لی۔ تم سوچ نہیں سکتے کہ میری کیا حالت ہوتی ہوگی۔ کس کس طرح مجھے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ کتنی ڈرپ لگائی جاتی تھیں۔ گھنٹوں طاقت در نیند کی دوائیں دی جاتی تھیں۔ چار مہینے تک اس کرب میں مبتلا رہی ہوں اور پھر بالآخر میں نے نشہ ترک کر دیا۔ اپنی قوت ارادی کے بل پر میں نے زہریلی موت کو شکست دے دی...... تو یہ ہے میری کہانی۔''

''اور تمہاری امی۔ ان کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ان کا تو انتقال ہو گیا۔'' اس نے بتایا۔ ''تم نے جن کو دیکھا وہ میری سوتیلی ماں ہیں لیکن شاید ماں سے زیادہ پیار کرنے والی۔ ڈیڈی کو میری وجہ سے دوسری شادی کرنی پڑی کیونکہ مجھے دیکھ بھال اور توجہ کی سخت ضرورت تھی۔ اس ماں نے میری اتنی خدمت کی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اور اب میں بالکل نارمل ہوں۔''

''لیکن تمہارے قریب آنے والے کس طرح مر جاتے ہیں؟''

ذرا ٹھہریئے

بس کنڈیکٹر مسافروں سے: ''سب لوگ بیٹھ جائیں تاکہ بس چل سکے۔''

کسی خاتون کی آواز آئی۔ ''ذرا ٹھہرنا، میں اپنے کپڑے اتار دوں۔''

سب مسافروں کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک دھوبن نے اپنے سر سے میلے کپڑوں کا بڑا سا گٹھر اتار کر پائدان پر رکھ دیا۔ سب مسافر جھینپے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"میری سانسوں کی وجہ سے۔" اس نے بتایا۔ "اتنی زہریلی ہو گئی تھیں میری سانسیں۔ لوگ ایڈونچر کے لیے میرے قریب آتے اور موت ان کا مقدر بن جاتی۔ میرے گھر والوں نے اسی لیے مجھے آسیب زدہ مشہور کر دیا کیونکہ وہ یہ تلخ حقیقت سامنے نہیں لا سکتے تھے۔"

"اب بات سمجھ میں آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تو کیا وہ زہر ابھی تک تمہارے بدن میں موجود ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "بہت ممکن ہے کہ اب تک موجود ہو۔ میں مزید کوئی تجربہ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میری وجہ سے کئی لوگ مر چکے ہیں اس لیے میں اب کسی کو قریب نہیں آنے دیتی۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی اور کا خون میری گردن پر آ جائے۔"

"تم میری ایک بات مانو گی۔"

"اب تک تو مانتی ہی آئی ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم پہلے آدمی ہو جس کو میں نے اپنی یہ کہانی سنائی ہے۔"

"تم میرے ساتھ چیک اَپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس چلو۔" میں نے کہا۔ "اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارے خون میں اب زہر کی کتنی مقدار رہ گئی ہے۔"

"کیا فائدہ۔ میں جانتی ہوں کہ میں اب تک زہریلی ہوں۔"

"تم چلو تو سہی۔ ٹیسٹ کروانے میں کیا حرج ہے؟"

"نہیں حرج تو کچھ بھی نہیں ہے، میں کل چلوں گی تمہارے ساتھ۔"

دوسرے دن میں اسے اپنے ساتھ ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ وہ میری جان پہچان کا ڈاکٹر تھا۔ اس نے خون کے کئی نمونے حاصل کیے اور دو دن کے بعد رپورٹ کے لیے آنے کو کہا۔

اس دوران میں شہلا کو تسلیاں دیتا رہا۔ اسے یقین دلاتا رہا کہ اب اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ بھی میری باتیں سن کر بہت پُرامید ہو چلی تھی۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو ندیم ......" اس نے کہا۔ "تاکہ میں بھی ایک نارمل لڑکی کی طرح اپنی زندگی گزار سکوں۔"

لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

برسوں کی بے اعتدالیوں نے اس کے پورے بدن میں زہر ہی زہر بھر دیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس کی رگوں میں اور خون میں اب تک زہر کے اثرات موجود تھے۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ "ندیم صاحب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لڑکی اب تک زندہ کیسے ہے۔ اس کو تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔"

"آپ یہ بتائیں، کیا یہ شادی کے قابل ہو سکے گی؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کے شوہر کے لیے موت ہو گی۔ کیونکہ اس کی سانسیں، اس کا لعاب دہن زہریلا ہو چکا ہے اور اگر کسی طرح شادی ہو بھی گئی اور شوہر زندہ بھی رہ گیا تو آنے والے بچے کے لیے موت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"کیا اس کے جسم سے یہ اثرات کسی طرح ختم نہیں ہو سکتے؟"

"بہت سال لگ جائیں گے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس کو حاصل کرنے کے لیے اتنا انتظار کر سکتا ہو۔"

میں نے شہلا کو اس رپورٹ کے بارے میں بتا دیا۔ یہ سب سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "ندیم تم ہی ضد کر رہے تھے۔ ورنہ میں تو اپنی حالت سے خود واقف تھی۔ چھوڑ دو مجھے میرے حال پر...... میں ایک آسیب زدہ لڑکی ہوں اور میرے پاس آنے والے کے لیے سوائے موت کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں اس کی حالت اور بے چارگی پر سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتا تھا۔

بہت دنوں تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ نہیں کہ اس کے لیے میری چاہت میں کوئی کمی ہو گئی ہو بلکہ میں خود ہی اس کی طرف نہیں گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی محرومی اور بے چارگی کے احساس کو زندہ کر دیا جائے۔ وہ جیسی بھی زندگی گزار رہی ہو گی ٹھیک ہی ہو گی۔

پھر ایک دن میرے دوست کی بیوی نے مجھے بتایا۔ "تمہیں معلوم ہے کل شہلا کا انتقال ہو گیا۔"

"کیا......!" مجھے یہ سن کر شاک سا لگا۔ "انتقال ہو گیا کیسے؟"

"شاید اس نے کوئی نشہ استعمال کیا تھا۔" اس نے کہا۔ "میڈیکل رپورٹ تو یہی ہے۔"

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "جب وہ لڑکی سراپا زہر تھی تو پھر نشے کے استعمال سے کیسے مر گئی؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نشہ ترک کر دیا تھا۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "اس کے اعصاب نشے کے بغیر کام کرنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے، اس کا جسمانی نظام نشے کے خلاف مزاحمت کرنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ نشہ لیا تو اس کے اعصاب اور دماغ کی شریانیں اسے قبول نہ کر سکیں۔ اندر کی اس ہولناک ٹوٹ پھوٹ نے آخر کار اسے قبر میں اتار دیا۔"

اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ آخر کیوں اس نے دوبارہ نشہ استعمال کرنا شروع کیا...؟

•••

اسرار و تحیر کی دھند میں ملفوف مجرم کی تلاش کا پرتجسس ماجرا

تقدیر کا لکھا جاننا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک جوڑے کا احوال جس نے اپنے مستقبل کی جھلک دیکھ لی تھی مگر وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ چالاک صیاد کا قصہ جس کے شکار کو بھی اپنے انجام کا علم ہو چکا تھا ...... لیکن اسے یقین نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

پیش گو

آصف ملک

بل کولن اور اس کی نئی نویلی اور حسین و دل کش بیوی جیسیکا کولن میلے میں گھوم رہے تھے۔ یہ مخصوص دیہاتی طرز کا میلا تھا جس میں ان کی دلچسپی کی چیزیں زیادہ نہیں تھیں۔ کہیں نشانے بازی کا مقابلہ تھا اور کہیں گتے بازی ہو رہی تھی۔ جادوگر اور قسمت کا حال بتانے والے اپنے اپنے اسٹال سجائے بیٹھے تھے۔ بل اور جیسیکا شادی کے بعد ہنی مون پر نکلے ہوئے تھے۔

بل ایک بجلی گھر میں انجینئر تھا اور جیسیکا سے اس کی ملاقات چند مہینے پہلے ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ تروتازہ اور نوجوان نظر آنے والے بل کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک ذمے دار پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ وہ شکل و صورت سے کالج بوائے نظر آتا تھا۔ جیسیکا ایک کالج میں پڑھتی تھی اور اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ اس ڈیلٹا ہاؤس پارٹی میں آئی تھی۔ یہاں اس نے بل کو دیکھا اور پہلی نظر میں دونوں دل ہار گئے۔

شادی کے بعد انہوں نے ہنی مون کا پروگرام بنایا تھا۔ اس ایک مہینے کے سفر میں بل نے دل کھول کر جیسیکا پر خرچ کیا اور وہ بہت مطمئن تھی۔

واپسی میں ان کو جو جگہ اچھی لگتی، وہ وہاں رک جاتے۔

وہ ورجینیا کے ایک دیہی علاقے سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک جگہ میلا لگا نظر آیا۔ بل کا بچپن ایک گاؤں میں گزرا تھا اور اسے ایسی چیزیں بہت متوجہ کرتی تھیں۔ اس نے جیسیکا سے کہا۔ ''ڈیئر! کیا خیال ہے کچھ دیر کے لیے یہاں نہ رک جائیں؟''

جیسیکا کو بھی میلا دلچسپ لگ رہا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اور میرا خیال ہے کہ یہاں ہمیں لنچ کے لیے بھی کوئی اچھی چیز مل جائے گی۔''

میلا بڑا نہیں تھا لیکن بہت رنگا رنگ اور صاف ستھرا تھا۔ یہاں سب سے زیادہ اسٹال کھانے پینے کی چیزوں کے تھے۔ وہ کھاتے پیتے رہے اور میلے کی رونقوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جیسیکا نے ہارس رائیڈنگ کی اور بل نے ہتھوڑا مار کر ڈسک اوپر کرنے کے مقابلے میں حصہ لیا۔ انہوں نے سلاٹ مشین پر بھی چند ڈالرز ضائع کیے اور پھر اکتا گئے۔ انہیں رات ہونے سے پہلے واشنگٹن پہنچنا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب چلتے ہیں۔'' جیسیکا نے کہا۔

''ضرور۔'' بل نے تائید کی۔ ''لیکن میں ذرا واش روم سے ہو آؤں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہارا یہاں انتظار کر رہی ہوں۔''

جیسیکا ایک اسٹال کے پاس رک گئی۔ یہ کسی قسمت کا حال بتانے والی جپسی عورت کا اسٹال تھا۔ اس نے اسٹال کے ساتھ اپنی ایک بڑی سی تصویر لگا رکھی تھی جس میں وہ قسمت کا حال بتانے والی سے زیادہ کوئی ماڈل لگ رہی تھی۔ واش روم اس جگہ سے کچھ دور تھے، بل اس جانب بڑھ گیا اور جیسیکا جپسی عورت کی تصویر دیکھنے لگی۔ اچانک اس کے اسٹال کا پردہ ہٹا اور جپسی عورت نے باہر جھانکا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''یہاں کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ جیسیکا بے ساختہ اندر چلی گئی۔ خیمہ نما اسٹال اندر سے بہت مختصر تھا۔ ایک چھوٹی سی فولڈ ہو جانے والی میز تھی اور اس کے دونوں طرف دو عدد فولڈ ہو جانے والی کرسیاں رکھی تھیں۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو عام طور سے قسمت کا حال بتانے والوں کے پاس پائی جاتی ہے۔ دیواریں بھی سادہ سی تھیں۔ جپسی عورت میز کے دوسری طرف جا کر بیٹھ گئی اور جیسیکا کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا تم واقعی قسمت کا حال بتاتی ہو؟''

''ہاں... کیا تمہیں شک ہے؟''

''نہیں... نہیں، میں نے تو ایسے ہی پوچھا ہے۔'' جیسیکا جلدی سے بولی۔

''کیا تم اپنی قسمت کا حال جاننا چاہو گی؟''

جیسیکا ہچکچائی۔ اسے ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔ جپسی عورت نے اس کی بے یقینی بھانپ لی۔ وہ مسکرائی۔ ''شاید تم اس بات پر یقین نہیں رکھتی ہو؟''

''ہاں، تم کہہ سکتی ہو......'' جیسیکا نے سر ہلایا۔ ''میں نے عملی زندگی گزاری ہے اور مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے سے زیادہ اسے بہتر بنانے کی فکر رہتی ہے۔''

''یہ تو ہے... لیکن جب تک تمہیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ مستقبل میں تمہیں کیا واقعات پیش آسکتے ہیں، تم کس طرح اس کے بارے میں بہتر پلاننگ کر سکتی ہو؟'' جپسی عورت کے لہجے میں چیلنج آگیا۔ وہ پُرکشش اور حسین عورت تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے اور جسامت بڑی ہونے کے باوجود اس کا بدن نسوانیت سے بھرپور تھا۔ اس نے اپنی تصویر سے بھی زیادہ تو بہ شکن لباس پہن رکھا تھا۔

''مجھے اس بارے میں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

جیسیکا کو اس کے انداز پر غصہ آگیا۔

''فرض کرو تمہیں مستقبل میں کسی سے خطرہ لاحق ہو جائے اور تم اس سے بے خبر ہو تو تم اس کا تدارک کیسے کرو گی؟''

جیسیکا الجھ گئی۔ ''مجھے... بھلا کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ دنیا میں ہر انسان کو خطرات کا سامنا ہوتا ہے۔ تمہیں بھی ہو سکتے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟ میرا تو کوئی دشمن نہیں ہے۔''

''یہ تو تمہارا خیال ہے۔ ممکن ہے دنیا میں کچھ لوگوں کا خیال تم سے مختلف ہو اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں۔''

جیسیکا کی الجھن بڑھ گئی۔ ''فرض کرو اگر میرا کوئی دشمن ہے اور مجھے اس سے کوئی خطرہ ہے تو تم مجھے اس کے بارے میں کس طرح بتاؤ گی؟''

''اپنے علم کی مدد سے۔'' جپسی عورت نے کہا۔ ''میرے پاس ایسا علم ہے جو مجھے کسی بھی شخص کے آنے والے وقت کے بارے میں بتا دیتا ہے۔''

''لیکن میں کیسے یقین کر سکتی ہوں کہ تم نے مجھے مستقبل کے بارے میں جو بتایا، وہ سچ ہے اور تم نے اپنی طرف سے نہیں گھڑا ہے؟'' اس بار جیسیکا نے صاف بات کی۔

جپسی عورت آگے جھکی، اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سرخ ہو گئیں۔ اس لمحے جیسیکا کو اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ ''میں تمہیں یقین دلا دوں گی۔''

''کیسے؟''

''کیا تمہارے ساتھ کوئی ہے؟''

''ہاں، میرا شوہر ہے۔'' جیسیکا نے کہا۔

''اسے بلاؤ، میں تمہیں ابھی یقین دلاتی ہوں۔''

جپسی عورت بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ شاید جیسیکا کی بات سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ جیسیکا نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اس نے جلدی سے معذرت کی۔

''اگر میری بات سے تمہیں تکلیف ہوئی تو...''

''اسے چھوڑو، تم اپنے شوہر کو بلاؤ۔'' جپسی عورت کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔ جیسیکا عام حالات میں نہ تو بل کو اس عورت کے سامنے بلانا پسند کرتی جس کا.... بدن اس کے لباس سے جھلک رہا تھا اور نہ ہی وہ کسی کا ایسا لہجہ برداشت کرتی لیکن اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ زیادتی کر چکی ہے اس لیے وہ اس کی بات ماننے پر مجبور تھی۔ اس کے خیال میں بل واش روم سے آچکا ہوگا۔ اس نے بل کے سیل فون پر کال کی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

''جیسی! تم کہاں ہو؟'' بل کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں یہاں قسمت کا حال بتانے والی عورت کے اسٹال پر ہوں۔ تم اسی کے سامنے مجھے چھوڑ کر گئے تھے، اس کی تصویر بھی لگی ہے۔''

''او کے، میں نے دیکھ لیا... اب تم باہر آجاؤ۔''

''میں باہر نہیں آرہی بلکہ تم اندر آجاؤ۔''

''کیوں؟''

''پلیز بل!'' جیسیکا نے التجا کی تو بل بادلِ ناخواستہ پردہ ہٹا کر اندر آیا اور ایک لمحے کو اس کی نظر جپسی عورت پر جم کر رہ گئی۔ پھر اسے جیسیکا کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ گڑبڑا گیا۔ اس نے جھینپ کر پوچھا۔

''جیسی... کیا بات ہے؟''

''تمہیں میں نے بلایا ہے۔'' جپسی عورت کے لہجے میں ایک خاص لوچ آگیا۔ جو قدرت نے عورت کے گلے میں صرف مرد کے لیے رکھا ہے۔ وہ چاہے بھی تو اپنی جیسی دوسری عورت سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتی۔ بل ایک بار پھر اسے دیکھتا رہ گیا۔ جپسی عورت نے کہیں سے ایک اور فولڈنگ کرسی برآمد کی اور اپنے بائیں طرف رکھ دی۔ ''یہاں آجاؤ۔''

بل کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کیا ہے جیسی... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

جیسیکا خاموش تھی، اس بار بھی جپسی عورت نے کہا۔

''تمہاری بیوی اپنے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتی ہے لیکن اسے مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

جپسی عورت کے اتنے نزدیک بیٹھ کر بل کسی قدر نروس ہو رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

جپسی عورت نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اچانک ہی تن کر بیٹھ گئی۔ روشنی اب اس زاویے سے اس پر پڑ رہی تھی کہ اس کا جسم بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ بل نے بہ مشکل اس سے نظریں چرا کر جیسیکا کی طرف دیکھا تو وہ یوں مسکرائی جیسے اپنے شوہر کی اندرونی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ بل شرمندہ ہو گیا پھر اسے غصہ آنے لگا۔ وہ اتنا کمزور نہیں تھا کہ کوئی عورت اسے یوں آسانی سے اپنے سحر میں گرفتار کر لے۔ یہ یقیناً ماحول کا اثر تھا۔ اس نے جیسیکا سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔''

''نہیں، میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ اپنے علم میں کتنی سچی ہے۔'' جیسیکا نے انکار کر دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ''اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مجھے میرے مستقبل کے بارے میں بتائے گی۔''

اسی لمحے جپسی عورت نے آنکھیں کھول دیں اور اب

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹیس	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئرکنڈیشننگ	ایئر ٹکٹنگ	بوتیک فیشن	آلو سروسنگ
ٹیلیویژن وی سی آر کی مرمت	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈرائنگ پینٹنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹوگرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
ہومیو پیتھی / شمسی توانائی	مُہر سازی	سلمنگ بیوٹی	حکمت / اردو ادب
موٹر سائیکل مرمت / لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (ہومیو)	میڈیکل ایڈ	آرٹ پینٹنگ	ڈینٹل ٹیکنیشن
پولٹری ڈیری فارمنگ	نیوز رپورٹر	فلاور میکنگ	پبلک ریلیشن آفیسر

یہ تمام کورسز اردو میں سیکڑوں تصاویر اور ڈایا گرام کے ساتھ پرنٹڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک طلبہ کو گھر پر کراتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل رہنمائی۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او، اسلام آباد

اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ بل نے اس کی طرف دیکھا تو اسے اس میں خوب صورتی کے بجائے کرختگی کا احساس ہوا۔ اس کا جسم اتنا تن گیا تھا کہ غیر معمولی طور پر نمایاں تھا لیکن اب اس سے نسوانیت کے بجائے ایک طرح کا پتھریلا پن ٹپک رہا تھا۔ اس کی دل کشی اور رعنائی یک دم غائب ہو گئی تھی۔ اس نے جیسیکا کو گھور کر دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی۔ ''میں نے تمہارا مستقبل دیکھ لیا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔''

جیسیکا اس کی بات سے ذرا بھی ہراساں نہیں ہوئی اور نہ وہ جپسی عورت کی بدل جانے والی حالت سے متاثر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''اچھا... مجھے بھی تو پتا چلے کہ مستقبل میں میرے ساتھ کیا ہوگا؟''

''یہ میں تمہارے شوہر کو دکھاؤں گی۔ میرا خیال ہے تمہیں اس کی بات پر تو اعتبار ہوگا؟'' الفاظ کے برعکس اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔

''مجھے؟'' بل گھبرا گیا۔ ''نہیں... میں...''

جپسی عورت نے بل کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کی نسوانیت اور کشش لوٹ آئی تھی۔ ''تم فکر مت کرو، تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔''

''لیکن مجھے ان چیزوں پر اعتبار نہیں ہے۔'' بل نے مزاحمت کی۔

جپسی عورت نے بل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ تو اور اچھی بات ہے۔ تم یقین سے کہہ سکو گے کہ تم نے جو دیکھا ہے وہ تمہارا واہمہ یا توہم نہیں ہے۔''

اس کے ہاتھ کے لمس نے بل کا جسم سنسنا کر رکھ دیا اور وہ چند لمحے کے لیے سب بھول گیا۔ پھر وہ چونکا۔ ''لیکن... کیسے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' جپسی عورت نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔ جیسیکا کو اس پر غصہ آنے لگا، وہ اس کے سامنے اس کے شوہر سے کھیل رہی تھی۔ جیسیکا جانتی تھی کہ اس میں بل کا کوئی قصور نہیں۔ یہ عورت غیر معمولی کشش رکھتی تھی اور اس کے پاس آنے والا مرد اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بل نے ایک بار پھر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''میری آنکھوں میں دیکھو۔'' جپسی عورت نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تحکمانہ انداز میں کہا تو بل اس کی بڑی بڑی سحر انگیز اور پُرکشش آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے اردگرد کا سارا ماحول سمٹ کر اس کی آنکھوں تک محدود ہو گیا ہے۔ وہ آنکھیں جیسے سارے منظر پر حاوی ہو گئی تھیں۔ پھر اسے لگا جیسے ماحول سرخ ہو رہا ہو اور یہ سرخی دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ سرخی اتنی زیادہ ہو گئی کہ یہ سیاہی میں تبدیل ہونے لگی۔ پھر سیاہی گہری ہوتی چلی گئی۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے صرف سیاہی تھی۔ اس سیاہی نے اس کے پورے وجود کو گھیر لیا تھا۔ بل کو وحشت ہونے لگی لیکن اسی لمحے سیاہی میں ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا اور پھر ایک دائرہ آہستہ آہستہ یوں روشن ہوتا چلا گیا جیسے وولٹیج آنے سے بلب کی روشنی تیز ہوتی جاتی ہے۔

پھر یہ دائرہ کسی قدر روشن ہو گیا اور اس نے جیسیکا کو دیکھا۔ وہ سرتاپا عریاں تھی اور وہ خوف سے مرنے کے قریب تھی۔ وہ مسلسل ایک طرف دیکھ رہی تھی اور شاید کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مارے خوف کے اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ زمین پر گرتی پڑتی اور گھسٹتی ہوئی پیچھے جا رہی تھی جیسے کسی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کا ہاتھ سامنے کی طرف اٹھا ہوا تھا جیسے وہ کسی ہتھیار سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر دائرے میں ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں ایک خون آلود چاقو تھا۔ یہ ایک عام سا چاقو تھا جیسا کہ گھروں میں کچن میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی نوک سے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ چاقو والا ہاتھ جیسیکا کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ مسلسل پیچھے کھسک رہی تھی۔ لیکن کب تک... جلد دیوار آ گئی اور اب وہ مزید پیچھے نہیں جا سکتی تھی۔ چاقو والے ہاتھ پر پشت کی طرف گول جلنے کا نشان تھا، یہ بالکل وسط میں تھا۔

بل دم بہ خود سا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ سب دماغ کو سُن کر دینے والا ایک خواب لگ رہا تھا جس میں آدمی مزاحمت بھی نہیں کر پاتا۔ اس کے سامنے ایک قاتل قدم بہ قدم اس کی بیوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا عریاں بدن اور بکھرے بال بتا رہے تھے کہ اس سے پہلے بھی اس پر کوئی اور افتاد گزر چکی ہے۔ اب قاتل اس کی جان کے درپے تھا۔ بل نے اس وقت شدید خواہش محسوس کی کہ وہ جیسیکا کو بچا سکے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ قاتل کا ہاتھ بلند ہوا اور چاقو جیسیکا کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس وقت اس کی کھو جانے والی گویائی لوٹ آئی اور اس نے چیخ ماری۔ قاتل نے چاقو نکالا تو اس کے سینے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ قاتل نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس نے جیسیکا پر پے درپے

وار کیے اور اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ بل کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ قاتل کا ہاتھ روکنا چاہتا تھا۔ وہ جیسیکا کو تھامنا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکا۔ جیسیکا دیوار کے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو گئی اور اس کے جسم سے بہنے والا خون آس پاس پھیلنے لگا۔ منظر اس خون سے ایک بار پھر سرخ ہونے لگا اور پھر یہ سرخی سمٹ کر جپسی عورت کی آنکھوں تک محدود ہو گئی۔ اچانک بل کو احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور جیسیکا اس کے برابر میں بیٹھی ہے۔ اس کا ہاتھ بدستور جپسی عورت کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور وحشت زدہ آنکھوں سے جیسیکا کو دیکھا اور کانپتی آواز میں بولا۔

''یہ... یہ بکواس ہے؟''

جپسی عورت جیسے تھک گئی تھی۔ اس نے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔ جیسیکا بل کے ردعمل سے پریشان تھی۔ اس نے بل کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا ہوا ہے ڈیئر... تم پریشان ہو؟''

''یہ سب جھوٹ، بکواس اور دھوکا ہے۔'' بل کھڑا ہو گیا اور جپسی عورت کی طرف جھکا جو اپنی کرسی میں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ ''ہے نا... میں نے جو دیکھا وہ میرا واہمہ تھا؟''

''میں نہیں جانتی۔'' جپسی عورت سرگوشی میں بولی۔ ''جو تم نے دیکھا وہی میں نے بھی دیکھا ہے اور مستقبل یہی ہے۔''

''جھوٹ... بکواس۔'' بل تیز لہجے میں بولا۔ ''تم صرف دھوکے باز ہو۔ چلو جیسی یہاں سے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے جیسیکا کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا اور دوسرے لمحے خیمے سے باہر آ گیا۔

''مسٹر!'' عقب سے جپسی عورت نے کہا۔ ''میری فیس ادا کرتے جاؤ۔ میں مستقبل کے بارے میں بتانے کی فیس لیتی ہوں۔''

بل ایک جھٹکے سے رک گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا اور پلٹ کر خیمے میں آیا۔ ''کتنی فیس ہے تمہاری؟''

''دس ڈالرز۔'' وہ بولی۔

بل نے دس ڈالرز اس کے سامنے میز پر رکھ دیے اور جھک کر بولا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم دھوکے باز ہو لیکن میں یہ دھوکا کھانے کی فیس ادا کر رہا ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''میں نے جو بتایا ہے، وہ سچ ہے یا دھوکا... اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا... لیکن ایک مشورہ میں مفت میں دوں گی۔ اپنی بیوی کو اکیلا مت چھوڑنا۔ وہ اکیلے رہنے کی عادی نہیں ہے۔''

بل نے اس کی بات سنی اور اس پر توجہ دیے بغیر باہر آ گیا۔ وہ ذہنی طور پر بے حد منتشر اور پریشان ہو گیا۔ اس نے جو دیکھا تھا اسے اپنا واہمہ بھی قرار نہیں دے سکتا تھا جو کچھ دیکھا، بالکل واضح تھا۔ جیسیکا نے اس کی حالت محسوس کر لی تھی۔ وہ پارکنگ کی طرف جا رہے تھے تو جیسیکا نے ایک طرف کھلے شراب کے اسٹال کی طرف اشارہ کیا۔ ''بہتر ہوگا تم کچھ لے لو۔ اس وقت تمہارے اعصاب کو اس کی ضرورت ہے۔''

بل کو اس کا مشورہ درست لگا۔ وہ اسٹال کی طرف بڑھ گیا اس نے کاغذ کے گلاس میں اپنے لیے رم لے لی۔ اس کے چند گھونٹ پی کر بل خود کو بہتر محسوس کرنے لگا وہ پارکنگ کی طرف آئے۔ جیسیکا نے ڈرائیونگ خود کرنے کا فیصلہ کیا اور بل نے بھی بہتر سمجھا کہ چابی اس کو دے دے۔ اس کے اعصاب پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے۔ جیسیکا نے گاڑی پارکنگ سے نکالی۔ ہائی وے پر آ کر جیسیکا نے کہا۔

''بل! کیا تم بات کر سکتے ہو؟''

''ہاں... لیکن اس موضوع پر نہیں۔'' بل نے کہا۔ ''میں نے جو دیکھا ہے، وہ بہت زیادہ شاکنگ ہے۔''

''بل! پہلے تو ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ عورت فراڈ ہے اور اس کا کام یہی ہے۔''

''لیکن میں نے سب کچھ بالکل واضح دیکھا ہے۔''

''اس نے تمہیں دکھایا ہے۔'' جیسیکا کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''وہ ہپناٹزم کی ماہر لگ رہی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' بل نے شک سے کہا۔

''ہاں، میں نے سنا ہے کہ اس علم کے ماہر لوگ دوسروں کا ذہن اپنے قابو میں کر لیتے ہیں اور ان کو جو چاہے دکھا سکتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں نے جو دیکھا ہے، اس کا تمہارے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے... اور یہ اس عورت نے مجھے ارادتاً دکھایا ہے؟''

''یہی بات ہے۔ میں نے اسے چیلنج کر دیا تھا اور اس نے مجھے اور تمہیں ڈرانے کے لیے یہ حرکت کی ہے۔'' جیسیکا نے کہا اور پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتائی۔ ''وہ بہت چالاک عورت ہے۔ اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ تم نے دیکھا نہیں، اس نے کیسا حلیہ بنایا ہوا تھا؟ اس نے تمہیں پہلے ہی گڑبڑا دیا تھا۔''

بل جھینپ گیا کیونکہ وہ واقعی جپسی عورت کی دل کشی کے سامنے گڑبڑا گیا تھا۔ ''تم نے ٹھیک کہا... اس نے سچ مچ ایسا ماحول بنا دیا تھا جس میں انسان وہی کرنے پر مجبور ہو جاتا

ہے۔اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مستقبل میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے اور شاید اسی لیے میرا ذہن بن گیا اور میں نے وہی دیکھا جو وہ مجھے دکھانا چاہتی تھی۔''

''تم نے کیا دیکھا تھا؟'' جیسیکا نے نرمی سے پوچھا۔

بل نے اس بار انکار نہیں کیا اور آہستہ آہستہ اسے وہ سب بتا دیا جو اس نے خواب کی سی کیفیت میں دیکھا تھا۔ جیسیکا کا چہرہ یہ سن کر زرد ہو گیا لیکن اس نے جلد خود پر قابو پا لیا۔'' بکواس... میرا خیال ہے اس نے میری بات کا بدلہ لینے کے لیے تمہیں یہ سب دکھایا ہے تاکہ ہم پریشان ہو جائیں... اور اس وقت وہ ہم پر ہنس رہی ہوگی۔''

''شاید۔'' بل نے بے یقینی سے کہا۔'' کیا وہ عورت واقعی اتنی طاقت ور ہے کہ اس نے مجھے یہ سب دکھا دیا؟ میں ..... کمزور اعصاب کا آدمی نہیں ہوں جسے کوئی بھی اپنی مرضی پر چلائے۔''

''تم نے ٹھیک کہا لیکن وہ بہت شاطر عورت ہے۔ میں نے کہا نا وہ پورا ماحول بنا کر کام کرتی ہے اور اسی لیے کامیاب ہوتی ہے۔ اگر وہ کہیں اور یہ سب کرنے کی کوشش کرتی تو یقیناً ناکام رہتی۔''

بل کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔ اس روز وہ مزید چار گھنٹے سفر کر کے واشنگٹن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ان کا ارادہ ایک دن دارالحکومت میں رک کر وہاں کی سیر کا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں رکے اور اگلے دن انہوں نے شہر کی سیر کی۔ اس تفریح نے ان کے اعصاب پر چھائی کشیدگی کو خاصی حد تک کم کر دیا۔ دو دن بعد وہ نیویارک واپس پہنچ گئے۔ اس وقت تک وہ اس بات کو تقریباً بھول گئے تھے۔

بل نے طویل چھٹیاں کر لی تھیں اور اب اسے ملازمت پر جانا تھا۔ وہ اگلے دن سے کام پر جانے لگا جہاں سے اس کی تاخیر سے واپسی ہوتی تھی اور جیسیکا گھر میں اکیلی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ بل کا خوب صورت مکان سترویں شاہراہ پر ایک دیدہ زیب عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ یہ چھ کمروں کا عالی شان اپارٹمنٹ تھا جس تک رسائی کے لیے الگ سے زینہ تھا۔ اپارٹمنٹ بہترین فرنیچر اور آرائشی اشیا سے سجا ہوا تھا۔ ماسٹر بیڈ روم عقبی سمت تھا جہاں سکون تھا اور سڑک سے گزرنے والے ٹریفک کا شور وہاں بہت معمولی سا سنائی دیتا تھا۔ بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس سے ہی ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی سیڑھیاں گزرتی تھیں۔ لیکن وہ ذرا فاصلے پر تھیں اور اس سے ان کی خلوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اگر کوئی اس کھڑکی سے جھانکنا چاہتا تو بیڈ روم کی ایک دیوار ہی اسے نظر آتی، وہ بھی پردہ ہٹا ہونے کی صورت میں۔ جیسیکا اتنا اچھا گھر پا کر بے حد خوش تھی۔ وہ سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھی اور شام کو تیار ہو کر بل کا انتظار کرتی۔ وہ چھ یا زیادہ سے زیادہ سات بجے تک گھر آ جاتا اور اس کے بعد اس کا سارا وقت جیسیکا کے لیے ہوتا۔

ان کا ویک اینڈ مصروف گزرتا تھا۔ وہ رات کا کھانا باہر کھاتے پھر کہیں تفریح کرنے چلے جاتے۔ کبھی مووی دیکھنے جاتے اور کبھی کسی نائٹ کلب چلے جاتے۔ اتوار کا دن پکنک یا کسی پارٹی کے لیے مخصوص تھا۔ بل کا حلقۂ احباب بہت وسیع تو نہیں تھا لیکن اسے ہر اتوار کہیں نہ کہیں سے دعوت ملتی رہتی تھی۔ ان کا موڈ ہوتا تو وہاں چلے جاتے یا پھر کہیں اپنی پسند کی جگہ جاتے تھے۔ جیسیکا کو ساحل بہت پسند تھا۔ اتفاق سے ان دنوں گرمیاں تھیں اور وہ سمندر پر تفریح کے لیے جا سکتے تھے۔

ایک سال بعد وہ جپسی عورت اور اس کی پیش گوئی کو فراموش کر چکے تھے۔ ایک دن بل دفتر سے ذرا دیر سے آیا۔ اس دن مرمت کا ایک کام اچانک ہی درپیش آ گیا تھا۔ وہ گیارہ بجے گھر پہنچا تو اس کا انتظار کرتے کرتے جیسیکا سو چکی تھی۔ بل اپنی چابی سے تالا کھول کر اندر آیا۔ ٹی وی چل رہا تھا اور جیسیکا صوفے پر نیم دراز تھی۔ بل ٹی وی بند کرنے لگا تھا کہ نیوز کاسٹر کی آواز نے اسے متوجہ کر لیا۔ وہ کسی عورت کے قتل کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''قاتل نے گزشتہ رات گھر میں گھس کر مسز سمپسن کو آبرو ریزی کے بعد خنجر سے کئی وار کر کے ہلاک کر دیا۔ پولیس ابھی تک قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔ کیس کے تفتیشی افسر لیفٹیننٹ ریک کا کہنا ہے کہ یہ کوئی وحشی جنسی جنونی قاتل ہے کیونکہ آبرو ریزی اور قتل کے بعد بھی قاتل خاصی دیر مسز سمپسن کے گھر میں رہا اور اس کی لاش سے کھیلتا رہا اور اسے گھر کے مختلف حصوں میں گھسیٹتا رہا...''

''جنسی جنونی قاتل۔'' بل کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ جیسیکا بھی گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ اس نے باقی خبر سنی۔ مسز سمپسن کی رہائش سترویں شاہراہ پر ہی تھی اور یہ جگہ ان کے گھر سے ایک کلومیٹر دور تھی۔ گویا قاتل ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے مسز سمپسن کی تصویر دیکھی، وہ بہت خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اچھی دل کش عورت تھی اور اس کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ سمپسن ایک بیرا اسٹور میں منیجر تھا اور اس کی واپسی رات عموماً دیر سے ہوتی تھی۔ اس

رات بھی وہ بارہ بجے گھر پہنچا تھا اور اس نے اپنی بیوی کو خون میں لت پت مردہ حالت میں پایا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق مسز سمپسن کا قتل رات دس بجے ہوا تھا۔ قاتل دروازے کے راستے اندر داخل ہوا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی خاص طریقے سے تالا کھولا تھا۔ اندر کوئی کنڈی یا زنجیر نہیں لگی تھی۔ سمپسن کے دیر سے آنے کی وجہ سے عام طور سے دروازے پر تالا ہی لگا ہوتا تھا تاکہ سمپسن باہر سے چابی لگا کر اسے کھول کر اندر آ سکے۔ جیسا کہ بل بھی کرتا تھا اور مسز سمپسن کو دروازہ نہیں کھولنا پڑتا تھا۔ بل خبر دیکھنے میں اتنا گم تھا کہ اسے جیسیکا کے جاگنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

''تم آ گئے؟'' جیسیکا خمار آلود لہجے میں بولی۔

''ہاں... یہ خبر دیکھو۔''

جیسیکا بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی اور جب اس نے قتل کے بارے میں جانا تو وہ بھی خوف زدہ نظر آنے لگی۔

''میرے خدا... یہ جگہ تو ہمارے گھر سے کچھ ہی دور ہے۔''

''اب تمہیں احتیاط کرنی ہوگی۔'' بل نے کہا۔'' کل سے دروازے کی کنڈی اور زنجیر بھی لگا کر رکھنا اور بغیر تصدیق کے کسی کو اندر آنے کی اجازت مت دینا۔''

''میں تو ویسے ہی کسی کو اندر آنے نہیں دیتی۔'' جیسیکا نے جھرجھری لی۔'' یہ تو بہت خوف ناک بات ہے۔''

بل نے فوراً گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے چیک کیے۔ داخلی دروازہ ایک ہی تھا اور یہ بہت مضبوط لکڑی کا بنا تھا۔ اس کا تالا بھی آسانی سے کھلنے والا نہیں تھا۔ اکثر کھڑکیاں .... محفوظ اور اس طرح سے تھیں کہ ان سے کوئی گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ماسٹر بیڈ روم کی کھڑکی ہنگامی زینے سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھی اور اس کا پٹ شیشے کا تھا جسے کھولنا ناممکن نہیں تھا۔ شیشہ کاٹ کر یہ کام بہ آسانی کیا جا سکتا تھا۔ بل نے فیصلہ کیا کہ اس کھڑکی کے باہر وہ مضبوط فولادی گرل لگا دے گا جسے تالا لگا کر بند کیا اور کھولا جا سکتا ہو۔

اس قتل نے بل کو بہت زیادہ بے چین کر دیا۔ جیسیکا کا خیال تھا کہ یہ خبر کا فوری ردِعمل تھا لیکن جب وہ مسلسل تشویش زدہ رہا تو جیسیکا نے اسے سمجھایا۔'' یہ نیویارک شہر ہے اور یہاں ایسی وارداتیں معمول کی بات ہیں۔''

''پھر بھی ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' بل نے اصرار کیا۔

اچانک جیسیکا کو جپسی عورت کی پیش گوئی یاد آ گئی۔ ''بل! کہیں تم اب تک اس عورت کی باتوں کو تو سچ نہیں سمجھ رہے ہو؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔'' لیکن اگر کوئی قاتل ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر واردات کر جائے تو ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ تم گھر میں اکیلی ہوتی ہو اور مجھے کبھی کبھی دیر بھی ہو جاتی ہے۔ یہ قاتل عام طور سے ایسے گھروں میں ہی واردات کرتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ قاتل اتفاقاً مسز سمپسن کے گھر میں گھسا ہوگا؟ نہیں، اس نے پہلے تمام معلومات حاصل کیں اور پھر کسی طریقے سے اس وقت تالا کھول کر گھر میں داخل ہو گیا جب مسز سمپسن اکیلی تھی۔''

بل کی بات نے جیسیکا کے کم ہو جانے والے خوف کو پھر سے تازہ کر دیا۔ بل کی باتوں میں وزن تھا۔ انہیں واقعی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ آنے والے اتوار کو بل نے کھڑکی کے باہر فولادی گرل لگوا دی اور اسے ایک پٹ کی طرح لگوایا جس کے اندر تالا لگانے کی جگہ تھی اور بہ وقتِ ضرورت وہ اسے کھول کر ہنگامی زینے استعمال کر سکتے تھے۔ یہ کام کرنے کے بعد بل اور جیسیکا نے اطمینان محسوس کیا۔ اب قاتل یا کسی بھی فرد کے لیے ان کے گھر میں داخل ہونا آسان کام نہیں تھا۔ مزید حفاظتی تدبیر کے طور پر بل نے ایک سیکیورٹی سسٹم خرید لیا۔ اس سسٹم پر ایک سے لے کر نو تک بٹن تھے اور چار نمبر کا کوڈ دبانے پر خود بہ خود نزدیکی پولیس اسٹیشن میں ہنگامی مدد کا پیغام ارسال ہو جاتا تھا اور پولیس فوراً اس پتے پر روانہ ہو جاتی جو اسے پہلے سے فراہم کیا ہوا ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ سسٹم ذرا مہنگا تھا لیکن بل نے جیسیکا کے خیال سے لے لیا۔ اس نے داخلی دروازے پر نئی مضبوط کنڈی اور زنجیر بھی لگوا دی تھی۔

ان کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا تھا اور ابھی تک ان کے گھر میں کسی بچے کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جیسیکا کو بچوں سے دلچسپی نہیں تھی جبکہ بل کی خواہش تھی کہ اب ان کے گھر میں کوئی بچہ آنا چاہیے لیکن جیسیکا کی عدم دلچسپی دیکھ کر وہ بھی خاموش تھا۔ اس کے خیال میں ابھی ان کے پاس بہت وقت تھا۔

مسز سمپسن کے قتل کو ایک مہینا گزر گیا۔ دوسروں کے ساتھ بل اور جیسیکا بھی اسے بھول چکے تھے۔ ویسے بھی وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ بل ان دنوں پھر دیر سے آ رہا تھا۔ پاور ہاؤس میں ایک توسیعی منصوبے پر کام جاری تھا اور اکثر بل کو دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ اس رات بھی وہ دیر سے آیا تھا۔ اس نے کال بیل بجائی تو جیسیکا نے ذرا دیر سے دروازہ کھولا۔ وہ سو گئی تھی، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نائٹی پہنے ہوئے تھی۔

''آج پھر تم نے دیر کر دی؟'' اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''سوری جان!'' بل نے اس کا رخسار چوما۔ ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔''

جیسیکا نے اس کا کوٹ لیا۔ ''تم نے کھانا کھالیا؟''

''ہاں۔'' بل نے جوتے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور تم نے کھالیا؟''

''میرا موڈ نہیں تھا بنانے کا اس لیے میں ریستوران چلی گئی تھی۔'' جیسیکا بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

تھکن اتارنے کے لیے بل وہیں صوفے پر دراز ہو گیا اور اس نے ٹی وی کھول لیا۔ نیوز چینل لگاتے ہی وہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔ قاتل نے پھر وار کیا تھا اور اس بار بھی اس نے سترویں شاہراہ منتخب کی تھی۔ ان کے گھر سے صرف دو بلاک آگے۔ اس نے ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر وہاں رہنے والی ایک اکیلی عورت کو قتل کر دیا تھا۔ اس نے پہلے زیادتی کی اور پھر مسز سمپسن کی طرح اسے خنجر سے کئی وار کر کے قتل کر دیا تھا۔ شیلا مورگن نامی یہ عورت غیر شادی شدہ تھی اور اس کی پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی۔ وہ گزشتہ دو سال سے اس اپارٹمنٹ میں اکیلی رہ رہی تھی۔ قاتل نے اسے باندھ کر اور ٹیپ سے اس کا منہ بند کر کے اپنی کارروائی کی تھی کیونکہ یہ اپارٹمنٹ چھوٹا تھا اور یہاں ہونے والی چیخ و پکار آس پاس سنی جا سکتی تھی۔

ڈاکٹرز نے زخموں کا معائنہ کر کے بتایا کہ قتل اسی خنجر سے کیا گیا تھا جس سے مسز سمپسن کا قتل ہوا تھا۔ طریقۂ واردات بھی وہی تھا۔ قاتل دروازے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور اپنا کام کر گیا تھا۔ اس بار بھی اس نے اپنے بارے میں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ قتل رات گیارہ بجے کے آس پاس ہوا تھا۔ اس دوران عمارت کے آس پاس سناٹا ہوتا تھا۔ کسی نے قاتل کو آتے جاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ٹی وی رپورٹ کے مطابق دوسرے قتل نے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی اور خاص طور سے اس علاقے سے لوگ پولیس کی نااہلی کی شکایت کر رہے تھے جس نے پہلے قتل کے بعد بس خانہ پُری کی حد تک تفتیش کی تھی۔ اگر وہ سرگرمی سے قاتل کو تلاش کرتی تو اس دوسرے قتل کی نوبت ہی نہ آتی۔ لوگ اور خاص طور سے وہ خواتین جو اکیلی رہتی تھیں، عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھیں۔

''بل! کیا سونا نہیں ہے؟'' بیڈ روم سے جیسیکا کی آواز آئی۔

''ایک منٹ... آیا۔'' بل نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس نے آ کر کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ''تم نے آج ٹی وی دیکھا؟''

''ہاں... کیوں، کوئی خاص بات؟''

''پھر ایک عورت کا قتل ہوا ہے۔'' بل فکرمندی سے بولا۔

جیسیکا چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ''اسی قاتل نے کیا ہے؟''

بل نے سر ہلایا۔ ''پولیس کا یہی کہنا ہے۔ جیسی! اب ہمیں اور خاص طور سے تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ تم گھر میں اکیلی ہوتی ہو۔ اس بار بھی قاتل دروازے سے داخل ہوا تھا۔''

''میں ایک لمحے کو بھی دروازے کو زنجیر اور کنڈی کے بغیر نہیں چھوڑتی۔''

''پھر بھی احتیاط کرنا۔ کبھی کبھی انسان سے بھول ہو جاتی ہے۔ شیلا نامی اس عورت نے بھی زنجیر کے ہوتے ہوئے اسے استعمال نہیں کیا تھا اور قاتل کو اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا تھا۔''

جیسیکا اس موضوع سے کچھ بیزار لگ رہی تھی۔ اس نے قتل کی خبر کے بارے میں زیادہ تجسس نہیں دکھایا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گی۔''

''ممکن ہے میں کل بھی دیر سے آؤں۔'' بل نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ مسلسل بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی نے اسے تھکا دیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اسے دیر ہو رہی تھی۔ جیسیکا کو جگانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر خود ہی تیاری کی اور ناشتا کیے بغیر دفتر روانہ ہو گیا۔ اسے دفتر پہنچ کر خیال آیا کہ اس نے جیسیکا سے دروازہ بند کرنے کو تو کہا ہی نہیں تھا۔ اس نے گھر فون کیا۔ کافی دیر کے بعد جیسیکا نے فون اٹھایا۔

''سوری ڈیئر! میں نکلتے وقت تمہیں جگانا بھول گیا تھا۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' جیسیکا نے جماہی لے کر کہا اور فون بند کر دیا۔

اس دن موسم ٹھیک نہیں تھا اور شام سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ ستمبر کے شروع میں بارش کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا اور گرمی کا اثر ختم ہونے لگا تھا۔ بل رات گیارہ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ وہ وین گلی میں پارک کرتا تھا اور یہ ریزرو پارکنگ تھی جو بلڈنگ میں رہنے والوں کے لیے مخصوص تھی۔ وین پارک کر کے وہ نیچے اترا اور جلدی سے سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ اتفاق سے وہ چھتری لانا بھول گیا تھا۔ اس لیے دروازے تک آتے آتے خاصا بھیگ گیا تھا۔

اس نے چھجے کے نیچے کوٹ سے پانی جھاڑتے ہوئے ایسے ہی پلٹ کر دیکھا تو اسے سڑک پار فٹ پاتھ پر ایک شخص نظر آیا۔ وہ برستے پانی میں ساکت کھڑا تھا اور اس کا رخ عین بل کے اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ اس نے کسی قدر لمبا کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ہیٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بل کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تو اس آدمی کو بھی احساس ہو گیا اور وہ اچانک ایک طرف چل پڑا۔ بل اوپر آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھا اور اس کے اپارٹمنٹ کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا؟ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ جیسیکا حسبِ معمول سو چکی تھی اور اس نے کسی قدر دیر سے دروازہ کھولا۔ اپنے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے اس نے بل کی ہیلو کا جواب دیا اور اندر چلی گئی۔ بل دروازہ بند کر کے اندر آیا۔ اس نے لاؤنج کی کھڑکی سے سامنے فٹ پاتھ پر دیکھا۔ وہ آدمی جا چکا تھا۔ اگرچہ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن نہ جانے کیوں بل کا دل مطمئن نہیں تھا۔ آخر وہ شخص اتنی شدید بارش میں یہاں کیوں کھڑا ہوا تھا اور اس کے اپارٹمنٹ کی طرف ہی کیوں دیکھ رہا تھا؟ کپڑے بدلتے ہوئے اس نے بیڈ روم کی کھڑکی کا معائنہ کیا۔ اس کی گرل میں تالا لگا ہوا تھا اور ہنگامی زینے نیچے چھوٹی گلی میں اترتے تھے۔ یہ ویران گلی تھی جس میں سوائے کوڑے دانوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اگر کوئی شخص ہنگامی زینے سے اوپر آنا چاہتا تو اسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' بستر میں گول مول ہو کر لیٹی جیسیکا نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، ابھی جب میں اندر آ رہا تھا تو ایک شخص سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا ہمارے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔''

''کسی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ہمارے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھے ہ؟''

''نہیں، وہ بارش میں کھڑا تھا اور اس طرح کون بلاوجہ بھیگتا ہے۔'' بل نے کہا اور نہانے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو جیسیکا سو چکی تھی۔ اس نے کھانے کا نہیں پوچھا تھا کیونکہ بل اتنی دیر سے آیا تھا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب اس نے تینوں وقت کا کھانا گھر سے باہر کھایا تھا۔ اس نے جیسیکا کے بال سنوارے اور آہستہ سے بولا۔ ''سوری جان! بس چند مہینوں کی بات ہے پھر یہ کام مکمل ہو جائے گا اور میں جلدی گھر آیا کروں گا۔''

بل کو احساس تھا کہ جیسیکا ان دنوں مکمل طور پر تنہائی کا شکار تھی۔ جب وہ گھر آتا تو رات گہری ہو چکی ہوتی اور پھر صبح سویرے اسے کام پر جانا ہوتا۔ وہ جیسیکا کو بالکل بھی وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ لیکن ایک بار اس کا پروجیکٹ مکمل ہو جاتا تو وہ اس کی تلافی کر سکتا تھا۔ اسے کام مکمل ہونے پر بونس اور چھٹیاں ملتیں تو وہ جیسیکا کو کہیں تفریح کرانے لے جا سکتا تھا۔

صبح وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ موسم صاف ہو گیا تھا اور بارش بھی رک گئی تھی۔ جیسیکا کچن میں اس کے لیے ناشتا بناتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اچانک بل نے اس کی آواز سنی۔

''بل! جلدی آؤ۔''

''کیا ہوا؟'' وہ اپنی ٹائی باندھتا ہوا لاؤنج میں آیا۔ کچن اس کے ساتھ ہی تھا۔ ٹی وی پر ایک اور قتل کے بارے میں بتایا جا رہا تھا اور نیچے ہیڈ لائن چل رہی تھی۔

''قاتل کا ایک اور شکار!''

''میرے خدا....!'' بل بولا۔ ''یہ تو ہمارے گھر کے پاس ہے۔ وہ دیکھو، نیلی بلڈنگ... اس کا نام شاید مارسن ہاؤس ہے۔''

خبر کے مطابق کل رات ایک بجے قاتل مارسن ہاؤس کے ایک فلیٹ میں داخل ہوا... اور اس بار اس نے ہنگامی زینے استعمال کیے تھے۔ وہ کھڑکی کے راستے فلیٹ میں داخل ہوا اور اس نے اندر سوئی ہوئی میگٹ نامی عورت کو آبروریزی کے بعد بے دردی سے خنجر کے وار کر کے..... قتل کر دیا تھا۔ طریقۂ واردات بالکل وہی تھا اور اس بار بھی استعمال ہونے والا آلۂ قتل بھی وہی تھا۔ میگٹ کا بوائے فرینڈ جارج ایک بار میں اٹینڈنٹ تھا اور وہ روزانہ رات تین چار بجے تک گھر آتا تھا۔ وہ رات ساڑھے تین بجے گھر پہنچا تو دیر تک دروازہ بجانے پر بھی میگٹ نے دروازہ نہیں کھولا۔ اندر زنجیر لگی تھی اس لیے جارج کو دروازہ توڑنا پڑا اور جب وہ اندر داخل ہوا تو میگٹ کی لاش لاؤنج میں پڑی تھی۔ چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔ جارج دل کا مریض تھا اور اسے یہ منظر دیکھ کر ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ جارج ابھی تک آئی سی یو میں تھا۔

پینتیس سال کی میگٹ ایک نائٹ کلب میں ڈانسر تھی لیکن گزشتہ دو ہفتے سے وہ کام پر نہیں جا رہی تھی کیونکہ اس کی کمر کی ہڈی کا ایک مہرہ ہل گیا تھا اور ڈاکٹر نے اسے دو مہینے کا بیڈ ریسٹ بتایا تھا۔ وہ گھر میں ہوتی تھی اور اسی دوران میں قاتل کا نشانہ بن گئی۔ مارسن ہاؤس بل کے اپارٹمنٹ سے صرف سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ خبر سنتے ہوئے صرف وہی

متوحش نہیں تھا بلکہ جیسیکا بھی خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ بل کو رات والا شخص یاد آگیا۔ پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ جب بل نے اسے دیکھا تھا تو وہ مارسن ہاؤس والی سمت گیا تھا۔ تو کیا وہی قاتل تھا اور تاک میں تھا؟ کیا اسے معلوم ہوگیا تھا کہ جیسیکا اس وقت گھر میں اکیلی ہوتی ہے؟ اگر یہ سچ تھا تو بہت تشویشناک تھا۔ قاتل کل رات جیسیکا کی تاک میں تھا۔

”نہیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟“ بل کی بات سن کر جیسیکا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ بل نے پریشان ہوکر کہا۔

”لیکن ہم پولیس کو کیا بتائیں گے؟“ جیسیکا نے کہا۔ ”یہ کہ ایک جپسی عورت نے تمہیں میرے قتل کا منظر دکھایا تھا یا یہ کہ ایک شخص کل رات بارش میں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا تھا؟ دونوں باتیں پولیس کے لیے غیر اہم ہیں۔“

”لیکن ہمارے گھر سے صرف سو گز دور قتل کی واردات ہوچکی ہے۔“

”ہاں مگر اس سو گز کے اندر ہمارے علاوہ بھی تو بہت سارے لوگ رہتے ہیں اور صرف ہم پولیس کے پاس جائیں گے تو ہمارا تماشا بن جائے گا۔“ جیسیکا نے نفی میں سر ہلایا۔

”اگر میں پولیس کو صرف اس شخص کے بارے میں بتاؤں جو رات کو فٹ پاتھ پر کھڑا تھا؟“

”اس کا فائدہ کیا؟ تم نے اس کا حلیہ دیکھا تھا، اس کی صورت دیکھی تھی؟ تم پولیس کو اس کے بارے میں کیا بتا سکو گے؟ الٹا خود مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ پولیس بار بار تم سے سوالات کرنے کے لیے آن موجود ہوگی یا تمہیں پولیس اسٹیشن بلا لیا کرے گی۔“ جیسیکا اس کے اصرار پر چڑ گئی۔ ”پہلے ہی تم رات گئے آتے ہو، اب کیا ڈیوٹی سے پولیس اسٹیشن جاؤ گے اور وہاں سے صبح دفتر چلے جایا کرو گے۔“

بل اگرچہ جیسیکا کی باتوں سے متفق نہیں تھا لیکن اس کی آخری بات نے بل کو پسپائی پر مجبور کردیا۔ ان دنوں اس کا موڈ خراب تھا اور اس کی وجہ بھی ظاہر تھی لیکن بل کی بھی مجبوری تھی۔ اس کی نوکری کا سوال تھا اور نوکری بھی بہت اچھی تھی۔ اس میں ترقی کا امکان تھا۔ وہ جس منصوبے پر کام کررہا تھا، اس کے بعد امکان تھا کہ بل اور اس کے ساتھیوں کو اگلے گریڈ میں ترقی دے دی جاتی۔

وہ رات گئے دفتر سے آیا تو اس نے سب سے پہلے ٹی وی لگایا۔ ایک نیوز چینل سے تازہ واردات کے بارے میں خبر آرہی تھی۔ ابھی تک پولیس قاتل کو تلاش کرنے یا اس کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ اتنا چالاک تھا کہ اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کی چالاکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے تین عورتوں کو زیادتی کے بعد قتل کیا لیکن کسی ایک واردات میں بھی پولیس کو ڈی این اے تجزیئے کے لیے کوئی مواد نہیں ملا تھا اور نہ ہی کہیں انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ تمام حفاظتی انتظامات سے لیس ہوتا ہے۔ تیسرے قتل نے سیریل کلر کی دہشت میں اضافہ کردیا تھا۔ صرف چالیس دن میں اس نے تین عورتوں کو قتل کردیا تھا اور پوری بے خوفی سے آزاد گھوم رہا تھا۔ سماجی اور سیاسی رہنماؤں نے ان وارداتوں پر ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے پولیس کو تفتیش تیز کرنے کا حکم دیا تھا اور پولیس نے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے آس پاس مشکوک لوگوں پر نظر رکھیں اور اگر کسی پر سیریل کلر کا شبہ ہو تو فوراً پولیس کو اطلاع کریں۔ پولیس نے زور دیا تھا کہ معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ بل کو ایک بار پھر خیال آیا کہ وہ پولیس کو اس مشکوک شخص کے بارے میں بتادے لیکن پھر اس نے یہ خیال مسترد کردیا۔ اول تو اس میں دیر ہوگئی تھی اور دوسرے اس کے پاس پولیس کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

بل نے محسوس کیا کہ اب جیسیکا اس کی طرف سے بے پروا ہوتی جارہی ہے، وہ نہ تو اس سے زیادہ بات کرتی تھی اور نہ ہی اس کی گرم جوشی کا جواب گرم جوشی سے دیتی تھی۔ وہ دفتر سے آتا تو دروازہ کھول کر واپس جاکر سو جاتی۔ اس کے بعد بل بھی اپنے معمولات پر عمل کرکے سونے کے لیے لیٹ جاتا۔ صبح جیسیکا ناشتا تیار کرکے اسے اٹھا دیتی اور پھر خود سو جاتی۔ وہ ناشتا کرکے اور تیار ہوکر دفتر چلا جاتا۔ بل اس بات کو محسوس کررہا تھا اور وہ جیسیکا کا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کرتا تھا لیکن عورت کو مرد کی مکمل توجہ درکار ہوتی ہے۔ بل فی الحال اسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا پروجیکٹ ختم ہوجاتا تو وہ ایک ساتھ ہی ساری تلافی کرکے جیسیکا کو منا لیتا۔ اب اس کا کام صرف ایک مہینے کا رہ گیا تھا کیونکہ پروجیکٹ توقع سے پہلے مکمل ہونے والا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ تیسرے قتل کے بعد قاتل نے پھر وار نہیں کیا تھا۔ اصل میں لوگ اور خاص طور سے اکیلی عورتیں ہوشیار ہوگئی تھیں اور اب اپنی حفاظت پر خاص توجہ دے رہی تھیں جس کی وجہ سے قاتل کو موقع نہیں مل رہا تھا۔ پھر پولیس نے بھی سترویں شاہراہ پر اپنا گشت بڑھا دیا تھا۔ بل حسبِ معمول صبح جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ سوائے اتوار کے

اسے گھر میں وقت گزارنے کا موقع کم ملتا تھا لیکن اتوار کا دن مختلف کاموں میں گزر جاتا اور ان کو کہیں باہر جانے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ جیسیکا نے اس بارے میں اس سے شکایت تو نہیں کی تھی لیکن بل کو احساس تھا کہ وہ اندر سے اس سے ناراض ہے۔ وہ جب جیسیکا کا بنا ہوا منہ دیکھتا تو دل ہی دل میں کہتا۔ ”جان! فکر مت کرو بس کچھ دن کی بات ہے۔ تمہاری ساری شکایتیں دور کردوں گا۔“

اس روز اتفاق سے کام جلدی نمٹ گیا اور وہ آٹھ بجے ہی گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ جب وہ اپنی بلڈنگ کے پاس پہنچا تو اس نے دور سے فٹ پاتھ پر ایک شخص کو کھڑے دیکھا۔ وہ اس کے اپارٹمنٹ کے عین سامنے کھڑا ہوا تھا۔ بل کو یہ وہی شخص لگا۔ اس نے بے ساختہ بریک لگائے اور گاڑی کو ذرا دور سڑک کے کنارے روک دیا۔ وہ اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو ساکت کھڑا تھا۔ بل گاڑی میں ہی ... بیٹھا رہا۔ ویسے بھی اس جگہ اندھیرا تھا، اگر فٹ پاتھ پر کھڑا شخص گاڑی کی طرف دیکھتا، تب بھی اسے بل نظر نہیں آتا۔

چند منٹ بعد وہ سڑک عبور کرکے عمارت کی طرف بڑھا۔ بل کا دل دھڑک اٹھا کیونکہ وہ عقبی گلی کی طرف جارہا تھا۔ وہ جلدی سے کار سے اترا اور درختوں اور گاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ جب تک وہ گلی کے سرے تک پہنچتا، وہ شخص ہنگامی زینوں تک پہنچ گیا تھا۔ بل اس کو دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شخص زینے کو نیچے لانے کی کوئی کوشش کرے گا۔ یہ اسپرنگ کی مدد سے پہلی منزل تک سمٹ جانے والے زینے تھے جن پر دباؤ ڈالا جائے تو وہ پھیل کر زمین تک آجاتے ہیں۔

لیکن لمبے کوٹ والے نے اس کے بجائے وہاں کوڑے دانوں کو کھنگالنا شروع کردیا۔ وہ کوڑا نکال نکال کر پھینک رہا تھا اور شاید اسے کھانے کی کسی چیز کی تلاش تھی کیونکہ اس نے ایک چھوٹا سا برگر کا ٹکڑا ملتے ہی اسے منہ میں ڈال لیا تھا اور اب اسے چباتے ہوئے کچھ اور تلاش کررہا تھا۔ ایک ڈبے سے مایوس ہوکر وہ دوسرا کھنگالنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کچرے میں کھانے کی چیزیں نہ پھینکنے والوں کو دبی زبان میں گالیاں بھی دے رہا تھا۔ بل کے تنے ہوئے اعصاب نرم پڑ گئے۔ اس کی توقع کے برعکس وہ قاتل نہیں بلکہ ایک آوارہ گرد ثابت ہوا تھا جو کچرے کے ڈھیر سے چن کر چیزیں کھاتا تھا۔ بل نے اوپر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ گلی سے نکل آیا اور گاڑی کی طرف آیا لیکن فوری گھر جانے کے بجائے اس نے گاڑی ایک نزدیکی بار کی طرف موڑ دی۔ وہ وہاں بارہ بجے تک رہا اور پھر گھر روانہ ہوگیا۔ اس نے بیل بجائی۔ حسبِ معمول جیسیکا نے خاصی دیر بعد دروازہ کھولا۔ وہ سوتے سے اٹھ کر آئی تھی اور اس دن بھی وہ اس سے بات کیے بغیر واپس سونے کے لیے چلی گئی۔ بل بھی کپڑے بدل کر بیڈ روم میں آگیا اور جیسیکا کے برابر میں بستر پر دراز ہوگیا۔

اگلے دن سے بجلی گھر کی توسیع کی آزمائش شروع ہوگئی اور لگائے جانے والے نئے گرڈز میں آزمائشی طور پر بجلی چھوڑ دی گئی تھی۔ بل کا کام ختم ہوگیا تھا اور اب اسے صرف نگرانی کرنی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا کمپیوٹر اسکرینوں کی مدد سے نگرانی کا کام کرتا رہتا تھا۔ یہ کام ایک ہفتہ جاری رہتا اور اس کے بعد پروجیکٹ ختم ہوجاتا۔ بل کو مسلسل بارہ گھنٹے تک نگرانی کا کام کرنا پڑتا تھا اور اس کے بعد دوسرا انجینئر آجاتا اور بل چھٹی کرکے گھر کی طرف روانہ ہوجاتا۔

آزمائش کا تیسرا دن تھا اور بل چھٹی کرکے دس بجے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ ایک گھنٹے کا تھا اور جب وہ اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کے سامنے پہنچا تو وہاں کئی پولیس کاریں کھڑی دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ پولیس والے لوگوں کو آگے جانے سے روکنے کے لیے پیلی پٹی لگا رہے تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کر پولیس والوں کی طرف لپکا۔ ایک پولیس والے نے اسے روکا تو اس نے بے تابی سے کہا۔ ”میں اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔ یہاں کیا ہوا ہے؟“

”تم کس اپارٹمنٹ میں رہتے ہو؟“ پولیس افسر نے پوچھا۔

”یہ سامنے والے؟“ بل نے لاؤنج کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس افسر نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے مسٹر؟“

”بل... بل کولن۔“

”مسٹر کولن! مجھے افسوس ہے... تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ بل نے چیخ کر کہا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ پولیس افسر نے کہا اور اسے پیلی پٹی کے دوسری طرف لے گیا۔ وہ سیڑھیوں سے بل کے اپارٹمنٹ تک آئے۔ کھلے دروازے سے اندر کئی پولیس والے دکھائی دے رہے تھے جو مختلف کام کررہے تھے۔ ”کسی

چیز کو ہاتھ مت لگانا۔'' پولیس افسر نے اس سے کہا۔
''اندر کیا ہوا ہے؟'' بل کو اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔
پولیس افسر اسے کچن کے برابر والے کمرے میں لایا اور دروازے پر رک گیا۔ سامنے ایک دیوار کے ساتھ جیسیکا اس حالت میں پڑی تھی کہ اس کے عریاں بدن پر چاقو کے بے شمار زخم تھے اور وہ یقیناً مر چکی تھی۔ بالکل وہی منظر تھا جو جپسی عورت نے اسے دکھایا تھا۔ ایک آدمی اس کا جسم سفید چادر سے ڈھانپ رہا تھا۔ بل کو لگا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔ وہ پہلے نیچے بیٹھا اور پھر لڑھک گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب بل کو ہوش آیا تو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں ہی تھا اور ایک طرف رکھے کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ بے ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ اٹھا تو ایک سفید کوٹ والا اس کی طرف آیا۔
''اٹھو مت... ابھی تمہاری حالت اچھی نہیں ہے۔''
''جیسیکا... وہ...'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔
اسے اوپر لانے والا پولیس افسر اس کے پاس آیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ وہ مر چکی ہے۔ ہم نے ڈیڈ باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دی ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد وہ تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔ وہ تمہاری کون ہے؟''
''میری بیوی ہے۔'' بل نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''
''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہومی سائڈ والے تفتیش کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں اور وہ آنے والے ہیں..... بظاہر یہ اسی سیریل کلر کی کارروائی لگ رہی ہے جس نے اس سے پہلے بھی تین عورتوں کو قتل کیا ہے۔''
''قاتل؟'' بل نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔
''سیریل کلر۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''تم اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟''
''میں ڈیوٹی سے آرہا ہوں۔'' بل نے اسے اپنی جاب کے بارے میں بتایا۔
''تمہاری ڈیوٹی اس وقت آف ہوتی ہے؟''
''نہیں، اصل میں پاور ہاؤس میں ان دنوں توسیع کا کام جاری ہے ورنہ میری ڈیوٹی شام پانچ بجے ختم ہو جاتی ہے۔''
''قاتل دروازے سے داخل ہوا اور وہیں سے رخصت ہو گیا۔''
''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' بل چونکا۔
''کیونکہ کسی کھڑکی میں کوئی بریک اپ نہیں پایا گیا اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔''
''کیا قاتل نے دروازے کا تالا کھولا... یا اسے توڑ دیا تھا؟''
''اس کے لیے دروازہ تمہاری بیوی نے کھولا کیونکہ تالے یا اس کی زنجیر میں بھی کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہے۔ پھر قاتل جاتے وقت دروازہ بند کر گیا۔ اس میں آٹومیٹک لاک لگ گیا تھا۔ ویسے کیا وہ ہر ایک کے لیے دروازہ کھول دیا کرتی تھی؟''
بل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہرگز بھی نہیں... میں نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے دروازہ نہ کھولے۔ سیریل کلر والے واقعات کے بعد تو وہ اور بھی محتاط ہو گئی تھی۔''
''لیکن دروازہ اسی نے کھولا ہے۔ جب پولیس نے دروازہ توڑا تو اس کا لاک لگا ہوا تھا اور فارنسک والوں نے تصدیق کی ہے کہ لاک کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہے۔''
''ممکن ہے کال بیل بجنے پر جیسی سمجھی ہو کہ میں آگیا ہوں اور اس نے بغیر پوچھے اور باہر دیکھے دروازہ کھول دیا ہو۔''
''ہو سکتا ہے۔''
''پولیس کو کس نے اطلاع دی؟''
''ایک نامعلوم آدمی نے فون بوتھ سے کال کر کے بتایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے ایک مرد کو ایک عورت پر تشدد کرتے دیکھا ہے۔ عام طور سے پولیس اس قسم کی نامعلوم افراد کی طرف سے کی جانے والی کالز پر ایکشن نہیں لیتی لیکن سیریل کلر کی وجہ سے پولیس ان دنوں چوکس ہے۔ مجھے اور میرے ساتھی کو یہاں بھیجا گیا اور ہم نے دروازے کو اندر سے بند پایا۔ وارننگ کے بعد بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو ہم نے اسے توڑ دیا۔''
''اندر... جیسی اسی حالت میں پڑی تھی؟''
''ہاں، ڈاکٹر کے مطابق اس کی موت آٹھ سے ساڑھے آٹھ کے درمیان میں ہوئی ہے اور قاتل نے مارنے سے پہلے اس کے ساتھ زیادتی بھی کی ہے۔ لیکن حتمی بات پوسٹ مارٹم سے ہی پتا چلے گی۔ تم دونوں کی شادی کب ہوئی؟''
بل ایک بار پھر روہانسا ہو گیا۔ ''ہماری شادی کو دو سال بھی نہیں ہوئے۔ ابھی آنے والے مارچ میں ہماری

شادی کی دوسری سالگرہ ہوتی۔''
اس دوران میں ہومی سائڈ والے اپنا کام مکمل کر کے بل کے پاس آگئے۔ کیس انچارج آفیسر وارڈ تھا۔ اس نے بل سے بیان لیا۔ اس کے انداز میں سرد مہری تھی اور وہ پہلے والے آفیسر کی طرح بالکل بھی خوش مزاج نہیں تھا۔ اس نے بل سے اس کے کام کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ اس دوران میں جیسیکا کی لاش اٹھائی جانے لگی۔ بل اس کے ساتھ باہر تک آیا۔ ایمبولینس میں ڈال کر جب اسے لے جایا گیا تو بل اشک بار نظروں سے دیکھتا رہا۔ پولیس اور فارنسک والے اپنا کام کر کے جا چکے تھے اور انہوں نے سوائے جائے واردات کے باقی گھر بل کے حوالے کر دیا تھا۔ جیسے ہی پولیس رخصت ہوئی اور بل اندر آیا تو اس کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ بالکل بھی افسردہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اس نے فریج سے وسکی کی بوتل اور گلاس نکالا، وہ پینے کا عادی نہیں تھا لیکن اس وقت وہ پینا چاہتا تھا۔ فریج کھولتے ہوئے اس کی نظر اپنے ہاتھ کی پشت پر بنے جلنے کے گول نشان پر پڑی۔ تین دن پہلے بے دھیانی میں اس کا ہاتھ کافی کی گرم کیتلی سے جا لگا تھا۔
اس نے جو سوچا تھا، ویسا ہی ہوا تھا۔ اس نے آج کام کے دوران پاور ہاؤس کے عقبی دروازے سے نکل کر گھر کا رخ کیا۔ وہ سات بجے تک گھر آگیا تھا اور جب جیسیکا نے اسے دیکھا تو حیران ہو گئی۔ بل اسے بیڈ روم میں لے گیا اور اسے مزاحمت کا موقع بھی نہیں دیا۔ اس نے جیسیکا کے ساتھ ممکن حد تک وحشیانہ سلوک کیا تھا اور وہ اس پر حیران تھی۔ جب جذبات کا طوفان گزر گیا تو بل اٹھ کر کچن میں آیا۔ اس نے چاقوؤں والے اسٹینڈ سے ایک تیز دھار والا چاقو منتخب کیا اور بیڈ روم میں آیا۔ جیسیکا اسے چاقو بدست دیکھ کر سہم گئی۔
''تمہیں وہ منظر یاد ہے جو جپسی عورت نے مجھے دکھایا تھا؟''
''ہاں۔'' جیسیکا ذرا حیران ہوئی۔ ''لیکن اس وقت اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''
''ضرورت ہے کیونکہ اس منظر کے پورے ہونے کا وقت آگیا ہے۔'' بل نے چاقو سامنے کیا تو جیسیکا ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گئی۔
''بل! تم مذاق کر رہے ہو؟'' اس نے کانپتی آواز میں کہا۔
''نہیں، میں مکمل طور پر سنجیدہ ہوں۔ آج اور ابھی میں تمہیں قتل کر کے واپس کام پر چلا جاؤں گا۔''
''لیکن کیوں؟'' جیسیکا اٹھ کر دروازے کی طرف سرکنے لگی اور اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ عریاں ہے۔
''یہ سوال تم خود سے کرو۔'' بل نے نفرت سے کہا۔ ''اس جپسی عورت نے مجھے تمہارے بارے میں ایک بات اور کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں اکیلا نہ چھوڑوں اور اس نے درست کہا تھا۔ میں اپنی جاب میں مصروف ہوا اور تم نے فوراً میرا متبادل تلاش کر لیا۔''
''کک... کیا کہہ رہے ہو؟ یہ جھوٹ ہے۔'' جیسیکا گیلری میں نکل آئی۔ وہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور بل اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔
''اوپر رہنے والا نوجوان پیری... کتنا آسان ہے نا... ہنگامی زینے کے راستے آنا جانا۔''
جیسیکا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تمہیں کیسے پتا...؟'' وہ کہتے کہتے رک گئی لیکن ان تین الفاظ نے اس کے جرم کا اس کے منہ سے اعتراف کرا لیا تھا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ بل مسکرایا۔
''اب تم بتاؤ کیا، وہ منظر سچ نہیں تھا۔ اس عورت نے تمہارے مستقبل کے بارے میں سچ کہا تھا۔''
جیسیکا پیچھے ہٹتے ہوئے زمین پر گر گئی اور پھر خوف و دہشت کے عالم میں بیٹھے بیٹھے پیچھے گھسٹنے لگی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر بل اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے چاقو والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ قتل بھی اس سیریل کلر کے سر جائے گا۔''
اس کا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا اور چاقو جیسیکا کے سینے میں اتر گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی لیکن وار سیدھا دل پر لگا تھا اور وہ ختم ہو گئی لیکن بل نے اس پر پے در پے وار کیے۔ اس کے اندر اس وقت سے ایک آگ سی بھڑک رہی تھی جب اس نے پیری کو کھڑکی کے راستے نکل کر ہنگامی زینے سے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ جیسیکا نے گرم جوشی سے اسے رخصت کیا تھا اور یہ سب بل نے اس وقت دیکھا جب وہ آوارہ گرد کا تعاقب کرتا ہوا عقبی گلی میں آیا تھا۔ آج جیسیکا کے جسم پر چاقو آزماتے ہوئے اس کے اندر بھڑکتی آگ سرد پڑ گئی تھی۔ اس نے جیسیکا کو دل و جان سے چاہا تھا، اسے اپنی بیوی بنایا اور اس کی ہر خواہش پوری کی۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھا اور اس نے بل سے بے وفائی کی۔
جب اس کی آگ سرد پڑ گئی تو اس نے چاقو اور اپنا جسم

پانی سے صاف کیا۔ کپڑے پہنے اور اپارٹمنٹ سے نکل گیا لیکن جانے کے لیے اس نے ہنگامی زینے ہی استعمال کیے تھے کیونکہ کھڑکی کی فولادی گرل کی چابی اس کے پاس تھی۔ کسی نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی دفتر میں کسی نے اس کی کمی محسوس کی۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں اکیلا ہی ہوتا تھا اور وہاں شاذ ہی کوئی آکر جھانکتا تھا۔ وہ دفتر پہنچ گیا اور اس کے بعد حسبِ معمول دفتر سے نکل کر گھر آگیا۔ اسے یقین تھا کہ پولیس اس قتل کو سیریل کلر کے کھاتے میں ڈال دے گی۔ اس نے چاقو دفتر جاتے ہوئے گٹر میں ڈال دیا تھا۔ اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔

میڈیا نے اگلے دن بل کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میڈیا کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ جیسیکا کے قتل کو بھی اسی سیریل کلر کا کام قرار دیا جارہا تھا۔ نیویارک پولیس، ہومی سائڈ کے افسران اس کیس پر کام کر رہے تھے۔ تیسرے دن بل دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دو دن سے وہ چھٹی پر تھا۔ کال بیل بجی تو وہ سمجھا کہ اس کا کوئی پڑوسی ہے۔ انہوں نے دو دن سے تعزیت کے نام پر اس کا دماغ کھا رکھا تھا۔ جیسیکا کی لاش کل اس کے حوالے کی گئی تھی اور اس نے ایک کیئر ٹیکر ادارے کو اس کی تدفین کا کام سونپ دیا تھا۔ تدفین اگلے روز تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے خلافِ توقع آفیسر وارڈ نظر آیا۔

''آفیسر... تم...؟'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ حسبِ معمول سرد لہجے میں بولا۔ بل نے جلدی سے کہا۔

''میں دفتر جارہا ہوں۔''

''یہ ضروری ہے۔'' آفیسر وارڈ نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آگیا۔ اس کے انداز سے بل کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''آفیسر! کیا کوئی خاص بات ہے؟''

اس نے بل کا چبھتی ہوئی نظروں سے معائنہ کیا۔ ''تم جانتے ہو سیریل کلر بہت چالاک اور عیار شخص ہے اور اس نے اب تک پولیس کے لیے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا جو اس کی طرف راہنمائی کرتا ہو۔''

''ہاں... میں نے اس کے بارے میں کچھ ایسا ہی سنا ہے۔''

''لیکن اس بار وہ ایک غلطی کر گیا ہے۔''

''کیسی غلطی؟''

''وہ قتل سے پہلے عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتا تھا اور اس بارے میں اتنا محتاط رہتا تھا کہ پولیس کو اس کے ڈی این اے تجزیئے کے لیے کبھی کوئی مواد نہیں ملا تھا۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہاں، سمجھ رہا ہوں۔'' بل نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

''لیکن جیسیکا کے معاملے میں وہ یہ غلطی کر گیا ہے اور اس کی لاش کے تجزیئے کے بعد مطلوبہ مواد مل گیا ہے۔''

اس بار بل کو لگا کہ اس کا دل حلق میں آکر دھڑکنے لگا ہو۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ گھر آکر جیسیکا کو بیڈروم میں لے گیا تھا تو اس نے کوئی حفاظتی تدبیر نہیں کی تھی۔ بل نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تمہارے پاس سیریل کلر کا ڈی این اے موجود ہے؟''

''نہیں، ابھی پولیس میچنگ کا کام کر رہی ہے۔''

''تب میں اس معاملے میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''ہمیں تمہارا ڈی این اے تجزیہ بھی کرنا ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ تم جیسیکا کے شوہر ہو اور ظاہر ہے اس کے پاس بھی جاتے رہتے تھے۔ سیریل کلر کے ڈی این اے کے حتمی تعین کے لیے ہمیں تمہارا ڈی این اے ٹیسٹ بھی لینا ہوگا اور اس کے بعد ہی ہم اسے تلاش کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق جیسیکا کو قتل کرنے .... سے آدھا گھنٹا پہلے اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی... اس لیے ملنے والا ڈی این اے یقینی طور پر قاتل کا ہی ہے۔''

بل کا سر سچ مچ چکرانے لگا۔ جیسیکا کی لاش دیکھ کر اس نے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی تھی لیکن اس بار وہ حقیقت میں بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ اس نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں ڈی این اے ٹیسٹ کرانے سے انکار کر دوں تو؟''

''یہ تمہارا حق ہے۔'' آفیسر وارڈ پہلی بار مسکرایا۔ ''لیکن اس صورت میں پولیس یہ سمجھنے میں حق بہ جانب ہوگی کہ اپنی بیوی کا قتل تم نے خود کیا ہے اور اب ڈی این اے ٹیسٹ سے انکار کر رہے ہو... لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پولیس، عدالت سے تمہارے ڈی این اے ٹیسٹ کی اجازت حاصل کر لے گی اور تمہیں ٹیسٹ کرانا ہی پڑے گا۔ اب بولو؟''

بل کو آنے والے چکروں کی شدت میں اضافہ ہوگیا اور پھر وہ سچ مچ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔

صورت گر

مختار آزاد

صورت گری اس کا پیشہ اور شوق، دونوں تھے۔ چہروں کے درمیان دن بسر کرنے کے خواہشمند مصور کو اتفاق سے ایک ایسا چہرہ نظر آگیا جسے طاقِ دل پہ سجا کر رکھنا چاہتا تھا۔ مصور کی زندگی میں شامل ہونے والی ماہ جبیں عشق کی بساط پر اپنی الگ ہی چال چل رہی تھی۔

قناعت پسند مصور کا ماجرا، اسے وہ سب کچھ ملنے والا تھا جس کا وہ تمنائی نہ تھا

تین دن پہلے میں اس ایک کمرے کے فلیٹ میں منتقل ہوا تھا۔ جس صبح میں نے اس فلیٹ میں پہلا قدم رکھا تھا، تب سے اب تک گھر کی صفائی ستھرائی اور اس کے عیب ڈھانپنے میں مصروف تھا۔ جس وقت میں نے کمرے کی شکستہ دیواروں کو ڈھانپنے کے لیے آخری وال پیپر چسپاں کیا، اس وقت تیسرے دن کی سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اس وقت میں حلیے سے آرٹسٹ کے بجائے ایک مزدور دکھائی دے رہا تھا، بندرگاہ پر سامان ڈھونے والے مزدوروں جیسا...!

ویسے تو میں نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہوں لیکن میں نے آج تک ایک چوہیا بھی نہیں ماری۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پولیس والا تو ہوں لیکن میرا کام مجرموں کے پیچھے بھاگنا یا انہیں پکڑ کر عدالت میں پیش کرنا نہیں۔ میں تو عینی شاہدین کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق ایسے مفرور مجرموں کے خاکے بناتا ہوں جن کی پولیس کو تلاش ہوتی ہے مگر ان کی شناخت عینی شاہدین کے سوا ممکن نہیں ہو پاتی۔ سو عینی شاہدین کے بیان کے مطابق میں ملزمان کے خاکے بناتا ہوں جو ان کی گرفتاری میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بچپن سے ہی مجھے لوگوں کے پورٹریٹ بنانے کا شوق تھا لیکن کبھی بھی رنگ اور کینوس میسر نہیں آسکے تھے۔ میرا باپ

میری پیدائش کے فوراً بعد ہی مجھے اور میری ماں کو بے آسرا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ ماں بھی کوئی خاص تعلیم یافتہ نہیں تھی کہ ڈھنگ کی ملازمت کر سکتی۔ ماں نے گھر چلانے کے لیے ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی تھی۔ یوں بچپن سے لے کر جوانی تک تنگ دستی اور غربت ہمارے ساتھ رہی۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ بچپن سے مجھے لوگوں کے پورٹریٹ بنانے کا شوق تھا۔ جب رنگ اور کینوس نہ ملے تو میں نے سفید کاغذ اور پنسل سے کام چلانا شروع کر دیا۔ میں جس چہرے کو ایک دفعہ دیکھ لیتا، اس کے بعد جب جی چاہتا اس کا اسکیچ بنا ڈالتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا ہوا کہ راہ چلتے کسی شخص پر ایک بار نظر پڑ گئی، وہ چہرہ مجھے اچھا لگتا تو گھر آ کر فوراً اس کا پنسل اسکیچ بنا ڈالتا۔ اگر کبھی وہ شخص مجھے دوبارہ ملتا تو میری کوشش ہوتی تھی کہ اسکیچ اسے تحفے میں دے دوں۔ اکثر لوگ اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کرتے تھے کہ میں نے صرف ایک نظر چہرے پر ڈال کر کس طرح اسکیچ بنا ڈالا۔ بعض لوگ تو مجھے انعام میں کئی ڈالرز بھی دے جاتے تھے۔

ہم جس جگہ رہتے تھے وہ نہایت غریب لوگوں کا علاقہ تھا۔ اس لیے چند ایک کے سوا، ہمیشہ لوگوں نے مجھے انعام کے طور پر صرف شکریہ پر ہی ٹرخایا تھا۔ انعام نہ ملنے پر میں دلبرداشتہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ حقیقت میں تو ان کی حیرت اور میری تعریف ہی اصل انعام ہوتا تھا۔ غربت میں زندگی بسر کرنے کے باوجود مجھے اپنی ضروریات کی تکمیل کے سوا کبھی بھی دولت کے حصول کی حاجت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پوری زندگی قناعت اور شرافت میں بسر کی تھی۔ میں بطور آرٹسٹ ہی اپنی پوری زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات میری ماں کے لیے پریشانی کا سبب تو تھی لیکن انہوں نے کبھی مجھ پر یہ دباؤ نہیں ڈالا کہ صرف پیسے کمانے کے لیے میں اپنے شوق کا گلا گھونٹ کر ایسی زندگی بسر کروں جو مجھے قطعاً پسند نہ ہو۔

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں میں نے تازہ تازہ ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ ایک دن اتوار تھا۔ مام کی عادت تھی کہ جب اتوار کو چرچ سروس میں شامل ہونے کے بعد گھر لوٹتی تھیں تو اس دن کا اخبار خریدتے ہوئے ساتھ لے آتی تھیں۔ گھر پہنچ کر وہ مجھے بیدار کرتیں اور پھر ہم اکٹھے ناشتا کرنے کے بعد سارا دن اخبار پڑھتے، باتیں کرتے اور گھر کی صفائی ستھرائی میں گزار دیتے تھے۔ اتوار ہی وہ دن ہوتا تھا جب ہم پورے ہفتے میں ایک بار اکٹھے ناشتا کیا کرتے تھے، ورنہ تو مام صبح کے سات بجے فیکٹری جاتیں تو شام کو ہی گھر واپسی ہوتی تھی۔ اس لیے اتوار ہم دونوں کے درمیان رشتے کی تجدید کا بھی دن ہوتا۔ اُس دن ماں، صرف ماں ہوتی تھی، مزدور ماں نہیں کہ جسے فیکٹری میں اپنی ڈیوٹی پر جانے کی جلدی ہوتی ہے۔

اُس اتوار کو جب مام اخبار لے کر آئیں تو ناشتے کے بعد میں کافی کا مگ اٹھا کر فلیٹ کی بالکونی میں آ کر بیٹھ گیا اور دھوپ تاپنے لگا۔ یونہی اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر ایک غیر نمایاں اشتہار پر پڑی۔

”نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کو ایسے نوجوان مصور کی ضرورت ہے جو پورٹریٹ اسکیچ بنانے میں مہارت رکھتا ہو۔ تعلیم ہائی اسکول تک ہو۔ پنسل اسکیچ بنانے میں خصوصی مہارت ہونی چاہیے اور وہ لوگوں کے بیان کردہ حلیے کے مطابق درست ترین اسکیچ بنانے کی صلاحیت کا حامل ہو۔ مناسب تنخواہ، رہائش اور الاؤنسز دیے جائیں گے۔ سالانہ چھٹیاں بھی پولیس قوانین کے تحت ملیں گی۔“

اس کے بعد درخواست دینے کی آخری تاریخ اور پتا وغیرہ لکھا ہوا تھا۔

اشتہار پڑھ کر مجھے لگا کہ جیسے مجھے ہی دعوت دی جا رہی ہے۔ میں نے مام کو یہ اشتہار دکھایا۔ انہوں نے بھی میری بات کی تائید کی۔ یوں میں نے اپنی زندگی کی پہلی ملازمت کے لیے پہلی درخواست دے ڈالی۔ ہفتہ بھر بعد مجھے انٹرویو کے لیے طلب کر لیا گیا۔ صرف دو ہفتوں کے بعد ہی بذریعہ ڈاک مطلع کیا گیا کہ مجھے اس نوکری کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ یوں اگلے ہفتے سے میں اپنی زندگی کی پہلی اور شاید آخری ملازمت کو جوائن کر چکا تھا۔

میری ملازمت کے بعد مام نے ملازمت چھوڑ کر مکمل طور پر میری دیکھ بھال شروع کر دی۔ ماں کا وہ پیار جو مجھے بچپن میں نہیں ملا تھا، اب وہ اس کا قرض اتار رہی تھیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ملازمت کے چند سال بعد ہی ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اس جہاں کو الوداع کہہ گئیں۔ مام کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا تھا اور اب تک تنہا ہوں۔

عمر کے چالیسویں سال کو عبور کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کب تک یونہی مفرور ملزمان کے اسکیچ بنا بنا کر اپنے اندر کے آرٹسٹ کو مارتا رہوں گا۔ بہتر ہے کہ سرکاری رہائش کو الوداع کہہ کر تھوڑی بہت رقم جو پس انداز کی ہے، اس سے اپنا فلیٹ خریدوں اور ملازمت کو خیر باد کہہ کر مکمل طور پر اپنے اندر کے مصور کو باہر آنے کا موقع دوں۔ ہو سکتا ہے تقدیر مہربان ہو جائے اور میرا نام بھی کسی بڑے مصور کی طرح صدیوں تک دنیا کو یاد رہ پائے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ جن دنوں میں مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا، انہی دنوں ایک فلیٹ کی نیلامی کا اشتہار شائع ہوا۔ یہ فلیٹ ایک ریٹائرڈ کلرک کی ملکیت تھا جو نوّے برس کی عمر میں طویل علالت کے بعد چند ماہ قبل ہی انتقال کر گیا تھا۔ مقامی انتظامیہ نے بوڑھے کی وصیت کے مطابق اس فلیٹ کو فروخت کر کے رقم خیراتی ادارے کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے نیلامی کا اشتہار دیا گیا تھا۔ یہ فلیٹ شہر کے مضافات میں ایک معمولی سے علاقے میں واقع تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ سستے داموں مل جائے گا۔

وقتِ مقررہ پر میں بھی نیلامی کے مقام پر پہنچا۔ وہاں بولی دینے والوں میں کُل چھ افراد موجود تھے۔ صرف دس منٹ کے اندر اندر نیلامی کی کارروائی مکمل ہو گئی اور مجھے اپنے اندازے سے بھی کہیں کم قیمت پر یہ فلیٹ مل گیا۔

جس عمارت میں یہ فلیٹ واقع تھا، وہ اس علاقے کا مصروف ترین کاروباری مرکز تھا۔ خاصی چہل پہل والی جگہ تھی۔ میرے فلیٹ والی بلڈنگ چوراہے پر واقع تھی جس کے اِرد گرد دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اِن دکانوں میں زیادہ تر کھانے پینے کی اشیا فروخت ہوتی تھیں۔

مجھے ایسی ہی ہنگامہ خیز جگہ رہنے کے لیے پسند تھی۔ یہ پسماندگی میں زندگی بسر کرنے والے مفلوک الحال لوگوں کی بستی تھی۔ میرا تجربہ تھا کہ ایسے علاقوں میں رہنے والے انسانوں کے چہروں پر حقیقی زندگی رقص کرتی ہے جنہیں اگر کینوس پر ڈھالا جائے تو رنگوں میں نہا کر زندگی کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقت جو کینوس پر ہو تو متمول لوگوں کے لیے وقت گزاری اور گھر کی آرائش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ زندگی کے یہی رنگ جب جیتے جاگتے اور غربت کے مارے مفلوک الحال زندہ لیکن مُردوں سے بدتر لوگوں کے چہروں پر ہوتے ہیں تو دنیا کی تلخی سے زہر آلود انسانوں کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں کہہ جاتے ہیں۔

نیلامی کے وقت میں نے فلیٹ کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ گو کہ ... نیلامی کرنے والی انتظامیہ نے بولی سے قبل پیشکش کی تھی کہ ممکنہ خریدار فلیٹ کا معائنہ کر سکتے ہیں لیکن میں نے اس معائنے کو وقت کا زیاں سمجھا۔ مجھے فلیٹ کے اندرونی حصے سے زیادہ اس کے بیرونی منظر نامے میں زیادہ کشش محسوس ہو رہی تھی۔ ویسے ایک بات تو طے ہی تھی کہ فلیٹ کی حالت ٹھیک نہیں ہو گی۔ اس کے باوجود میں مطمئن تھا۔ میں اس لیے مطمئن تھا کہ فلیٹ کی خریداری کے لیے جو رقم مختص کی گئی تھی، اس سے کہیں کم قیمت پر یہ مل گیا تھا۔ اس لیے بچ جانے والی رقم میں سے تھوڑی بہت رقم مرمت پر خرچ بھی ہو جاتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے نیلامی کے اگلے روز ہی یہاں منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن صبح کے دس بجے کا وقت ہو رہا ہو گا جب میں مختصر سے سامان کے ساتھ یہاں پہنچا۔ یہ زندگی کا وہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے ملکیتی فلیٹ کا تالا کھول رہا تھا۔ پہلی بار مجھے صاحب جائداد ہونے کا احساس ہوا جس نے میرے سینے کو فخر سے چوڑا کر دیا۔

جب پہلی بار میں نے فلیٹ کے اندر قدم رکھا اور چاروں جانب نظر گھمائی تو مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی شکستگی میرے اندازوں سے کہیں بڑھ کر تھی لیکن میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس فلیٹ کی صورت بدل دوں گا۔ میں دفتر سے ایک ماہ کی چھٹیاں پہلے ہی لے چکا تھا۔ اس لیے نہ تو وقت کی قلت تھی اور نہ ہی کوئی دوسری مصروفیت۔ اس لیے میں نے پیسے بچانے کے لیے فیصلہ کیا کہ مرمت کا جو کام میں خود کر سکتا ہوں، اس کے لیے مستری اور مزدوروں کی خدمات نہیں لوں گا۔

اس فلیٹ میں داخل ہونے کے آدھے گھنٹے کے بعد ہی میں مزدوروں کی طرح کام میں جُت گیا۔ وہ آدھا گھنٹا بھی

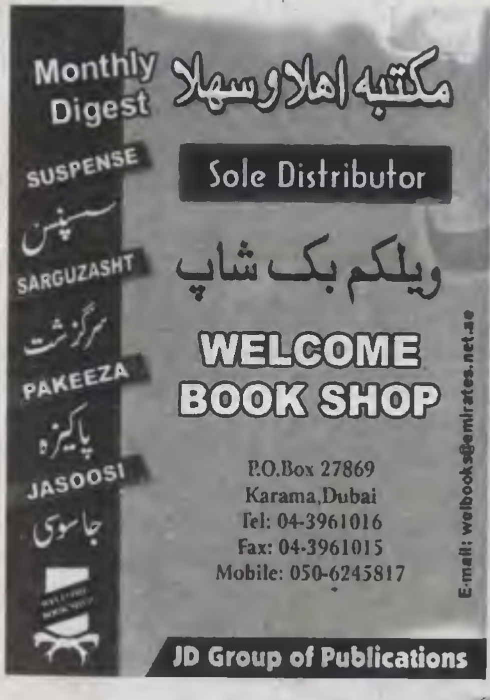

میں نے بیٹھ کر نہیں بلکہ یہ سوچتے ہوئے گزارا تھا کہ مرمتی کام کہاں کہاں ہونا ہے۔

اپنی آمد کے تیسرے دن کی سہ پہر جب میں نے آخری وال پیپر چسپاں کیا تو احساس ہوا کہ لو جی اب کام ختم۔ اس کے بعد یہ فلیٹ کسی بھی شریف آدمی کے رہنے کے لیے نامناسب نہیں رہا۔ اس کے بعد میں نے چاروں جانب تجزیاتی نظریں گھمائیں۔ مجھے یقین تھا کہ جس نے بھی اس فلیٹ کو تین دن پہلے دیکھا ہوگا، اب اسے دیکھ لے تو ماننے پر تیار نہ ہوگا کہ یہ وہی فلیٹ ہے۔

فلیٹ کی آرائش سے فارغ ہو کر میں نے گوند اور رنگ کے خالی ڈبے، سیمنٹ کے پیکٹ، وال پیپر کی کترنیں اور فرش پر پھیلے دوسرے تمام کچرے کو پلاسٹک کے بیگ میں بھرا تاکہ اسے باہر لے جا کر کچرے کے ڈبے میں ڈال سکوں۔ اس کے بعد فرش کو اچھی طرح صاف کیا۔ اپنے بیڈ کو فٹ کیا۔ بستر پر دھلی ہوئی صاف چادر بچھائی۔ تکیوں پر کشن چڑھائے۔ الماری میں کپڑے لٹکائے اور برتنوں کو کچن میں ان کی جگہ پر رکھا۔ اب یہ فلیٹ واقعی رہنے کے قابل تھا۔ ہر چیز قرینے کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود تھی۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر جب میں نے سکھ کا سانس لیا تو محسوس ہوا کہ خود میرے سوا اس فلیٹ میں ایسی کوئی اور شے نہیں تھی جسے صفائی ستھرائی کی ضرورت ہو۔ میری جینز پر رنگوں کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ٹی شرٹ پر جگہ جگہ گوند کے نشانات تھے جو خشک ہونے کے بعد اور بدنما لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہ کپڑے بھی ناقابلِ استعمال ہو چکے ہیں۔ اس لیے میں نے اچھی طرح نہا دھو کر لباس تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کپڑوں کو کچرے کے ساتھ ہی باہر پھینک سکوں۔

جب میں نہانے کے لیے غسل خانے کی طرف جا رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ کمرے میں اب تک رنگ، وارنش اور گوند کی بُو پھیلی ہوئی ہے۔ میری ناک تو اس بُو کی عادی ہو چکی تھی لیکن کوئی شخص اس فلیٹ کے بیرونی دروازے کے قریب سے بھی گزرتا تو وہ اس کی بُو کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے سڑک کی طرف موجود کھڑکی کو کھول دیا تاکہ ہوا کی آمد و رفت سے یہ بُو کچھ کم ہو سکے۔ ویسے بھی رنگ اور وارنش کی بُو کو جاتے جاتے بھی چند دن لگ ہی جاتے ہیں۔ میں نے تو اس فلیٹ کے بہت بڑے بے رنگ حصے اور بدرنگ دروازوں کو رنگنے کے لیے ویسے بھی خاصا رنگ استعمال کیا تھا۔ اس لیے اس بُو کو ختم ہونے میں چار پانچ دن تو لگنے ہی تھے۔

میں نہا کر نکلا تو جہاں تھکن غالب تھی، وہیں بھوک نے بھی شدت سے اپنا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ پچھلے تین دنوں میں، میں نے ڈبل روٹی، مکھن اور کافی پر ہی گزارہ کیا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے ذائقے دار کھانے کا احساس کہیں دب گیا تھا مگر اب جو فرصت ملی تو بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ اوپر سے کھلی کھڑکی سے آنے والی ہوا کے جھونکے بھی طرح طرح کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کی لپٹیں اپنے ساتھ لے کر کمرے کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ نیچے طرح طرح کے کھانوں کی دکانیں تھیں۔ اس لیے مزید بھوکے رہنے کے بجائے میں نے فیصلہ کیا کہ فوراً نیچے جاؤں اور پیٹ پوجا کر لوں۔

نیچے پہنچا تو ہیم برگر سے لے کر فرائی فش تک... طرح طرح کے کھانوں کی دکانیں تھیں۔ لوگ فٹ پاتھ پر رکھی کرسیوں پر بیٹھے طرح طرح کے فاسٹ فوڈ سے شکم پُری میں معروف تھے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کھاؤں؟ اچانک ہوا کا ایک جھونکا میری سانسوں سے ٹکرایا۔ ہوا کا جھونکا فش فرائی کرنے والی کڑاہی سے ٹکرا کر گزرا تھا، تب ہی تو مچھلی کی مہک اس کے ساتھ تھی۔ ہوا کی سمت نظر ڈالی تو سامنے ہی ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔

''روزا میری فرائی فش۔''

''واہ... بہت خوب! چلو مچھلی کھاتے ہیں۔'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ مچھلی میری کمزوری تھی۔ اگر بھوک لگی ہو تو پھر اس کی طلب اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔

کچھ ہی دیر میں میرے سامنے فرائی فش سے بھری ہوئی پلیٹ، ایک رول بن اور چٹنی رکھی ہوئی تھی۔ کھانے کا ذائقہ بتا رہا تھا کہ روزا میکسیکن ہے۔ میری ماں بھی میکسیکو کی رہنے والی تھی۔ اس لیے میں میکسیکن کھانوں کے ذائقے کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

میں کھانے کا بل چکانے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو روزا میری سے بھی ملاقات ہو گئی۔ یہ درمیانی عمر کی قبول صورت عورت تھی۔ جوانی میں یقیناً نوجوان اسے یہ باور کرواتے ہوں گے کہ وہ حسینۂ عالم سے کسی طور کم نہیں مگر بڑھاپا بتا رہا تھا کہ وہ کچھ زیادہ غلط بیانی بھی نہیں کرتے ہوں گے۔

''میرا خیال ہے کہ آپ ہی روزا میری ہیں؟'' میں نے جیب سے پرس نکالتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں... مگر اس سے پہلے میں نے آپ کو کبھی یہاں نہیں دیکھا۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل درست کہہ رہی ہیں آپ۔ اصل میں تین دن پہلے ہی میں یہاں منتقل ہوا ہوں۔ اس بلڈنگ کی تیسری منزل کا ایک فلیٹ میں نے خریدا ہے۔''

''اوہ... کہیں آپ نے انکل چارلی والا تو فلیٹ نہیں خریدا ہے؟''

''شاید... مجھے ان کا نام تو نہیں معلوم لیکن نیلامی والے بتا رہے تھے کہ وہ فلیٹ کسی بوڑھے پنشنر کا تھا۔''

''میں سمجھ گئی۔ خوش آمدید اس علاقے میں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''مجھے رونالڈ و کہتے ہیں۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ امید ہے کہ آپ یہاں آتے جاتے رہیں گے۔'' روزا نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سچا خلوص نظر آ رہا تھا۔

''جی ہاں۔ آپ کے ہاتھ کی بنی مچھلی تو بہت ہی ذائقے دار تھی۔''

''شکریہ۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''مچھلی میری کمزوری ہے۔ چلو اسی بہانے ملاقات ہوتی رہے گی۔''

''ضرور!''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اگلی بار ملنے تک کے لیے خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر میں نے بل ادا کیا اور پھر فلیٹ پر پہنچ کر جو بستر پر گرا تو صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہی آنکھ کھلی۔

بیدار ہونے کے بعد میں جب تک کافی اور سگریٹ نہ پی لوں، تب تک دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ میں نے کافی بنائی اور مگ لے کر بالکونی میں آ بیٹھا۔ سامنے سڑک پر ٹریفک رواں... دواں تھا۔ سڑک کے پار میری بلڈنگ کے مقابل میں ایک اور رہائشی عمارت واقع تھی۔ میں وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر سامنے والی عمارت پر پڑی۔ میرے فلیٹ کے بالکل سامنے، سڑک پار جو فلیٹ واقع تھا، اس کی بالکونی میں ایک خاتون گیلے کپڑے سکھانے کے لیے لٹکا رہی تھی۔ اچانک وہ سیدھی کھڑی ہوئی تو علم ہوا کہ یہ تو روزا میری ہے۔

''اچھا... تو یہ موصوفہ یہاں رہتی ہیں۔'' میں نے خود کلامی کی۔

اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ہلایا تو میں نے بھی ہاتھ ہلا کر اسے جواب دیا۔ وہ خاصی ملنسار عورت لگ رہی تھی۔ نئے علاقے میں اتنی جلدی کسی پر اعتبار کر لینا اس بات کی علامت ہے کہ روزا میری دل کی بہت اچھی عورت ہے۔

Mob: 0300-2219514, 0344-2609828
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہُنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام اور پتہ ضرور لکھیے
نوٹس برائے داخلہ
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد، کراچی 75080

ناشتے کے بعد میں یوں ہی آوارہ گردی کے لیے باہر نکل گیا۔ سہ پہر کو واپس آیا تو کپڑے بدل کر جو سویا تو کئی گھنٹوں کے بعد آنکھ کھلی۔ دوپہر کو ڈٹ کر کھانا کھایا تھا، سو بھوک بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں دل چاہ رہا تھا کہ روزا میری سے ملاقات کروں۔ اس لیے منہ ہاتھ دھوکر نیچے چلا آیا۔ اب اس ملاقات کا واحد وسیلہ مچھلی ہی تھا، سو جا کر ایک پلیٹ جھینگا فرائی کا آرڈر دیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد بل چکانے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرادی۔

''گڈ ایوننگ روزا میری۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

''کہیے، کیسی لگی یہ نئی جگہ آپ کو؟''

''بہت اچھی... جگہ بھی اور آپ بھی۔''

''اوہ... بہت شکریہ رونالڈو۔ ویسے مجھے آپ کا یہ کہنا اچھا لگا۔'' اس نے پیار سے جواب دیا تو میرا بھی کچھ حوصلہ بڑھا۔

''ویسے آپ سے بات کرنے کے لیے مچھلی کھانا کیا ضروری ہے؟''

''بالکل نہیں۔ ہم پڑوسی ہیں۔ اس بہانے بھی ہم مل سکتے ہیں۔'' روزا میری کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے گاہک اور دکان دار کے رشتے کے علاوہ بھی معاشرے کے دوسرے رشتوں کی قدر ہے۔

''تو ٹھیک ہے۔ کل صبح کی کافی آپ میرے فلیٹ پر، میرے ساتھ پئیں۔'' میں نے روزا کو پیشکش کی۔

''بہت شکریہ رونالڈو۔ ویسے آپ چاہیں تو صبح میرے ہاں چلے آئیں۔ ناشتا ساتھ کریں گے۔ بہت مزہ آئے گا۔ کئی مہینوں سے میں بھی اکیلے ناشتا کرکر کے بور ہوگئی ہوں۔''

''بڑی مہربانی... تو ٹھیک ہے کل صبح ساڑھے آٹھ بجے ملتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' روزا نے ہنس کر جواب دیا۔

''ویسے شکریہ ناشتے کے بعد کہوں گا۔'' میں نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''یہ ضروری نہیں ہے۔'' اس نے بھی بے تکلفی سے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے کھانے کا بل چکایا اور اپنے فلیٹ پر لوٹ آیا۔

ویسے تو میری طبیعت مجلسی ہے لیکن مجھے بہت سارے لوگوں میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے بجائے کسی ایک دوست کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ یوں تو میری زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں لیکن وہ سب کی سب ہوا کا آوارہ جھونکا ثابت ہوئیں۔ وہ سب ایک جیسی طبیعت کی مالک تھیں۔ قلاش مگر وفادار مصور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بجائے وہ مال دار مگر بے وفا مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس سے اوپر کا ہونے کے باوجود میں تنہا زندگی بسر کر رہا تھا۔ ویسے مجھے خود بھی اندازہ تھا کہ اس عمر میں مجھ سے کوئی عقل مند لڑکی تو شادی کرنے سے رہی۔ اس لیے جی جلانے سے بہتر ہے کہ سکون کو ترجیح دو۔ جو ہے اسی پر اکتفا کرو۔ جو نہیں ملا، اس کے بارے میں مت سوچو مگر روزا میری سے مل کر مجھے لگا کہ وہ آج کل کی دوسری عورتوں سے شاید مختلف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی سوچ اس لیے زیادہ میچور ہو کہ وہ عمر کے جس حصے میں ہے، اس میں دولت سے زیادہ وفادار ساتھی زیادہ اہمیت حاصل کر جاتا ہے۔

اس رات میں نے کئی گھنٹے لگا کر روزا کا ایک بہت خوبصورت پین اسکیچ تیار کیا۔ اسکیچ بناتے ہوئے مجھے لگا کہ واقعی میں روزا کو پہلی نظر میں ہی دل دے بیٹھا ہوں۔ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ شاید روزا بھی یہی سوچ رہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ میں غلط ہوں مگر اس کی یہ بات کہ... میں بھی اکیلے ناشتا کرکر کے بور ہوچکی ہوں... اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ بھی میری طرح تنہا ہے۔

دوسری صبح میں تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ جب میں روزا کے دروازے کی بیل بجا رہا تھا تو اس وقت آٹھ بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں رول کی ہوئی وہ پیپر شیٹ تھی جسے میں روزا کو گفٹ کرنا چاہتا تھا۔

''گڈ مارننگ!''

روزا نے پہلی بیل پر ہی دروازہ کھول دیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ میرے انتظار میں دروازے پر ہی کھڑی تھی۔

واقعی... روزا کے ہاتھ کے بنے کھانوں میں بہت ذائقہ تھا۔ اس نے نہایت پُرتکلف ناشتے کا اہتمام کیا تھا۔ اس کا فلیٹ خاصا قرینے سے سجا ہوا تھا۔ اگرچہ ہمارے درمیان یہ تیسری ملاقات تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ ہم دونوں بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

ناشتے کے بعد ہم دونوں کافی کا مگ لے کر لیونگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں میں نے اپنا بنایا ہوا اسکیچ اسے پیش کیا۔

''یہ میری طرف سے آپ کے لیے چھوٹا سا تحفہ۔'' یہ سن کر اس نے رول میرے ہاتھ سے لے کر کھولا۔

''اوہ میرے خدا!'' اپنا اسکیچ دیکھتے ہی وہ حیرت سے بولی۔ ''یہ تم نے بنایا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''تو کیا تم مصور ہو؟''

''خوش قسمتی سے۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھی ہیں۔''

''تو پھر سنو۔ مجھے واقعی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ صرف خوشی نہیں بلکہ دلی خوشی۔'' اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

''یہی بات میں بھی کہتا ہوں۔''

''تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں فائن آرٹس میں گریجویشن کر رہی تھی مگر...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن دوسرے موضوعات پر بات چیت بدستور جاری رہی۔

اگلے دو تین گھنٹوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ اگرچہ یہ ملاقات بہر طور ناشتے تک ہی محدود تھی لیکن لنچ تک چلتی چلی گئی۔ لنچ کے بعد مجبوری یہ تھی کہ روزا کو جا کر دکان کھولنا تھی ورنہ ناشتے کی میز سے شروع ہونے والی یہ ملاقات ڈنر تک بھی طویل ہوسکتی تھی۔

میرا خیال بالکل درست نکلا۔ روزا میری کے بنائے ہوئے کھانوں میں واقعی میکسیکن کھانوں کا ذائقہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے والدین میکسیکو سے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے امریکا آئے تھے۔ بعد میں انہوں نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی تھی۔ جب وہ لوگ امریکا آئے، تب روزا کی عمر دس برس تھی۔ روزا نے مجھے بتایا کہ اس نے نہایت عسرت زدہ ماحول میں بچپن گزارا تھا۔ گریجویشن کرنے کے دوران اس کی ملاقات ٹونی نامی نوجوان سے ہوئی۔ ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور چند ہفتوں کے اندر ہی اندر انہوں نے شادی کر لی۔

شادی کے چند ماہ بعد روزا پر یہ راز کھلا کہ ٹونی درجۂ اول کا نکما، کام چور اور دوسرے کی آمدنی پر پلنے والا شخص ہے۔ بے تحاشا شراب نوشی اور جوا کھیلنے کی لت کے سبب وہ اکثر چھوٹی موٹی چوریاں کر کے اخراجات پورا کرنے کے اسباب کیا کرتا تھا۔

ٹونی سے شادی کے بعد روزا کی زندگی اتنی اجیرن ہوئی کہ اس نے کیلیفورنیا کو خیرباد کہا اور یہاں چلی آئی۔ کچھ عرصہ ادھر اُدھر کام کرنے کے بعد آخر اس نے بینک سے قرض لے کر دکان کھولی اور آج دس برس کے بعد اس کا کاروبار اتنا مستحکم تھا کہ اسے کسی کے سہارے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی... لیکن ٹونی نے اس کا پیچھا اب تک نہیں چھوڑا تھا۔

اگرچہ وہ برسوں پہلے ٹونی سے طلاق لے چکی تھی مگر اب بھی وہ اکثر یہاں آتا تھا اور ڈرا دھمکا کر اس سے پیسے اینٹھتا رہتا تھا۔ ٹونی کے ڈر کے سبب ہی اس نے پھر کبھی شادی نہیں کی... کیونکہ ٹونی کہتا تھا کہ وہ جس مرد سے بھی شادی کرے گی، وہ اسے قتل کردے گا۔ روزا کا یہ بھی کہنا تھا کہ پچھلے کئی مہینوں سے اس نے یہاں کا رُخ نہیں کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی جرم میں جیل کی ہوا کھا رہا ہو۔ روزا نے یہ بھی انکشاف کیا کہ جس فلیٹ میں، میں رہتا ہوں، اس میں رہنے والا بوڑھا چارلی، ٹونی کا کوئی دور پار کا رشتے دار تھا۔ ٹونی جب یہاں آتا تو ایک آدھ بار چارلی انکل سے ملنے کے لیے ضرور جاتا تھا۔

روزا سے ملنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ عمر کی چار دہائیاں گزر چکی ہیں۔ اب مجھے اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے روزا سے زیادہ بہتر عورت کا ملنا مشکل تھا۔ میں نے سوچا کہ چند ہفتوں تک ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے تاکہ ہم ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب آسکیں۔ اس کے بعد مناسب موقع دیکھ کر میں اسے شادی کی پیشکش کردوں گا۔

آنے والے دنوں میں ہم دونوں تواتر کے ساتھ ملنے لگے۔ روزا واقعی نفیس ذوق رکھتی تھی اور نہایت شائستہ مزاج... عورت تھی۔ چند دنوں میں ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔

☆☆☆

اس دن صبح میں اٹھا تو سات بج رہے تھے۔ میں نے کافی بنائی اور مگ لے کر بالکونی میں آکھڑا ہوا۔ اچانک مجھے ایسے لگا کہ جیسے روزا کی بالکونی میں سے کوئی مرد اندر کمرے میں گیا ہے۔

''تو کیا ٹونی آگیا ہے؟'' یہ دیکھ کر میں زیرلب بڑبڑایا۔

اچانک روزا کے کمرے کا بالکونی میں کھلنے والا دروازہ بھی بند ہوگیا۔ میرے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی۔ روزا جب تک گھر میں رہتی تھی، بالکونی میں کھلنے والا یہ دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔ اس دروازے سے ہی مجھے پتا چل جاتا تھا کہ وہ فلیٹ پر ہے یا نہیں۔ اب جبکہ کمرے کا دروازہ بند ہوا تو مجھے یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو، ٹونی آچکا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس کے ہاں جاؤں یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹونی اس کو کوئی نقصان پہنچائے۔ ان چور اُچکوں سے کیا بعید۔ وہ تو کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے کافی کا کپ ختم کیا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد روزا سے ملنے کے لیے چل دیا۔

میں بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص تیزی سے نیچے اترا۔ وہ کافی کیم شحیم تھا۔ اس نے بنا بازو

کی بلیک ٹی شرٹ اور چمڑے کی بلیک پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ کافی جلدی میں تھا۔ اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے ایک طرف کیا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اس دوران میری نظر صرف ایک لمحے کے لیے ہی اس کے چہرے پر پڑی ہوگی۔

جب میں روزا کے فلیٹ پر پہنچا تو دروازہ غیر معمولی طور پر کھلا ہوا تھا۔ میں گھنٹی بجائے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہوئی ہے۔ سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کرسیاں الٹی پڑی تھیں اور روزا فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی ایک دو جگہ سے پھٹ چکے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ یہ دیکھ کر میں فوراً فریج کی طرف بڑھا۔ پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں پانی بھر کر اس کی طرف بڑھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کے ہونٹوں سے گلاس لگانے کے لیے چہرہ اوپر کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور دائیں آنکھ کے نیچے بڑا سا نیل پڑ چکا تھا۔ روزا گلاس سے منہ لگانے کے بجائے مجھ سے چمٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''پلیز... مجھے اس سے بچالو۔ یہ مجھے مار دے گا... پلیز! مجھے بچالو۔''

''کوئی تمہیں نہیں مار سکتا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دیا اور زبردستی اس کے منہ سے گلاس لگا دیا۔ کافی دیر تک وہ بلک بلک کر روتی رہی اور میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔

''تمہاری یہ حالت کس نے بنائی اور کیوں؟''

''ٹونی...'' اس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا اور وہ پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''کب آیا تھا وہ؟''

''آج صبح سویرے۔'' روزا نے ہچکیوں میں جواب دیا۔

کافی دیر بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے تو وہ بتانے لگی۔

''میں نے اسے کافی دی۔ کافی ختم کر کے وہ اٹھنے لگا تو میں نے پوچھ لیا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو وہ کہنے لگا، انکل چارلی کے پاس۔ جب میں نے اسے بتایا کہ کئی ہفتوں پہلے ان کا انتقال ہوگیا ہے... بلدیہ نے وہ فلیٹ نیلام کر دیا ہے اور اب اس میں کوئی مصور رہتا ہے... بس یہ سنتے ہی وہ سیخ پا ہوگیا۔ اس نے طرح طرح کے الزامات لگائے مجھ پر۔ پھر گھر کا سامان توڑنے پھوڑنے لگا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ جب میں نے روکا تو اس نے مجھے بھی لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔''

''تم پولیس میں اس تشدد کی رپورٹ درج کروا دو۔''

''نہیں۔ وہ جرائم پیشہ آدمی ہے۔ میں نے ایسا کیا تو وہ مجھے تڑپا تڑپا کر مار ڈالے گا۔'' اس نے چیختے ہوئے جواب دیا۔ اس کے اوسان قدرے بحال ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

''لیکن اسے غصہ کس بات پر آیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ چاہتا ہو کہ جب انکل چارلی مریں گے تو یہ فلیٹ اسے مل جائے گا۔ اب جب اسے پتا چلا کہ فلیٹ ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ سیخ پا ہوگیا۔'' کافی دیر بعد جب وہ نارمل ہوئی تو میں نے ٹونی کے پُرتشدد رویّے پر اظہارِ خیال کیا۔

''ہوسکتا ہے وہ ایسا سوچ رہا ہو۔'' روزا نے مختصر سا جواب دیا۔

''ممکن ہے۔ ایسے مجرموں اور نکھٹو لوگوں سے ہر بات ممکن ہے۔ انہیں تو ہمیشہ پرایا مال اپنا نظر آتا ہے۔''

اب اس کی حالت سنبھل چکی تھی۔ جب وہ نہانے کے لیے جانے لگی تو میں نے اجازت لی۔

''سنو... اب وہ گھر آئے تو دروازہ مت کھولنا۔ مچانے دو ہنگامہ اسے باہر ہی۔ اگر اس نے غل غپاڑا کیا تو محلے والے خود ہی پولیس کو بلالیں گے۔ بس تم دروازہ مت کھولنا۔'' میں نے روزا کو تاکید کی۔

''بہت بہتر۔ اب ایسا ہی کروں گی۔ اسے قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی اس گھر کے اندر۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اس بُرے وقت میں دل جوئی پر شکریہ ادا کر رہی ہو۔

''دروازہ لاک کرلو۔ میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پیار سے اس کے گال پر تھپکی دی۔

''تمہارا شکریہ یہاں آنے کا۔'' روزا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ویسے کوئی بات ہو تو مجھے فون کرلینا۔''

''ضرور۔'' یہ کہتے ہوئے روزا نے دروازہ بند کرلیا اور میں گھر واپسی کے لیے سیڑھیاں اترنے لگا۔

اگلے دو تین دن خیریت سے گزر گئے۔ اس دوران میں، میں روزا کے فلیٹ پر تو نہیں گیا، البتہ فون پر اس کی خیریت ضرور معلوم کرتا رہا۔ ایک آدھ بار نیچے جا کر اس کی دکان پر ہی اسے مل بھی آیا مگر کوئی خاص بات نہ ہوسکی۔ ویسے بھی وہ دکان پر بہت مصروف ہوتی تھی۔

میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ چلو ٹونی دفع ہوگیا۔ ایک بار میری اس سے شادی ہوجائے پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کم بخت کس طرح اس کے اِردگرد نظر آتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب اسے معلوم ہوگا کہ روزا نے پولیس والے سے شادی کرلی ہے تو وہ خود بخود ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہوجائے گا۔

ٹونی کی ہنگامہ خیزی کو گزرے چوتھے دن کی شام تھی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے گھر پر ہی کھانا بنایا۔ کھانے کے بعد کافی بنائی اور مگ لے کر بالکونی میں آ کھڑا ہوا۔ مجھے بالکونی میں کھڑے ہو کر گھروں میں جلنے والی روشنیوں کا منظر دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس رات بھی میں کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے اِدھر اُدھر بے مقصد نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے لگا کہ میرے بائیں کان کی لَو میں کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ اتار دی ہو۔ میں تڑپ کر رہ گیا اور درد کی شدت سے اتنی زور سے تڑپا کہ میرے ہاتھ سے کافی کا مگ چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا اور کان کی لَو کو ہاتھ لگایا تو وہ گیلا ہوگیا۔ میں نے فوراً دیکھا۔

''اوہ میرے خدا! میرے کان سے خون بہہ رہا ہے۔'' میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں جھکے جھکے کمرے کے اندر آگیا اور فون اٹھا کر ایمبولینس بلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں اسپتال کے ایمرجنسی روم میں تھا۔ کان کی لَو سے بہنے والے خون نے میری سفید ٹی شرٹ کو دائیں طرف سے لہو رنگ کر دیا تھا۔

''آپ پر گولی چلائی گئی ہے۔ شکر کریں کہ حملہ آور کا نشانہ چوک گیا ورنہ تو آپ کی جان بھی جاسکتی تھی۔'' میرے مضروب کان کی مرہم پٹی کرنے والے ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔

''مجھ پر گولی چلائی گئی ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں۔ یہ زخم رائفل سے چلائی گئی گولی کا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''میں نے پولیس کو اطلاع کردی ہے۔ وہ پہنچ رہے ہیں رپورٹ لکھنے اور آپ کا بیان لینے کے لیے۔''

ڈاکٹر کی بات سن کر میں نے غور کیا تو مجھے یاد آیا کہ جس وقت مجھے یہ زخم آیا تھا، عین اس وقت مجھے نیچے سڑک پر گاڑی کے ٹائروں کی چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب میں نے نیچے کی طرف نظریں کر کے ذرا سی گردن گھمائی تھی۔ بس، اس کے ساتھ ہی مجھے کان کی لَو پر دہکتی سلاخ رکھ دیے جانے کا احساس ہوا تھا۔

''اوہ میرے خدا... تو کیا گولی چلانے والا شخص سچ مچ میری جان لینا چاہتا تھا؟'' منظر نامے پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ زخم کی نوعیت بتاتی ہے کہ حملہ آور کا نشانہ چوک گیا ورنہ تو...'' ڈاکٹر نے اپنی بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی۔ شاید وہ مجھے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

'وہ کون ہوسکتا ہے جو مجھے مارنے کی کوشش کرے؟ میری تو کسی سے، کبھی بھی کوئی معمولی سی رنجش بھی نہیں رہی۔' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اچانک میرے دماغ میں بجلی کوندی۔ 'کہیں یہ ٹونی تو نہیں۔' یہ شبہ قرین از قیاس تھا۔ ٹونی کو انکل چارلی کا فلیٹ ترکے میں مل جانے کی امید تھی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات کا بدلہ لینا چاہتا ہو۔

ابھی میں اپنے ممکنہ قاتل کو جاننے کے لیے دماغ لڑا ہی رہا تھا کہ انسپکٹر جیفرسن اور پولیس سراغ رساں آرتھر پہنچ گئے۔ یہ دونوں مجھے پہچانتے تھے۔ جب انہیں یہ پتا چلا کہ جس زخمی کا بیان لینے وہ یہاں پہنچے ہیں، وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ پولیس کا ہی ایک افسر ہے تو انہیں بھی بڑی حیرت ہوئی۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تمہارا کون سا دشمن پیدا ہوگیا ہے؟ تم تو خاصے شریف آدمی ہو۔ نہ کسی کے لینے میں، نہ دینے میں۔'' آرتھر نے آہستگی کے ساتھ کہا۔ وہ بنچ پر میرے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

پولیس کے آنے کے بعد ڈاکٹر بھی مطمئن تھا لیکن جب اسے پتا چلا کہ زخمی خود پولیس افسر ہے تو اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

''مسٹر رونالڈو! میں نے مرہم پٹی کردی ہے۔ زخم خطرناک نہیں ہے۔ اب آپ چاہیں تو گھر جاسکتے ہیں۔ ویسے آپ کو داخل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میاں چلتے بنو۔ باقی تفتیش تھانے میں بیٹھ کر کرلینا۔

''شکریہ ڈاکٹر!'' آرتھر نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں اسپتال سے سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے۔

''ویسے رونالڈو... تم حملہ آور کے نشانے سے اس وقت تو بچ گئے مگر ایک بات طے ہے۔ حملہ آور جو بھی ہے، وہ تم سے اتنا خائف ہے کہ وہ تمہاری جان لے کر ہی چھوڑے گا۔'' کافی پیتے ہوئے آرتھر نے کہا۔

''ہاں۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ اگر میں نے عین اس وقت، جب اس نے گولی چلائی، اچانک گردن نہ گھمائی ہوتی تو اس وقت میرا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہوتا۔'' میں نے اپنے اعصاب و قابو میں کرلیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ موت کا خوف

اچھے اچھوں کا پتّا پانی کردیتا ہے۔ میں بھی لاشعوری طور پر خوف زدہ تھا مگر کوشش بھی کررہا تھا کہ بظاہر پُرسکون نظر آؤں۔

''ویسے تم کچھ بتا سکتے ہو کہ یہ اچانک تم اتنے مطلوب کیسے ہوگئے کہ کوئی تمہاری جان کے پیچھے پڑ گیا؟''

''مجھے خود سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں نے تو آج تک کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی سے کبھی بھی پنگا لینے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں پر ایک بات ہوئی ہے۔'' میں نے آرتھر کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کے کان کھڑے ہوگئے۔

''کیا بات ہے؟ ذرا کھل کر بتاؤ۔''

آرتھر کی بات سن کر میں نے تفصیل سے اسے روزا میری سے ملاقات، ٹونی کا اس پر تشدد اور پھر مرحوم چارلی کے فلیٹ پر قبضے کے لیے ٹونی کی خواہش کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان باتوں کا علم مجھے روزا میری سے ہوا تھا۔

''اچھا... تو یہ بات ہے۔'' آرتھر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''پھر تو تمہاری جان کو واقعی خطرہ لاحق ہے۔ زن اور جائداد، دونوں کا معاملہ لگتا ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ اب تم مکمل نگرانی میں ہو۔ حملہ آور بچ نہیں سکتا۔ آخر کو اس نے ایک پولیس والے پر حملہ کیا ہے۔''

''روزا بتا رہی تھی کہ وہ چور اُچکا ہے۔ اکثر مہینوں لاپتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دھرا گیا، جیل ہوئی، سزا کاٹی اور باہر آگیا۔ چھوٹا موٹا بدمعاش ہوگا ورنہ اتنی جلدی باہر کیسے آسکتا ہے؟'' میں نے ٹونی کو ممکنہ حملہ آور مان کر رائے دی۔

''تمہارا خیال درست ہے۔ ویسے اب ایسا کرو کہ تم گھر چلو۔ میں خفیہ طور پر تمہاری نگرانی کا انتظام کرواتا ہوں۔ ویسے روزا سے پتا کرو کہ اس کے پاس ٹونی کی کوئی تصویر ہے تاکہ اس کی بھی نگرانی کی جاسکے۔'' آرتھر نے کہا۔

''وہ تو میں ابھی پتا کرلیتا ہوں، اس کے موبائل پر فون کرکے۔''

''ابھی نہیں۔ کل صبح تم اسے فون کرنا اور باتوں باتوں میں پوچھ لینا۔ البتہ کوشش کرو کہ جب تک تمہارے کان پر لگی یہ پٹی نہیں اتر جاتی، اس وقت تک اس سے نہ ملو تو بہتر ہے۔ ورنہ اس کو مطمئن بھی کرنا ہوگا کہ یہ زخم کیسے لگا۔ دوسرے یہ کہ اگر حملہ آور ٹونی ہی ہے تو اس تک بھی یہ بات پہنچ سکتی ہے۔ یوں وہ چوکنا ہوسکتا ہے کہ زخم لگا ہے تو تم اسپتال بھی گئے ہوگے۔ زخم گولی کا ہے تو پولیس کو بھی خبر گئی ہوگی۔ یوں وہ محتاط رویّہ اختیار کرسکتا ہے۔'' آرتھر نے تفصیل سے مجھے آگاہ کیا کہ اب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔

''ٹھیک ہے تو پھر میں ٹیکسی لے کر گھر جاتا ہوں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ ویسے تم بالکونی میں گولی تلاش کرنا۔ وہ کان کو چھو کر گزری ہے۔ اس لیے یا تو دیوار میں کہیں لگ کر پھنس گئی ہوگی یا پھر نیچے فرش پر کہیں گری ہوگی۔ گولی مل جائے تو اسے کسی لفافے میں ڈال کر رکھنا اور کل صبح نو بجے گرین لینڈ پارک آجانا اور اسے مجھے دے دینا۔ ہاں، خیال رکھنا کہ میں پارک میں نظر آؤں گا۔ تم جس بنچ پر بیٹھے ہوگے، مجھے دیکھ کر وہ لفافہ وہیں رکھ کر اٹھ جانا۔ میں نہیں چاہتا کہ ملزم کو کسی طور پر بھی یہ پتا چلے کہ معاملہ پولیس کے پاس ہے۔'' آرتھر معاملے کو نہایت سنجیدگی سے لے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کروں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔''

میں فلیٹ پر واپس پہنچا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کپڑے بدلے اور نیند کی گولی کھا کر بستر پر لیٹا تو صبح ساڑھے سات بجے الارم کے بجنے پر ہی آنکھ کھلی۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد جب میں نے بالکونی کا جائزہ لیا تو مجھے دیوار میں پھنسی ہوئی گولی مل گئی جسے نکال کر میں نے پلاسٹک کی چھوٹی سی تھیلی میں ڈالا۔ حسبِ معمول جب میں کافی کا مگ لے کر بالکونی میں کھڑا ہوا تھا تو روزا نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا اور پھر اندر کمرے میں آکر اس کا فون نمبر ملانے لگا۔

''ہیلو... گڈ مارننگ!''

''ہائے... کیسے ہو؟'' میری آواز سنتے ہی وہ چہک کر بولی۔

''بس... ٹھیک ہوں کل کی طرح۔''

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''اور سناؤ... ٹونی پھر دوبارہ تو نہیں آیا؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ویسے یہ اچانک تمہیں ٹونی سے کیوں دلچسپی پیدا ہوگئی؟''

''ارے بس یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ارے ہاں، ایک بات بتاؤ.. اس کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟'' میں نے عام سے لہجے میں روزا سے پوچھا۔

''کئی تصویریں تھیں مگر اب نہیں ہیں۔ کافی عرصہ پہلے اس نے شادی کی تصاویر بھی جلا ڈالی تھیں۔ اسے تصاویر کھنچوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایسے ہی۔ مجھے چہروں سے دلچسپی ہے۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ٹونی دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ آخر کو اب وہ میرا رقیب بھی ہے۔ ایک رشتہ تو بن گیا نا اس سے بھی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' اس کے لہجے میں بھی شرارت جھلک رہی تھی۔ ''جس دن تم گھر آئے تھے تو اسی وقت ٹونی نکل کر گیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ تم نے سیڑھیوں پر اسے دیکھ لیا ہوگا۔''

''اوہ... ویسے میری ایک ہلکی سی نظر پڑی تھی اس شخص پر۔ مجھے درست طور پر اس کا چہرہ یاد نہیں۔''

''چلو اس کا اسکیچ بنالو۔ مجھے دکھا دینا۔ جو کمی بیشی ہوگی، وہ میں بتادوں گی۔ تمہارا شوق پورا ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔

''چلو یہی کرتے ہیں، مجھے اور کیا کام ہے۔ آج کا دن ٹونی کے نام۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا، اب میں فون رکھتی ہوں۔ مجھے ناشتا بنانا ہے۔ سخت بھوک لگی ہے، چاہو تو تم بھی آجاؤ۔ ساتھ ناشتا کرتے ہیں۔''

''نہیں شکریہ... وہ ذرا پیٹ کا معاملہ گڑبڑ ہے۔ اس لیے آج تو میں فاقہ کررہا ہوں۔ تم جاکر ناشتا بناؤ اور اطمینان سے ناشتا کرو۔ پھر ملتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون رکھ دیا۔

آرتھر کی ہدایت کے مطابق گرین لینڈ پارک جاکر میں نے اسے خفیہ طور پر گولی حوالے کردی تھی۔ پارک سے واپسی کے بعد میں ڈرائنگ شیٹ اور پنسل لے کر بیٹھ گیا۔ آخر شام تک میں نے اپنے دماغ پر زور دے دے کر ٹونی کا خاکہ تیار کر ہی لیا۔

سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے میں اسپتال جانے کے لیے باہر نکلا تو روزا میری کی دکان سے اٹھنے والی مچھلی کی خوشبو نے میرے پاؤں جکڑ لیے لیکن میں دل پر جبر کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میرے کان کی کو پٹی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا کہ روزا کو اس زخم کی وضاحت دیتا پھروں۔

''ارے واہ... تمہارا زخم تو بڑی حد تک ٹھیک ہوگیا ہے۔'' ڈاکٹر نے پٹی اتارتے ہی کہا۔ ''اب تمہیں پٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک ٹیوب دے دیتا ہوں۔ ایک دو دن لگاتے رہنا۔ زخم کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔''

☆☆☆

''ہاں بھئی... وہ کل کے ناشتے کی آفر اب تک موثر ہے تو آؤں تمہارے ساتھ ناشتا کرنے کے لیے؟'' اگلی صبح میں نے روزا کو فون کیا۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوڑتے ہوئے آجاؤ۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ یہ لو... ابھی پہنچا۔'' میں نے فون بند کیا اور ٹونی کے اسکیچ کی شیٹ کو رول کر کے ہاتھ میں تھاما اور روزا کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ میری ہی منتظر تھی۔ ناشتا تیار تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم لیونگ روم میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

''ارے ہاں... یہ لو تمہارے ٹونی کا یادگار اسکیچ۔'' میں نے یہ جملہ ایسے انداز میں ادا کیا کہ جیسے مجھے ٹونی میں تو کوئی خاص دلچسپی نہیں بلکہ میں یہ اسکیچ روزا کو دکھا کر اس سے اپنی مصوری کی داد وصول کرنا چاہتا ہوں۔

''اوہ میرے خدا... رونالڈو! تم تو غضب کے مصور ہو۔ تم کہہ رہے تھے کہ تمہاری اچٹتی سے نظر ٹونی پر پڑی تھی۔ ایک اچٹتی نظر کا یہ کمال ہے تو بغور دیکھنے پر کیا غضب ڈھاتے ہوگے؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تو رکھ لو اسے۔ رونالڈو کو تحفے میں پیش کردینا۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ جلدی سے بولی۔

''ارے نہیں۔ یہ تم رکھو... اپنے ساتھ ہی لے جانا۔ اس بدبخت نے کہیں اسے دیکھ لیا تو سمجھے گا کہ میں نے یہ اسکیچ اس لیے بنوایا ہے کہ پولیس میں اس کی باتصویر شکایت کرسکوں تاکہ اس کی گرفتاری میں کوئی شک نہ رہے۔'' ٹونی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں خوف صاف جھلک رہا تھا۔

''اگر یہ بات ہے تو لاؤ اسے پھاڑ کر پھینک دوں۔''

''نہیں۔ اپنے ساتھ لے جانا اور وہیں پھاڑ کر پھینک دینا۔ وہ بہت شکی آدمی ہے۔ اگر اسکیچ کا ایک ٹکڑا بھی اسے مل گیا تو پھر میری خیر نہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ لاؤ اسے مجھے دے دو۔ گھر جاکر ڈسٹ بن میں ڈال دوں گا۔''

کوئی دس بجے کے قریب میں واپس اپنے فلیٹ پر پہنچا اور آرتھر کو فون کیا۔ ''میں نے ٹونی کا اسکیچ بنالیا ہے۔ روزا نے تصدیق کردی ہے کہ اسکیچ ہو بہو ٹونی کا عکس ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم اپنے دفتر پہنچو۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔ پہلے اس کا ریکارڈ چیک کرلیں۔''

''ٹھیک ہے، میں لنچ ٹائم میں آفس پہنچتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

دفتر پہنچا تو آرتھر میرا منتظر تھا۔

ہم سیدھے ماسٹر کمپیوٹر روم کی طرف گئے اور جب ٹونی کا اسکیچ اسکین کر کے ریکارڈ میں تلاش کیا تو تمام تر تفصیلات سامنے آگئیں۔

اس کا اصل نام رچرڈ گارسن تھا۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم میں ہمیشہ پولیس کو مطلوب رہا تھا۔ کئی معمولی سزائیں بھگت چکا تھا۔ پولیس ریکارڈ میں اس کا سب سے بڑا جرم ایک بینک ڈکیتی تھا۔ تین افراد نے مقامی بینک سے بیس لاکھ

ڈالرز کی رقم لوٹی تھی۔ یہ بینک اسی علاقے میں واقع تھا جہاں میں اس وقت رہائش پذیر تھا۔ واردات کے دس گھنٹوں کے اندر ہی اندر پولیس نے ملزمان کا سراغ لگالیا تھا مگر جب ان تینوں کو گرفتار کرنے کے لیے ایک بار پر چھاپا مارا گیا تو اس کے دو ساتھیوں نے پولیس پر حملہ کردیا اور جوابی فائرنگ میں مارے گئے۔ البتہ ٹونی پکڑا گیا لیکن اس کے قبضے سے لوٹی ہوئی رقم برآمد نہ ہوسکی۔ نہ ہی یہ ثابت ہوسکا کہ پولیس پر گولیاں چلانے والوں میں یہ بھی شامل تھا۔ رقم کی تلاش میں پولیس نے روزا کے فلیٹ کی بھی تلاشی لی تھی مگر رقم کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ یوں جرم ثابت نہ ہونے پر عدالت نے اسے بری کردیا اور وہ چھ ماہ جیل کاٹ کر ہفتہ بھر پہلے ہی رہا ہوا تھا مگر پولیس نے ڈکیتی کی فائل کو بند نہیں کیا تھا۔ تفتیش جاری تھی۔ عدالت کے فیصلے بعد انشورنس کمپنی نے بینک کو کلیم ادا کردیا تھا لیکن پولیس لوٹی ہوئی رقم کی تلاش میں بدستور سرکھپا رہی تھی۔

''اب دو باتیں ہیں۔ ڈکیتی کی رقم اس نے کہیں چھپائی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارا فلیٹ ہو۔ یاد ہے، تم نے ہی کہا تھا کہ مرحوم چارلی اس کا دور کا رشتے دار تھا؟'' آرتھر نے ماہرانہ انداز میں اپنے شکوک کا اظہار کیا۔

''دوسری بات کیا ہے؟''

''روزا میری... آخر وہ اس کی محبوبہ اور سابقہ بیوی ہے۔ ٹونی کی غیر موجودگی میں وہ تمہارے خاصی قریب آچکی ہے۔ بس وہ جذبۂ رقابت میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے، روزا اس دن کہہ رہی تھی کہ ٹونی دھمکی دیتا ہے کہ اگر اس نے کسی سے شادی کی تو وہ اسے قتل کردے گا۔ مجھے یہ دوسرا نکتہ خاصا قرین از قیاس معلوم ہوتا ہے۔'' آرتھر کی بات سن کر میں نے بھی اپنے خدشات کا اظہار کردیا۔

''کچھ بھی ہو، ہمیں ٹونی پر نظر رکھنا ہوگی۔ میں بینک ڈکیتی کی تفتیش کرنے والے پولیس افسر سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس کیس میں شامل ہوجائے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارا معاملہ اس کے کیس میں بھی مددگار ثابت ہو۔''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' میں نے آرتھر سے کہا۔ ''تمہارے خیال میں کیا میں اب واپس جاسکتا ہوں؟ میری چھٹی کا ایک دن تو اس دفتر میں ضائع ہو ہی چکا، اب کیوں نہ گھر جاکر کچھ آرام کرلوں۔''

''ہاں ہاں... کیوں نہیں۔ تم گھر جاؤ۔ البتہ خیال رکھنا۔ محتاط رہنا ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے آرتھر کی نصیحت سن کر کہا اور گھر لوٹ آیا۔

اس دن میں نے لنچ بھی نہیں کیا تھا۔ اس لیے شام کو روزا کی دکان پر جاکر پُرشکم ڈنر کیا۔ سارے دن کے خالی پیٹ میں کھانا گیا تو پھر نیند نے ایسا غلبہ ہوا کہ ..... آتے ہی بستر پر گرا اور پھر دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش نہ رہا۔

معلوم نہیں رات کا کیا وقت ہوا ہوگا جب مجھے ایسا لگا کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ گہری نیند میں یہ آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ اچانک دروازہ اتنے زور سے کھٹکھٹایا گیا کہ میری آنکھ تو کھل گئی مگر نیند اب بھی آنکھوں میں تھی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب لگے بٹن کو دبا کر لائٹ جلائی اور جونہی دروازہ کھولا، باہر موجود شخص نے کوئی بھاری چیز اتنے زور سے میرے سر پر ماری کہ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے اور پھر میں فرش پر گر پڑا۔ گرنے کے بعد کیا ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔

مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر ایک نرس تیزی سے میری طرف بڑھی۔

''خدا کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آگیا۔ میں ڈاکٹر رابرٹ کو اطلاع کرتی ہوں۔'' نرس دیوار پر لگے انٹرکام کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

میں کافی نقاہت محسوس کررہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میں سویا کہاں تھا اور اس اسپتال میں آنکھ کیوں کھلی؟ میں نے کچھ یاد کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ اسی دوران کمرے میں ڈاکٹر رابرٹ اور آرتھر داخل ہوئے۔

''گڈ آفٹرنون!'' دونوں نے یک زبان کہا۔

''میں یہاں کیسے پہنچا؟'' میں نے آرتھر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اگر تم یہاں نہ پہنچائے جاتے تو پھر عالمِ بالا میں پہنچ چکے ہوتے۔ شکر کرو کہ یہیں تک پہنچے ہو ورنہ...''

''تمہیں دوبارہ مارنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ہم چوکنا تھے اس لیے حملہ آور پکڑا گیا۔'' آرتھر کی بات سن کر مجھے اچانک سب کچھ یاد آگیا۔

''ٹونی پکڑا گیا؟''

''ہاں، ٹونی بھی پکڑا گیا۔'' آرتھر نے میرے سوال کا جواب دیا۔

''کیا مطلب تمہارا... ٹونی بھی... بات کیا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ تمہیں دو دن بعد ہوش آیا ہے۔ سر پر لگنے والا تانبے کا بھاری گل دان بے ہوشی کی حالت میں تمہاری وفات کا سبب بن سکتا تھا لیکن ہم نگرانی کررہے تھے۔

اس لیے تمہیں فوراً اسپتال لے آئے۔ ورنہ گولی سے بچنے والا گل دان سے مارا جاتا۔''

آرتھر کے لہجے میں شگفتگی تھی۔ اس کی بات سن کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو پیشانی سے اوپر پٹی بندھی ہوئی محسوس ہوئی۔

''برائے مہربانی دماغ پر زور نہ ڈالیں اور آرام کریں۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں آپ مکمل صحت یاب ہوسکتے ہیں بشرطیکہ آرام کریں۔ باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔''

ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو میں نے دماغ سے تمام خیالات کو جھٹک دیا۔ ویسے سر میں اب بھی درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

''کیا خیال ہے مسٹر آرتھر... چلیں؟ میرے خیال میں رونالڈو کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر رابرٹ نے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''ضرور۔ اچھا رونالڈو! تم تو اگلے دو تین دن تک یہیں ٹھہرو گے۔ پھر ملتے ہیں۔ اب چلتا ہوں۔'' آرتھر نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ نقاہت کے مارے مجھ سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔

☆☆☆

جس دن مجھے اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا، وہ جون کی چھبیس تاریخ تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس ماہ کی بیس تاریخ تھی جب میں نے ٹونی کا اسکیچ لے کر اس کا ریکارڈ تلاش کیا تھا اور اُسی رات یہ حادثہ پیش آگیا تھا۔ یوں پچھلے پانچ دنوں سے میں اسپتال میں تھا۔ ان گزرے روز و شب کے دوران اور کیا کچھ ہوا تھا، میں اس سے قطعی طور پر لاعلم تھا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب بینک ڈکیتی کی تفتیش کرنے والے پولیس افسر کارٹر نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسپتال سے گھر چھوڑا۔ اب میں طبیعت میں پہلے کی نسبت خاصی بہتری محسوس کررہا تھا۔ اگرچہ کارٹر میرے ساتھ تھا لیکن میں اس کے سہارے کے بغیر چل کر اپنے فلیٹ تک پہنچا۔

''چلیں، آپ آرام کریں۔ میں اور آرتھر شام کو آپ کی طرف آتے ہیں۔'' مجھے فلیٹ پر پہنچا کر کارٹر نے جانے کی اجازت چاہی۔

''ویسے ہوا کیا ہے... کچھ تو بتاؤ مجھے؟'' میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہم آرہے ہیں نا شام کو... پھر سب کچھ آپ کو بتادیں گے۔ ویسے مطمئن رہیں۔ اب آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔ ''اچھا... اب میں چلتا ہوں۔''

شام کے سات بج رہے ہوں گے جب میں بیدار ہوا۔ میں اب اپنے آپ کو کافی حد تک فٹ محسوس کررہا تھا۔ میں سیدھا کچن میں گیا اور کافی بنا کر بالکونی میں چلا آیا۔ حسب معمول طرح طرح کے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آرہی تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر میری پسندیدہ مہک یعنی مچھلی فرائی کی مہک غائب تھی۔

'کہیں روزا بیمار تو نہیں جو اس کی دکان بند ہے؟ ورنہ اس کی دکان تو میرے فلیٹ کے عین نیچے ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس کی دکان پر مچھلی فرائی ہو اور خوشبو نہ پھیلے۔' میں نے سوچا۔

دل چاہا کہ اسے فون کرکے خیریت دریافت کروں۔ ابھی میں فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی آرتھر کی آواز آئی۔

''دروازہ کھولو۔''

دروازہ کھولا تو کارٹر اور آرتھر دونوں موجود تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں ان دونوں کے لیے کافی بنانے کے لیے کچن میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد ہم تینوں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

''ہاں تو ذرا بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟'' میں نے کافی کا خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے دونوں سے سوال کیا۔

''ہاں... تم اب اس قابل ہو کہ بات کرسکو۔ اس سے پہلے کہ ہم بتائیں کیا ہوا تھا، تم اس رات جو کچھ ہوا تھا۔ اس کا تفصیلی بیان کارٹر کو لکھوادو۔''

''اب بتاؤ۔ اصل بات کیا ہے؟'' بیان لکھوانے کے بعد میں نے کارٹر سے سوال کیا۔

''جب آدھی رات کو تمہارے کمرے کی لائٹ جلی تو اس وقت میں باہر سڑک پر کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر تمہارے گھر کی نگرانی کررہا تھا۔'' آرتھر نے بات شروع کی۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔ ''کھلی کھڑکی سے لائٹ جلتے ہی باہر روشنی نظر آئی۔ یہ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں اور میرا ساتھی، دونوں تمہارے فلیٹ کی طرف دوڑے۔ جب تمہارے فلیٹ پر پہنچے اور دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو وہ بند تھا۔ ہم دونوں دروازے سے تھوڑا ہٹ کر دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ کمرے کی لائٹ بدستور روشن تھی اور دروازے کی جھریوں سے یہ روشنی نظر آرہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہمیں محسوس ہوا کہ کوئی دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم خاموشی سے کوریڈور کے اندھیرے والے حصے کی طرف بڑھ گئے۔ ذرا

دیر بعد ہی تمہارے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور کوئی دو بڑے سیاہ رنگ کے پلاسٹک شاپنگ بیگ لے کر تمہارے فلیٹ سے نکلا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کو پکڑتے، اچانک سیڑھیوں پر ٹونی نمودار ہوا اور اس نے اس کو دبوچ لیا اور چلایا۔

''تُو کمینی عورت...''

اس سے پہلے کہ کچھ اور ہوتا، ہم دونوں نے ان پر دھاوا بول دیا اور دونوں کی مشکیں کس لیں۔

''تو مجھ پر حملہ کرنے والی کوئی عورت تھی؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''جی ہاں۔''

''کون تھی وہ اور ٹونی سے کیا تعلق تھا اس کا؟''

''وہ تمہاری روزا تھی۔ ٹونی کی سابقہ بیوی اور محبوبہ۔ اس نے ہی تم پر رائفل سے گولی چلائی تھی۔''

یہ سنتے ہی میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ ''یار! کھل کر بتاؤ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''ٹھیک ہے تو سنو۔'' آرتھر نے جواب دیا۔

''ٹونی بہت معمولی بدمعاش ہے۔ اس نے پہلی مرتبہ سب سے بڑی واردات بینک لوٹنے کی کری۔ وہ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ رقم چھپانے کے لیے اس نے روزا کا سہارا لیا۔ روزا نے یہ رقم تمہارے فلیٹ کے غسل خانے میں لگی پانی کی دو میں سے ایک ٹنکی میں چھپادی تھی۔ انکل چارلی فالج زدہ تھے۔ روزا ان کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس لیے روزا نے ان کے اعتماد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رقم دو بڑے شاپنگ بیگ میں ڈال کر ٹنکی میں چھپادی تھی۔ بدقسمتی سے واردات کی رات ہی ٹونی گرفتار ہوا اور اس کے باقی دو ساتھی مارے گئے۔ ٹونی خوش تھا کہ جب وہ رہا ہوکر جائے گا تو بلاشرکت غیرے بیس لاکھ ڈالرز کا مالک ہوگا۔ جس صبح تم روزا سے اس وقت ملے، جب ٹونی نے اسے مارا تھا تو اس رات ہی وہ جیل سے رہا ہونے کے بعد روزا کے پاس پہنچا تھا۔ جب اس نے رقم کی بات کی تو روزا نے اسے بتایا کہ چارلی نے مرنے سے قبل فلیٹ خیراتی ادارے کو دے دیا تھا اور انہوں نے چارلی کی وفات کے چند روز بعد ہی اسے نیلام کردیا۔ اب اس کے بعد رقم کا کیا ہوا... یہ اسے معلوم نہیں۔ بس اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔''

''لیکن اس نے مجھ پر گولی کیوں چلائی؟ وہ مجھے کیوں مارنا چاہتی تھی؟''

''سچ یہی ہے کہ واقعی اسے یہ علم نہیں تھا کہ چارلی نے فلیٹ عطیہ کردیا ہے۔ جب اسے علم ہوا کہ چارلی مرگیا ہے تو اس نے سوچا کہ یہ فلیٹ اب برسوں لاوارث حالت میں بند پڑا رہے گا۔ اس وقت تک وہ یہی چاہتی تھی کہ ٹونی آئے گا تو وہ اسے بتادے گی کہ رقم کہاں ہے لیکن تمہارے اس فلیٹ میں آنے کے بعد اس کی سوچ بدل گئی۔'' آرتھر کی بات سن کر مجھے حیرت ہورہی تھی۔

''ہوا یہ کہ...'' آرتھر کی بات جاری تھی۔ ''تمہارے آنے کے بعد اس نے نیا منصوبہ بنایا۔ وہ غیرمحسوس طور پر تمہیں اپنے قریب آنے کا موقع دیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ٹونی اب تک چند ماہ سے زیادہ کبھی بھی جیل میں نہیں رہا ہے۔ اب اتنی بڑی رقم دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اگر ٹونی قتل جیسے جرم میں جیل چلا جائے تو پھر وہ پندرہ بیس سال تک سلاخوں کے پیچھے قید رہ سکتا ہے۔ یہی سوچ کر اس نے تم پر گولی چلائی۔ اس نے اتنی عمدگی سے نشانہ لیا کہ تم صرف زخمی ہو لیکن مرو نہیں۔ اس نے پہلے ہی تمہیں باور کروادیا تھا کہ جو شخص اس کے قریب ہوا، ٹونی اس پر قہر کی طرح ٹوٹے گا۔ گولی چلانے والے واقعے کے بعد جب ٹونی کا اسکیچ بنانے کے لیے تم اسے استعمال کررہے تھے تو دراصل وہ تمہیں استعمال کررہی تھی۔ اس نے نہایت چالاکی سے ٹونی کا اسکیچ بنوایا اور اس طرح تمہیں وہ اسکیچ لوٹایا کہ وہ تمہارے فلیٹ سے ہی برآمد ہو۔ اسی رات اس نے تمہارے گھر پر دھاوا بولا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اگر تم تین چار گھنٹے تک یونہی بےہوش رہے تو مرجاؤ گے اور پھر تفتیش کے دوران تمہارے کمرے سے یا ڈسٹ بن میں سے ٹونی کا اسکیچ پولیس کو مل جائے گا۔ یوں وہ قتل کے جرم میں جیل پہنچ جائے گا اور وہ رقم لے کر کہیں اور جاکر بڑا سا فاسٹ فوڈ ریستوران کھول کر سکون کی زندگی بسر کرے گی۔ بس ایک چُوک ہوگئی اس سے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ تم محکمۂ پولیس میں ملازم ہو۔ وہ تمہیں صرف ایک مصور سمجھتی تھی۔ اسے اگر تمہارے پولیس میں ہونے کا علم ہوتا تو شاید وہ یہ منصوبہ نہیں بناتی۔ دوسری ایک بات اور ہوئی۔ مار پیٹ کے بعد جب ٹونی اس کے گھر سے نکلا تو پھر نہ تو وہ اس کے گھر واپس گیا اور نہ ہی وہ اسے کہیں نظر آیا جس سے اس نے سمجھ لیا کہ ٹونی کہیں چلا گیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ ٹونی خفیہ طور پر روزا اور خود تمہاری نگرانی کررہا تھا۔''

''میری نگرانی... مگر وہ کیوں؟'' میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''وہ تمہاری نگرانی اس لیے کررہا تھا کہ جیسے ہی اسے موقع ملے وہ تمہاری غیرموجودگی میں، فلیٹ میں داخل ہوکر

رقم نکالنے کی کوشش کرے۔'' آرتھر کی باتیں سن کر میرا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔

''اگر تم خدانخواستہ قتل ہوجاتے اور ٹونی تمہارے خون کے جرم میں گرفتار ہوجاتا تو پولیس کے سامنے سوال پیدا ہوتا کہ ٹونی نے تمہیں قتل کیوں کیا؟ اس کے لیے یہی جواز کافی تھا کہ روزا تم سے شادی کرنے والی تھی اور یہ بات ٹونی کو پسند نہیں تھی۔ روزا میری تمہارے قتل کے الزام میں ٹونی کے گرفتار ہونے کے بعد پولیس کو یہی بیان دیتی کہ رونالڈو سے ٹونی کو یہی پُرخاش تھی کہ ہم دونوں شادی کرنے والے تھے۔''

آرتھر کے انکشافات سن کر تو میں پاگل ہوگیا تھا۔ وہ معصوم حلیم الطبع، آرٹ کی دلدادہ، گھریلو سی خاتون اتنی چالاک اور عیار ہوسکتی ہے، مجھے یقین نہیں آرہا تھا... مگر حقیقت یہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' آرتھر نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ ''یقین نہیں آرہا ہے نا؟''

''ہاں۔ یہی بات ہے۔'' میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو اس سے شادی کرنے کے سپنے بُن رہا تھا مگر وہ...''

میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''چلو اچھا ہوا۔ بینک ڈکیتی کا کیس تو حل ہوگیا۔'' میں نے جان بوجھ کر بات کو روزا سے بینک ڈکیتی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ روزا کی حقیقت نے عورت پر سے میرا اعتبار ہی اٹھا دیا تھا۔

''جی ہاں۔ بینک ڈکیتی میں لوٹی جانے والی پوری کی پوری رقم برآمد ہوگئی ہے۔'' کارٹر نے کہا۔ ''بینک کو چونکہ انشورنس کمپنی کی جانب سے کلیم مل چکا ہے، اس لیے یہ رقم اب انشورنس کمپنی کو جائے گی۔ تمہارے بیان کا انتظار تھا۔ کل ملزمان اور رقم کو، تمہارے بیان کے ساتھ عدالت میں پیش کردیں گے۔ عدالت برآمد کی گئی رقم کمپنی کو ادا کرنے کا حکم دے گی تو رقم فوراً کمپنی کے حوالے کردی جائے گی۔''

''چلو، یہ کیس بھی حل ہوگیا۔'' میں نے خوشی سے کہا تو کارٹر بولا۔

''میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میرا کیس حل ہوگیا ورنہ تو میں خود مایوس ہونے لگا تھا۔'' کارٹر نے آرتھر کے خوش ہونے پر کہا۔ ''اس کامیابی کا سہرا آپ کے ہی سر جاتا ہے۔''

''کہو... کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہو؟'' آرتھر نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

''میرے خیال میں کچھ اور جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب کچھ تو تم بتا چکے ہو۔'' میں نے بےدلی سے جواب دیا۔

''ارے ہاں، کارٹر... وہ انشورنس کمپنی کا لیٹر کہاں ہے؟'' آرتھر نے کہا۔

''ارے... وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے قمیص کی جیب میں رکھا ہوا لفافہ نکالا۔ ''یہ آپ کے لیے ہے۔''

میں نے لفافہ لے کر اسے کھولا۔ اس میں میرا نام لکھا ہوا تھا۔

''اگرچہ بینک ڈکیتی کی جو رقم برآمد کی گئی ہے یہ اس وقت فلیٹ میں موجود تھی، جب آپ نے یہ فلیٹ خریدا۔ اس لحاظ سے یہ آپ کی ملکیت ہوئی لیکن چونکہ یہ ڈکیتی کی رقم تھی اور ملزمان کی گرفتاری اور رقم کی برآمدگی ایک ساتھ عمل میں آئی ہے اس لیے یہ رقم کمپنی کو ملے گی....... کمپنی کا خیال ہے کہ رقم کی برآمدگی اور ملزمان کی گرفتاری میں بنیادی کردار آپ کا ہے اور اس سلسلے میں ایک بار آپ کی زندگی بھی داؤ پر لگ چکی تھی۔ اس لیے ہم نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ برآمد کی گئی کل رقم کا بیس فیصد آپ کو بطور انعام دیا جائے گا۔ عدالت کے حکم کے بعد جب کمپنی کو رقم مل جائے گی تو ایک تقریب منعقد کی جائے گی جس میں بیس لاکھ ڈالرز کا بیس فیصد حصہ، مبلغ چار لاکھ ڈالرز آپ کو شکریے کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔''

''اوہ میرے خدا!'' میرے منہ سے بےساختہ نکلا۔ ''یہ تو روزا کی بےوفائی سے بھی زیادہ چونکا دینے والی خبر ہے۔''

''کہو... کیا کرو گے اتنی بڑی رقم کا؟'' آرتھر نے مسکرا کر پوچھا۔

''نوکری چھوڑ رہا ہوں۔ اپنا اسٹوڈیو اور آرٹ گیلری بنانے کے لیے۔''

''واہ... یہ خوب رہی۔ روزا نے تمہیں چھوڑا اور تم نے نوکری کو۔''

''نہیں۔ تم غلط کہہ رہے ہو آرتھر!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نوکری چھوڑ رہا ہوں، مصوری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنانے کے لیے۔''

زندگی بھر قناعت کی اور کبھی دولت کے پیچھے نہیں بھاگا۔ اب لکشمی خود آگے بڑھ کر گلے لگی ہے تو میں اور کیا کروں؟

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

دسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے ۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے …… مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی …… وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے …… جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے …… کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے …… سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے …… ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے …… عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے …… جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر …… عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے …… کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر …… ایک للکار ہے ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ اسی دوران میں اپنے گھر کے قریب سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں سے میرا سامنا ہو گیا اور انہوں نے درجنوں لوگوں کے سامنے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ میری حساس طبع کے لیے یہ سب کچھ نہایت تباہ کن تھا۔ میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے واجی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم مغورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم مغورا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ ابرار

صدیقی کے پاس مہاتما بدھ کا کوئی نادر مجسمہ تھا جسے میڈم صنوبرا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ مجید منشو نامی شخص کی ہلاکت پر… شک کی بنا پر میڈم صنوبرا نے عمران کو اغوا کرالیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے صنوبرا کو قائل کرلیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سردمہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہوسکا۔ نادیہ شدید زخمی ہوگئی۔ میری بے وقوفی، کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ میں نے عمران کو پہلی بار تھوڑا پریشان دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم صنوبرا بہن کا انتقام لینے کے لیے شعلہ جوالہ بن جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ میڈم کے ہرکاروں سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ نے میرا اور عمران کا پیچھا کیا۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھگا دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کررہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کردیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش وحواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم ایک کھوہ میں چلے گئے… سلطانہ کا تعاقب کرتا ہوا ایک ہارون نامی شخص کھوہ میں پہنچا اور سلطانہ کی کلہاڑی سے زخمی ہوکر بے ہوش ہوگیا۔ ہم اس کھوہ سے نکل گئے۔ راستے میں ہاشو نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور نل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی نل پانی میں آئی ہے۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارِمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ لیکن یہاں مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کردیا… سلطانہ کو پناہ ملنے کا امکان معدوم ہوگیا۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعدازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم جی کے لوگوں کے حوالے کردیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے بگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کردیا گیا۔ یہاں میری میڈم صنوبرا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے بگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ سے اصطبل میں کام لیا جانے لگا۔ مجھ پر تشدد کرکے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رک گئی۔ پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ نے مجھے ہمت بخشی اور میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ دو کتوں کو ہلاک کرڈالا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں نتائج سے بے پروا باہر کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا۔ ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہوگئے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ مسلح گھڑ سوار میرے تعاقب میں تھے اور میں جنگل میں بھٹکتا رہا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن صبح اچانک میرا تعاقب کرنے والے آپہنچے۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے اچانک فائرنگ کردی۔ دو افراد فرار ہوگئے جبکہ دو موت کے گھاٹ اتر گئے۔ میں انہی افراد کے ایک گھوڑے پر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ مگر مجھے پھر اپنے تعاقب میں کچھ لوگ نظر آئے۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ اس کی حالت خراب تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا۔ مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کے بجائے حکم جی کے اہلکاروں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہاں فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم جی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی سہیلی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔

ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا، اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے جہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ماریا نے اپنے پاس چھپے پستول سے فائرنگ کی اور گولی ہمارے ساتھی فیروز کے لگی تاہم میں نے اسے پکڑ لیا۔ ماریا کو اب اچھی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگالیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے کہیں بھی ٹریس کرلیا جاتا ہے۔ ماریا کے اغوا کی خبر ہم نے حکم جی کے اہلکاروں تک پہنچا دی۔ غار کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور ہم ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ ادھر بارونڈا نامی عجیب الخلقت شخص نے مجھ پر کچھ باتیں عیاں کیں۔ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن تھا اور یہاں ماریا اور حکم جی کے گارڈز کو تربیت دینے آیا تھا مگر ایک ہندو لڑکی کے عشق نے اسے حکم جی کے عتاب کا شکار بنادیا اور وہ اپنی ٹانگ اور ایک ہاتھ گنوا بیٹھا۔ بارونڈا نے مجھے جوڈو کراٹے کے حوالے سے اہم باتیں بھی سکھائیں۔

دوسرے دن سرنگ کے دہانے پر ہنگامہ برپا تھا۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہوچکی تھی اور انور خاں اور حکم جی کے اہلکاروں میں زوردار بات چیت ہورہی تھی۔ بات چیت کے دوران مجھے ایک نام سنائی دیا جسے سن کر میرے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ یہ رنجیت پانڈے تھا، انڈین اسپیشل فورسز کا سابقہ افسر جس نے مجسمے کی چوری پر ہمیں پاکستان سے پکڑ کر یہاں انڈیا میں قیدی بنالیا تھا… اور اسے دشمنوں کے لیے عزرائیل کہا جاتا تھا… وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔

ب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے پانڈے کی بس ایک ہی جھلک دیکھی اور وہ بھی عقب سے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا اور چھلانگ لگا کر ایک نشیب میں اوجھل ہوگیا۔ وہ خاصا تنومند تھا۔ اس نے پینٹ اور چیک دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ غالباً گرد موداں سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے نشیب میں اترا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل بھی وہیں موجود ہو…

اس تبادلۂ خیال کا نتیجہ پانچ دس منٹ بعد سامنے آگیا۔ پانڈے کی بھاری بھرکم کرخت آواز ایک بار پھر درختوں کے عقب سے ابھری۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ”انور خاں! ہم ناہیں چاہت کہ تم کسی طرح کی حماقت کرو اور اس کے نتیجے میں سب کچھ برباد ہو جائے۔ گرد موداں خون خرابے سے بچنے کے لیے ہر حد تک جانا چاہت ہیں۔ تم نے پچاس لوگن کی جو لسٹ دی ہے، ان میں سے آدھے تو ہمارے پاس آگئے ہیں لیکن باقیوں کا کچھ پتا ناہیں۔ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی مزید کوشش کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر کچھ لچک پیدا کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل دوپہر تک تم لوگن کو کوئی حتمی جواب دے سکیں گے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ تم صرف وقت گزاری کررہے ہو۔“ انور خاں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ”تمہاری فطرت دھوکا ہے پانڈے… اور تم اس کے خلاف نہیں چل سکتے ہو۔ مگر میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتادوں۔ ہمیں تو مرنا ہی ہے لیکن یہ میم صاحب بھی زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ میرا تم سے اور اسٹیل… موداں وغیرہ سے وعدہ ہے۔“ انور کی آواز میں حد درجے کی تپش تھی۔

سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز ابھری۔ ”ہام ماریا کا لائف بچانا چاہتا اور اس کے ساتھ تمہارا سب کا لائف بھی بچانا چاہتا۔ ہام ہوپ کرتا ہے کہ کچھ طے ہو جائے گا۔ ہام کی طرف سے پرامس ہے کہ کل دوپہر تک کسی طرح کا کوئی کارروائی ناہیں ہوگا۔ تم لوگ بھی خود کو COOL رکھو۔“

انور خاں… سرجن اسٹیل اور پانڈے کے درمیان اس حوالے سے دو چار منٹ بات ہوئی پھر انور خاں کل دوپہر کا مزید وقت دینے کو تیار ہوگیا۔

یہ بڑی سخت قسم کی اعصابی جنگ تھی۔ ہر ہر پل جیسے سولی پر گزر رہا تھا۔ دونوں طرف سخت تناؤ موجود تھا۔ ایسی صورت حال میں کامیاب فریق وہی ہوتا ہے جو اعصاب کو ٹوٹنے سے بچائے رکھتا ہے اور اندازہ ہوتا تھا کہ انور خاں اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی چل رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے کی بشاشت قائم رکھی ہوئی تھی۔ گفتگو کے آخر میں انور خاں نے ماریا کے لیے تین بوتل شراب کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ مطالبہ میرے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسی وقت شراب کی سربمہر بوتلیں اندر سرنگ میں بھجوا دیں۔

گفتگو ختم ہوئی تو میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ”یہ پانڈے وہی ہے جو انڈین سیکیورٹی فورس میں افسر تھا اور اب یہاں حکم کے لیے کام کرتا ہے؟“

”وہی ہے حرامی…“ انور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس کے یہاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم اور جارج وغیرہ دونوں راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت کا… اور کسی اچانک کارروائی کا بھی۔ پانڈے اور اس کے ساتھی ایسی اچانک کارروائی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور سے یہ پانڈے کسی لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خطرناک ہے۔ ہمیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔“

اسحاق نے کہا۔ ”میری تو رائے ہے کہ دستی بموں میں سے دو چار بم اس خبیث ماریا کی کمر سے بھی باندھ دیے جائیں اور پانڈے وغیرہ کو بھی بتا دیا جائے کہ ماریا کس حال میں ہے۔“

”چلو اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔“ انور خاں نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ”لیکن ماریا ہے کہاں؟“

اسحاق بولا۔ ”وہ اُدھر بیٹھی اپنی روٹی پکا رہی ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ یہاں ڈبل روٹی اور کیک پیسٹری ناہیں ملیں گی… روٹی ہی ملے گی اور یہ روٹی بھی اسے خود پکانا ہووے گی۔“

میں نے دیکھا کہ سرنگ کے خم پر جہاں عارضی باورچی خانہ بنایا گیا تھا، وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے جاکر دیکھا اور یقین ہوگیا کہ بھوک انسان سے سب کچھ کرواسکتی ہے۔ سفید فام ماریا کے پاؤں زنجیر میں بندھے ہوئے تھے لیکن ہاتھ آزاد تھے۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور اوپر توا رکھا تھا۔ ماریا جس نے شاید کبھی تنکا پکڑ کر بھی دہرا نہیں کیا ہوگا، اپنے لیے روٹی پکا رہی تھی۔ پچھلے دو تین دن میں اسے کافی مشق ہوگئی تھی۔ توے پر ایک گول روٹی نظر آرہی تھی۔

اسحاق میرے پیچھے آکھڑا ہوا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میم جی کو کافی تجربہ ہوگیا ہے۔ اب ان پر کچھ اور ذمے داری ڈال دینی چاہیے۔“

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی، یہ سارا دن بیٹھ کر ہمیں گھورنے کے سوا اور تو کچھ کرتی نا ہیں۔ ہم چھ سات بندوں کے لیے اگر چودہ پندرہ روٹیاں اتار دیا کرے گی تو کون سی قیامت آجاوے گی؟ اس کی اپنی روٹی بھی ہضم ہو جایا کرے گی۔''

ماریا، اسحاق کی بات مکمل سمجھ گئی تھی لیکن سنی ان سنی کر گئی۔ اس کے چہرے کی سرخی سے ظاہر تھا کہ اس کا پارا چڑھ رہا ہے لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور صحت مند جسم رکھتی تھی۔ کل باروندا جیکی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک وقت میں جوڈو کراٹے بھی سیکھتی رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ جوڈو کراٹے میں اسے مہارت تھی یا نہیں مگر اس کے ڈیل ڈول اور تاثرات سے دکھائی دیتا تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت سخت قسم کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ بہر حال، ابھی تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہوا تھا اور وہ خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

ہمیں اپنے قریب دیکھ کر وہ جھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے روٹی اتار کر ایک طرف رکھی اور سالن گرم کرنے کے لیے توا اتارنا چاہا۔ جب وہ توا اتار رہی تھی، وہ ایک دم لڑھک گیا اور گھوم کر اس کے پاؤں پر آیا۔ وہ چلا اٹھی... اور پھر ''او گاڈ... او گاڈ'' کی گردان کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ توے نے اس کے سفید گلابی پاؤں کو آتشیں بوسہ دیا تھا اور انگلیوں سے اوپر کی ساری جگہ سرخ نظر آرہی تھی۔ ماریا کی آوازیں سن کر چوہان اور ہمیش بھی وہاں آگئے۔

چوہان نے اس کا متاثرہ پاؤں دیکھ کر کہا۔ ''ماریا کے بیگ میں ایک دواؤں والا شاپر پڑا ہے، وہ لے کر آؤ۔''

ہمیش بیگ کی طرف بڑھا۔ ماریا ایک دم بھڑک کر انگریزی میں بولی۔ ''مجھے نہیں چاہیے دوا۔ مجھے نہیں چاہیے تمہاری ہمدردی۔ مجھے مر جانے دو۔ مجھے زہر کا کوئی انجکشن لگا دو تا کہ میری جان چھوٹ جائے۔''

اسحاق پھنکارا۔ ''تم ابھی سے گھبرا گئی ہو میم جی!! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی پورا پورا حساب کتاب ہونا ہے اور جو کچھ ہوا ہے یہ تو ''حساب'' کا عشرِ عشیر بھی نا ہیں۔ بس ایک چھوٹی سی مثال سن لو۔ جس ملازم لڑکے کو تم نے طوطوں کو خوراک نہ دینے کی پاداش میں بھوکا مار دیا تھا، یہ اس کی ایک گھنٹے کی بھوک پیاس کا بدلہ بھی نا ہیں ہے۔''

اس مرتبہ وہ گلابی اردو میں بولی۔ ''اسی لیے تو ہام تو م سے کہتا ہے کہ ہام کو مار ڈالو۔ تمہارا سارا ہی بدلہ ایک بار میں پورا ہو جائے۔''

''موت اتنی آسان نا ہیں ہے میم جی۔'' اسحاق پھنکارا۔ ''میں نے اپنی بہن کو ایک ایک سانس کے لیے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ کیا تم نے کبھی ہانپتی ہوئی پیاسی چڑیا کو دیکھا ہے؟ وہ اسی طرح سانس لیوت تھی۔ اور وہ تھی بھی تو ایک چھوٹی سی چڑیا کی طرح... تمہارے بھائی کی شکرہ آنکھوں نے اسے شکار کے لیے چنا... اور پھر اس کے بے رحم پنجوں نے اس کے جسم کو لہولہو کر ڈالا۔ وہ اس کے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے جیون کی ریکھا ہی پار کر گئی۔ ہاں، میں نے اسے مرتے دیکھا ہے اور میں جانت ہوں کہ جان دینا آسان نا ہیں۔''

اسحاق کے لہجے میں اتنی آگ تھی کہ چاروں طرف انگارے برستے محسوس ہوئے... ماریا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اسحاق پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ وہاں کھڑا رہا تو طیش کے دریا میں بہہ جائے گا اور وہ اس طیش کی وجہ سے پٹ جائے گی۔

انور خاں آگے بڑھا اور اس نے ماریا کو بہ مشکل آمادہ کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر دوا لگوا لے۔ وہ بُرے بُرے منہ بنا رہی تھی۔ میں اس کے قریب چوکس کھڑا تھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی اور میری انگلی ٹریگر کے آس پاس تھی۔ ماریا کے ہاتھ فی الحال کھلے ہوئے تھے اور یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ طیش کے عالم میں کسی پر جھپٹ پڑتی۔ پچھلے چند دن میں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کی طرف سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سرنگ کے دور افتادہ کونے سے باروندا جیکی کا واویلا سنائی دے رہا تھا۔ وہ نشے کے بغیر تڑپ رہا تھا اور اس کی وہی تلخی اور جھلاہٹ واپس آچکی تھی جس کا مشاہدہ ہم نے کشتی میں کیا تھا۔

احمد نے آکر مجھ سے کہا۔ ''تابش بھائی! تمہارا یار بہت بے چین ہووت ہے۔ وہ کہوت ہے، میں مرنے والا ہوں۔ اگر میں پیاسا مر گیا تو تم سب جہنم میں جاؤ گے۔''

''وہ جس طرح کا پانی مانگ رہا ہے، وہ دے کر بھی تو ہم جہنم میں ہی جائیں گے۔'' چوہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انور خاں بولا۔ ''اس کی پیاس ذرا بڑھنے دو، پھر وہ اندر کی باتیں بتانے پر مجبور ہوگا۔''

میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ شام تک اس کی تڑپ ذرا بڑھ جائے تو پھر اسے ''مہیا'' کی جائے۔ اندر جیکی کا واویلا تھا اور باہر ان کتوں کی آوازیں تھیں جو پانڈے اور اسٹیل کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر باروندا جیکی کے پاس تھا۔ آج وہ خلافِ معمول دراز ہونے کے بجائے ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دیتا تھا۔ ''جیکی!'' میں نے کہا۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور بے حرکت بیٹھا رہا۔

''جیکی... جیکی!'' میں نے دہرایا لیکن صورتِ حال جوں کی توں رہی۔

یکا یک مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ عدم آباد ہی روانہ نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ وہ جیسے اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری جھلاہٹ ابھری۔ وہ نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم کہاں سے آگئے ہو؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟ دفع ہو جاؤ... دفع ہو جاؤ۔''

''تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ میں تابش ہوں۔''

''تابش ہو تو میں کیا کروں؟'' اس پر بدستور جھلاہٹ سوار تھی۔

''دیکھو، میں یہ کیا لایا ہوں۔'' میں نے وسکی کی چم چم کرتی بوتل لالٹین کے رخ پر رکھ کر اسے دکھائی۔ اس کی تلخی ایک دم کم ہو گئی۔

اس نے آنکھیں موند کر دو تین گہری سانسیں لیں پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بہت دور گیا ہوا تھا... وہ میرے بہت پاس تھی۔ ہم اس خاموش پانی کے کنارے پر تھے اور وہاں سیکڑوں کنول کھلے ہوئے تھے۔ تم نے... سارا طلسم توڑ دیا...'' شاید وہ مایوس لہجے میں کچھ اور بھی کہتا مگر پھر اس کی نظر بوتل پر پڑ گئی۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس نمایاں ہونے لگی۔

''تم کس طلسم کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''محبت کے طلسم کی!'' اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ ''جب میں بہت تنہا ہوتا ہوں... دکھ کی آخری حدوں کو چھو رہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس چلی آتی ہے۔ اسی لباس میں جس میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا... اور اسی لباس میں جس میں وہ سات آٹھ روز میرے ساتھ کشتی پر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور سرسبز جنگل میں پانی کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیتی ہے۔ ہنستی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنا وزن میری بانہوں پر ڈال کر لہراتی ہے۔ اس کے بال بہت لمبے ہیں... وہ کسی سیاہ آنچل کی طرح ہوا میں جھومتے ہیں اور مچلتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر کرنیں موتی بکھیرتی ہیں اور اس کی شربتی آنکھوں میں پھولوں اور تتلیوں کے سارے رنگ اتر آتے ہیں۔ وہاں فطرت کے سوا ہمیں کوئی نہیں دیکھتا اور فطرت بھی ہماری ہم مزاج ہو جاتی ہے۔ رات کی پھیلتی ہوئی چادر میں ہم اپنی کشتی کے اندر چلے جاتے ہیں اور اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ... محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا...''

''مجھے افسوس ہے دوست کہ میں نے تمہیں تمہارے تصور سے دور کر دیا۔'' میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں۔ اس کو تصور مت کہو۔ یہ تو حقیقت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے جسم اور لباس کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتا ہوں... جیسے اب۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔ میں اس سونگھ رہا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنی سانس اندر کی طرف کھینچی۔

شاید وہ اس بارے میں کچھ دیر مزید بات کرتا لیکن اب شراب کو اپنے سامنے دیکھ کر اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہی روز والا عمل پھر شروع ہوا۔ میں وہ سیال آتش، گلاس میں بھر بھر کر اسے دیتا رہا اور وہ یہ تلخ بدبو اپنے گلے میں اتارتا رہا۔ آخر اس کا نشہ پختہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ اور ناتوانی ختم ہونے لگی۔ مدقوق چہرے پر برسنے والی ازلی جھلاہٹ کی جگہ ایک طرح کے سکون نے لے لی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ایک بار پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اب یہاں کی صورتِ حال کو بھی کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم حکم اور جارج کے باغیوں کی حیثیت سے یہاں اس سرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

جلد ہی میں گفتگو کا رخ کل والے موضوع کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ حقیقت ہے کہ مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نامور کھلاڑی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ ''ماسٹر کھلاڑی'' عام لوگوں کی طرح جسمانی تکنیک اور داؤ پیچ کے بجائے ذہنی کیفیت اور دماغی توانائی پر زور دیتا نظر آتا تھا۔

وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ نیڈ بیگ ہمارے سامنے تھا۔ وہ ایک بار پھر مجھے مختلف ٹپس دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے عملی مشق بھی کرا رہا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ مجھے

وہ باتیں بتا رہا تھا جو آج تک کسی نے نہیں بتائی تھیں۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس شخص کی بے پناہ صلاحیتیں مجھ پر آشکار ہو رہی تھیں۔ یہ بظاہر لاغر و حقیر شخص میرے لیے دیکھتے ہی دیکھتے غیر معمولی ہو گیا اور میں خود کو اس کے سامنے ایک دم بونا محسوس کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''جیکی! آپ نے کل ''درد'' کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ کیا طریقہ ہے جس سے ہم درد کو کم سے کم محسوس کر سکتے ہیں؟''

وہ ذرا ہانپ گیا تھا اور اسے ہلکی ہلکی کھانسی بھی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا پھر بولا۔ ''درد بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ہمیں اتنا ہوتا نہیں جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اسے سمجھنے کے لیے میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔ میڈیکل کی تعلیم یہ ثابت کرتی ہے کہ اگر کسی شخص کو بے ہوش کیے بغیر یا اسے سن کیے بغیر اس کا پیٹ چاک کر دیا جائے اور اس کی انتڑیاں وغیرہ اٹھا کر باہر رکھ دی جائیں اور کچھ کو مہارت سے کاٹ داٹ بھی دیا جائے تو وہ شخص آسانی سے برداشت کر سکتا ہے... اور اس کا درد ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا لیکن عملی طور پر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ جس شخص کے ساتھ ایسا ہوگا، وہ روئے چلّائے گا اور نشتر کی ہر ہر حرکت پر آسمان سر پر اٹھا لے گا اور عین ممکن ہے کہ بے ہوش ہی ہو جائے۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آتی ہے؟''

''... کہ وہ درد کی وجہ سے نہیں، خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوتا ہے۔''

''ہاں، خوف کی وجہ سے اور اس غلط احساس کی وجہ سے کہ اسے بہت درد ہو رہا ہے... ہماری عام زندگی میں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ حقیقت میں ہمیں درد اتنا نہیں ہو رہا ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟''

''ہاں... کچھ کچھ۔''

''ہم عام طور پر جانوروں کو بہت سخت جان سمجھتے ہیں... اور وہ ہوتے بھی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کتا ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ساتھ گلیوں میں پھرتا رہتا ہے۔ کسی شکاری جانور کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے اور ایک بڑا زخم بن جاتا ہے لیکن وہ اسی حال میں بھاگ دوڑ کرتا رہتا ہے۔ ایک مادہ ہرن کسی کی مدد کے بغیر بچے کو جنم دیتی ہے اور خود ہی کوشش کر کے اسے اپنے جسم سے علیحدہ بھی کرتی ہے۔ ان سب جانوروں کو بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ صرف اور صرف درد کو محسوس کرتے ہیں۔ ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ درد کے ساتھ اپنے خدشوں، واہموں اور ذاتی احساسات کو بھی منسلک کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آسانی سے بڑے سے بڑے درد کو جھیل لیتے ہیں۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ درد کو ذہن پر سوار نہ کیا جائے؟''

''نہیں... میں اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ درد کی گہرائی میں اترا جائے۔ اس کو پرکھا جائے کہ اصل میں وہ کتنا ہے۔ اس میں کیا دم خم ہے۔ اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ جب ہم یہ سب کچھ جان لیں گے تو آدھے سے زیادہ درد تو ویسے ہی ختم ہو جائے گا... جو میں کہہ رہا ہوں تم اس کو فالو کر رہے ہو؟''

''ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

اچانک اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی بیساکھی نما لاٹھی زور سے میرے کندھے کے قریب دے ماری۔ میرا بازو جھنجھنا اٹھا۔ میں تکلیف کی شدت سے ایک طرف کو جھک گیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا کندھا تھام لیا۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تم نے اس ضرب کو ویسے ہی لیا ہے جس طرح عام لوگ لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بڑے زور سے لاٹھی ماری گئی ہے اور انہیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاٹھی لگنے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اس سے ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اس نے چند لمحے کھانس کر گلا صاف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو... اب میں تمہیں دوبارہ چوٹ لگاتا ہوں۔ تم باقی ساری باتیں اپنے ذہن سے نکال دینا۔ پوری یکسوئی کے ساتھ صرف یہ محسوس کرنا کہ تمہیں تکلیف کتنی ہوئی ہے اور تمہارا دماغ اس تکلیف کو کس طرح محسوس کر رہا ہے۔ صرف اور صرف تکلیف پر دھیان رکھنا، باقی کسی چیز پر نہیں۔''

مجھے ہدایات دینے کے بعد اور ذہنی طور پر تیار کرنے کے بعد، اُس نے ایک بار پھر زور سے لاٹھی گھما کر میرے دوسرے بازو پر ماری۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ایک بار پھر درد کی لہر میرے بازو سے اٹھ کر دماغ کی طرف گئی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اس مرتبہ درد بہت کم ہوا اور میں اسے آسانی سے برداشت بھی کر گیا۔

''کیسا لگا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو ایک میجک کی طرح ہے۔''

''میجک تو تمہارے اندر ہی ہے۔ اس مرتبہ تم درد کی

گہرائی میں اترے ہو اور اسے اتنا ہی محسوس کیا ہے جتنا وہ اصل میں ہے۔'' جیکی نے کہا اور ایک بار پھر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس بندے میں کوئی بات تھی۔ وہ کوئی روحانی شخص تو نہیں تھا لیکن مارشل آرٹ کے حوالے سے اس میں کچھ نہ کچھ انوکھا پن پایا جاتا تھا۔

درد کی گہرائی میں اتر کر اس کی حقیقی شدت کو پرکھنے والی بات میں نے پہلے بھی کہیں سنی یا پڑھی تھی۔ کسی پیرا سائیکولوجسٹ نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے دانت یا گردے وغیرہ کے درد پر اپنی سوچ کو مرکوز کر لے اور اس کی اصل کیفیت کو جانچنے کی کوشش کرے تو یہ درد کم ہونے لگتا ہے۔

درد پر غالب آنے کے موضوع پر باروندا جیکی نے مجھے کئی باتیں بتائیں۔ یہ باتیں دل میں کھب رہی تھیں اور دماغ انہیں قبول کر رہا تھا... اور ان باتوں کی سچائی کی گواہی خود جیکی بھی تو تھا۔ میں نے اس کے جسم میں برداشت کی غیر معمولی کیفیت دیکھی تھی۔

وہ شراب کا تلخ گھونٹ بھر کر بولا۔ ''ان باتوں کو یاد رکھو گے تو یہ تمہاری زندگی کو تبدیل کر دیں گی۔ درد پر غلبہ پانے کی کوشش جاری رکھو گے تو آہستہ آہستہ یہ بالکل تسخیر ہو جائے گا۔ تمہیں عام لوگوں کے مقابلے میں دسواں حصہ درد ہو یا شاید اس سے بھی کم۔ اور جب ایسا ہو جائے گا، کئی نہایت مشکل کام تمہارے لیے مشکل نہیں رہیں گے۔''

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں کل بتایا تھا، جسمانی درد کے علاوہ بس ایک چیز اور ہوتی ہے جو ہمارے لیے لڑائی بھڑائی والے کاموں کو مشکل بناتی ہے... اور وہ ہے بے عزتی کا احساس! ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر مسابقت کے عمل میں ناکامی اور توہین ہمارے حصے میں آئی تو کیا ہوگا؟ اگر ہم کوشش کر کے اس دوسرے احساس پر بھی غلبہ پالیں تو پھر ہم کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت... بے خطر ہو کر مبارزت کے میدان میں کود سکتے ہیں۔''

وہ میرے لیے بڑی یادگار رات تھی۔ مارشل آرٹ کا انٹرنیشنل اسٹار باروندا جیکی میرے ساتھ تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میرے سلوک کی وجہ سے وہ مجھ پر مہربان تھا۔ وہ مجھے کچھ خاص الخاص باتیں بتانا چاہ رہا تھا، سمجھانا چاہ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں اس کی ان باتوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکوں گا یا نہیں لیکن اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ دل کی باتیں دل ہی میں لے کر نہیں جا رہا۔

''درد'' کے حوالے سے باروندا جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اچھوتا اور انوکھا تھا۔ اس کی باتیں میرے دل و دماغ کے اندر گہرائی میں پیوست ہو رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی خاص چیز ہے جو جیکی مجھے بتا رہا ہے... یا کوئی جادو، یا سحر یا کوئی ایسا نادر عمل جو زمین و آسمان کی وسعتیں میرے سامنے کھول سکتا ہے۔ وہ درد کی نفی چاہتا تھا اور جب درد کی نفی ہو جائے اور درد کامل یعنی موت کی نفی ہو جائے تو پھر اور کون سی چیز ہے جو بندے کا راستہ روک سکتی ہے۔

یہ بارشوں کا موسم تھا۔ سرنگ سے باہر شاید بارش ہو رہی تھی۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اندر تک آ رہی تھی اور اس خوشبو کے ساتھ ساتھ کبھی ہلکی سی گرج بھی سنائی دیتی تھی۔

جیکی رواں انگریزی میں بولا۔ ''بارش ہو رہی ہے... یہی موسم ہوتا ہے پینے کا۔ کیا آج تم مجھے اجازت دو گے کہ میں یہ بوتل ختم کر لوں؟''

''میں آپ کے لیے بڑی مشکل سے مہیا کر رہا ہوں۔ اگر اسے آج ہی ختم کر لو گے تو کل کیا کرو گے؟''

''کل نہ ہی آئے تو کتنا اچھا ہے۔ سب کچھ آج ہی ختم ہو جائے... اسی برستی بارش میں، اسی ہلکی ہلکی خنکی میں... لیکن... نہیں میں اپنی کشتی سے باہر مرنا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپ... ن کی آخری خوشی سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں مر کر بھی چین نہیں پا سکوں گا۔''

کشتی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر بے چین ہو گیا۔ اس کے اندر جیسے کچھ پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا اضطراب اس کے ہڈیوں بھرے چہرے سے عیاں تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے جیسی کیفیت سے ہی دوچار ہے۔ میرے ساتھ بھی تو اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک دم میرے سینے میں دھواں بھر جاتا تھا۔ میں اس راجواڑے سے نکل کر اپنی سرزمین پر، اپنی پسندیدہ فضاؤں میں پہنچنے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ شاید ہر پابند و مجبور شخص جب یادوں کے دھارے پر بہتا ہے تو ایسے ہی اپنے پَر پھڑپھڑاتا ہے۔

وہ کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا پھر نیم دراز ہو گیا۔ خنکی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے جسم پر ایک لنگوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ اس کا جسم ہر قسم کی سختی کو سہہ سکتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں... تب وہ اپنی ترنگ میں کچھ گنگنانے لگا۔ پہلے اس کی آواز بالکل مدھم تھی، کچھ دیر بعد قدرے بلند ہو گئی۔ یہ کوئی نیپالی گیت تھا۔ میری سمجھ میں الفاظ تو نہیں آ رہے تھے لیکن طرز دلکش تھی۔ جیسے سوچ کی کرنوں

سے ماضی کی برف پگھل رہی ہو اور یادوں کے جھرنے بہہ رہے ہوں۔

وہ گنگناتا رہا... پھر اس کی آواز دوبارہ مدھم ہو گئی اور وہ دھیرے دھیرے سو گیا۔

اگلی صبح ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ انور خاں کی دی ہوئی ڈیڈ لائن ختم ہونے سے پہلے ہی رنجیت پانڈے درختوں کے جھنڈ میں پہنچا اور اس نے بہ آوازِ بلند پکار کر انور خاں سے کہا کہ وہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔

انور خاں نے کہا۔ ''بات چیت بہت ہو چکی ہے۔ اب ہمیں صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں مطالبات منظور ہیں یا نہیں؟''

''یہی بتانے کے لیے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔'' پانڈے کی پاٹ دار آواز آئی۔

''کون آیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''میں ہوں مراد شاہ... تل پانی سے۔'' ایک گونجتی ہوئی آواز ابھری۔

ایک دم میرے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ نام میں نے چرواہے نریندر سنگھ اور انور وغیرہ کی گفتگو میں سنا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ تل پانی میں مراد شاہ کی حیثیت چھوٹے سرکار کے مشیرِ خاص اور دستِ راست کی ہے اور اب یہی مراد شاہ یہاں بات چیت کے لیے موجود تھا۔

''السلام علیکم شاہ صاحب! ہمیں امید نہیں تھی کہ ہم یہاں آپ کی آواز سنیں گے۔'' انور خاں نے بلند آواز میں کہا۔

''اور مجھے بھی امید نہیں تھی کہ مجھے یہاں آ کر اس طرح تم سے بات کرنی پڑے گی۔''

''دیکھ لیں شاہ صاحب! یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی راج بھون کے ستم سے محفوظ نہیں رہا۔ وہاں تل پانی میں سلطانہ نے آپ کے سامنے دہائی دی تھی کہ اگر اسے واپس زرگاں بھیجا گیا تو اس کی جان اور عزت کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اور دیکھ لیں شاہ صاحب... ویسا ہی ہوا ہے۔''

''یہ تو تمہارا بیان ہے انور خاں! اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی سامنے آئے گی... اگر واقعی کسی نے قانون توڑا ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے لیکن تم اور تمہارے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تم ایک بے گناہ لڑکی کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہو۔ اس کو اذیت دے رہے ہو۔ یہ صورتِ حال کسی کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس طریقے سے انصاف کرنے کی ریت چل پڑی تو پھر یاد رکھو کہ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں رہے گی۔'' مراد شاہ کا لہجہ سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے چرواہے نریندر کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ چھوٹے سرکار کو ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ انہوں نے واقعی سخت رویہ اپنا لیا ہے۔

انور خاں نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم نے انصاف اور قانون کا دروازہ بہت کھٹکھٹا لیا، اب ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔ اب پانی سر سے گزر گیا ہے جی۔ اب اینٹ کا جواب پتھر سے اور پتھر کا گولی سے ملے گا۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔''

''اگر تمہارا یہ فیصلہ ہے تو پھر ہمارا فیصلہ بھی سن لو۔'' مراد شاہ کی غصیلی آواز ابھری۔ ''ہم کو اس معاملے میں حکم جی کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا اور اگر تم لوگ اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ہم نے جن لوگوں کو تل پانی میں پناہ دی ہے، وہ بھی ہماری پناہ میں نہیں رہیں گے۔''

''تو آپ بھی ظلم کے آگے جھکنا شروع ہو گئے ہیں... میں اسے موقع پرستی کہوں یا کچھ اور؟''

''تم ہر حد توڑ رہے ہو انور خاں! تمہیں اس کے لیے پچھتانا پڑے گا۔''

''ہم تو یہ سمجھے تھے شاہ صاحب کہ آپ حق کا ساتھ دینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات سنیں گے اور دوسروں کو بھی سمجھائیں گے۔''

''میں اب بھی تمہاری بات سننے کو تیار ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں پہلے مسز اسٹیل کو چھوڑنا ہوگا۔''

''آپ پہلے ہماری پوری بات سن لیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ نے ہمیں قائل کر لیا تو میں خود اور اپنے سارے ساتھیوں کی طرف سے بھی عہد کرتا ہوں کہ ہم اس لڑکی کو چھوڑ دیں گے۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی، پھر طے ہوا کہ مراد شاہ ہم سے بات کرنے کے لیے اور ماریا کو صحیح سلامت دیکھنے کے لیے سرنگ کے اندر آئے گا۔ رنجیت پانڈے، شاہ صاحب کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی بھیجنا چاہتا تھا لیکن انور خاں اور اسحاق نے سختی سے منع کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مراد شاہ اندر آ گیا۔ مراد شاہ درمیانے قد اور درمیانی عمر کا بارعب... شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں کچھ بال سفید بھی نظر آتے تھے۔ اس نے سفید شلوار قمیص اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر انور خاں کی آنکھوں میں معنی خیز چمک آ گئی۔ مراد شاہ کی آنکھوں میں بھی دوستانہ چمک تھی۔ بہرحال، ماریا بھی یہاں موجود تھی، اس کے سامنے شاید مراد شاہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سرنگ کے ایک علیحدہ گوشے میں انور خاں، فیروز، چوہان اور مراد شاہ کے درمیان بات چیت ہوئی۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ مراد شاہ نے کہا۔ ''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ سب سے پہلے وہ کام کرو جو سب سے ضروری ہے۔ اس گواہ کو یہاں لاؤ جو ہارون کے قتل کے سلسلے میں گواہی دینا چاہتا ہے۔''

انور خاں نے فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ ہے... آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔''

مراد شاہ نے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں اور غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سفید قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لیا۔ یقیناً یہ ٹیپ ریکارڈر، بیٹری سیل سے چلتا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ اب ساری پلاننگ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں آ کر مراد شاہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک تو سرجن اسٹیل وغیرہ کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ ماریا کے اغوا کو قابلِ مذمت سمجھتے ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ فیروز کا وہ بیان بھی لینا چاہ رہے تھے جو چھوٹے سرکار کے سامنے سلطانہ کو بے گناہ ثابت کر کے موہن کمار کو اپنے ہی دیرینہ ساتھی کا قاتل ثابت کر سکتا تھا۔

مراد شاہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور فیروز سے پوچھا۔ ''تم مقتول ہارون کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں اس کو نہ جانوں گا تو اور کس کو جانوں گا؟ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم اکٹھے جوان ہوئے، ہم نے اکٹھے ''حکم'' کی ملازمت کی۔ وہ گھڑ سوار محافظوں میں شامل تھا، میں راج بھون میں کام کرتا تھا لیکن ہم ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔ میں سوچ بھی ناہیں سکت تھا کہ ایک دن ہارون کو اس کے اپنے ہی ساتھی ''حکم'' کے کہنے پر جان سے مار ڈالیں گے۔ انہوں نے صرف سلطانہ کو پھنسانے کے لیے اتنا بڑا پرادھ کیا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت اس حرامزادے موہن کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔''

''تم نے ہارون کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا؟''

''لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ تب تک میں حکم کا باغی ناہیں بنا تھا بلکہ حکم کے خاص ملازموں میں شامل تھا۔ جو لوگ ہارون کے قتل میں موہن کے ساتھ شامل تھے، میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں اور اس قتل کی ساری تفصیل جانی ہے۔''

زخمی فیروز اور مراد شاہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک سوال جواب ہوئے اور فیروز کا مکمل بیان ریکارڈ ہو گیا۔

مراد شاہ کے چہرے پر اطمینان کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''یہ بیان بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔''

انور خاں نے کہا۔ ''آپ ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہم نے ان لوگوں کو آج دوپہر ایک بجے تک کا الٹی میٹم دیا ہے۔''

مراد شاہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات بنتی ہے تو بنا لینی چاہیے۔ صورتِ حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ماریا عورت ذات ہے۔ اس کے یرغمال بنائے جانے کی وجہ سے تل پانی میں بھی کچھ لوگ تشویش ظاہر کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکم جی اور جارج کی حمایت بڑھ بھی سکتی ہے۔''

''لیکن لوگوں کو سلطانہ والا معاملہ بھی تو نظر آنا چاہیے... اور اب تو فیروز کے بیان کے بعد بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سلطانہ کے معاملے میں سراسر ظلم ہوا ہے۔''

''وہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔'' مراد شاہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے بھی ایک عورت کو ہی یرغمال بنایا ہے اور یہ عورت... سلطانہ والے معاملے میں نردوش ہے۔''

''مگر وہ بہت سے دوسرے معاملوں میں نردوش ناہیں ہے۔ ہرگز ناہیں ہے۔'' اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''یہ ظالم عورت ہے اور اس کا بھائی اس سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ میری بہن کا قاتل ہے اور اس طرح کے کئی ظلم اس گھرانے کے کھاتے میں ہیں۔ ہم اپنے کسی مطالبے سے پیچھے ناہیں ہٹیں گے۔ اگر یہ لوگن ناہیں مانیں گے تو پھر یہ میم قتل ہووے گی اور بہت بُرے طریقے سے ہووے گی۔''

''لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟'' مراد شاہ نے قدرے برہم انداز میں کہا۔ ''تم سب لوگوں کو تو مار ہی دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم سے رشتہ ناتا رکھنے والوں پر بھی بڑا سخت وقت آئے گا۔ بہت خون بہے گا۔''

انور خاں نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر وہی ہلکی سی آسودگی پھیل گئی جو ایک دم کشیدہ ماحول کو تبدیل کر دیتی تھی۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''لیکن میرا خیال ہے شاہ صاحب... یہ لوگ ماریا کی موت کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیں گے۔ انہیں مطالبات ماننے ہی پڑیں گے۔''

''اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔'' مراد شاہ

بولا۔ ”جارج اور اس کے بہنوئی اسٹیل اور ان کے ساتھیوں کو ماریا کی موت کسی طور بھی قبول نہیں ہوگی لیکن زرگاں میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک ماریا اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی وہ پچاس بندے رکھتے ہیں جن کو تم رہا کرانا چاہتے ہو۔ یہ لوگ کوئی بھی ایسی چال چل سکتے ہیں جس سے سب کچھ ختم ہو جائے۔“

انور خاں کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ بہر حال، وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”میں گرو مودان وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔“ مراد شاہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”گرو مودان اور دیگر گرو اندر خانے جارج گورا سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور سے جب سے پگوڈا میں آگ والا واقعہ ہوا ہے۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ زرگاں میں پگوڈا کے بڑے پجاریوں اور جارج کے کارندوں میں چپقلش چلتی رہتی ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ انور خاں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرے نزدیک گرو مودان اور رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی ایک خاص مطلب رکھتی ہے۔ جہاں تک گرو مودان کو میں جانتا ہوں، وہ ایک بہت ہی گہرا بندہ ہے۔ اس کے اندر جھانکنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بندے کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتا ہے۔ رنجیت پانڈے سے بھی اس کی دوستی ہے اور رنجیت پانڈے تو ویسے بھی بکاؤ شخص ہے۔ جو اس کی مطلوبہ قیمت دے دے، وہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ گرو مودان اور پانڈے یہاں کوئی اپنا کھیل کھیل سکتے ہیں؟“ فیروز نے پوچھا۔

”یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہاں اسٹیٹ کی سیاست میں سب کچھ چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے۔“

”لیکن... شاہ صاحب... ماریا کا شوہر اسٹیل یہاں خود موجود ہے۔ موہن کمار جیسے لوگ بھی ہیں۔ کیا وہ گرو مودان کو کوئی چال چلنے دیں گے؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ضرور ہی کوئی چال کھیلی جائے گی، میں صرف ایک امکان بتا رہا ہوں۔ فرض کرو اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی رنجیت پانڈے تو یہاں موجود ہے نا... اور جہاں یہ خبیث موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی مار دھاڑ تو ضرور ہوتی ہے۔ اس بندے کے تو خمیر میں ہی خون اور بارود شامل ہے۔ اس کی عیاری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔“

مراد شاہ نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ”میری یہ بات ذہن میں رکھ لو... جب تک پانڈے یہاں موجود ہے، تم کسی معاملے کو بھی آسان نہیں لے سکتے۔ تمہیں ہر سیکنڈ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑیں گی۔ یہ کوئی نہ کوئی کارستانی ضرور کرے گا۔“

”تو کر لے کارستانی۔ اس کی جو کارستانی بھی ہوگی، وہ میم کے جیون کی قیمت پر ہو دنے گی۔“ اسحاق آتش بار لہجے میں بولا۔

دو چار منٹ تک مراد شاہ سے ہماری بات چیت مزید جاری رہی۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس گفتگو کا اختتام اس امر پر ہوا کہ انور خاں نے اپنی دی ہوئی ڈیڈ لائن کل رات آٹھ بجے تک بڑھا دی۔

☆☆☆

مراد شاہ نے جو کچھ کہا تھا، اس نے ہمیں مزید چوکس کر دیا۔ رنجیت پانڈے کی عیاری اور سفاکی کی جو کہانیاں میں سن چکا تھا، اس کے بعد اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ عمران مجھے ہر بات پر یاد آتا تھا۔ پانڈے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی بار بار یاد آیا۔ پانڈے جیسے خطرناک ترین لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا عمران کا شوق تھا۔ اگر عمران یہاں ہوتا تو شاید وہ پانڈے کا بہترین حریف ثابت ہوتا۔ وہ رات میں نے پھر باروندا جیکی کے ساتھ گزاری۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرا روحانی استاد ہے۔ وہ مجھے مارشل آرٹ کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتا رہا تھا جو مجھے کسی کتاب میں نہیں مل سکتی تھیں، نہ کوئی شخص انہیں اپنے تجربے کا حصہ بنا سکتا تھا۔ خاص طور سے وہ مجھے جسمانی درد برداشت کرنے کے حوالے سے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ نایاب تھا۔

یہ اس رات دو ڈھائی بجے کی بات ہے۔ جیکی سے ملاقات کے بعد میں دہانے کے قریب واپس آ گیا تھا اور ہیش کے برابر لیٹ گیا تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا، جب اچانک مجھے ایک نامانوس بو محسوس ہوئی۔ یہ اسپرٹ.... جیسی... کوئی تیز اثر بو تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ایک اندیشہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتا ہوا میرے دماغ میں گھس آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ الفاظ ذہن میں گونجے جو آج صبح مراد شاہ نے یہاں سرنگ میں ہمارے سامنے کہے تھے۔ اس نے رنجیت پانڈے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پانڈے یہاں موجود ہو اور وہ نچلا

بیٹھا رہے۔ مراد شاہ نے وارننگ دی تھی کہ ہمیں اس کی طرف سے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور لالٹین کی لَو اونچی کی۔ ہیش بھی اٹھ بیٹھا تھا اور نتھنے پھیلا کر بُو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ کیسی بُو ہے؟ کہیں کوئی گیس وغیرہ تو ناہیں؟“ وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”ماریا کہاں ہے؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

ماریا اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ ذہن میں یہ خیال برق کی طرح کوندا تھا کہ کہیں سرنگ کے اندر کوئی گیس وغیرہ تو نہیں چھوڑی گئی۔ دہانے کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی پھر چوہان بھی رائفل بدست وہاں آن موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی۔

”یہ بُو کیسی ہے؟“ اس نے بھی وہی سوال کیا۔

اسی دوران میں سرنگ کے ایک گوشے سے شوں شوں کی مدھم آواز آئی۔ اسحاق بھی جاگ گیا تھا۔ وہ اس تاریک گوشے کی طرف لپکا اور چند سیکنڈ بعد ماریا کو کھینچتا ہوا روشنی میں لے آیا۔ ”حرامزادی... الو کی پٹھی... تو خود چین سے رہوت ہے نہ ہمیں رہنے دیوت ہے۔“ اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

ماریا کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں میں ایک ٹن اسپرے تھا۔ اسپرے کی اسی بوتل سے نکلنے والے کیمیکل کی بُو نے ہم سب کو بُری طرح چونکایا تھا۔ یہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی صورتِ حال تھی۔ یہ ایک مچھر مار ٹائپ کا اسپرے تھا جو ماریا کے سامان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

”یہ کیا کر رہی تھی؟“ اسحاق نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

”ہام یہاں ناہیں رہ سکتا۔ یہاں بہت زیادہ کیڑا ہے۔ ہر طرح کا INSECTS ہے۔ ہام کا ہاتھ پاؤں سوج گیا۔“ وہ طیش میں بولی۔

”تم یہیں رہو گی جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ تم آسمان سے ناہیں اتریں۔ ہماری ہی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی ہو۔“ اسحاق پھنکارا۔

”ہام سے ناہیں رہا جاتا۔“ وہ کراہی۔

”تم سے رہا جاوے گا۔ جس طرح تم کو روٹی پکانا آ گئی ہے، مٹی کے پیالے میں پانی پینا آ گیا ہے اور کوئلے سے دانت صاف کرنا آ گئے ہیں، اسی طرح تم کو رہنا بھی آ جاوے گا۔“ اسحاق نے مچھر مار اسپرے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینک دیا۔

”ہام یہاں ناہیں رہے گا۔ چاہے تو ہام کو شوٹ کر دے۔“ وہ دہاڑی اور اس نے سرنگ کے عقبی حصے میں جانے کی کوشش کی۔

اسحاق اور احمد نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اسحاق نے اسے دو طمانچے مارے اور گھسیٹتا ہوا واپس لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے گراری دار چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ وہ پھنکارا۔ ”اگر اپنے باپ کی ہے تو اب قدم اٹھا کر دکھا۔ سیدھا تیرے جگر میں یہ چاقو نہ ڈال دیا تو میرا نام اسحاق ناہیں۔“

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی آتش تھی کہ ماریا کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

احمد بولا۔ ”بہتر تو یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں ڈھیل نہ چھوڑی جاوے۔ رات کے وقت پاؤں کس کر باندھ دیے جاویں تاکہ یہ چل ناہیں سکے۔“

”اب کوئی حرکت کرے گی تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ اسحاق نے کہا۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ وہ اچھل رہی تھی۔ کبھی دائیں ہو رہی تھی، کبھی بائیں۔ اس کے پاؤں پر سے کوئی چھپکلی گزر گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ڈانس کرنے والی کیفیت میں نظر آئی۔ پھر وہ جیسے اچھل کر ایک پتھر پر چڑھ گئی۔ اس پتھر کے ارد گرد تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے گی لیکن یہ پتھر چھوٹا سا تھا۔ اس پر بس کھڑا ہی ہوا جا سکتا تھا اور وہ کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں طیش آمیز بے بسی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ اسی طرح کھڑی رہو اور کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ۔“ اسحاق نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا دہانے کی طرف چلا گیا۔

وہ کھڑی رہی اور غصے میں بڑبڑاتی رہی۔ وہ نہایت قیمتی جینز اور شرٹ میں تھی۔ یہ لباس اس کے سامان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اب یہ کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جارج گورا کی بہن نے ڈیڑھ دو ہزار ڈالرز کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے بال جو اغوا کی رات ریشم کی طرح ملائم اور سلک کی طرح چمک رہے تھے، اب گھونسلے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور اس گھونسلے کے نیچے اس کی صورت بھی اجڑی بجڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل عام لڑکی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے عمران کی کہی ہوئی ایک بات یاد

آ گئی۔ ایک روز میڈم صغورا کی چھوٹی بہن میڈم نادیہ کے ناز نخرے دیکھ کر اس نے کہا تھا... اس لڑکی کی چمک دمک میں پچھتر فیصد حصہ اس کی دولت اور حیثیت کا ہے۔ اگر یہی نادیہ کسی کھوتی ریڑھی پر بیٹھ کر جھگیوں میں سے نکلے تو اس کے مقابلے میں اس کی کھوتی زیادہ خوب صورت نظر آئے۔ اور یہ کوئی نادیہ کی بات ہی نہیں ہے، اکثر امیر کبیر لڑکیاں خوب صورتی میں بس کھوتی کے آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا تھا... بھئی، یہ تو امیر کبیر لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ جھٹ بولا تھا... اور میں سمجھتا ہوں یہ کھوتیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ گدھا برادری اس کا بُرا مان سکتی ہے لیکن میں سب امیر لڑکیوں کی بات تو نہیں کر رہا۔ بس ایکسٹرا ماڈرن اور فیشن زدہ بیبیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

عمران کی کہی ہوئی باتیں ایسے ہی میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ جب بھی یاد آتا تھا، اپنے ساتھ میرے لیے ندامت و پشیمانی کا ایک بہت بڑا ریلا لاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کا قاتل ہوں اور ہزار ہا ملامتی نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔

صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دہانے سے کچھ فاصلے پر کتوں کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی کتے تھے جو حکم جی کے اہل کاروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ان کی آوازیں اکثر و بیشتر سنائی دیتی رہتی تھیں۔ لیکن آج یہ آوازیں دہانے کے عین سامنے قریباً ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے آ رہی تھیں۔ انور خاں، احمد اور میں اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے انور خاں کو چونکتے دیکھا۔ اس کی نگاہ دور جنتر اور کیکر کے درختوں پر مرکوز تھی۔ ہم نے دیکھا، دیو ہیکل بُو گیر کتے تیزی سے کسی چیز کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کا رخ دہانے کی طرف ہی تھا۔ وہ جس چیز کا پیچھا کر رہے تھے، وہ کوئی چھوٹا جانور تھا جو تیزی سے پینترے بدل رہا تھا۔

دفعتاً ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کتے سیدھے سرنگ کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔

''اوہو... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انور خاں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اس کی انگلی ٹریگر پر تھی لیکن وہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ گولی چلائے یا نہیں۔ اور جب انور خاں خود فیصلہ نہ کر سکا تو ہم کیسے کرتے؟ قریباً نصف درجن خوں خوار کتے سماعت شکن شور برپا کرتے سیدھے سرنگ میں گھس آئے۔ وہ جس چیز کا تعاقب کر رہے تھے، اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے دیکھی۔ وہ جنگلی ہرن کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ سیدھا سرنگ کے اس قدرتی چیمبر میں گھسا جہاں ہم نے بستر بچھا رکھے تھے۔ شکاری کتے اس پر جا پڑے، وہ بُری طرح زخمی ہوا۔ ہمیں اس کا پھٹا ہوا پیٹ نظر آیا۔ اسی حالت میں وہ گھوما اور ہماری پوزیشنوں کی طرف آیا۔ اب ہمارے لیے بے حرکت رہنا مشکل تھا۔ میری اور انور خاں کی رائفلوں سے ایک ساتھ شعلے نکلے۔ دو کتے قلابازیاں کھا کر گرے۔ باقی کتوں نے ننھے سے جانور کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ ماریا چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ سرنگ میں ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب دہانے کے عین سامنے فائرنگ شروع ہو گئی۔ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر حکم کے مسلح اہل کاروں نے ہلا بول دیا تھا۔

''گولی چلاؤ۔'' انور دہانے کی طرف رخ کر کے دہاڑا۔

میں نے دیکھا، دو افراد جھک کر بھاگتے ہوئے دہانے کے عین سامنے پہنچ گئے تھے۔ وہ جدید رائفلوں سے فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ میں نے احمد کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ ایک دوسری گولی چوہان کے کندھے میں لگی اور رائفل اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یہاں انور خاں کی مہارت اور اس کے اعتماد کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس دوسرا موقع نہیں ہے۔ اگر اس کا نشانہ خطا گیا تو حملہ آور بھاگتے ہوئے سرنگ میں گھس آئیں گے۔ اس نے اپنی اسنائپر گن سے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ قریباً بیس میٹر کی دوری پر دونوں حملہ آوروں کے سروں میں گولیاں لگیں اور وہ اپنے ہلارے میں دور تک لڑھک گئے۔ یہ واقعی بڑے خطرناک لمحے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دونوں حملہ آوروں نے جدید بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ اگر ان کے سروں میں گولی نہ لگتی تو وہ اندر آنے میں کامیاب ہو جاتے۔

دو افراد کے گر جانے سے پیچھے آنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ انہوں نے سیدھا دہانے کی طرف آنے کے بجائے دائیں بائیں پوزیشن لے لی۔ فیروز زخمی ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ مل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ چند گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزریں تو اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کرنی چاہی۔ یہ فیصلہ غلط نکلا۔ دہانے کے عین سامنے سے وہ ''ہٹ'' ہو گیا۔ میں نے اسے سینے پر گولی کھا کر مردہ ہرن کے اوپر گرتے دیکھا۔ دو شکاری کتے تو سرنگ سے باہر نکل گئے تھے۔ دو تین سرنگ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے اور ان کی آوازوں سے ایک پُرہول گونج پیدا ہو رہی تھی۔

اسحاق نے ماریا کو زمین پر گرا کر رائفل کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے اسے شوٹ کر سکتا تھا لیکن پھر یہ ہنگامہ جس طرح اچانک شروع ہوا تھا، اسی طرح آناً فاناً ختم ہو گیا۔ فائرنگ تھم گئی۔ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا کوئی آواز باقی نہ رہی۔

ہم اپنی پوزیشنوں پر پوری طرح چوکس تھے۔ ہم نے انگلیاں ٹریگر پر رکھی ہوئی تھیں اور دہانے کے سامنے ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کا نوٹس لے رہے تھے۔

اسحاق دہاڑا۔ ''یہ اس طرح ناہیں مانیں گے۔ اس حرامزادی کے ٹکڑے کر کے باہر بھیجنا شروع کرو۔ اور پہلا ٹکڑا میں کرتا ہوں، ابھی کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا خوفناک پھل کا گراری دار چاقو نکال لیا۔

انور خاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن دو منٹ ٹھہر جاؤ۔

فائرنگ تھم گئی تھی پھر بھی خطرہ موجود تھا۔ میں اور ہمیش نیچے جھک کر دوڑتے ہوئے فیروز کے پاس پہنچے۔ گولی اس کی چھاتی پر بائیں طرف لگی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ہم نے اسے اٹھا کر فائرنگ کی رینج سے ہٹایا اور ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ چوہان حالانکہ خود بھی زخمی تھا تاہم وہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ہم نے فیروز کو پانی پلایا جو اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔

''کچھ ہو سکتا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں چوہان سے پوچھا۔

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر شدید کرب تھا۔

فیروز کی نگاہیں ہم پر جمی تھیں۔ یہ نگاہیں زندہ تھیں لیکن بتدریج بے جان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ احمد کی طرف دیکھ کر بہت نحیف اور شکستہ آواز میں بولا۔ ''اگر... کبھی... اکبر سے ملاقات ہو تو... اسے بتا دینا... میری ماں مسلمان تھی... میں مسلمان ماں کا بیٹا ہوں۔''

احمد نے اشک بہاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیروز کی آنکھیں تارا ہو گئیں۔ ہم نے اس کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا...

اسحاق قریباً تیس فٹ کے فاصلے سے فیروز کی موت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ چنگھاڑنے لگا اور ماریا کو زدوکوب کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسحاق کا ہاتھ کسی نے نہیں روکا۔ صدمے نے سب کو جکڑ رکھا تھا... اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جاتا تو فیروز کی موت میں ماریا بھی حصے دار تھی۔ چند دن پہلے اس نے فیروز پر گولی چلائی تھی جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ آج لڑائی کے دوران میں اسی زخمی ٹانگ کی وجہ سے فیروز تیزی سے حرکت نہیں کر پایا تھا۔ بہرحال، یہ بات تو اٹل حقیقت تھی کہ آج اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے جو ناشتا اس نے کیا تھا، وہ آخری تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور تیز رفتار تھا کہ کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا... اور شاید ڈاکٹر چوہان کے علاوہ کوئی اس کا راستہ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ ماریا کے لیے اب کسی کے دل میں ہمدردی کی رمق موجود نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اسحاق نے بے رحمی سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت جڑ سے کاٹ ڈالی تھی۔ اب ماریا چلا رہی تھی اور اس کے ہاتھ کا زخم تیزی سے خون اگل رہا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

اسحاق نے جنونی انداز میں کٹی ہوئی انگلی ماریا کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور پھنکارا۔ ''... ہاں یہی انگلی تھی نا جس سے تُو نے فیروز پر گولی چلائی تھی۔ یہی تھی نا؟ یہ انگلی ہے ہی کاٹے جانے کے قابل... یہی ہم جیسے غریبوں پر گولی چلاوت ہے... ہمیں اپنے اشاروں پر نچاوت ہے... ہم... ہم اب ایسی ساری انگلیوں کو کاٹ دیویں گے۔''

چلا چلا کر ماریا کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اس پر غشی طاری ہو گئی۔ پتا نہیں کہ ایسا تکلیف کے سبب ہوا تھا یا کٹی ہوئی انگلی دیکھنے کے بعد اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔

اسحاق نے کٹی ہوئی خون آلود انگلی انور خاں کے سامنے پھینکی۔ ''انور بھائی! یہ پہلا چھوٹا سا نذرانہ بھیجو اس حرامزادی کے پتی کو... اور ساتھ ہی بتاؤ اس کو کہ یہ ایک چھوٹی سی جھلکی ہے اس فلم کی جو ابھی ان کو دیکھنی ہے۔'' اسحاق کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

میں نے انگلی کو دیکھا۔ جب یہ جسم کے ساتھ تھی تو خوب صورت لگتی ہوگی، اب علیحدہ ہو کر کریہہ المنظر ہو گئی تھی۔ جڑ کی طرف سے اس کے ساتھ تھوڑی سی کھال لٹک رہی تھی۔ ناخن لمبا تھا اور اس پر گلابی پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد ایک مکھی چکرا رہی تھی، شاید بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اسحاق نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ بااختیار اور طاقتور طبقے کی اسی انگلی نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ یہ انگلی ٹریگر دباتی ہے... پورے پورے

ملک... اور پورے پورے خطے خاک وخون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ حالتِ امن میں بھی یہ انگلی ایک خوفناک دھمکی کی صورت ٹریگر پر دھری رہتی ہے اور خلقِ خدا کی ناتوانی سے خراج وصول کرتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر چوہان کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ تاہم اطمینان کی بات یہ تھی کہ گولی کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ چوہان نے اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا تاکہ خون کا زیادہ اخراج نہ ہو۔ احمد کو گولی کے بجائے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔ یہ چھرا اس کے بازو کے اندر ہی تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر صاف نظر آتے تھے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دونوں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ اگر ان میں ماریا کو بھی شامل کرلیا جاتا تو زخمیوں کی تعداد تین تھی۔ فیروز کی چادر سے ڈھکی ہوئی لاش ہمارے سامنے تھی اور یہ لاش ہم سب کے ذہنوں میں چنگاریاں بکھیر رہی تھی۔ اب واقعی کچھ کرگزرنے کو دل چاہتا تھا۔

حکم کے جن دو گارڈز کو انور خاں نے دہانے کے عین سامنے اپنے باکمال نشانے سے ٹھنڈا کیا تھا، وہ وہیں ساکت پڑے تھے۔ انہیں انور نے قریباً بیس میٹر کی دوری سے نشانہ بنایا تھا لیکن وہ چونکہ برق رفتاری سے دہانے کی طرف آرہے تھے، اس لیے گولی کھانے کے بعد بھی وہ لڑھکتے تھے اور دہانے سے مزید قریب ہوگئے تھے۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کے پاس چھوٹے بیرل والی جدید رائفلیں تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ دونوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی ہیں۔

اسحاق اور ہمیش نے دونوں مُردہ کتوں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر سرنگ کے عقبی حصے میں پھینک دیا۔ یہ ہاؤنڈ نسل کے قد آور کتے تھے اور میں انہیں زرگاں میں دیکھ چکا تھا... ایسے ہی خوں خوار کتوں نے مجھ پر جارج گورا کی کوٹھی میں حملہ کیا تھا۔ کتوں کے ساتھ ساتھ ہرن کے بچے کا کٹا پھٹا جسم بھی وہاں سے ہٹادیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، یہ سارا واقعہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اگر انور خاں اپنی دور مار رائفل سے بروقت دو ٹھیک نشانے نہ لگاتا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اس سارے واقعے کے دوران میں عجیب الخلقت بارونڈا جیکی ہم سے قریباً سو میٹر دور سرنگ کے عقبی حصے میں موجود رہا تھا اور اس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا... وہ اس دوران میں سو رہا تھا۔

انور خاں کے کہنے پر اسحاق نے فوری طور پر ایک پرچہ لکھا۔ اس پرچے کا مختصر مضمون کچھ اس طرح تھا۔ ''لگتا ہے کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ پہلا تحفہ تم کو ارسال کررہے ہیں۔ یہ تمہاری میم صاحبہ کی انگلی ہے۔ یہ سب سے چھوٹا ٹکڑا ہے جو تم وصول کررہے ہو۔ اس کے بعد جو ٹکڑا بھی آئے گا، وہ اس سے بڑا ہوگا۔ تمہارے پاس ہمارے مطالبوں کی منظوری کے لیے فقط ایک گھنٹے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد میم صاحبہ کی باقی چار انگلیاں تمہارے پاس پہنچیں گی اور پھر پورا پنجہ پیشِ خدمت کیا جائے گا۔ تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ تم کسی رعایت کے حق دار نہیں ہو۔ اگر تم گولی کی زبان میں فیصلہ چاہتے ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔ اب ہمارے مطالبوں میں ایک مطالبہ اور شامل کرلو۔ ہم اب نل پانی جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں راجواڑے سے نکلنے کے لیے محفوظ راستہ چاہیے اور تمہاری یہ میم تب تک ہمارے ساتھ رہے گی جب تک ہم راجواڑے سے نکل نہیں جاتے۔''

انور خاں نے ماریا کی انگلی ایک موی کاغذ میں لپیٹی پھر اس کے ساتھ اسحاق کا لکھا ہوا پرچہ رکھا۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ ایک پتھر رکھنے کے بعد انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر اوپر سے باریک ڈوری باندھ دی۔

انور خاں نے اپنی پوزیشن کے عقب سے پانڈے کو بلند آواز میں پکارا اور کہا۔ ''پانڈے! تیری منحوس صورت یہاں دیکھ کر ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اب میم زندہ نہیں بچے گی۔ تیری بدمعاشی کا تیرے انگریز دوستوں کو بڑا اچھا صلہ ملنے والا ہے۔ اپنی حماقت کا یہ پہلا انعام قبول کرو۔'' اس کے ساتھ ہی انور خاں نے پورے زور سے بازو گھما کر ڈوری میں بندھا ہوا پارسل درختوں کے جھنڈ کی طرف پھینک دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' جھنڈ کے عقب سے پانڈے کی گرج دار آواز ابھری۔

''کھول کر دیکھ لے۔ امید ہے، جو کچھ بھی ہے تجھے پسند آئے گا۔'' انور خاں نے کہا۔

کچھ دیر بعد درختوں کے عقب سے پانڈے کا ایک ساتھی برآمد ہوا۔ اس نے پہلے ہمیں اپنے خالی ہاتھ دکھائے اور پھر محتاط قدموں سے پارسل کی طرف بڑھا۔ پارسل اٹھا کر وہ واپس گھنے درختوں میں اوجھل ہوگیا۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ بہرحال، اب ہم مخالف فریق کو مزید رعایت دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اسحاق بھی بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جو الٹی میٹم ہم نے دیا ہے، اس سے ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھنا چاہیے اور حقیقت یہی تھی کہ فیروز کی لاش اٹھانے کے بعد اب ہمارے دلوں میں رحم کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ چوہان اور احمد زخمی ہو

چکے تھے، اپنے ساتھی ماجد کی موت کا صدمہ ہم چند دن پہلے جھیل چکے تھے۔ اب اگر ہمارے ساتھ یہی سب کچھ ہوتا تھا تو پھر جارج گورے کی اس گوری بہن کو بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ اب ہوش میں آچکی تھی اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی انگلی کے زخم سے خون کا اخراج روکنے کے لیے چوہان نے وہاں خاص طریقے سے پٹی باندھ دی تھی... پھر بھی خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ماریا نے بھی شاید اب محسوس کرلیا تھا کہ اس کے بچنے کا امکان کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف منجمد ہوگیا تھا اور اس کی ساری تن فن ایک خوف آمیز مایوسی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

الٹی میٹم کا ایک گھنٹا مکمل ہونے میں آٹھ دس منٹ باقی تھے جب جھنڈ کے عقب سے پھر پانڈے کی آواز ابھری۔ وہ بیٹری سے چلنے والے میگافون کے ذریعے بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اسٹیل اور موہن کمار تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمیں ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔'' انور خاں گرجا۔ ''اور ایک بات اچھی طرح دماغ میں بٹھالو پانڈے! ہم یہاں مرنے کے لیے بالکل تیار ہوکر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کروگے تو اس کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا... ہم نے جو کہہ دیا ہے، وہ کہہ دیا ہے۔ اب ہم ایک سیکنڈ اور نہیں دیں گے۔ ٹھیک دس منٹ بعد اسٹیل کی بہنی کا دوسرا ٹکڑا اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد...''

اسحاق ایک تیز دھار تلوار نکال لایا تھا۔ اس نے صاف سیدھے لہجے میں ماریا فرگوسن کو بتادیا کہ وہ اس کا ہاتھ لینا چاہتا ہے اور وہ خود کو اس کے لیے تیار کرلے۔

''توم ہام کو ایک ہی دفعہ مار کیوں ناہیں دیتے؟ ہام کو گولی مار دو۔'' وہ کربناک انداز میں چلائی۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناکہ موت اتنی آسانی سے ناہیں آوت ہے۔ ایک ایک سانس کے لیے تڑپنا پڑت ہے۔ جس طرح ململ کے گیلے کپڑے کو کانٹے دار جھاڑیوں پر ڈال کر کھینچا جائے تو وہ تار تار ہووت ہے... اسی طرح نکلتی ہے جان۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے اپنی آنکھوں سے...'' وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا گیا۔

''آچھا... ہام کو دہانے پر لے جاؤ... ہام ایک آخری بار... اپنے ہسبینڈ سے بات کرنا مانگتا۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ اس نے اسحاق کی انگارہ آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگلے دو تین منٹ میں اس کا ہاتھ کلائی پر سے الگ ہونے والا ہے۔

اسحاق نے سوالیہ نظروں سے انور خاں کی طرف دیکھا۔ انور خاں نے سر کے اشارے سے اسحاق کو مشورہ دیا کہ وہ ماریا کی بات مان لے۔

چند منٹ بعد ماریا ایک بار پھر دہانے پر تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پاؤں میں بھی زنجیر تھی۔ اس زنجیر میں بس اتنی گنجائش تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتی تھی۔ اس کے عین عقب میں اسحاق موجود تھا۔ اس کی ٹرپل ٹو رائفل کی نال ماریا کی کمر سے بس ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر تھی۔

دہانے پر پہنچ کر ماریا نے دل فگار لہجے میں پکار بلند کی۔ وہ اب انگریزی میں بول رہی تھی۔ اس نے اسٹیل کو مخاطب کرکے کہا۔ ''یہ لوگ میرا ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ اب تم کس بات کا انتظار کررہے ہو؟ کیا تم اس بات کے لیے تیار ہوگئے ہو کہ میں ٹکڑوں میں یہاں سے باہر نکلوں؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہے ماریا... لیکن جو کچھ ہمارے بس میں نہیں، وہ ہم کیسے کرسکتے ہیں؟ جو بندے یہ مانگ رہے ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ ان بندوں کی جگہ کوئی تاوان وغیرہ لینا چاہیں تو ہم تیار ہیں... لیکن وہ بندے کیسے پیدا کرسکتے ہیں؟''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' ہماری طرف سے چوہان نے گرج کر انگریزی میں کہا۔ ''یہ سب تمہاری سیاست ہے لیکن یہ سیاست تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ گرو مودان وغیرہ کا تو کچھ نہیں جائے گا لیکن تم اپنی بیوی کو بچا نہیں سکوگے۔''

ماریا ایک بار پھر چلائی۔ ''اسٹیل! ان لوگوں کا ایک ساتھی مرگیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تو بھائی جارج کو یہاں بلالو۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو شاید اب تک کوئی حل نکل آتا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ماریا کی آواز شدتِ جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ دل دوز انداز میں رونے لگی۔

اسحاق اور ہمیش اسے کھینچتے ہوئے سرنگ میں واپس لے آئے۔ اس کے رونے کی آواز آخر تک سنائی دیتی رہی۔ اس واقعے کے فقط پانچ چھ منٹ بعد حالات نے ایک حیران کن پلٹا کھایا۔ اسحاق، ماریا کا ہاتھ کاٹنے کے لیے بالکل تیار ہوچکا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے بظاہر اس سفاک عمل سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ فیروز کی بے گور و کفن لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی دید نے ہمارے

سینوں میں انگارے بھر رکھے تھے۔ یہ کھلی جنگ تھی اور جنگ میں سب کچھ روا ہوتا ہے اور ماریا تو ویسے بھی فیروز کی موت میں حصے دار تھی۔

اچانک میگافون پر سرجن اسٹیل کی آواز ابھری۔ ''انور خاں! توم کہاں ہے؟''

انور اطمینان سے بولا۔ ''میں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور اپنے فیصلے پر بھی قائم ہوں۔''

''ٹھیک ہے انور خاں... ہام تمہارے مطالبوں کو مان رہے ہیں۔ توم اب کسی طرح کا کارروائی نا ہیں کرے گا۔'' اسٹیل کی آواز میں شکست خوردگی اور پسپائی نمایاں تھی۔

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بھی کوئی چال نا ہیں ہے؟'' اسحاق کی آواز میں دہاڑ تھی۔ ''تم پھر کسی حیلے سے اپنے شکاری کتے ہماری طرف روانہ کرسکت ہو... یا وہ تمہارا پالتو پانڈے کوئی اور حرکت کرسکت ہے۔''

''اب ایسا کچھ نا ہیں ہوگا... توم لوگوں کی تسلی کے لیے ہام اپنے گارڈز کو سو میٹر پیچھے لے جار ہے ہیں۔ ہام ہوپ کرتا کہ توم کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا موومنٹ نا ہیں ہوگا۔''

اگلے ایک گھنٹے میں واقعی اس امر کے واضح ثبوت نظر آئے کہ مخالف فریق نے ہمت ہار دی ہے اور اب وہ ماریا فرگوسن کی بخیریت رہائی چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہم اس ساری کارروائی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر چکے تھے اور مشکل ترین مرحلہ وہی تھا جب پانڈے نے شکاری کتوں والی خوفناک چال چلی تھی۔ یقیناً ہرن کے بچے کو پلاننگ کے تحت دہانے کے سامنے چھوڑا گیا تھا۔ کتے ہرن کے پیچھے لپکے تھے۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ ہرن جان بچانے کے لیے بھاگے گا تو سرنگ کے دہانے کی طرف آئے گا۔ اگر وہ دائیں بائیں ہونے کی کوشش کرتا تو بھی ''حکم'' کے اہل کار اسے ڈرا کر اس کا رخ دہانے کی طرف کرسکتے تھے۔ بہرحال جو ہوا، وہ منصوبہ ساز کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔

پانڈے اور اس کے مسلح ساتھیوں نے دہانے کے اردگرد سے اپنی پوزیشنیں ہٹالی تھیں۔ باقی لوگ بھی کافی فاصلے پر چلے گئے تھے۔ ان کے گھوڑے اور کتے وغیرہ بھی اب دہانے کے قریب دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دہانے کی طرف سے غافل ہوگئے ہوں۔ انہوں نے ہماری حرکات و سکنات پر مکمل نظر رکھی ہوئی تھی۔ کم از کم دو ٹیلی اسکوپس کے چمکتے ہوئے شیشے مجھے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ماریا کا درد سے بُرا حال تھا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں کانٹا چبھنے کو بھی باقاعدہ ایک تکلیف کا نام دیا جاتا ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کے لیے آپریشن تھیٹر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں اس کی پوری انگلی جڑ سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہوچکا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر چوہان نے اسے ایک پین کلر انجکشن دیا اور انفیکشن سے بچانے والا ایک کیپسول بھی کھلایا... وہ پھر بھی مسلسل ہائے وائے کرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب ہمیں اپنا دوست چرواہا نریندر سنگھ دہانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر کا صافہ کھول رکھا تھا تاکہ ہم اسے دور ہی سے اچھی طرح پہچان لیں۔

دہانے کے عین سامنے آکر وہ زور سے بولا۔ ''آپ لوگوں کے لیے میرے پاس ایک چٹھی ہے، کیا میں آگے آکر دے سکت ہوں؟''

اس نے یہ الفاظ مقامی زبان میں ادا کیے تھے۔ انور خاں نے اس سے کہا۔ ''اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے تو آجاؤ۔ اگر ہتھیار ہے تو اسے وہیں رکھ دو...''

انور خاں نے بھی یہ الفاظ اسی علاقائی زبان میں کہے تھے۔ یہ زبان میری اور چوہان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے اپنی چھوٹی سی کلہاڑی کمر سے نکال کر وہیں ایک درخت کی جڑ میں رکھ دی اور آگے بڑھ آیا۔ وہ ہم سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کررہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے مخالف فریق کی طرف سے ہماری جانب روانہ کیا گیا ہے۔

اس نے ایک چٹھی نکال کر انور خاں کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ سرجن اسٹیل کی طرف سے تھی اور انگلش میں لکھی گئی تھی۔ چوہان نے چٹھی پڑھی۔ اس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

''... ہم تمہارے مطالبات کو من وعن تسلیم کررہے ہیں۔ امید ہے کہ اب تمہاری طرف سے ماریا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تمہارے مطلوبہ لوگوں کو لانے کے لیے آدمی زرگاں روانہ کیے جاچکے ہیں۔ وہ کل شام تک واپس آجائیں گے۔ سلطانہ کا والد اور بھائی بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اگر تم لوگ انہیں یہاں بلوانا چاہتے ہو تو بتادو... لیکن اگر براہِ راست نل پانی پہنچانا چاہتے ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے۔ تمہارا کوئی بندہ خود نل پانی جاکر اس بات کی تصدیق کرسکتا ہے کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر تم لوگ اسٹیٹ سے نکلنا چاہتے ہو تو بھی ہم تمہیں محفوظ راستہ دینے کے لیے تیار ہیں۔

اب ہمارے درمیان معاملات طے ہیں۔ اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ تم ماریا کی صحت اور آرام کا پورا خیال رکھو گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہماری طرف سے ایک ڈاکٹر

آکر ماریا کی مرہم پٹی کردے۔ اگر تم لوگوں کو خوراک یا کوئی اور ضروری چیز درکار ہے تو ہمیں بتاؤ، ہم مہیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

.... حالات میں بہتری کا خواہاں اسٹیل بریرے۔''

یہ خط خوش آئند تھا۔ سب کے چہرے چمک گئے۔ درحقیقت اب اس سارے معاملے کو سات آٹھ روز گزر چکے تھے۔ مسلسل تناؤ نے سبھی کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ ایسے حالات میں اتنا زیادہ وقت گزارنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ وہ تھکا نہیں اور اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تو وہ غلط کہے گا۔ دلیری سے موت کا سامنا کرنا اور بات ہے... مسلسل موت اور زندگی کے درمیان معلق رہنا اور بات۔

انور نے نریندر سے پوچھا کہ چٹھی بھیجنے والوں سے اس کا رابطہ کیسے ہوا؟

اس نے بتایا کہ اس کے پاس ہمارے لیے ایک اور پیغام بھی ہے اور یہ مراد شاہ وغیرہ کی طرف سے ہے۔ وہ اس امید پر دہانے کے آس پاس موجود تھا کہ شاید اسے کوئی ایسا موقع مل جائے کہ وہ یہ پیغام ہم تک پہنچا سکے۔ یہ امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی... لیکن پھر وا ہگرو کی طرف سے کرپا ہوگئی اور جو کام ناممکن نظر آتا تھا، ممکن ہوگیا۔ اسے درختوں میں بکریاں چراتے دیکھ کر خود صاحب لوگوں نے اپنے پاس بلایا اور یہ چٹھی دے کر ہماری طرف روانہ کردیا۔

نریندر سنگھ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پانڈے وغیرہ نریندر کو اندر بھیج کر شاید یہ بھی جاننا چاہ رہے تھے کہ اندر کا نقشہ کیا ہے اور دہانے کے آس پاس کتنے لوگ موجود ہیں۔

انور خاں نے نریندر سے پوچھا کہ مراد شاہ کا پیغام کیا ہے؟

نریندر کے تاثرات بدل گئے۔ محسوس ہوا کہ اس کے پاس ہمیں بتانے کے لیے کچھ خاص باتیں ہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں جلدی جلدی انور خاں کو مقامی زبان میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

... ماریا کے اغوا نے پوری اسٹیٹ میں کھلبلی مچادی ہے۔ ہر طرف بس اسی بارے میں بات ہورہی ہے۔ زرگاں کے اونچے طبقے کے لوگوں میں سخت خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے جو انگریز یہاں موجود ہیں، وہ سخت خوف زدہ ہیں۔ ان کی عورتیں گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ گھروں پر بھی سخت پہرے بٹھادیے گئے ہیں۔ عام لوگ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جارج گورا صاحب کی بہن اغوا ہوسکتی ہے تو اور کون محفوظ ہے۔

نریندر سنگھ نے بتایا کہ اس کے علاوہ زرگاں میں ایک اور طرح کی چپقلش بھی پیدا ہوگئی ہے۔ وہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار ہے، وہ اندر خانے دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ کا تو خیال ہے کہ ماریا کی جان بچانے کے لیے انور خاں اور اس کے ساتھیوں کے سارے مطالبے مان لیے جائیں اور کسی طرح کا خطرہ مول نہ لیا جائے... لیکن کچھ لوگ اسے بہت بڑی شکست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح باغی ذہن رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے۔ ویسے بھی چالیس پچاس خطرناک ترین لوگوں کو یوں چھوڑ دینا بہت نقصان کا کام ہوگا اور بعد میں اس کے نتائج بہت بُرے نکلیں گے۔

''حکم کا اپنا ردِعمل کیا ہے؟'' انور نے نریندر سے پوچھا۔

نریندر نے مقامی زبان میں کہا۔ ''مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ حکم جی خود بھی بندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' پھر وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''مراد شاہ نے مجھے آپ لوگوں کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں جتنے نظر آرہے ہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہیں۔ ظاہری طور پر شاید یہ لوگ کچھ نرمی دکھا رہے ہوں مگر اندرونِ خانہ ایک زبردست حملے کا پورا پروگرام بن چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس حملے میں ماریا کے ساتھ ساتھ آپ سب لوگوں کو بھی ختم کردیا جائے... اس حملے کی تیاری کے لیے رنجیت پانڈے اور اس کے تین درجن ساتھی یہاں موجود ہیں۔ انہیں تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے، اسی لیے وہ نرمی دکھا رہے ہیں اور یہ چٹھیاں وغیرہ بھیج رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ کے چہروں پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ واقعی یہ ایک تشویشناک اطلاع تھی۔

چوہان نے نریندر سنگھ سے پوچھا۔ ''مراد شاہ صاحب اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

جواب میں نریندر سنگھ بولا۔ ''شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کے بندوں نے زرگاں میں خفیہ طور پر جو جانکاریاں اکٹھی کی ہیں، ان سے پتا چلا ہے کہ پچاس بندوں کی لسٹ میں سے قریباً چالیس پینتالیس بندے ایسے ہیں جنہیں ''حکم جی'' کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس بارے میں آپ لوگوں کو جو کچھ بھی بتایا جارہا ہے وہ صرف اور صرف وقت گزارنے کے لیے ہے۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کے جو زیادہ سے زیادہ مطالبے مانے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بیمار بھائی کو چھوڑ دیا جائے... اور آپ لوگوں کو نل پانی جانے یا پھر اسٹیٹ سے نکلنے کے لیے راستہ دے دیا جائے۔ شاہ صاحب نے آپ لوگوں کو مشورہ

دیا ہے کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی کو تل پانی بھجوا دیں اور خود اسٹیٹ سے نکلنے کا راستہ لے لیں۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں نے اور کچھ نہیں دینا... چاہے اس کے لیے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔''

انور خاں نے زیندر سنگھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم اس بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور کوئی فیصلہ لیتے ہیں۔''

''اور اس چٹھی کا جواب؟'' زیندر نے پوچھا۔

''اس کا جواب بھی ہم کچھ دیر بعد دیں گے۔''

زیندر نے مقامی زبان میں انور خاں سے گفتگو جاری رکھی اور کہا۔ ''انہوں نے ڈاکٹر کے بارے میں خاص طور سے پوچھا ہے کہ کیا وہ میم جی کے لیے کوئی ڈاکٹر بھیج دیں؟''

اسحاق چمک کر بولا۔ ''کوئی ضرورت ناہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ڈاکٹر ہمارے پاس موجود ہے... بلکہ ہم سب ڈاکٹر ہیں اور اس کا بہت اچھا علاج کر سکت ہیں۔''

زیندر سنگھ ہم سے اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

یہ ایک بدلی ہوئی صورتِ حال تھی۔ ہمیں اندر کی رپورٹ ملی تھی اور یہ خاصی تشویشناک تھی۔ زرگاں کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک گروہ ماریا کی زندگی کی پروا کیے بغیر مہم جوئی کر سکتا تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ آدھ پون گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اسحاق اور احمد وغیرہ تو اس پر تیار نہیں تھے کہ اپنے دوستوں کی رہائی کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائیں مگر ڈاکٹر چوہان اور انور خاں کا خیال تھا کہ بدلی ہوئی صورتِ حال میں حکمتِ عملی سے کام لینا پڑے گا۔ انور خاں موت سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا لیکن وہ مستقبل قریب کے حالات کو بھی ذہن میں رکھ رہا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اگر یہ معاملہ خون خرابے پر ختم ہوتا اور ماریا بھی ماری جاتی تو پھر زرگاں کے مسلمان رہائشیوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی تھی۔ حکم جی وغیرہ اس واقعے کو بہانہ بنا کر بہت ظلم کر سکتے تھے۔

آخر میں انور خاں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یارو! ہم اس وقت جنگ جیسی حالت میں ہیں اور جنگ میں کبھی وقت کے مطابق تھوڑا سا پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شکست ہو گئی۔ میری رائے میں مراد شاہ صاحب نے جو اندر کی رپورٹ ہم تک پہنچائی ہے، وہ بڑی اہم اور قیمتی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''لیکن اگر ہم اپنے دوسرے مطالبوں سے پیچھے ہٹیں گے تو وہ لوگن اور بھی شیر ہو جاویں گے۔'' اسحاق نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہو گا۔'' چوہان نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''بیچ میں مسئلہ تو ان پچاس بندوں کا ہی ہے جن کو ہم چھڑانا چاہتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ نہیں ہو گا تو پھر حکم جی ''ایکشن والا خطرہ'' کسی صورت مول نہیں لے گا۔ اس پر جارج گورا وغیرہ کی طرف سے بھی زبردست دباؤ پڑ جائے گا کہ اس معاملے کو خون خرابے کے بغیر حل کیا جائے۔''

''ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آوت ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''اگر ہم اپنے اس مطالبے سے پیچھے ہٹ جاوت ہیں... اور پھر بھی حکم اور پانڈے وغیرہ کھون کھرابے کا سوچتے ہیں تو جارج اور اس کے سیکڑوں ساتھی ایک دم قیامت برپا کر دیویں گے۔''

اس موضوع پر پانچ دس منٹ مزید بات ہوئی۔ آخر ایک حتمی فیصلہ کر لیا گیا... طے ہوا کہ اسٹیل وغیرہ کو ان کی چٹھی کا جواب دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ سب سے پہلے سلطانہ کے والد اور بھائی کو تل پانی پہنچائیں، اس کے بعد ہم بھی اپنی مانگوں پر نظرِ ثانی کریں گے۔ ان کو شروع میں یہ عندیہ دیا جائے کہ اگر پچاس کے پچاس لوگ رہا نہیں کیے جا سکتے تو ان میں سے جتنے لوگ جارج کی جیل میں موجود ہیں، ان کو چھوڑ دیا جائے اور یہاں پہنچایا جائے۔ اس فیصلے پر اسحاق سمیت سب نے اتفاق کیا۔ تاہم اسحاق کی رائے تھی کہ اسٹیل اور اس کے ساتھیوں نے کل شام تک سارے مطالبے ماننے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کے پورا ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔

کچھ بحث و تمحیص کے بعد اسحاق کی یہ بات مان لی گئی۔ حالانکہ اس وعدے کے پورا ہونے کے امکانات کم ہی تھے۔ فیروز کو نہلائے بغیر ایک چادر میں لپیٹا گیا۔ انور خاں نے باقاعدہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر سرنگ کے اندر ہی اسے ایک نیم پتھریلی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ سب کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ دونوں کتوں کی لاشوں کو سرنگ کے عقبی حصے میں پہلے سے موجود ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی گئی۔ پانڈے کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے۔

...رات کو دہانے پر اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد میں پھر بارونداجیکی کے پاس پہنچا اور وہاں اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے گزارے۔ شراب پینے کے بعد اس کی توانائیاں عود کر آتی تھیں اور وہ کافی حد تک صحت مند دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بے حد مشکور بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے مجھے مارشل آرٹ کے داؤ پیچ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس کے اندر جیسے یہ شدید خواہش پیدا ہو گئی

تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ بتائے اور میں اس کے بتائے ہوئے کو ''فالو'' بھی کر دوں۔ اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے اندر ایک آگ دیکھ رہا ہے اور اگر یہ آگ جلتی رہی تو میں کافی کچھ حاصل کر لوں گا۔ اور وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا... میں خود محسوس کرتا تھا کہ میرے اندر کچھ روشن ہو چکا ہے اور اس روشنی کی ابتدا اسی رات ہوئی تھی جس رات سلطانہ نے میرے لیے بہت کچھ کھو دیا تھا۔

مجھے سکھلانے کے دوران میں جیکی چھوٹے چھوٹے وقفے بھی لیتا تھا۔ ان وقفوں میں وہ وِسکی کے گھونٹ لیتا، کھانستا اور ہنٹر بیف چبانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پرانی یادیں بھی تازہ کرنے لگتا۔

جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس رات جنگل میں خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے۔ بھیگی ہوئی نباتات کی خوشبو ہوا کے ساتھ سرنگ میں چکراتی رہی۔ اس ماحول نے جیکی کا نشہ دوآتشہ کر دیا۔ وہ اپنا من پسند نیپالی گیت گنگنانے لگا۔

...ہم نے اگلے روز شام تک سرجن اسٹیل اور پانڈے وغیرہ کا وعدہ ایفا ہونے کا انتظار کیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق ان لوگوں نے ایک بار پھر عذرِ لنگ کا سہارا لیا۔ پانڈے نے میگافون کے ذریعے ہمیں بتایا کہ بارش کی وجہ سے رات کو کافی راستے بند ہو گئے ہیں۔ جنگل میں سات آٹھ میل کا علاقہ ایسا ہے جہاں سفر ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا جیل سے یہاں پہنچنے والوں کی آمد میں ایک دو روز کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

بات کی تہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کی طرف سے جو اطلاعات ہم تک پہنچی تھیں، وہ بالکل درست ثابت ہو رہی تھیں۔ ہم سے وعدے کیے جا رہے تھے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جا رہا تھا۔

اسحاق اور احمد بہت برہم تھے۔ وہ ذہنی طور پر مرنے مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ خاص طور سے اسحاق تو یہی چاہتا تھا کہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا جائے۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

بہرحال، طے شدہ پروگرام کے مطابق اسحاق کو بھی ہماری بات ماننا پڑی۔ چوہان نے انگریزی میں خط لکھا... اور اس میں اسٹیل وغیرہ کو یہ عندیہ دیا گیا کہ اگر وہ لوگ فوری طور پر سلطانہ کے والد اور بھائی کو گونگے ہاشم سمیت تل پانی پہنچا دیں... تو ہم باقی کے مطالبات میں کچھ لچک پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ خط ایک بار پھر میں ہی لے کر گیا۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں انڈین سیکیورٹی فورسز کے سابقہ افسر رنجیت پانڈے کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ رنجیت پانڈے کی جگہ ایک سانولا سا فربہ اندام شخص خط لینے کے لیے آگے آیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ تھیں اور وہ حکم کے سپاہیوں کی مخصوص وردی میں تھا۔ میں نے تل پانی میں چھوٹے سرکار یعنی اجیت رائے کے محافظ بھی دیکھے تھے۔ ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔ جنگل میں یہ وردیاں جیسے سبز گرد و پیش کا حصہ ہی بن جاتی تھیں۔ حکم کے سپاہیوں کی وردیوں میں سبز اور خاکی رنگ تھا۔

خط دینے کے بعد میں واپس آ گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے پھر انتظار اور تناؤ کے تھے۔ دونوں طرف خاموشی تھی لیکن یہ ایسی خاموشی تھی جسے کسی بھی لمحے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خاموشی کی دھند میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی موجود تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب پانڈے نے ہی ہمیں میگافون کے ذریعے اطلاع دی کہ ہمارا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔ سلطانہ کے والد، بھائی اور ملازم ہاشو بخیریت تل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اگر ہم اس کی تصدیق کرنا چاہیں تو ہم میں سے کوئی ایک شخص تل پانی جا کر واپس آ سکتا ہے۔

انور خاں تصدیق کیے بغیر کیسے مان سکتا تھا؟ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اطلاع دینے والا پانڈے تھا۔

مشورے کے بعد طے ہوا کہ ہم میں سے احمد سرنگ سے باہر جائے گا اور تصدیق کر کے ہمیں اطلاع دے گا۔ تل پانی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ احمد ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بہ آسانی واپس آ سکتا تھا۔ میرے دل میں آئی کہ میں بھی رضاکارانہ طور پر احمد کے ساتھ چلا جاؤں۔ اس طرح میں تل پانی میں سلطانہ سے مل سکتا تھا اور اس بچے سے بھی جسے میرا خون کہا جا رہا تھا۔ میں سلطانہ کو تسلی تشفی بھی دے سکتا تھا مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں جس منزل کا راہی نہیں تھا، اس منزل کی طرف جانے سے کیا حاصل تھا؟ مجھے سلطانہ کی طرف نہیں کسی اور کی طرف جانا تھا۔ وہ جو ایک روز، بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کہے، خاموشی سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی... سمندر پار جا بیٹھی تھی... ان گلی کوچوں کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ گئی تھی... جہاں ایک چپے پر ہماری یادوں کے گلشن کھلے ہوئے تھے۔ ہاں، میری منزل وہی تھی۔ اس کے سوا کوئی بنتِ حوا میری زندگی میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر سلطانہ آئی تھی تو وہ میرے ہوش و

حواس میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بیتا ہوا وقت میرے ذہن کی سلیٹ پر سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی قربانیوں کے بارے میں سنا تھا۔ ان جانکاریوں کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تو موجود تھی لیکن کسی بھی درجے کی محبت نہیں تھی۔

احمد، انور خاں کی ضروری ہدایات کے ساتھ سرنگ سے روانہ ہو گیا۔ اس کے لیے پانڈے نے گھوڑا فراہم کیا اور ایک محافظ بھی ساتھ بھیجا۔ احمد کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے ہی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ مثبت خبر لایا ہے۔ اس نے آ کر بتایا۔

''سب ٹھیک ہے انور بھائی! میں سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ سلطانہ بی بی کے بیمار بھائی کو چارپائی اور گھوڑا گاڑی پر سفر کرا کے نل پانی پہنچایا گیا ہے۔''

''نل پانی میں کیا حالات ہیں؟'' چوہان نے پوچھا۔

''سلطانہ بی بی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجرموں کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔ اگر حکم اور اس کے لوگن ناہیں دیتے تو پھر اس سزا کی ذمے داری چھوٹے سرکار کو لینی چاہیے۔''

انور خاں نے احمد سے سرنگ کے اردگرد کے حالات دریافت کیے۔

احمد اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''باہر ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ لوگن موجود ہیں۔ میرے کھیال میں تو ان کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم ناہیں ہووے گی۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دوربینیں لے کر درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ان کے گھوڑے گھاس پر منہ مارتے نظر آوت ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ ہے۔ ٹیلوں کے ساتھ ساتھ ان کی چھولداریاں ہیں اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ میم صاحبہ کا معاملہ ہے۔ اگر ساری فوج بھی یہاں بھیج دی جاتی تو حیرانی کی بات نہیں تھی۔'' چوہان نے کہا۔

انور خاں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''چلو، پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' احمد نے پوچھا۔

''اب ان کو دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مزید یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ ہمارے مطلوبہ بندے یہاں پہنچا دیں۔ اگر سارے نہیں آ سکتے تو اتنے پہنچا دیں جتنے کا انہوں نے اقرار کیا ہے... یعنی پچیس افراد!''

''لیکن وہ اتنے بھی نہیں پہنچائیں گے۔'' بھکشو ہمیش نے کہا۔

''نہیں پہنچائیں گے لیکن کچھ نہ کچھ تو بتائیں گے نا۔ فی الوقت وہ جو بھی دیں، ہمیں مان لینا چاہیے... کیا خیال ہے؟'' آخری الفاظ کہتے ہوئے انور خاں نے چوہان کی طرف دیکھا۔

چوہان نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

اس بار خط لکھنے کے بجائے چوہان اور انور خاں نے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری طرف سے چوہان اور احمد باہر نکلے۔ ان کی طرف سے سرجن اسٹیل اور گردموادان آئے۔ درختوں کے جھنڈ میں قریباً آدھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ ہماری توقع اور اندیشے کے عین مطابق وہ لوگ فوری طور پر صرف سات بندے دینے کے لیے آمادہ ہوئے۔ یہ زیادہ اہم بندے نہیں تھے۔ یہاں بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ صادق آ رہا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ معاملہ طے ہو گیا۔ چوہان اور احمد واپس آ گئے۔

چوہان نے بتایا۔ ''کل دوپہر تک سات بندے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ماریا سمیت یہاں سے نکل سکیں گے اور نل پانی کی طرف روانہ ہوں گے۔''

''ماریا آخر تک ہمارے ساتھ رہے گی؟'' ہمیش نے پوچھا۔

''نہیں... اسٹیٹ کی حدود سے دو میل پیچھے ماتی پور کے قریب ہمیں ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بدلے سرجن اسٹیل یا گردموان میں سے کوئی ایک ہماری تحویل میں آ جائے گا۔ وہ تب تک ہمارے ساتھ رہے گا، جب تک ہم کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے۔''

''یہ دھوکا ہے۔ کوئی چال ہے۔'' اسحاق نے چیخ کر کہا۔ ''میں آپ سب کو بتا دیوت ہوں، ہم تب تک ہی بچے ہوئے ہیں جب تک یہ چھوکری ہمارے ساتھ ہے۔ جس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکلی، ہم مارے جاویں گے۔ میں کسی صورت ایسا ناہیں ہونے دوں گا۔ یہ تب ہی رہا ہووے گی جب ہم یہاں سے نکلیں گے۔'' اسحاق کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

انور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو، ہم ماریا کے بدلے جو کچھ لے رہے ہیں، وہ بھی کچھ کم خاص نہیں ہے۔ سرجن اسٹیل یا پھر گردموادان۔ ماریا کی طرح ان دونوں کے جیون کا رسک لینا بھی ان لوگوں کے لیے آسان نہیں ہو گا... اور پھر تب تک ہم ویسے بھی اسٹیٹ سے تقریباً نکل چکے ہوں گے۔''

اسحاق بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا۔ بہرحال، انور خاں اور چوہان اسے سمجھانے میں لگے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسے بمشکل راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ اب ہمیں کل دوپہر تک زرگاں سے رہا ہونے والے سات بندوں کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں سے نکلنے کی تیاری بھی کرنا تھی۔

احمد نل پانی سے ہو کر آیا تھا۔ میں اس سے سلطانہ اور بالو وغیرہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ احمد خود بھی بھانپ گیا کہ میں اس سے سلطانہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کھانے کے بعد ہم ایک الگ جگہ جا بیٹھے۔ احمد نے بتایا۔ ''وہ ابھی تک سخت صدمے میں ہے۔ کچھ کھاتی پیتی ناہیں۔ نہ ہی بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ بس گم صم بیٹھی رہوت ہے یا پھر رونا شروع کر دیوت ہے۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر ایک ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا ہے۔ میں اس سے ملا ہوں۔ وہ بتا رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بہتر ہو جاوے گی۔''

''تم خود بھی اس سے ملے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میں گیا تھا۔ وہ عبدالغنی کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ میاں بیوی اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رونے لگ گئی۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہاری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بہت تاکید کی کہ میں تمہارا بہت کھیال رکھوں... اس کے دل میں تمہارے لیے وہی پریشانی ہے جو ایک بہت پیار کرنے والی بیوی کے دل میں ہو سکت ہے۔''

''اس نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟''

''ناہیں تابش بھائی! میرا کھیال ہے کہ وہ اپنا سارا دکھ درد اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔ جیسے ساگر اوپر سے شانت ہووے ہے، پر اندر طوفان پلے ہے۔ سلطانہ بی بی کے اندر بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔ اب پتا ناہیں، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔''

''تم نے اسے بتایا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں؟''

''ناہیں، میں یہ بتاتا تو وہ زیادہ غمگین ہو جاتی۔ وہ اوپر اوپر سے کچھ بھی کہے لیکن کوئی بھی بیوی اس طرح اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لیے کھونا ناہیں چاہتی۔ اور سلطانہ تو ایسی شوہر پرست بیوی ہے جس نے...''

کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے۔

میں نے احمد سے مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے... ایسا کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ جلد سے جلد نارمل ہو جائے؟ اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں؟''

اس سے پہلے کہ احمد جواب میں کچھ کہتا، اسحاق نے اشارے سے ہمیں اپنی طرف بلایا۔ وہ ہمیں کوئی خاص چیز دکھانا چاہ رہا تھا۔

ہم اٹھ کر اس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دہانے سے کچھ فاصلے پر اس جگہ لے آیا جہاں ہم سوتے تھے۔ ''یہ دیکھو۔'' اسحاق نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ماریا جو پچھلے تقریباً اٹھارہ گھنٹے سے پتھر پر چڑھی بیٹھی تھی تاکہ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے... اب تھک ہار کر زمین پر لیٹ گئی تھی اور سو رہی تھی۔

اسحاق زہریلے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''حرامزادی کہوت تھی مجھے بیڈ چاہیے، گدا چاہیے۔ اب دیکھو، پتھروں پر سو رہی ہے۔''

''سیانے ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ وقت سب کچھ سکھا دیوت ہے۔'' احمد نے تائید کی۔

''ایک دو ہفتے اور ہمارے ساتھ رہی تو اسے کانٹوں پر بھی سونا آ جاوے گا۔'' اسحاق نے کہا۔

واقعی یہ دیکھنے والا نظارہ تھا۔ خوشبودار کمروں میں مچھر دانیاں لگا کر آرام دہ بستروں کا لطف لینے والی، سخت ناہموار زمین پر پڑی تھی۔ اس کا قیمتی لباس سرنگ کی مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔ اپنے لباس کی طرح وہ خود بھی بے ترتیب تھی۔ ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں تھا۔ میں نے دہانے کی طرف سے آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا، اس کی گوری چٹی پنڈلی پر ایک چھوٹا لال بیگ رینگ رہا تھا۔ یہی زندگی اور زندگی کی بوالعجبی ہے۔

اگلے روز سہ پہر ڈھائی تین بجے کے قریب وہ ساتوں افراد زرگاں سے آ گئے جن کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ ان کی عمریں بیس اور ستائیس اٹھائیس سال کے درمیان تھیں۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں، سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں تھے۔ ان کی شکلوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بامشقت قید گزار کر آ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ انور خاں، احمد اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔

ایک پارسی کے سوا یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ ان

میں سے صرف ایک شخص قتل کا مجرم تھا، باقی سب جرمِ بے گناہی کا شکار تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے حکم یا جارح کی کسی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ کسی سرکاری اہل کار کے دستِ ستم کو روکنے کی کوشش کی تھی یا ایسا ہی کوئی اور گناہ کیا تھا۔ انور خاں نے مجھ سے اور چوہان سے ان سب کا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک حجام تھا، دوسرا ایک ماہر قفل گر تھا۔ یہ سب افراد اپنی اس آزادی کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ رہے تھے اور قدرت کی نیرنگی پر حیران تھے۔

سب سے پہلے انہیں کھانا کھلایا گیا۔ ہمارے پاس بس گزارے لائق خوراک تھی۔ زیادہ تر خشک راشن یعنی چنے، بُھنے، ہنٹر بیف اور بسکٹ وغیرہ ہی تھے۔ قیدیوں نے یہ چیزیں ندیدوں کی طرح کھائیں۔ اندازہ ہوا کہ اپنی طویل قید کے دوران میں وہ معقول خوراک سے یکسر محروم رہے ہیں۔

ان میں سے جو شخص حجام تھا، وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زرگاں میں وہ میرے بال تراشتا رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا حمام اسی محلے میں ہے جہاں مختار راجپوت اور ان کی بیٹی سلطانہ رہتے ہیں۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اکثر سلطانہ خود مجھے اپنے ساتھ لے کر آتی تھی اور جب تک میرے بال تراشے جاتے تھے، وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ میں چونکہ پوری طرح صحت مند اور چوکس نہیں تھا، وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ عبدالرحیم نامی یہ حجام اس بات پر ششدر بھی تھا کہ میں اسے کیوں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔ چوہان اسے ایک طرف لے گیا، غالباً صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا...

ان قیدیوں سے ہمیں اپنے اردگرد کے حالات کے بارے میں بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم رات تک تیاری میں لگے رہے۔ خشک راشن تھیلوں میں رکھا گیا۔ فالتو ایمونیشن کو پولیتھین میں لپیٹ کر کینوس کے دو بڑے بیگوں میں اس طرح سنبھالا گیا کہ وہ بارش وغیرہ سے محفوظ رہے۔ رائفلوں کو صاف کر کے بالکل تیار کر لیا گیا۔ مکمل ترتیب بنائی گئی کہ ہمیں کس فارمیشن میں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہنگامی صورتِ حال سے کس طرح نمٹنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انور خاں میں یقیناً قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل وقت سے پہلے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس تنگ و تاریک سرنگ میں یہ ہماری آخری رات ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرح کی سنسنی بھی رگ و پے میں جاگی ہوئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد حالات ہمارے لیے ایک دم خطرناک ہو جائیں گے۔ آنے والے ایک دو روز میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ماضیِ قریب میں ایسے حالات مجھے اعصاب زدہ کر دیا کرتے تھے۔ میں خطرے کی آمد سے پہلے ہی اس کے بارے میں اتنا سوچتا تھا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ حالات کی سنگینی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس پُرجوش گروپ کا حصہ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا۔ میرا جوش یوں اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے تھے، وہ میری خواہش کے عین مطابق تھا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں کسی طرح اس ''جادو نگری'' سے نکل جاؤں۔ بے شک اس راجواڑے نے ایک جادو نگری ہی کی طرح مجھے کئی برس سے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ اب میرے لیے ایک سبب پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایک ایسی جماعت کا حصہ بن گیا تھا جو یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس جماعت کے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری طرف ہمیں روکنے والوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔

یہ بات اب ہر شک و شبہے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ میرے جسم میں ایک الیکٹرانک چپ موجود ہے جو مجھے اس راجواڑے کی حدوں میں پابند رکھے ہوئے ہے۔ یہ چپ اب بھی میرے جسم میں موجود تھی۔ میرے صیادوں کو اب بھی فوراً معلوم ہو سکتا تھا کہ میں اس اسٹیٹ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں۔ لیکن اب میں جس جماعت کا حصہ تھا، وہ اسے روک نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ روکتے تو پھر زبردست خون خرابے کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔

جو بات چیت ہوئی تھی، اس میں چوہان نے پانڈے وغیرہ سے تین خچر بھی طلب کیے تھے۔ ہمیں دو خچر اور ایک گھوڑا دیا گیا۔ یہ تینوں جانور رات آٹھ نو بجے ہی سرنگ میں پہنچ گئے۔ ہمیں ان کو سامان برداری کے لیے استعمال کرنا تھا۔ حسبِ معمول رات کے پہلے حصے میں جن افراد کی ڈیوٹی تھی... ان میں، میں بھی شامل تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں نے دس پندرہ منٹ تک چٹائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کی اور پھر شراب کی نصف بوتل لے کر بارونداجیکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کے لیے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی اور لالٹین رکھ دی گئی تھی۔ وہ تنہائی میں خوش رہتا تھا اور ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ علیحدہ رہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس میں شراب کی طلب بیدار ہو جاتی تھی اور

یہ طلب شام تک بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شام کے بعد یہ طلب عروج پر پہنچ جاتی تھی اور وہ واویلا شروع کر دیتا تھا۔ ہمیں جہنمی ہونے کی بشارتیں سناتا... خود کو کوستا اور ان حالات کو بھی جو اسے پیاسا مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم باروندا کو اس کی طلب کے مطابق شراب فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے تو اس سرنگ کے اندر ہی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں بارونداجیکی کے ٹھکانے پر پہنچا تو چونک گیا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اور نہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے نیڈ بیگ کی طرف دیکھا، وہ بھی اکیلا ہی جھول رہا تھا۔ لالٹین کی لَو اونچی کر کے میں دائیں بائیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ شاید وہ کسی حاجت کے لیے کسی کونے کھدرے کی طرف رینگ گیا ہے۔

اگلے دو چار منٹ کے اندر میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر سے باندھ دی جاتی تھی اور صبح کے وقت ہی بس ایک دو گھنٹے کے لیے کھولی جاتی تھی... یا پھر کسی وقت رات کو جب وہ مجھے فائٹنگ آرٹ کے داؤ پیچ سکھاتا تھا، میں کچھ دیر کے لیے اس کی ٹانگ کھول دیتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے میں خود ہی اسے کھانا دینے کے لیے یہاں آیا تھا، تب بھی اس کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی بندھی ہوئی ٹانگ کے ساتھ رینگ کر کہیں جاتا تو زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اسے دو چار آوازیں دیں پھر اسے سرنگ کی ذیلی شاخوں میں ڈھونڈنا شروع کیا۔

میری آوازیں سن کر ہمیش اور احمد بھی ٹارچ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

''کیا ہوا تابش؟'' احمد نے پوچھا۔

''جیکی نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

وہ دونوں بھی میرے ساتھ تلاش میں شریک ہو گئے۔ ہم نے زمینی شہادت ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی۔ ایک دو جگہ ننگے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ بیساکھی نما لکڑی کا نشان بھی موجود تھا۔ تو کیا بارونداجیکی کسی طرح اپنی زنجیر کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ اپنے اکلوتے ہاتھ سے وہ کس طرح ایسا کر پایا تھا؟ جلد ہی دیگر ساتھیوں تک بھی یہ خبر پھیل گئی کہ جیکی غائب ہے۔

سب دہانے کے قریب اکٹھے ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ''یہ تو سوچا نہیں جا سکتا کہ وہ باہر نکل گیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ دہانے کی طرف سے ہی نکل سکتا تھا۔''

''مطلب ہے کہ وہ سرنگ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔'' اسحاق نے کہا۔

''ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔'' انور خاں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''وہ کیا؟'' چوہان نے پوچھا۔

''سرنگ سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ... جواب تک ہماری نظر سے اوجھل رہا ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکت ہے انور بھائی۔'' اسحاق الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''تم جانت ہی ہو، یہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ہم نے چپا چپا دیکھ لیا تھا۔''

''لیکن ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر جگہ پہنچے تھے اور سو فیصد تسلی کر لی تھی۔''

کسی نے انور کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ ہاں ایک طرح کی سنسنی سب نے محسوس کی۔ اگر واقعی سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ موجود تھا تو پھر اس راستے سے سرنگ میں داخل بھی ہوا جا سکتا تھا اور یہاں ہمارے دشمنوں میں پانڈے جیسا نہایت عیار اور گھاگ شخص بھی موجود تھا۔

انور خاں، چوہان اور اسحاق تو اپنی پوزیشنوں پر موجود رہے اور باقی ایک بار پھر جیکی کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ میں اپنی جگہ کچھ ندامت بھی محسوس کر رہا تھا۔ جیکی سے زیادہ تر میرا ہی رابطہ رہتا تھا۔ اس کی بندش کو چیک کرنا بھی میری ہی ذمے داری تھی۔ اسحاق اور انور خاں وغیرہ کا خیال تو شروع میں یہ تھا کہ مجھے اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن بعد میں جب انہیں جیکی کی مکمل کہانی معلوم ہوئی تھی، وہ بھی اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگے تھے۔

رات آخری پہر تک سرنگ کی بھول بھلیوں میں اس کی تلاش جاری رہی پھر ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری روانگی کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ انور خاں کا خیال تھا کہ ہم اجالا ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ جانوروں پر سامان رات کو ہی باندھ لیا گیا تھا۔ باقی تیاری بھی مکمل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہم جیکی کی مزید تلاش جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

☆☆☆

چھ بجے کے لگ بھگ ہم سرنگ سے نکل آئے۔ مطلع صاف تھا۔ گرد و پیش اوس میں نہائے ہوئے تھے۔ سرنگ چھوڑتے ہوئے میں نے الوداعی نظروں سے اس کے اندر جھانکا۔ یہاں گزارے ہوئے دن بڑے سنسنی خیز تھے... تناؤ سے پُر اعصاب شکن۔ یہاں کئی ایک انوکھے واقعات ہوئے تھے

جن میں شکاری کتوں کا اچانک سرنگ میں گھس آنا اور پھر اندھادھند فائرنگ کا شروع ہو جانا بھی شامل تھا۔ ہم اپنے قریبی ساتھی فیروز کی قبر بھی اسی سرنگ کی ویران تاریکی میں چھوڑے جا رہے تھے... اور پھر سب سے بڑھ کر بارونڈا جیکی تھا۔ وہ ایک معمے کی طرح ہمارے سامنے آیا تھا اور ایک معمے کی طرح اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کا یوں اچانک اوجھل ہو جانا میرے دل و دماغ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس اب یہاں رکنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ جیکی کو ہم کسی صورت چھوڑ کر نہ جاتے۔ انور خاں کے نزدیک اب بھی نوّے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ جیکی کہیں سرنگ کی بھول بھلیوں میں ہی موجود ہو گا۔ جونہی وہ اپنے اردگرد کے حالات بہتر دیکھے گا، یہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل چکا ہے لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو کیا وہ اس خطرناک جنگل کو پار کر کے واپس اس ندی تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ نہتا تھا، معذور تھا اور نشے کے بغیر اتنا کمزور تھا کہ کسی بھی وقت، کسی حادثے کا شکار ہو سکتا تھا...

میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ عمران مجھ سے جدا ہوا تھا تو کیا وہ شخص بھی جدا ہو گیا تھا جس میں عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں اس قافلے کا حصہ بن گیا جو اس سرنگ سے نکل کر گھنے درختوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اس مختصر قافلے میں موجود افراد ایک خاص ترتیب سے باہر نکلے تھے اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق یہ ترتیب ہر صورت میں برقرار رکھی جانی تھی۔

سب سے آگے وہ گھوڑا تھا جس پر خوراک کا سامان لدا تھا۔ اس کے عقب میں چوہان، ہمیش اور احمد تھے۔ ان کے پیچھے ماریا تھی جس کے عین عقب میں اسحاق تھا۔ ماریا کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ اس کے پیچھے وہ باقی پانچواں افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں تھے جنہیں زرگاں سے رہا کرایا گیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار تو نہیں تھا تاہم انور خاں نے ان میں سے چار بندوں کو تلواروں سے مسلح کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے عقب میں انور خاں اور میں تھے۔ ہم دونوں نے دو سامان بردار خچروں کی رسیاں بھی تھام رکھی تھیں۔ ان خچروں پر چٹائیاں، برتن اور اضافی ایمونیشن وغیرہ بار کیا گیا تھا۔ ہر بندے کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہنگامی صورتِ حال میں انہیں کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہے، ماریا اس مختصر قافلے کے عین درمیان میں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے جانے چاہیے تھے مگر انگلی کٹنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی تھا اس لیے انور نے تھوڑی سی رعایت کی تھی اور ہاتھ سامنے کی طرف بندھوائے تھے۔ اسحاق نے ایک بڑے سائز کی چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دی تھی۔ وہ اس چادر کے اندر ڈگمگاتی ہوئی سی چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تلخی اور جھلاہٹ کے آثار صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔

ہم روانہ ہوئے تو حسبِ پروگرام اسٹیل، پانڈے اور ان کے دیگر ساتھی ہمارے پیچھے چل دیے۔ اپنی ''کمٹمنٹ'' کے مطابق انہوں نے ہم سے کافی فاصلہ رکھا تھا۔ یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ یہ لوگ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گھڑسوار تھے۔ ان کی سبز اور براؤن وردیوں کی جھلک ہمیں چاروں طرف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی سو سے کم نہیں تھی۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ بھی موجود تھا۔ یہ لوگ چاہتے تو سیکنڈوں میں ہمیں بھون کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن ہمارے پاس ماریا ایک اہم مہرے کے طور پر موجود تھی۔ وہ اس اسٹیٹ میں ایک اہم ترین شخصیت تھی اور اس کی زندگی کے لیے رسک لینا آسان نہیں تھا۔

''ہمیں کتنا فاصلہ طے کرنا ہو گا؟'' میں نے اپنے پہلو میں چلتے انور خاں سے پوچھا۔

''میلوں میں تو ٹھیک سے نہیں بتا سکوں گا لیکن اندازہ ہے کہ یہ دو دن کا سفر ہو گا۔ ہم پرسوں دوپہر تک اسٹیٹ کی حد سے نکل جائیں گے۔''

''اسٹیٹ کی حد سے نکلنے کے بعد ہماری پناہ گاہ کہاں ہو گی؟''

''اسٹیٹ سے باہر جو مقامی لوگ آباد ہیں، وہ حکم وغیرہ کے سخت خلاف ہیں۔ یہ زیادہ تر جاٹ اور راجپوت برادریاں ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو نیپالی علاقے سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ حکم اور چھوٹے سرکار کے گارڈز کے ساتھ اکثر ان کی جھڑپیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ہمیں فوراً پناہ دے دیں گے۔''

''کیا ہم انہیں مطمئن کر سکیں گے کہ ہم واقعی حکم کے باغی ہیں اور ہمیں پناہ دی جانی چاہیے؟''

''یہ سب کچھ ڈاکٹر چوہان کرے گا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ہے۔ شاید تمہیں چوہان کی روداد کا پورا پتا نہیں ہے۔''

''پورا کیا، مجھے تھوڑا پتا بھی نہیں ہے۔ اس نے صرف اتنا بتا رکھا ہے کہ وہ الٰہ آباد میں رہتا ہے۔ وہاں حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اسے بھاگ کر اسٹیٹ میں آنا پڑا اور یہاں پناہ لینا پڑی۔''

انور بولا۔ ''حقیقت میں چوہان ایک دیہاتی کاشت کار کا بیٹا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر محنت مزدوری تک ہی محدود رہتے ہیں مگر چوہان قابل نکلا۔ نہ صرف یہ گاؤں سے شہر گیا بلکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ الٰہ آباد میں اس کا کلینک تھا اور مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ انہی مریضوں میں چوالیس پینتالیس سال کی ایک ہندو عورت ہیما بھی تھی۔ یہ بیوہ تھی اور کافی پراپرٹی کی مالک تھی۔ اس کے بیٹے نافرمان تھے اور اس کوشش میں تھے کہ ماں سے پراپرٹی اپنے نام کروا لیں۔ ہیما اپنے علاج کے دوران میں چوہان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے بیٹوں اور بہوؤں کے خوف سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات چوہان کے پاس رکھوا دیے۔ یہ صورتِ حال ہیما کے بیٹوں کو کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر چوہان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہیما کی ایک بہو نے اپنی ساس پر بدچلنی کا الزام لگا دیا... اور کہا کہ اس کی ساس اپنا دھرم بدل کر نوجوان ڈاکٹر سے بیاہ رچا لے گی۔ ہیما کے بیٹوں نے چوہان کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملے میں پولیس کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ چوہان کے خاندان برادری والے بھی بھڑک گئے۔ خدشہ پیدا ہو گیا کہ لڑائی ہو جائے گی۔ چوہان نے سمجھ داری دکھائی اور لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لیے چپ چاپ اسٹیٹ میں آ گیا۔ اب یہ قریباً ڈھائی برس سے یہیں پر ہے۔''

چوہان کے بارے میں جاننے کی خواہش کافی دیر سے میرے دل میں تھی۔ آج انور خاں کے ذریعے یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ میں نے اس روداد کے حوالے سے انور خاں سے کئی سوالات پوچھے۔ جو کچھ انور کو معلوم تھا، اس نے بتایا۔ ساتھ ساتھ ہمارا سفر بھی جاری رہا۔ میں نے انور سے پوچھا۔ ''اب چوہان اسٹیٹ سے باہر جا رہا ہے اور اپنے لوگوں میں واپس پہنچ رہا ہے۔ کیا اب اس کے لیے خطرہ نہیں ہو گا؟''

''اسٹیٹ سے باہر حالات کافی بدل گئے ہیں۔'' انور خاں نے جواب دیا۔ ''ہیما کے لالچی بیٹے ایک دوسرے سے ہی لڑ پڑے ہیں۔ ایک قتل ہو گیا ہے اور دوسرا جیل میں سڑ رہا ہے۔ ایک بہو اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے... اور یہ وہی ہے جس نے اپنی ساس پر الزام لگایا تھا۔ سارا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہیما نے اپنی زیادہ تر پراپرٹی بیچ دی ہے اور گورکھ پور چلی گئی ہے۔''

ہم بظاہر تو باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے مگر اطراف پر ہماری گہری نظر تھی۔ ایک عجیب سی سنسنی بھی رگ و پے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اور انور خاں سب سے پیچھے تھے۔ اگر خدانخواستہ کسی طرح کی کوئی کارروائی ہوتی تو سب سے پہلے ہم ہی نشانہ بنتے۔ عقب سے قافلے کے تحفظ کی ذمے داری بھی ہم پر ہی تھی۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہمارے رکتے ہی ساتھ چلنے والے حکم کے دو ڈھائی سو اہل کار بھی رک گئے۔ ہم نے کھانا وغیرہ کھایا۔ چوہان نے اپنی اور احمد کی مرہم پٹی کی۔ ہمیش کے ٹوٹے ہوئے بازو کی دیکھ بھال بھی چوہان باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہم میں سے زیادہ تر زخمی تھے۔ اگر ڈاکٹر چوہان ساتھ نہ ہوتا تو ہماری حالت کافی ابتر ہوتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو ڈاکٹر چوہان اس قافلے کا اہم ترین بندہ تھا۔

ہمارا سفر گھنے جنگل کا تھا۔ کہیں کہیں راستہ زیادہ دشوار ہو جاتا تھا۔ ایسے میں تلوار بردار افراد آگے چلے جاتے تھے اور کہیں کہیں سے شاخوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے۔ تلواریں ایک سرلائے کے ساتھ شاخوں سے ٹکراتیں۔ ایسے ہی سرلائے ہمارے اردگرد بھی سنائی دیتے۔ یہ پانڈے اور اس کے ساتھی ہوتے تھے جو ہماری ہی طرح راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ جنگل میں شیشم، کیکر، جنتر اور کچنار کے درختوں کی بھرمار تھی اور جنگلی جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایک دو جگہ ایسے نشان بھی نظر آئے جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تیندوے کے ہیں۔ ان نشانوں کی وجہ سے قافلے میں سنسنی کی لہر محسوس کی گئی۔

چلتے چلتے ایک جگہ ماریا کو اچانک ٹھوکر لگی۔ اس کی بائیں جانب چلنے والے شخص نے بے ساختہ اسے تھاما اور گرنے سے بچایا۔ یہ وہی پارسی تھا جو سات افراد کے ہمراہ جارج کی جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ حالانکہ اس نے ماریا کی مدد کی تھی مگر ماریا نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ شاید اسے کوفت ہوئی تھی کہ ایک نیچ کالے نے اسے چھوا ہے۔

''ہام سے دور رہو۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''معافی چاہتا ہوں میم جی۔'' پارسی گڑبڑا کر رہ گیا۔

''اب اس کو ہاتھ مت لگانا۔ چاہے گر کر اس کے تھوبڑے کا بھرتا بن جاوے۔'' اسحاق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ماریا اس رسّی کی طرح تھی جو جل جاتی ہے لیکن اس کے بل نہیں جاتے۔ پچھلے چند دن میں وہ بہت خوار ہوئی تھی... اس کے باوجود اس کی اکڑفوں برقرار تھی۔ اس کی نظروں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو حقارت سے دیکھ رہی ہے... غالباً نسلی تعصب بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ درختوں کی گھنی شاخوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔ کسی وقت ہلکی سی تمازت بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک جگہ عجیب سا واقعہ ہوا۔ ہمیں اپنے اردگرد مختلف جنگلی جانوروں کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کم کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ بس کسی وقت ہلکی سی جھلک نظر آجاتی تھی۔ اردگرد کے درختوں پر بندر اور ان کے بچے بھی اچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی باریک آوازیں جنگل میں دور تک گونجتی تھیں۔ ایک بڑے چھتاور درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے دفعتاً ایک جسیم بندر ماریا پر آن گرا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک جاتی ہے۔ بس اتنا ہی دکھائی دیا کہ اس نے ماریا کے ہاتھوں سے کوئی شے چھینی ہے... پھر وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس شاخوں پر چلا گیا۔ ماریا چلاتی ہوئی بائیں طرف ایک شخص پر گری۔ دونوں لڑھک کر ایک بارشی گڑھے میں چلے گئے۔ دو تین رائفلیں بندر کی طرف سیدھی ہوئیں مگر وہ زقند لگا کر شاخوں میں اوجھل ہو گیا۔ ماریا بدحواسی میں جس شخص سے ٹکرائی یہ وہی پارسی تھا جسے اس نے سہ پہر کے وقت برا بھلا کہا تھا۔ اب پارسی اوپر اور وہ اس کے نیچے تھی۔ پارسی تڑپ کر اٹھا لیکن کیچڑ کی وجہ سے پھر پھسل کر میم صاحبہ کے اوپر جا گرا۔ اسحاق اور احمد نے اسے کھینچ کر اٹھایا، پھر ماریا کو گڑھے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ پارسی ریان اور ماریا دونوں کیچڑ میں لت پت تھے۔

قافلہ رک گیا تھا۔ قافلے کے ساتھ ہی وہ دو ڈھائی سو افراد بھی رک گئے جن کی کمان پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے پاس تھی۔ پانڈے کے ایک ساتھی نے آگے آکر استفسار کیا کہ کیا ہوا ہے۔ انور خاں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا۔ ماریا کے چہرے اور لباس سے کیچڑ وغیرہ صاف کیا گیا۔ وہ اپنے گھر میں ہوتی تو شاید اس طرح سڑے ہوئے کیچڑ میں لتھڑ جانے کے بعد کئی گھنٹے واش روم کے اندر ہی گزارتی لیکن یہاں اسے بس ایک بالٹی پانی ہی میسر آسکا۔ پارسی ریان کو اتنا بھی نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد جب قافلہ پھر روانہ ہوا تو ہم نے اس شریر بندر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ ایک شاہ بلوط کی بلند شاخوں پر بیٹھا بسکٹ کھا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ کا ڈبا تھا۔ وہ ماریا سے یہی چھین کر لے گیا تھا۔ ماریا اب کچھ شرمندہ شرمندہ سی نظر آرہی تھی۔ شاید اسے بھی احساس تھا کہ جس شخص کے صرف ہاتھ لگانے پر وہ برہم ہو گئی تھی، اس کے ساتھ اسے باقاعدہ بغل گیر ہونا پڑا تھا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے میم جی اب کچھ شرما رہی ہے۔''

انور خاں گہری سانس لے کر بولا۔ ''ان گوری چمڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے یا غیرت شیرت جاگتی ہے۔''

ہم مدھم آواز میں باتیں کرتے چلتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی انور خاں عقابی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حیثیت ٹیم کے اس کپتان کی سی تھی جو ہمہ وقت فیلڈ پر گہری نظر رکھتا ہے اور ہر نقل و حرکت کو نوٹ کرتا ہے۔

رات کو درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر ڈیرا ڈالا گیا۔ درختوں کی شاخوں سے لالٹینیں لٹکا دی گئیں۔ دو عارضی چولہے بنائے گئے۔ راستے میں شکار کیے گئے گوشت کو بھونا گیا۔ نہایت سنگین صورتِ حال کے باوجود اس قیام نے لطف دیا۔ جنگلی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی مداخلت سے محفوظ رہنے کے لیے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن کردیے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ایک دم مجھے یارِ وندا جیکی پھر یاد آگیا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بھی اتنی جلدی کھو جائے گا۔ اس خطرناک جنگل میں وہ اکیلا کس طرح ''سروائیو'' کرے گا؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست تھا۔

چند دنوں کے ساتھ میں جیکی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اور اس میں سب سے اہم، درد کے حوالے سے وہ فلسفہ تھا جس نے میرے دل کی گہرائی کو چھوا تھا۔ وہ درد کے ساتھ انوکھے طریقے سے نمٹنا جانتا تھا اور اس نے یہ جانکاری بڑی تفصیلی انداز میں مجھ تک پہنچائی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس معاملے میں بھی عمران نے ہی میری مدد کی ہے۔ اگر مجھے جیکی میں اپنے بچھڑے یار کی جھلک نظر نہ آتی تو میں اسے کشتی سے اٹھا کر کہاں لاتا... اور اگر وہ نہ آتا تو پھر... اس کی باتیں بھی وہیں کشتی میں اس کے ساتھ رہ جاتیں...

مجھے لگا کہ مجھ سے بچھڑنے کے باوجود عمران قدم قدم پر میری مدد کر رہا ہے۔ کبھی کسی ڈھنگ سے، کبھی کسی روپ میں... وہ ہمہ وقت میرے ساتھ تھا۔ اس کی معنی خیز باتیں، اس کی جاں بخش مسکراہٹ، اس کی جادوئی چٹکی... سب کچھ میرے ساتھ تھا۔ اور پھر اس کی آواز، اس کا وہ انقلاب آفریں جملہ جس نے میری ناتوانیوں و نامرادیوں کی راکھ میں سے ایک نئے انسان کو وجود دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔'' اور پھر اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا تھا۔ ''جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے اور مرتا ہے تو ڈرتا گیا۔''

وہ رات خیریت سے گزری۔ ہم نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے باری باری پہرا دیا اور آرام بھی کیا۔ اگلی صبح اجالا ہونے کے ساتھ ہی ہم پھر روانہ ہو گئے۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی ہمارے اردگرد موجود دو ڈھائی سو افراد بھی حرکت میں آگئے۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ گرو موداں ان لوگوں میں موجود نہیں تاہم پانڈے، اسٹیل اور موہن کمار وغیرہ ساتھ ہی ہیں۔ جارج کی جیل سے رہا ہونے والے قیدیوں میں حجام عبدالرحیم بھی تھا۔ آج وہ میرے اور انور خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں زرگاں کی اس بدنام جیل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں حکم کے ایک سپاہی کو استرا مارنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ میرے استرے سے وہ بری طرح گھائل ہوا تھا۔ وہ میرے پاس ایک مسلمان بوڑھے کو لایا تھا۔ اس بوڑھے پر حکم کا کوئی افسر ناراض تھا۔ سپاہی نے مجھ سے کہا کہ میں بوڑھے کی داڑھی اور سر کے بال مونڈ دوں۔ میں نے انکار کیا۔ وہ سخت غصے میں آگیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کی گردن پر استرا مارا اور بھاگ گیا۔ دو دن بعد مجھے ندی پالی کے راستے میں پکڑ لیا گیا۔''

''کب سے جیل میں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تین سال سے اوپر ہو گئے تھے جی۔ مگر ایسے لگت ہے کہ تین صدیاں بیت گئی ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ پھانسی ہی دے دیتے۔ وہاں جیل میں بڑی کڑی مشقت لی جاوت ہے۔ بات بے بات ذلیل کیا جاوت ہے۔ جارج صاحب کے ہرکارے مار مار کر ادھیڑ دیوت ہیں... یہ ہرکارے قیدی عورتوں پر بھی ہر طرح کا ظلم ڈھاوت ہیں۔ وہاں کوئی کسی کی فریاد سننے والا نا ہیں۔'' عبدالرحیم نے اپنی قمیص اٹھا کر پشت دکھائی۔ یہاں ہنٹر کی مار کے انمٹ نشان موجود تھے۔ جس طرح گھوڑوں کی پیٹھ کو داغا جاتا ہے اسی طرح عبدالرحیم کی پیٹھ کو بھی داغا گیا تھا... یہ عبدالرحیم کا نمبر تھا... R88۔

عبدالرحیم، جارج کی جیل کے لرزہ خیز واقعات سناتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس جیل کے قیدیوں کی زندگی و موت کلی طور پر جارج اور اس کے اہل کاروں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر زرگاں میں کہیں قانون کا تھوڑا بہت گزر ہے بھی... تو اس جیل میں نہیں۔

سہ پہر تک حبس رہا لیکن پھر ایک دم بادل گھر کر آگئے۔ شمالی افق پر ایک کالی سیاہ گھٹا نظر آئی۔ آثار سے ظاہر تھا کہ زبردست بارش شروع ہونے والی ہے۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی چوکی نظر آرہی تھی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں ہمیں جنگل میں کئی جگہ ملی تھیں۔ یہ دو تین کمروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان کی دیواریں موٹی اور کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان چوکیوں کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ وزنی شہتیر اور بالے وغیرہ کی۔ شہر میں اتنی مہنگی چھتیں ڈالنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ جنگل تھا، یہاں لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو دیواریں بھی اسی قیمتی لکڑی کی بنا سکتے تھے۔ ان چوکیوں میں سے اکثر کی چھتیں گر چکی تھیں اور اندر خودرو گھاس اگی ہوئی تھی، تاہم دو چار چوکیاں سلامت بھی نظر آئی تھیں۔

انور خاں نے بتایا تھا کہ دس پندرہ سال پہلے تک بھانڈیل اسٹیٹ کی حد ان چوکیوں تک ہی تھی لیکن بعد میں اسٹیٹ کی حد بڑھالی گئی اور نئے بارڈر پر نئی چوکیاں بنالی گئیں۔ یہ پرانی چوکیاں بےکار ہو گئیں یا ان کو گودام وغیرہ کی شکل دے دی گئی۔

ہمیں کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک بوسیدہ چوکی نظر آرہی تھی۔ انور خاں رک گیا۔ اس نے ساتھیوں کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ابھی پڑاؤ کا وقت تو نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے۔ اگر ہمیں کھلے میں بارش نے گھیر لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ پانڈے اور اس کے ہرکاروں کے پاس تو چھولداریاں وغیرہ ہیں، ہم کیا کریں گے؟''

چوہان نے بھی افق پر پھیلتی ہوئی تاریکی کو دیکھا اور بولا۔ ''اس چوکی کو اندر سے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ رات گزارنے کے قابل ہے تو یہاں رک جاتے ہیں۔''

دیگر ساتھیوں نے بھی تائید کی۔ ہم نے چوکی کا اندر سے جائزہ لیا، چھتیں سلامت تھیں۔ جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا لیکن اسے معمولی کوشش سے صاف کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے رکنے کا

فیصلہ کرلیا۔

... ہمارا یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بارش شروع ہوگئی۔ سہ پہر چار بجے کا وقت تھا لیکن اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی اور بادل دہاڑنے لگے۔ ہمارے ساتھ اسٹیل... پانڈے اور ان کے ساتھیوں کو بھی رکنا پڑا تھا۔ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑی تیزی سے چھولداریاں اور خیمے وغیرہ لگائے تھے۔

جنگل کی بارش کا آہنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ گردوپیش ایک تاریک دھند لکے میں چھپ جاتے ہیں اور آواز سے لگتا ہے کہ کہیں ایک بہت بڑا آبشار گر رہا ہے۔ چوکی کی چھت کہیں کہیں سے ٹپک رہی تھی، وہاں برتن رکھ دیے گئے تاکہ زمین گیلی نہ ہو۔ کھڑکیاں مضبوطی سے بند کردی گئیں۔ خنکی ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔ چوکی کے اندر سے ہی کاٹھ کباڑ جمع کرکے آگ روشن کرلی گئی۔ جانوروں کو چھت مہیا نہیں کی جا سکتی تھی لہٰذا ان پر سے سامان اتار لیا گیا۔ پانڈے اور اس کے دو ڈھائی سو اہل کاروں نے چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

چوہان نے دونوں خچروں اور گھوڑے پر سے سامان اتروایا۔ اس کی آواز آئی۔ ''انور خاں! صرف دو لالٹینیں ہیں۔ باقی دو لگتا ہے کہ راستے میں کہیں گر گئی ہیں۔''

''چلو جو ہیں انہیں تو روشن کراؤ۔'' انور خاں نے کہا۔

''ان میں سے بھی ایک میں بس تھوڑا سا تیل ہے۔ ایک دو گھنٹے ہی جلے گی۔''

''ٹارچ وغیرہ سے کام چلالیں گے۔'' انور نے تسلی دی۔

ماریا تھک کر چور ہوگئی تھی... اور سونا چاہتی تھی۔ چوہان نے اس کے زخمی ہاتھ کی پٹی بدلی اور ایک چھوٹے کمرے میں اس کے لیے چٹائی بچھا دی۔ حسبِ معمول اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا گیا۔ مزید احتیاط کے طور پر کمرے کو بھی باہر سے مقفل کردیا گیا۔ چوکی میں داخل ہونے کا واحد راستہ سامنے کی طرف سے تھا۔ برآمدے میں چوکور ستونوں کی اوٹ میں دو رائفل برداروں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ستونوں کے اندر باقاعدہ سوراخ تھے جن میں رائفل کو ''پوزیشن'' کیا جا سکتا تھا اور اردگرد نگاہ بھی رکھی جا سکتی تھی۔ ایک مورچا انور نے اور دوسرا اسحاق نے سنبھال لیا۔ اپنے سفر کے اس آخری مرحلے میں ہم کسی طرح کی کوتاہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بارش مسلسل جاری تھی۔ چوکی کے سامنے ایک چھوٹی سی آبی گزرگاہ بن گئی تھی جس میں تیز رفتار پانی بہہ رہا تھا۔ میرے اندر کی کیفیت پھر عجیب ہورہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جیکی ہو، نیڈ بیگ ہو اور رات کا وہ آخری پہر ہو۔ میں جیکی کی ہدایت کے مطابق نیڈ بیگ پر ننگے ہاتھوں سے حملہ کروں اور اس وقت تک مُکے برساتا رہوں جب تک میرے ہاتھوں کی کھال چھل نہ جائے اور خون میری کہنیوں تک نہ پہنچنے لگے۔ پتا نہیں کیوں اب دھیرے دھیرے جسمانی چوٹیں مجھے تکلیف کے ساتھ ساتھ مزہ بھی دینے لگی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد تھکاوٹ نے اثر دکھایا اور جلد ہی سب سو گئے۔ صرف وہ جاگتے رہے جنہیں شروع رات میں ڈیوٹی دینی تھی۔ یعنی انور خاں اور اسحاق۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک لالٹین بجھ چکی تھی۔ صرف ایک لالٹین کی مدھم روشنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں نے کسی کو اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

پارسی ریان کی مدھم آواز آئی۔ ''میں ہوں۔ پیشاب کرنے جاوت ہوں۔''

میں نے پھر سر تکیے سے ٹکا دیا... اور سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے کی وجہ، پاؤں میں اٹھنے والی ٹیس تھی۔ شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا تھا۔ میں نے اٹھ کر پاؤں کو جھاڑا اور پھر لیٹ گیا۔ تب مجھے دوبارہ ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ''کون؟'' میں نے پھر استفسار کیا۔

یہ پارسی ریان ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گرم چادر لینے گیا تھا۔

بارش کے ساتھ اب تیز ہوا بھی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ پانی کی بوچھاڑیں کھڑکیوں کے چوبی تختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ موسم نے ایک دم کروٹ لے لی ہے اور ٹھنڈ شروع ہوگئی ہے۔ میں نے قریب لیٹے ڈاکٹر چوہان سے وقت پوچھا اور پھر سو گیا۔ ابھی ہماری ڈیوٹی شروع ہونے میں قریباً دو گھنٹے باقی تھے۔

پتا نہیں کہ اس بار میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکایک مجھے لگا کہ چھت ایک دھماکے سے مجھ پر آن گری ہے اور ہر طرف قیامت برپا ہوگئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چھت تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ میں نے چوہان، احمد، اور ہمیش کو چلّاتے ہوئے سنا۔ وہ بدحواسی میں برآمدے کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ ایک سیکنڈ کے لیے تاریک جنگل روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔

برستی بارش میں میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی، وہ ماریا تھی۔ وہ اندھا دھند چھولداریوں کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف شرٹ اور انڈرویئر تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں تیزی سے حرکت کررہی تھیں اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے یہ سارا منظر ایک سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھا۔

ایک سیکنڈ بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا مگر تب تک میں اپنی انگلی رائفل کے ٹریگر تک پہنچا چکا تھا۔ میں نے ماریا کے رخ پر یکے بعد دیگرے چار فائر کیے۔ ان میں سے کم ازکم ایک گولی ضرور ماریا کو لگی۔ چالیس پچاس فٹ کی دوری سے مجھے اس کے چلّانے کی آواز آئی۔ چوکی کے دروازے کی طرف بھی زبردست فائرنگ ہورہی تھی۔ سارا جنگل دھماکوں اور للکاروں سے گونج رہا تھا۔ احمد پکار رہا تھا۔ ''انور بھائی! میں چھت پر جارہا ہوں۔''

انور خاں نے اسحاق کو مخاطب کرکے بلند آواز میں کہا۔ ''اسحاق! کھڑکی کے پاس۔''

اسی دوران میں بجلی نے چمک کر پھر نشیب و فراز کو روشن کیا۔ مجھے ماریا کی فقط ایک جھلک نظر آئی۔ اسے کسی نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ تناور درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ میں نے رائفل کو کھڑکی میں رکھ کر پھر دو تین فائر کیے۔ ایک برسٹ سلاخ دار کھڑکی کے بالکل پاس دیوار سے ٹکرایا۔ چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ مجھے ایک دم نیچے جھکنا پڑا۔

صورتِ حال بڑی نازک ہوگئی تھی۔ وہ کام ہوگیا تھا جسے بدترین کہا جا سکتا تھا۔ ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کیسے نکلی تھی؟ کس وجہ سے نکلی تھی؟ یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا... فی الحال تو ہم مسلح افراد کے گھیرے میں تھے اور اگلے چند منٹ میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

میں جھک کر چلتا ہوا دوسری کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں انور خاں کی ہدایت کے مطابق اسحاق موجود تھا اور مسلسل فائر کررہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح مورچا بند ہوکر کسی لڑائی میں حصہ لے رہا تھا... ٹریگر پر انگلی کو حرکت دینا، رائفل کے جھٹکے کو برداشت کرنا، مخالف سمت سے آنے والی گولی کے خطرے کو محسوس کرنا... یہ سب کچھ میرے لیے نیا تھا۔

قریباً سات آٹھ منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ پھر ایک دم یہ سلسلہ ٹھہر گیا۔ غالباً ہمارے مخالفین کوئی حکمتِ عملی سوچ رہے تھے۔ وہ ہمیں مارنے یا زندہ پکڑنے کی بہترین پوزیشن میں تھے اور... غالباً... انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔

شاید وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کس طرح کم سے کم جانی نقصان کرا کے ہمیں بے بس کرسکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہمیں بس ایک معمولی سا فائدہ حاصل تھا اور وہ یہ کہ ہمارے مخالفین کھلی جگہ پر تھے جبکہ ہم اس چوکی میں مورچابند تھے لیکن یہ مورچابندی ایک طرح سے نقصان دہ بھی تھی۔ یہ عمارت ہمارے لیے چوہے دان بن سکتی تھی۔ اگر یہ دو ڈھائی سو افراد ہم تیرہ چودہ بندوں کو مارنے پر ہی تل جاتے تو پھر وہ اس چوکی کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے تھے۔

''یہ ہوا کیسے؟'' میں نے لرزتی آواز میں اسحاق سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ... اس حرامی کتے کی وجہ سے۔'' اسحاق نے کہا اور بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینکا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کھڑکی سے تیس چالیس فٹ کی دوری پر ایک لاش اوندھی پڑی نظر آئی۔ یقیناً یہ پارسی ریان کی لاش تھی۔ میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا۔

''یہ کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ اس حرامزادی کے ساتھ ہی بھاگ رہا تھا۔ انور بھائی نے اسے گولی ماری ہے۔''

''لیکن... لیکن وہ تو دوسری طرف بھاگی ہے...؟''

''ہاں، یہ اس طرف آیا تھا... وہ چھولداریوں کی طرف گئی تھی...''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا یار... وہ تو تالے میں تھی۔ اس کے پاؤں میں بھی زنجیر تھی...؟''

''تالے کھولنے والا یہ کتا بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھا۔'' اسحاق نے نفرت سے کہا اور ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر ریان کی لاش کی طرف پھینکی۔

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ جب یہ ساتوں قیدی جارج کی جیل سے رہا ہوکر سرنگ میں آئے تھے تو انور خاں نے ان سب کا تعارف کرایا تھا۔ پارسی ریان کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک ماہر قفل ساز ہے۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ سانحہ اس پارسی ریان کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات میں نے دو بار اس کی مشکوک نقل و حرکت بھی دیکھی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ریان نے ایسا کیا کیوں؟

میں نے یہی بات اسحاق سے پوچھی تو وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ ''ابھی ٹھیک سے تو پتا نا ہیں... لیکن لگت ہے کہ اس کو روٹی گوشت کی خماری چڑھی ہے۔''

"روٹی گوشت کی خماری؟"

"ہاں، تین سال سے کنجر جیل میں پڑا ہوا تھا۔ اب پیٹ بھر کر کھانا ملا... عورت دیکھی تو حرامی کے اندر کا جنگلی سور جاگ پڑا۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اب بات پوری طرح میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اگلے دو چار منٹ میں سب کچھ کھل گیا کہ کیا ہوا ہے۔

اسحاق کے کہنے پر میں اس چھوٹے کمرے کی طرف گیا جہاں ماریا کو حفاظت کی غرض سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، کمرے کے دروازے کا آہنی قفل کھلا ہوا تھا۔ اندر وہ زنجیر بھی کھلی پڑی تھی جو رات کے وقت ماریا کے پاؤں میں ڈالی جاتی تھی۔ زنجیر کے چھوٹے لاک کو بھی ایک آہنی تار کے ذریعے کھولا گیا تھا۔ چٹائی پر ماریا کی نیلی جینز پڑی تھی اور بالائی جسم کا زیر جامہ پڑا تھا۔ کمرے کا یہ نقشہ وہ ساری کہانی سنا رہا تھا جو یہاں گہری تاریکی میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اسی دوران میں انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے موقع کا جائزہ لیا اور یقیناً اسے بھی وہ سب کچھ سمجھ میں آگیا جو مجھے آیا تھا۔ اس نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ریان کو غائبانہ صلواتیں سنائیں۔ میں نے انور خاں کو بتایا کہ رات پہلے پہر کس طرح ریان پیشاب کرنے اور چادر لینے کے بہانے حرکت کرتا نظر آیا تھا۔

انور خاں بولا۔ "خبیث نے سب کچھ پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل شام جو دو لالٹینیں گم ہوئی تھیں، وہ بھی اسی نے تہیں گرائی ہوں گی... یا آس پاس کہیں چھپا دی ہوں گی۔"

یقیناً یہاں جو کچھ ہوا تھا، ماریا اور ریان کی باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے ہوا تھا۔ انور خاں نے پرسوں جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کہا تھا... ان گوری چمڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے...

تو کیا یہاں بھی اسی انتہا درجے کی "بے شرمی" نے کام دکھایا تھا؟ آزادی حاصل کرنے کے لیے ماریا نے اپنا آپ اس شخص کے حوالے کر دیا تھا جس کے ساتھ چھو جانا بھی اسے کل تک گوارا نہیں تھا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔ پارسی ریان نے یہاں سے نکلنے میں ماریا فرگوسن کی مدد کی تھی، تاہم اس مدد کی بھرپور قیمت بھی وصول کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اس وقت تک ماریا کے پاؤں ہی نہ کھولے ہوں جب تک اپنا مطلب پورا نہ کرلیا ہو۔ وہ ماسٹر قفل ساز و قفل شکن تھا اور اس نے جو دو "آخری قفل" کھولے تھے، انہوں نے اس پر مسرت کا در وا کیا تھا اور موت کا بھی۔

انور خاں کے ایک کان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی پوری سائڈ نیلی ہو رہی تھی۔ "یہ کیا ہوا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جس وقت ماریا یہاں سے بھاگی، اس کے ہاتھ میں پختہ اینٹ تھی۔ اسحاق سو گیا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا لیکن میری ساری توجہ بھی باہر کی طرف تھی۔ یہ گمان ہی نہیں تھا کہ اندر سے بھی کوئی خطرہ ہوسکتا ہے۔" انور نے کان کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے اور پھر ایک برسٹ چلا۔ قریبی سیڑھیوں سے کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور عین انور خاں کے قدموں میں گرا۔ یہ احمد تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے چھت پر پوزیشن سنبھالی تھی۔ اس کا کندھا خون سے سرخ نظر آرہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پانچ دن پہلے دوطرفہ فائرنگ میں لے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔

میں نے احمد کو سنبھالا، انور خاں دوڑتا ہوا اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ گیا اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ایک بار پھر اندھادھند گولیاں چلنے لگیں۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونج رہے تھے، ہر طرف شعلوں کا رقص تھا۔ میں، چوہان اور اسحاق بھی پوری توانائی سے اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف فریق کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری ایک گولی کے جواب میں درجنوں گولیاں آرہی تھیں۔

انور خاں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔"

"لیکن انہوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔" چوہان کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔

"گھیرا توڑ کر نکلنا ہوگا۔ ورنہ کچھ نہیں ہوسکے گا۔" انور خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"ہاں، تخت یا تختہ... اگر کچھ نا ہیں کریں گے تو بے موت مارے جاویں گے۔" اسحاق نے اپنی رائفل سے ایک طویل برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیان سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اسحاق کے قدموں میں ایک بندے کی لاش پڑی تھی۔ یہ ان ساتوں

افراد میں سے ایک تھا جو جیل سے رہا ہوئے تھے۔ یقیناً اسے دوطرفہ فائرنگ میں گولی لگی تھی۔ یہ واقعی نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماریا کو اپنے ہاتھ سے کھونے کے بعد ہم ایک دم موت کے منہ میں آگئے تھے۔ یہاں رہتے تو موت تھی، باہر نکلتے تو بھی موت تھی۔ بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔

تو کیا آخری وقت آگیا ہے؟ میں نے بے حد درد سے سوچا۔ اس بارشی رات، میں اس گھنے جنگل کے کسی نامعلوم حصے میں... ان تابڑتوڑ برستی گولیوں کے درمیان میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ کیا کبھی میرے پیاروں کو معلوم ہو سکے گا کہ میں کہاں اور کس حالت میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا؟ کیا کبھی کوئی میرے آخری لمحوں کے بارے میں جان سکے گا؟ چند لمحوں کے لیے... صرف چند لمحوں کے لیے میرے اندر مایوسی اور ناتوانی ابھری لیکن پھر فوراً ہی عمران کا تصور اندھیرے سے برآمد ہوا اور مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی شبیہ ان لمحوں میں بالکل واضح اور روشن تھی۔ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی دلکش ہڈیاں، اس کی ٹھوڑی کا گڑھا، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مخمور لہجے میں بولا۔ "آنکھیں بند کر کے کود جاؤ جگر... زیادہ سے زیادہ موت ہی ملے گی نا۔ اور موت تو ہماری محبوبہ ہے۔ وہ ہمارے آگے آگے بھاگتی ہے۔ ہم نے اس کے پیچھے بھاگنا سیکھ لیا ہے..."

میرے رگ و پے میں نئی توانائی سی بھر گئی۔ میں نے وہ سارے لمحے یاد کیے جن میں، میں نے دل کی گہرائی سے خودکشی کا سوچا تھا... یہاں جو کچھ بھی ہونے والا تھا، خودکشی سے تو بہتر ہی تھا۔

انور خاں اپنے ساتھیوں کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف آمیز دلیری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جارہا ہے، اس میں زندگی کے امکانات بہت کم ہیں... لیکن اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسحاق نے ایک جھٹکے سے دستی بموں والا وہ تھیلا کھول دیا جو اب تک ہمارے سامان کا حصہ رہا تھا۔ انور خاں نے دو دستی بم اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیے، ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دیگر ساتھیوں نے بھی ایک ایک، دو دو بم لے لیے۔ یہ عام دستی بموں کی طرح گول بم نہیں تھے، ان کی شکل لمبوتری تھی۔ یہ پرانی طرز کے لیکن بڑے طاقتور بم تھے۔ ان کی شکل "آئس کریم کون" سے ملتی جلتی تھی۔ انور خاں نے بتایا تھا کہ انہیں "سٹک بم" کہا جاتا ہے... چند روز پہلے انور خاں مجھے یہ بم استعمال کرنے کا طریقہ تفصیل سے بتا چکا تھا۔ لیکن اس حوالے سے میری عملی مشق صفر تھی۔ بہرطور ایک دستی بم میں نے بھی لے لیا۔

انور خاں نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے تم سب کے سامنے ہے۔ ہم بری طرح گھر چکے ہیں، جتنی دیر کریں گے اتنا ہی مزید پھنستے جائیں گے۔ ہم خود کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہیں۔ ہم چوکی کے عقبی دروازے کو ایک دم کھول کر نکلیں گے۔ میں سب سے آگے رہوں گا۔ ہم پوری رفتار سے دوڑیں گے اور گھنے درختوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں۔"

اسحاق بولا۔ "ہوسکتا ہے کہ ہم ایک دوجے سے بچھڑ جاویں۔ کوئی ایسی جگہ ٹھہرالو، جہاں ہم اکٹھے ہوسکیں۔"

"میرے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں۔" انور نے فوراً جواب دیا۔ "جو ساتھیوں سے علیحدہ ہو جائے، وہ اپنے طور پر جان بچانے کی کوشش کرے..."

ابھی انور خاں کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور فرش پر رکھے ہوئے کھانے پینے کے برتن بھنے ہوئے چنوں کی طرح اچھل اچھل کر چاروں طرف بکھر گئے... ہمارا گھوڑا اندھادھند بھاگتا ہوا برآمدے میں گھسا۔ پورے زور سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ اسے گولی لگ چکی تھی۔

"لگت ہے کہ وہ لوگن قریب آرہے ہیں۔" ہمیش نے کہا۔

انور خاں نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر اسنائپر گن سے دو فائر کیے اور بولا۔ "اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

ہم سب جھک کر دوڑتے ہوئے چوکی کے عقبی حصے میں پہنچے۔ یہاں ایک چھپر سا تھا جسے گولیوں کی بوچھاڑ سے آگ لگ گئی تھی۔ بارش کے سبب یہ آگ زیادہ پھیل نہیں پائی تھی۔ ہم عقبی دروازے کے ساتھ لگ گئے۔ انور خاں سب سے آگے تھا۔ موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کا سینہ تنا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں اسحاق تھا۔ پھر چوہان، پھر زخمی احمد پھر میں اور آخر میں ہمیش۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے فقط چار ہمارے ساتھ آسکے تھے۔ وہ چاروں ہماری قطار کے دائیں جانب تھے۔ یہ سائڈ قدرے محفوظ تھی۔ عبدالرحیم بھی ان چاروں میں شامل تھا۔

"بس دوڑنا ہے۔ رکنے کا مطلب موت کے سوا اور

کچھ نہیں۔'' انور نے آخری ہدایت دی اور دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ خصوصاً سامنے والے حصے کی طرف فائرنگ کا زیادہ زور تھا۔ ہم نے الوداعی نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ انور خاں نے اپنے ہاتھ والے دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر نکالی اور ٹانگ مار کر دروازہ کھول دیا۔

''بھاگو۔'' انور خاں کی آخری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ہم اندھا دھند نکلے۔ بارش کی بوچھاڑیں اور درختوں کی شاخیں ہمارے چہروں سے ٹکرائیں۔ ہم نے اپنی رائفلوں کے منہ کھول دیے اور جھک کر بھاگتے چلے گئے۔ سب سے پہلے انور خاں کے پھینکے ہوئے دستی بم کا دھماکا ہی سنائی دیا تھا۔ چکا چوند پیدا کرنے والے اس زوردار دھماکے نے ہر طرف سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ پھر کئی اور دھماکے ہوئے۔ ہم ان دھماکوں کا نتیجہ دیکھنے کے لیے رکے نہیں، بس شاخوں سے ٹکراتے دوڑتے چلے گئے۔ احمد میرے آگے دوڑ رہا تھا۔ بائیں جانب سے ایک برسٹ آیا... جو اسے چھلنی کر گیا۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا اور ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے مڑ کر دیکھا بھی جا سکتا۔ اس برستی موت کا دوسرا شکار ہمیش تھا۔ وہ میرے عین پیچھے تھا۔ مجھے تو یہی لگا کہ اس نے میری طرف آنے والی موت اپنے جسم پر روکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب گولی جسم سے ٹکراتی ہے اور گوشت میں گھستی ہے تو اس سے ایک خاص آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس رات پہلی بار میں نے اپنے عین عقب میں یہ آواز سنی۔ یہ ہمیش کے جسم سے پگھلا ہوا سیسہ ٹکرانے کی آواز تھی۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ اوندھے منہ گرا۔ غالباً گرنے سے پہلے وہ اپنے دستی بم کی سیفٹی پن ہٹا چکا تھا۔ اس کے گرنے کے تین چار سیکنڈ بعد ہی عین اس جگہ پر سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے سے پیدا ہونے والا ایئر پریشر مجھے اپنے پورے جسم پر محسوس ہوا تھا۔ میری خوش بختی کہ بم کا کوئی ٹکڑا مجھے نہیں لگا اور میں بالکل محفوظ رہا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔ ایک جگہ میں اوندھے منہ گرا۔ ایک جگہ بری طرح ایک درخت سے ٹکرایا... لیکن رکا نہیں، بھاگتا چلا گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ٹریل ٹو رائفل پر جما رکھے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے رائفل سے دوسرا میگزین اٹیچ کر لیا اور اطراف میں فائر کرتا رہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس دستی بم بھی تھا لیکن بھاگ دوڑ میں وہ دستی بم کہیں گر گیا تھا۔ کہاں گرا تھا، یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔

بھاگتے ہوئے مجھے اپنے سامنے صرف چوہان نظر آ رہا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ چوہان اور انور خاں کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔

فائرنگ کا زور اب ہماری بائیں جانب قریباً دو سو میٹر کی دوری پر تھا... مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم موت کی زد سے اگر نکلے نہیں... تو کم از کم دور ضرور چلے گئے ہیں۔

''گھاٹی کے ساتھ ساتھ بھاگو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس علاقے کے چپّے چپّے سے واقف ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس کی یہ واقفیت ہمیں ایک یقینی موت کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔

''تم ٹھیک ہو تابش!'' چوہان نے بھاگتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے بھی ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

'''اور ہمیش؟''

میں چپ رہا۔ چوہان سمجھ گیا کہ میرا جواب کیا ہے۔

پھر مجھے عبدالرحیم اور اس کا ایک ساتھی نظر آیا۔ وہ دونوں دائیں طرف تھے اور ہمارے متوازی ہی بھاگ رہے تھے۔

ہم قریباً بیس منٹ تک انور خاں کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ہماری ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں لیکن زندہ رہنے کی فطری خواہش ہمیں بھگائے چلی جا رہی تھی۔ یہ گھنا جنگل تھا، تاریکی تھی اور ہلکی بارش بھی... اس لیے ہماری یہ میراتھن دوڑ عجیب طرح کی تھی۔ درختوں سے ٹکراتا، پھسل کر گرتا اور گر کر اٹھنا... یہ سب کچھ ہماری دوڑ میں شامل تھا۔ ایک بڑی ٹارچ ہمارے پاس موجود تھی لیکن ہم اسے روشن نہیں کر سکتے تھے۔ قریباً بیس منٹ بعد ہم نے ایک آبی گزرگاہ کو پار کیا۔ پانی ہمارے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ ہم نے اپنی گولیوں والی بیلٹس گردنوں سے لپیٹ لیں اور رائفلیں سروں سے بلند کر لیں۔ آبی گزرگاہ کو پار کرتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ اسحاق بھی زخمی حالت میں ہمارے ساتھ ہے۔ چوکی سے نکلتے وقت ہم کل دس افراد تھے... لیکن اب صرف چھ نظر آ رہے تھے۔ چار مزید ساتھی گھیرا توڑنے کی کوشش میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ان میں سے احمد... ہمیش اور عبدالرحیم کے ایک ساتھی کی موت تو یقینی تھی۔ عبدالرحیم کا ایک ساتھی بُری طرح گھائل ہو کر گرا تھا

اور شاید اسی حالت میں پکڑا گیا تھا۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک کی لاش تو ہم نے خود چوکی میں دیکھی تھی، دوسرے کے بارے میں بھی غالب امکان یہی تھا کہ وہ چوکی میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوا۔

آبی گزرگاہ کو پار کرنے کے بعد ہم نے قدرے ''ریلیف'' محسوس کیا۔ ہم اس قدر ہانپ گئے تھے کہ چند منٹ کے لیے ستانا ضروری ہو گیا تھا۔ ہم ایک جگہ، گیلی زمین پر درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ''ہمیش کا کیا بنا؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''اسے گولی لگ گئی تھی۔'' میں نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔

عبدالرحیم روتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگن نے ہمارے ساتھ کیا کیا... اور ہم لوگن نے آپ کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ اس بدبخت ریان کی وجہ سے ہوا۔ کاش! ہم اسے اپنے ہاتھ سے مار دیتے۔''

انور اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ ''جو ہو چکا اس کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب اپنا سارا دھیان یہاں سے نکلنے کی طرف لگاؤ۔ ہم خطرے سے باہر نہیں۔ وہ لوگ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔''

ہم ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور گرتے پڑتے آگے بڑھنے لگے۔ اپنے بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا غم تازہ تازہ تھا اور دل میں ٹیسیں ابھار رہا تھا۔ جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ صرف بیس تیس منٹ پہلے ہمارے ساتھ چوکی سے نکلنے والے لوگ اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ کل رات تک ہم چوکی میں ماریا کے علاوہ کُل تیرہ افراد تھے... اب صرف چھ بچے تھے۔

ہم صبح سات آٹھ بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ آخر تھک کر چور ہو گئے۔ یوں لگا کہ اب چند قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں ہے۔ خاص طور سے زخمی چوہان سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی رائفل انور خاں نے اور گولیوں والا تھیلا میں نے اٹھا رکھا تھا۔ نہایت گھنے اور لمبے سرکنڈوں کے درمیان یہ عارضی طور پر چھپنے کے لیے ایک مناسب جگہ تھی۔ حشرات الارض بشمول سانپوں وغیرہ کا ڈر تو تھا مگر جو حالات ہمارا تعاقب کر رہے تھے، وہ ان سے زیادہ خطرناک تھے۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ ایک طرف ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ جوں جوں دھوپ تیز ہوتی گئی، اس جوہڑ سے اٹھنے والی بُو باس بڑھتی گئی۔ جونکیں... کیچوے... کیڑے مکوڑے بہت کچھ پودوں میں رینگ رہا تھا اور ہمارے جسموں پر بھی۔ دوپہر تک ہمیں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے اردگرد دور تک کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسحاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''یوں لگت ہے کہ وہ لوگن پانی کی دوجی طرف رہ گئے ہیں... ناہیں تو اب تلک کوئی ہلچل ضرور نظر آتی۔''

چوہان بولا۔ ''شاید انور بھائی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔''

''پھر بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا... اگلے ایک دو گھنٹے میں ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا۔'' انور خاں نے کہا۔

وقت گزرتا رہا اور شام تک ہم خود کو کافی مطمئن محسوس کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی یہ اطمینان ایک بار پھر تشویش میں ڈھل گیا۔ ہمیں کچھ فاصلے سے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس فائر سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ ہمارے آس پاس کوئی موجود ہے۔ ''وہ لوگن اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے ناہیں۔'' اسحاق نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اپنی رائفل کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چوہان نے بھی اپنی رائفل انور خاں سے لے لی اور ٹیلی اسکوپ گلے میں لٹکا لی۔ چند گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے تاریکی میں بدل گئے اور سرکنڈوں میں لاتعداد جھینگروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مجھے دیر سے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے بعد میں جوہڑ کے کنارے کی طرف گیا۔ اچانک مدھم آوازوں نے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ اسحاق کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ڈاکٹر چوہان تھا۔ اسحاق کہہ رہا تھا۔ ''... یہ بات ناہیں کہ اس کے ساتھ ہمدردی ناہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھی ہے... لیکن اس کا ساتھ ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرے گا... اور بہت بڑی مصیبت کھڑی کرے گا...'' آخری الفاظ کہتے کہتے اسحاق کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

''آہستہ بولو۔'' چوہان نے اسے تنبیہ کی۔

اسحاق نے اپنی آواز تھوڑی سی مدھم کر لی لیکن لہجہ ویسا ہی تشویشناک رہا۔ ''چوہان بھائی! میں تم سے اس بحث میں ناہیں پڑتا کہ تابش پر کوئی جادو ٹونے کا معاملہ ہے یا اس کے

شریر (جسم) میں کوئی پُرزہ وغیرہ لگایا گیا ہے... لیکن جو کچھ بھی ہے، ہمارے لیے ہے خطرناک۔ یہ جہاں بھی جائے گا، وہ لوگ ان اس کا پیچھا کریں گے... اور اس کے ساتھ... ہم بھی...'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو کیا تم وشواس سے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں ہوگا تو ہم بچ جائیں گے؟'' چوہان کی سرگوشی ابھری۔

''چلو نا ہیں بچیں گے... لیکن کچھ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع تو ملے گا نا۔''

میں بغیر آواز پیدا کیے آگے بڑھ گیا اور جوہڑ کی طرف چلا گیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

بے شک اسحاق جذباتی اور شعلہ مزاج تھا... لیکن جو بات وہ کئی دن سے مسلسل کہہ رہا تھا، وہ ٹھیک تھی... اور یقیناً یہ بات اسحاق کے علاوہ اور کئی ساتھیوں کے دل میں موجود ہوگی۔ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں تھا۔ ایک نادیدہ بندش نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بندش کسی جادو ٹونے کی شکل میں ہے لیکن اب یہ حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ اسٹیٹ کے کچھ اہم قیدیوں کی طرح میرے جسم میں بھی کوئی ایسی چیز رکھی گئی ہے جو میری WHERE ABOUTS کے بارے میں میرے دشمنوں کو آگاہ رکھتی ہے۔

اسحاق کی یہ بات بالکل درست تھی کہ یہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے کے معاملے میں، میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میری موجودگی میرے ساتھیوں کے لیے ہر راستہ بند کر سکتی تھی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اب میرے دل سے اس بات کی گواہی آنا شروع ہو گئی تھی کہ شاید میں اس منحوس جنگل کے حصار سے کبھی نکل نہیں سکوں گا... اور اگر... مجھے یہیں پر مرنا تھا تو پھر میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کے لیے خطرہ کیوں بنوں؟

کیوں نا میں اپنا اخلاقی فرض ادا کروں۔ اپنے ساتھیوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر خاموشی سے اکیلا ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اکیلا مرا جائے یا باجماعت...!

میں مردار کی بو والے کائی زدہ جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ میری رائفل، ایک چھوٹی ٹارچ، گولیوں والا بیگ اور ایک شکاری چاقو میرے پاس موجود تھے۔ اس کے علاوہ اور کیا چیز مجھے درکار تھی... اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں۔

میں نے چند لمحے تک سوچا، پھر وہیں سے گہری تاریکی میں آگے بڑھ گیا۔

مجھے کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ بس ایک یہی سوچ تھی کہ میں یہاں سے آگے بڑھ جاؤں۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کر لوں۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت ملی تو اسے گلے سے لگا لوں گا... زندگی ملی تو اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ عمران نے یہی تو سکھایا تھا مجھے۔

میں گہری تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور قریباً ایک گھنٹے میں دو تین کلومیٹر آگے نکل گیا۔ قدرتی طور پر میرا رخ اس آواز کی مخالف سمت میں تھا جو کچھ دیر پہلے ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ میرا مطلب فائر کی آواز سے ہے۔

چلتے چلتے میں سوچ رہا تھا کہ میری اچانک گمشدگی کے حوالے سے میرے ساتھیوں کا ردِعمل کیا رہا ہوگا؟ انہوں نے مجھے ارد گرد تلاش کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ محتاط انداز میں آوازیں بھی دی ہوں۔ وہ ٹارچیں روشن کرنے کا رسک تو نہیں لے سکتے تھے، تاریکی میں ہی مجھے اور میرے قدموں کے نشان ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے ذہن میں یہ شدید خدشہ پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں میں کسی جنگلی جانور کا نشانہ تو نہیں بن گیا... یا پھر ایسا تو نہیں کہ حکم کے اہلکار گھات لگا کر جوہڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں آگے بڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ گھنی جھاڑیوں میں کسی جنگلی جانور کی موجودگی کا متحرک احساس بھی ہوا لیکن ایسا کوئی خطرہ عملی طور پر میرے سامنے نہیں آیا۔ میں چل رہا تھا لیکن حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اسٹیٹ کی بیرونی حد کی طرف بڑھ رہا ہوں یا پھر بیرونی حد کے متوازی ہی چلتا جا رہا ہوں۔

رات کا آخری پہر تھا جب میں بے حد تھک گیا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن خطرات سے بھرے ہوئے اس سیاہ جنگل میں آرام کیسے کرتا؟ سب سے پہلے یہی بات ذہن میں آئی کہ اگر میں کچھ دیر رکنا چاہتا ہوں تو مجھے زمین کے بجائے کسی درخت پر ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے جب میں سلطانہ والی چوٹ کھا کر جارج کی رہائش گاہ سے بھاگا تھا تو دو روز جنگل میں بھٹکتا رہا تھا۔ تب بھی میں نے ایک شب ایک بلند درخت پر کاٹی تھی۔ آج کی شب میں نے پھر یہی کلیہ آزمایا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک ایسا درخت منتخب کر لیا جس پر چڑھا جا سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش اور چند تازہ خراشوں کے بعد میں درخت کے ایک مضبوط

دوشاخے پر نشست جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اردگرد کی شاخوں کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ شکاری جانور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں جن میں خطرناک جنگلی بلے، تیندوے اور چیتے وغیرہ شامل ہیں۔

ان خطرات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ قرب و جوار روشن ہو چکے تھے۔ سبزے پر سے شبنم آہستہ آہستہ اوجھل ہو رہی تھی۔ میری انتڑیوں میں بھوک کی وجہ سے کہرام مچا ہوا تھا لیکن اس کہرام کے مداوے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایک قریبی درخت پر خوبانی کے سائز کا ایک سبزی مائل پھل نظر آرہا تھا مگر مجھے انور خاں کی بتائی ہوئی باتیں یاد تھیں۔ اس نے کہا تھا... جنگل سے خوراک صرف وہی بندہ حاصل کرسکتا ہے جو "جنگل شناس" ہو۔ دوسری صورت میں بندہ بھوک مٹانے کی کوشش میں خود بھی مٹ سکتا ہے۔ بہت سے پھل اور بیج وغیرہ زہریلے ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شکل یا ذائقے وغیرہ سے ان کے زہریلے ہونے کا بالکل پتا نہیں چلتا۔

میں درخت سے اترا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی بیس تیس قدم ہی چلا تھا کہ بُری طرح چونک گیا۔ میں تیندوے کے پاؤں کے نشانات اب بڑی اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ اب پھر مجھے وہی نشان نظر آئے۔ گیلی زمین پر یہ بالکل واضح تھے۔ ان نشانات کو بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ پرانے نہیں۔ غالباً رات کے وقت تیندوا میرے آس پاس موجود تھا۔ ٹرپل ٹو رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ میں مزید احتیاط سے چلنے لگا۔ میں اردگرد کے درختوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خطرناک جانور "آسان درختوں" پر چڑھ سکتا ہے اور پھر درخت کے اوپر سے ہی بے آواز، اپنے شکار پر چھلانگ لگا دیتا ہے... اچانک مجھے اپنی رگوں میں لہو رکتا ہوا محسوس ہوا... وہ میرے سامنے تھا۔ فقط پندرہ بیس فٹ کی دوری پر۔ زردی مائل جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ جھاڑیوں کا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں غفلت میں آٹھ دس قدم مزید اٹھا لیتا تو سیدھا اس کی زد میں آجاتا۔ اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ شاخوں کی اوٹ میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی دُم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دراز قد جوان جانور تھا۔ اس کے جسم پر چیتے کی طرح داغ تھے۔ اس کا وزن اس کے پچھلے پاؤں پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ اگر میں نے دو قدم بھی اور بڑھائے تو وہ مجھ پر جست لگا سکتا ہے۔

میں پتھر کی طرح ساکت کھڑا ہوگیا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے سے پیوست تھا اور میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسا نہیں تھا لیکن میرے گولی نہ چلانے کی وجہ، اپنے نشانے پر "میرا عدم اعتماد" ہی نہیں تھا... اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ گولی کی آواز میری نشان دہی کرسکتی تھی اور اگر دشمن آس پاس موجود تھا تو اس کے لیے بہت آسانی فراہم ہوسکتی تھی۔

قریباً نصف منٹ تک میں اور درندہ آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ ایک دوسرے کے عمل اور ردِعمل کو دیکھتے ہوئے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ میں اس جانور کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں کسی درندے کو اس طرح کھلی جگہ پر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس فٹ کے بے رکاوٹ فاصلے کے سوا اور کچھ نہیں تھا... یہ ایک ناقابلِ بیان احساس تھا۔

وہ تیس چالیس سیکنڈ تیس چالیس گھنٹوں کی طرح لگے۔ پھر اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ موڑا۔ مجھے اور میری "ٹرپل ٹو" کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے وہ بے پروائی سے چلتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ جیسے میرا اور اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو... کوئی واسطہ کوئی بھی اچھا یا بُرا ناتا۔ اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہے... درست ہی کہتے ہیں۔ درندے اس وقت تک نقصان نہیں پہنچاتے جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا پھر جب تک ان کی زندگی میں جارحانہ مداخلت نہ کی جائے... لیکن حضرتِ انسان جب شر پر اترتا ہے تو کل وقتی اور سرتاپا مہلک ہو جاتا ہے۔ اپنی ہلاکت آفرینی کو عملی شکل دینے کے لیے وہ ہزار ہا بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔

میں کچھ دیر وہیں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے تیندوے سے اپنی روبرو ملاقات کا اثر اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتا رہا... تب ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ تیندوے کے پاؤں کے نشانات بدستور میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر اب یہ کچھ مدھم محسوس ہو رہے تھے۔ کئی جگہ یہ نشان چھوٹے بڑے دیگر جانوروں کے نقوشِ پا میں گڈمڈ ہو جاتے تھے... ایک جگہ میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا اور پھر مجھے پاؤں کے بل بیٹھنا پڑا۔ بیٹھتے بیٹھتے ہی میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی اور رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ مجھے کچی زمین پر انسانی پاؤں کے نشان دکھائی دیے تھے۔ یہ ننگا پاؤں تھا اور کئی جگہ اس کا نقش بہت واضح تھا۔ یہ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے لیے حد درجہ حیران ہونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ یہ صرف ایک پاؤں کا نشان تھا۔ دوسرا پاؤں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آتا تھا۔ جگہ جگہ نظر آنے والا یہ چھوٹا سا سوراخ کسی بیساکھی نما لکڑی کا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس جگہ اس قسم کی زمینی شہادت دیکھوں گا۔ میری نگاہوں میں بارونڈا جیکی کا دق زدہ چہرہ گھوم گیا۔ میں نے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہاں سے گزرا تھا... یقیناً گزرا تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔

میں تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تیندوے اور دیگر جانوروں سے وابستہ خیالات ایک دم میرے ذہن سے محو ہوگئے تھے۔ میں ان نشانات کو ٹریس کرتا ہوا بے تابی سے آگے بڑھتا رہا۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد مجھے گھنے درختوں میں چھپی ہوئی ایک چار دیواری کے آثار نظر آگئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھنڈر تھا۔ اس پر نباتات اور خودرو بیلوں کی یورش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ گھاس پات کا ہی حصہ ہے۔ یہ دراصل ویسی ہی بے آباد چوکیوں میں سے ایک تھی جو اس ویرانے میں کہیں کہیں دکھائی پڑتی تھیں لیکن یہ چوکی تقریباً مسمار ہو چکی تھی۔ بس ایک کمرا اور برآمدے کا ایک حصہ موجود تھے۔ تاہم ان کی چوبی چھتیں بھی گری ہوئی تھیں۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ بارونڈا جیکی اس کھنڈر میں ہی موجود ہے۔ یہ دوسرا سوال تھا کہ وہ زندہ حالت میں ہے یا مردہ... اور اکیلا ہے یا اس کے ساتھ بھی کوئی موجود ہے؟ میں پاؤں اور بیساکھی کے نشان دیکھتا ہوا احتیاط سے آگے بڑھا۔ نشان کھنڈر کی تاریکی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں کچھ دیر تک ایک دیوار کے ساتھ لگ کر سن گن لیتا رہا پھر میں نے محتاط انداز میں آواز دی۔ "جیکی... جیکی!"

جواب ندارد... میں نے دو مرتبہ مزید پکارا پھر ٹارچ روشن کر کے اندر چلا گیا۔ کمرے کی چھت نے گر کر جھونپڑی کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس جھونپڑی میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ اس جھونپڑی کے سامنے ہی ایک چھوٹے چیتل کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ غالباً چند گھنٹے پہلے یہ چیتل کسی تیندوے یا بھیڑیے وغیرہ کا شکار ہوا ہوگا۔ اس کے جسم پر بہت کم گوشت باقی بچا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے ٹارچ کی روشنی کو حرکت دی۔ بارونڈا جیکی مجھے سامنے ہی بے حرکت پڑا نظر آگیا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن پھر میری نگاہ اس کے سینے کے مدھم زیر و بم پر پڑی۔ وہ زندہ تھا۔ تب مجھے ایک شے نظر آئی۔ یہ شراب کی بوتلیں تھیں۔ مٹی میں لتھڑی ہوئی۔ یہ پانچ عدد بوتلیں جیکی کے قریب ہی پڑی تھیں۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب لگتی تھی۔ ان بوتلوں میں سے دو خالی ہو چکی تھیں۔ ایک میں سے تھوڑی سی پی گئی تھی، باقی دو بھری ہوئی تھیں۔ بوتلوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصہ مٹی میں دبی رہی ہیں۔ انہیں جیکی نے کھود کر نکالا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف کچی زمین میں ایک دو ڈھائی فٹ گہرا گڑھا موجود تھا۔ جیکی نشے کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے اکلوتے ہاتھ پر خون جم کر سوکھ گیا تھا تاہم مجھے لگا کہ یہ جیکی کا اپنا خون نہیں ہے۔ اس کے اپنے جسم میں خون تھا ہی کہاں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت چیز رگوں میں حرکت کرتی بھی ہوگی تو وہ شراب ہی ہوگی... یہ شاید چیتل ہی کا خون تھا۔

میں نے کچھ دیر تک اردگرد کا جائزہ لیا پھر جھنجوڑ جھنجوڑ کر جیکی کو جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور مجھے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ تب شاید اس نے مجھے پہچان لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے کسمسا کر انگڑائی لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں پھر بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولا۔ "میں سمجھا تھا کہ میں جب مر کر اٹھوں گا تو خود کو جنت میں پاؤں گا لیکن... تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ دوزخ ہی ہے... اور سناؤ.. تمہارے ساتھ اور کون کون ہے یہاں؟"

"خوش قسمتی سے آپ مرے نہیں، ابھی زندہ ہو۔"

اس نے پھر ایک مخمور انگڑائی لی۔ "تم اسے خوش قسمتی کہتے ہو۔ تم سے بڑا بھانڈ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ کچی کلیجی کھانے سے میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہے ورنہ میں تمہاری اس بات پر خوب ہنستا.. بلکہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا۔"

"کچی کلیجی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو اور کیا۔ یہاں میری نانی بیٹھی ہے جو پکا کر کھلاتی۔ بھوک کی وجہ سے میری آنتیں بریک ڈانس کر رہی

تھیں... اس لیے، چبا چبا کر ویسے ہی کھالی۔‘‘
’’کس کی کلیجی تھی؟‘‘
’’حکم جی کی۔‘‘ وہ مسکرایا۔ ’’وہ دیکھو، وہ سامنے پڑا ہے۔‘‘ جیکی نے کٹے پھٹے چیتل کی طرف اشارہ کیا۔
اب میری سمجھ میں آیا کہ جیکی کے ہاتھ پر خشک خون کیوں لگا تھا۔ وہ چیتل کے سینے میں سے کلیجی نکال لایا تھا اور اسے شراب کے آتشیں گھونٹوں کے ساتھ گلے سے نیچے اتارا تھا۔ سچ ہے کہ بھوک انسان سے سب کچھ کراتی ہے...
’’اس چیتل کو مارا کس نے؟‘‘
’’چیتل نہیں یار... حکم جی... اور حکم جی کو عوام کے سوا اور کون مارے گا؟ یہ عوام ہی ہیں جو بھوک سے بے بس ہو کر تیندوے کا روپ دھار لیتے ہیں اور حکم جی جیسے زور آور لوگ ان کے لیے چیتل اور ہرن بن جاتے ہیں۔ کل رات یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک عوام نے ایک حکم جی پر حملہ کیا۔ بڑی محبت سے اس پر جھپٹا مارا اور بڑی عقیدت سے اس کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ حکم جی ڈری ڈری آوازیں نکالتا رہا، اس کی دُم پھڑکتی رہی اور وہ عوام کے پنجے سے نکلنے کے لیے زور لگاتا رہا۔ لیکن عوام کی جپھی میں اتنی گرم جوشی تھی کہ وہ نکل نہیں سکا۔ ہاں دوست! ہر حکم جی ایک دن چیتل ضرور بنتا ہے... اور ہر مظلوم ایک دن تیندوے کا روپ ضرور دھارتا ہے۔‘‘
میں نے گہری سانس لے کر ٹارچ بجھا دی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ رات کسی وقت تیندوے نے چیتل مارا تھا اور اس کھنڈر کے سامنے بیٹھ کر اس کا گوشت کھایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھوکا جیکی گھسٹتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور اس نے بھی اس شکار میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے کچھ کلیجی نکالی تھی اور اس کا نرم گوشت چبایا تھا۔ یقیناً یہ وہی تیندوا تھا جو اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا اس سے سامنا بھی ہوا تھا۔ وہ تازہ شکار کی وجہ سے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ تھا لہٰذا اس نے مجھ سے بھی کوئی خاص تعرض نہیں کیا تھا۔
’’یہ سب کیا ہے جیکی! آپ مجھے بتاؤ کہ آپ کس طرح یہاں پہنچے؟ کیا وہاں سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی تھا؟‘‘
’’بالکل تھا... لیکن وہاں سے شاید میں ہی نکل سکتا تھا... کوئی اور نہیں۔‘‘
’’کیا مطلب؟‘‘
جیکی نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے کر روشن کی اور اس کا رخ اپنے جسم کی طرف کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ننگ دھڑنگ تھا۔ ایک تہ در تہ لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنے جسم کی گہری خراشیں دکھائیں۔ یہ خراشیں اس کے کانوں، اس کے سینے اور کمر پر خاصی گہری تھیں اور سیاہ نشان سے بن چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بہت سخت شے کے ساتھ بہت زیادہ رگڑ کھا کر گزرا ہے۔ ’’یہ سب کیا ہے؟‘‘ میں نے اس کی نہایت سخت جلد پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔
’’وہاں اس سرنگ میں آگے جا کر نکلنے کا ایک راستہ موجود تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا کہ مجھ جیسے پہلوان کو بھی بہت زور لگا کر اس میں سے گزرنا پڑا۔ بس اس وقت مجھے یہ کلیہ یاد رہا کہ جہاں سے بندے کا سر گزر سکتا ہے، وہاں سے پورا جسم بھی گزر سکتا ہے۔‘‘
وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ حیران کن تھا لیکن یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا کیونکہ بارونڈا جیکی میرے سامنے موجود تھا... اور وہ جس قسم کے ڈھیٹ جسم کا مالک تھا، وہ اس طرح کی مہم جوئی کر بھی سکتا تھا۔
’’تم نے زنجیر کیسے کھولی؟‘‘
’’جیسے ہمیشہ سے کھولی جاتی ہے۔ زنجیر کھولنے، توڑنے اور پگھلانے کے لیے ہمیشہ سے حوصلے کی ضرورت رہی ہے۔‘‘ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔
’’جیکی! آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح نکل جاؤ گے تو مجھ پر الزام آئے گا... اسے میری غفلت سمجھا جائے گا۔‘‘
وہ ہنسا۔ ’’اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بلکہ کسی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ میں سرنگ کی جس دراڑ میں سے نکلا ہوں، وہاں سے کوئی اور نکل کے دکھا دے تو میں مانوں۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم یہاں کیسے نازل ہوئے ہو؟ مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔‘‘
’’مجھے بھی نہیں ہو رہا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں آپ کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھ سکوں گا۔‘‘
میں نے بارونڈا جیکی کو مختصراً وہ سارے واقعات بتا دیے جو اس کے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ میں نے اسے ماریا فرگوسن کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے اپنے تحفظ کے لیے اسے یرغمال بنا رکھا تھا۔ سرنگ سے نکلنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ بھی میں نے جیکی کے گوش گزار کر دیا۔ جب میں روداد کے اس حصے پر پہنچا جہاں چالباز ماریا پارسی ریان کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کر کے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھی... جیکی کے چہرے پر عجب زہرناک تاثرات پھیل گئے۔ وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بولا۔ ’’تم لوگوں کے چنگل سے رہائی تو ماریا کے لیے بہت بڑی بات تھی، اس طرح کی یورپین لڑکیاں تو کبھی کبھی ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی خوشی خوشی کسی کے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ ان کا جسم ان کے لیے ایک فائدہ بخش پراپرٹی کی طرح ہوتا ہے جسے یہ کسی بھی وقت رینٹ پر دے سکتی ہیں... خیر، چھوڑو اس بات کو... اس کے بعد کیا ہوا؟‘‘
میں نے جیکی کو اس خونی ہنگامے کی پوری تفصیل بتائی جو چوکی کے آس پاس برپا ہوا تھا اور جس میں پارسی ریان کے علاوہ ماریا کو بھی گولی لگی تھی۔
ماریا کو گولی لگنے کا سن کر جیکی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آگئی۔ وہ بولا۔ ’’زندہ ہے یا مر گئی؟‘‘
میں نے کہا۔ ’’یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال، زخمی ضرور ہوئی ہے۔‘‘
’’چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ اگر وہ صاف بچ جاتی تو یہ میرے لیے ایک بُری خبر ہوتی... اور اپنی زندگی کے ان آخری دنوں میں، میں بُری خبریں سننا نہیں چاہتا۔‘‘
’’اس ماریا کے لیے آپ کے دل میں بہت رنج ہے؟‘‘
’’ہاں، اس نے صرف مجھے دکھ دیا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے شکنتلا کو دکھ دیا۔ اس کی گہری سہیلی ہو کر بھی اس نے دغا بازی کی اور ہماری ملاقاتوں کے بارے میں شکنتلا کے پتا کو بتایا۔ پتا نہیں کہ تم نے اچھا کیا ہے یا بُرا کہ مجھے سرنگ میں ماریا کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا... ورنہ اس کے لیے میری ’’بے پایاں محبت‘‘ نے جوش ضرور مارنا تھا۔ میں اس کی جتنی بھی عزت افزائی کر سکتا، ضرور کرنی تھی۔ اگر اس عزت افزائی سے اس کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جاتیں تو مجھے دلی راحت ہوتی... بہرحال جو ہوا ٹھیک ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے زندگی دے اور مصیبت والی زندگی دے۔ اسے کچھ تو دوسروں کے درد کا احساس ہو۔‘‘
جیکی اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا اور اپنا نشہ بحال رکھنے کے لیے شراب کے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔
میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں اس کھنڈر میں سے اس نے یہ سیال آگ کیسے ڈھونڈ نکالی ہے؟
وہ بولا۔ ’’شراب جہاں بھی ہوتی ہے، مجھے بلا لیتی ہے۔ کسی مستانی محبوبہ کی طرح مجھے دیکھ کر آنکھ مارتی ہے، سیٹی بجاتی ہے... اور جب لڑکی خود سیٹی مارے تو پھر عاشق کا تو فرض بن جاتا ہے کہ وہ اس کو گود میں بھرنے کے لیے سر دھڑ کی

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 35895313 فیکس: 35802551

بازی لگادے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہاں شراب موجود ہے؟''

''شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس کھنڈر میں گھستے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں کہیں شراب موجود ہے۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تمہاری کھوپڑی میں نہیں آئیں گی۔ اس کے لیے ریاضت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ورنہ میں اس حوالے سے بھی تمہیں کئی گر بتا جاتا۔''

''میں ایسے گُر نہ سیکھنے کے لیے پیشگی معذرت چاہتا ہوں...''

''دیکھو کچھ اور نہ کہنا میری دوسری محبوبہ (شراب) کے بارے میں۔ ورنہ یہ توہینِ محبت ہو جائے گی اور یہ توہینِ عدالت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اپنی شاگردی سے عاق بھی کر سکتا ہوں...''

وہ گول مول باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوتلیں شاید کسی جرائم پیشہ شخص یا اشخاص نے یہاں دبائی تھیں لیکن ان بوتلوں میں سے کچھ شراب رستی تھی۔ اس کی بدبودار نمی، مٹی میں جذب ہوتی رہتی تھی اور اسی مخصوص بدبو یا ہلکی سی باس نے جیکی کو اس شراب کا سراغ دیا تھا۔

شام ہونے کے بعد میری بھوک انتہا کو پہنچ گئی۔ شاید اس وقت مجھے بھی کوئی کلیجی قسم کی چیز ملتی تو میں بھی اسے کچا چبانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کل رات کی تیز بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ پیٹ خالی ہو تو سردی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرا ابھی یہی حال تھا لیکن یہ مدقوق جسم والا جیکی تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سردی گرمی کی مطلق پروا نہیں تھی۔ لیکن کچھ بھی تھا، شراب نے اس بے مثال بندے کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اس کا ایک ثبوت شام کے فوراً بعد اس وقت ملا جب جیکی کو شدید کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کے دوران میں ہی اس کے منہ سے خون رسنے لگا... اس نے کئی بار خون تھوکا اور اسے ڈھانپنے کے لیے اس پر مٹی ڈالی۔ وہ ایک دم گم صم نظر آنے لگا۔

وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ تم میری مدد کر سکو۔''

''دل چھوٹا مت کرو... آپ ٹھیک ہو جاؤ گے... اور مدد کی بات آپ کس حوالے سے کر رہے ہو؟''

''میری آخری خواہش پوری کر دو۔ مجھے کسی طرح میری کشتی پر لے جاؤ۔ ہم وہاں سے بہت دور نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دن کا سفر ہمیں واپس وہاں پہنچا دے گا۔ تمہارے پاس رائفل ہے... دو ٹانگیں ہیں... تم صحت مند ہو... مجھے میری منزل تک پہنچا سکتے ہو۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی یاسیت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کا گرم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے جیکی... آپ اپنی یادوں میں گم ہو کر رہ گئے ہو۔ آپ آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ راستہ یہاں ختم نہیں ہوا... ابھی آگے بہت کچھ ہے۔''

''میرے لیے کچھ نہیں ہے... میرے لیے سب کچھ وہیں ختم ہوگیا تھا جب اُس رات کشتی پر میرا ہاتھ شکنتلا کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ حکم کے محافظوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے... اس سے جدا ہونا میرے لیے کیسا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ بے مثال ہے دوست... میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس کی مسکراہٹ میں کھونے کے بعد دوبارہ ابھر نہ سکتا... اس کی زلفوں میں الجھنے کے بعد پھر رہائی نہ پا سکتا۔ کاش! میں شاعر ہوتا، میں کھل کر بتا سکتا کہ وہ کیا تھی اور...''

وہ بات کرتے کرتے ایک دم رک گیا جیسے کوئی نیا خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس خیال کو مجھ پر ظاہر کرے یا نہیں۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ توقف سے بولا۔ ''کہنا تو نہیں، کچھ دکھانا چاہ رہا ہوں تمہیں... لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ غلط نہ ہو... وہ اس پر ناراض نہ ہو جائے... جب وہ ناراض ہو جاتی ہے تو کئی کئی دن تک میرے تصور میں نہیں آتی۔ مجھے تڑپاتی ہے اور خود بھی تڑپتی رہتی ہے۔''

''کیا آپ مجھے اس کی کوئی چیز دکھانا چاہ رہے ہو؟''

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا... پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ''لیکن تم وعدہ کرو کہ اس کو پاک صاف نظروں سے دیکھو گے۔ اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں لاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا... اور میں خود کو بہت گناہ گار محسوس کروں گا۔''

''کیا آپ مجھے اس کی کوئی تصویر دکھانا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ویسا ہی ہوگا جیسا وہ چاہتا ہے۔ ساتھ ساتھ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ یہ تصویر اگر واقعی موجود ہے تو اس نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔ میں نے تو اسے اب تک اس میلے کچیلے لنگوٹ میں ہی دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جیکی نے اپنے تہ در تہ لنگوٹ کی گرہ کھولی اور اس کی ایک بالائی تہ میں بڑی احتیاط سے لپیٹی گئی کارڈ سائز کی تصویر نکال لی۔ اسے پہلے پولیتھین میں پھر ایک رومال میں لپیٹا گیا تھا۔ جیکی نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے رومال کی گرہ کھولی پھر پولیتھین کو ہٹایا۔ وہ تصویر کو یوں برآمد کر رہا تھا جیسے کسی عبادت گاہ میں ہو اور کسی مقدس شے کو منظرِ عام پر لا رہا ہو۔

یہ ایک نہیں تین تصویریں تھیں۔ مسلسل جیکی کے پاس رہنے سے ان پر تھوڑی بہت سلوٹیں بھی آچکی تھیں۔ جیکی نے پہلی تصویر مجھے دکھائی۔ یہ راج بھون کے کسی عالی شان ہال کمرے میں اتاری گئی تھی۔ اس میں سات لڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ ان ساتوں نے مختلف رنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ یہ سارے لباس گھاگرے چولی پر مشتمل تھے۔ لڑکیوں کے کندھوں پر خوب صورت آرائشی پَر لگے ہوئے تھے۔ یہ پَر بھی لباس کے رنگ کے ہی تھے۔ ایک لڑکی پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہی شکنتلا ہے۔ میں نے اس سے پہلے جیکی سے سنا تھا کہ شکنتلا جب ساتویں کے جشن کی پری بنی تو اس کو سبز رنگ ملا تھا۔ وہ واقعی حسین و جمیل تھی۔ اس کی صورت میں موجود ایک خاص قسم کی دلکشی، نگاہ کو کشش کرتی تھی

''پہچانا کہ وہ کون ہے؟'' جیکی نے مغموم لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے سبز لباس والی پر انگلی رکھی۔

جیکی کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو گے... ستاروں میں سے چاند کو پہچاننا کون سا مشکل ہوتا ہے۔''

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ ساتوں لڑکیاں ایک کرسی کے پیچھے قطار میں کھڑی تھیں۔ زرنگار کرسی پر کوئی شخص تمکنت سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا قدرے فربہ اندام شخص لگتا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ نہایت قیمتی شیروانی پہن رکھی تھی۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں تھیں مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ چہرے پر کسی نے سیاہ روشنائی والے قلم سے اتنی لکیریں لگائی تھیں کہ چہرہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

''کیا کرسی پر حکم جی بیٹھا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، تم اسے حکم جی بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ زیادہ دیر حکم جی نہیں رہے گا۔ بہت جلد چیتل بن جائے گا۔'' وہ معنی

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
نومبر 2010ء
گرم دوپہر اور سرد شاموں کا امتزاج
شمارے کی ایک جھلک

لبِ دمِ توبہ

معاشرے کے حقیقی رنگوں اور رنگین و سنگین تجربات پر مشتمل ایک فکر انگیز داستان ..... آخری صفحات کی زینت **محی الدین نواب** کے قلم سے۔

بخت گزیدہ

ابتدائی صفحات کے رنگ..... سازشوں، قتل و غارت گری کے فتنوں کے درمیان گھری زندگی کا احوال

کچھ یادیں، کچھ باتیں

محترم معراج رسول کا ایک یادگار انٹرویو

حضرت زکریا علیہ وسلم

آپؑ کی زندگی کے عبرت اثر حقائق.....
جنہیں بے موسم پھل عنایت کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ کبریائی کا جلوہ دکھایا۔

دو دھاری

انسانی فطرت کی بھرپور عکاس تحریر..... جو کبھی دودھاری اور کبھی کند ثابت ہوتی ہے۔
مرزا امجد بیگ کا دلچسپ انداز۔

واپسی

تحیر، تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر مشتمل پل پل رنگ بدلتی طویل داستان ..... **محی الدین نواب** کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ: اناڑی، محفلِ شعر و سخن، آپ کے خط

مزید: ش صغیر ادیب، تنویر ریاض، مختار آزاد، سلیم انور، کاشف زبیر، اور مریم کے خان کی دلکش تحریریں۔

خیز انداز میں بولا۔

''حکم جی'' کو دیکھنے کی آرزو میرے دل میں تھی لیکن یہ آرزو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

جیکی نے دوسری تصویر دکھائی۔ اس میں سبز لباس والی شکنتلا پنجوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی اور اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے چرن چھو رہی ہے۔ یقیناً یہ حکم جی کے پاؤں ہی تھے لیکن یہاں بھی اس کے پاؤں اور پنڈلیوں پر بے تحاشا سیاہ لکیریں لگا دی گئی تھیں اور پاؤں نظر نہیں آتے تھے۔ شکنتلا کی زلفیں واقعی بہت دراز تھیں۔ اس کی بھاری چوٹی، جیسے قالین پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے جسم کی ساری غیر معمولی رعنائی اور کشش اس پوز میں نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک دل آویز جسم کی مالک تھی۔ اس تصویر میں ایک دیوار پر بدھا کے اس نادر روزگار مجسمے کی پینٹنگ بھی نظر آ رہی تھی جو مقامی لوگوں کے نزدیک ناقابلِ شکست تھا اور جسے چوری کرنے کی پاداش میں، میں اور میڈم صفورا وغیرہ اس راجواڑے میں موجود تھے۔

تیسری تصویر کلاسیکل رقص کی تھی۔ یہ بھی گروپ فوٹو تھا۔ اس میں ساتوں ''پریاں'' پاؤں میں گھنگرو باندھے رقص کر رہی تھیں۔ ان کے پس منظر میں پگڑیوں والے سازندے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی شکنتلا نمایاں تھی۔ اس کا سراپا ایک تصویر تھا اور اس تصویر نے جیکی کے ساتھ ایک کشتی میں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیل کے اندر سات روز گزارے تھے۔ اگر بار وندا جیکی اس حوالے سے خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا تو شاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔

''یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں؟'' میں نے جیکی سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر کھانستے رہنے کے بعد بولا۔ ''بس، یہ میری خوش قسمتیوں میں سے ایک خوش قسمتی ہے۔ میں ان دنوں جیل سے بھاگ آیا تھا اور اپنی محسنہ ہوشن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہوشن سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح مجھے ساتویں کے جشن کی کچھ تصویریں لا دے۔ ساتویں کے جشن کی تصویریں اتاری جاتی ہیں اور یہ جشن کے میلے میں فروخت بھی ہوتی ہیں۔ لیکن میلا چونکہ ختم ہو چکا تھا، اس لیے جشن کے پکچر کارڈز کا ملنا بڑا مشکل تھا۔ پھر بھی ہوشن نے کسی طرح جشن کے آٹھ دس پکچر کارڈز حاصل کر لیے۔ ان میں سے ان تین کارڈز میں شکنتلا نظر آ رہی تھی... اور یہ تین کارڈز میرے لیے ایک بہت بڑے سرمائے کی طرح تھے۔''

''تصویروں پر یہ لکیریں... آپ نے لگائی ہیں؟''

''ہاں... حکم جی کے چہرے پر خوب صورتی اور نیکی کی چمک ہی اتنی ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ پھر کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ''دیکھو، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تم سے التجا کر رہا تھا کہ تم مجھے کسی طرح میری کشتی تک پہنچا دو۔ تم مجھے استاد کہتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اپنے استاد پر تمہارا یہ ایک بہت عظیم احسان ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، مجھے ایک نامانوس آہٹ سنائی دی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرا کہ یہ کسی ''پمپ ایکشن رائفل'' کے کاک ہونے کی آواز ہے۔ میں نے ٹارچ فوراً بجھا دی اور رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ لگتا تھا کہ جیکی نے بھی یہ آواز سنی ہے اور وہ تھوڑا سا چونکا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تاہم میرے لیے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ دھڑکن کی اس تیزی میں خوف کا عنصر شامل نہیں ہے۔ میں جھک کر چلتا ہوا محتاط قدموں سے دروازے کی طرف آیا۔ چینل کے ڈھانچے کے قریب پہنچ کر میں نے آنکھیں سکیڑیں اور اردگرد نگاہ دوڑائی۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔

یہاں دشمن موجود تھا... اور وہ ایک نہیں تھا۔ نہ ہی دو تین یا چار کی تعداد میں تھا۔ وہ درجنوں میں تھا۔ شاید ہر جھاڑی کے پیچھے... ہر درخت کی اوٹ میں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ نہایت خاموشی... نہایت ہوشیاری سے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں رنجیت پانڈے کا نام گونجا۔

تو کیا وہ وقت پہنچ گیا تھا جس کا انتظار تھا؟

کیا آج یہاں مجھے اپنا حوصلہ آزمانا تھا؟ آگے بڑھنا تھا، لڑنا تھا... اور مرنا تھا؟

مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ صرف چند سیکنڈ میں ہی میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تقریباً تیار ہو گیا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا... وہاں عمران کھڑا تھا۔ یہ اس کا تصور تھا لیکن حقیقت کی طرح واضح اور روشن لگا۔ اس نے میرے کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جادوئی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا... جگر! جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے... اور جو مرتا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ کاش! وہ جیتی جاگتی حالت میں میرے ساتھ ہوتا... بہرحال... اس کا تصور بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

> خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

تیسری کہانی

محمد عفان آزاد

معاشرے میں جرم کی پرورش کرنے والے سنگ دل مجرم کا عبرتناک احوال. وہ ایک ایسی جیل میں قید تھا جہاں اسے قانون کی دی گئی سزا بھگتنے کے علاوہ اپنے تمام جرائم کا یکمشت کفارہ بھی ادا کرنا تھا.

اس جیلر کا قصہ جو خطرناک مجرموں کی موجودگی میں اپنی جیل کو کمزور تصور کرتا تھا

بینسن مارکر نے اپنی گاڑی سے اُتر کر اردگرد دیکھا۔ جیل کے احاطے میں اس وقت چند قیدیوں اور ان پر تعینات گارڈز کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پارکنگ اور قیدیوں کے لیے مخصوص میدان کے درمیان مضبوط فولادی جنگلا لگا ہوا تھا اور کوئی قیدی اسے پار کر کے اس طرف نہیں آ سکتا تھا۔ اگر کوئی قیدی کسی طرح جنگلا پار کر کے گاڑیوں تک رسائی حاصل کر بھی لیتا تب بھی وہ جیل سے باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ جیل سے باہر آتے جاتے ہر گاڑی کی مکمل تلاشی لی جاتی تھی۔ کسی قیدی کے لیے گاڑی میں چھپ کر نکلنا بھی ناممکن تھا۔

ریاست آرکنساس کی اس جیل کا شمار امریکا کی چند محفوظ ترین جیلوں میں ہوتا تھا اور یہاں سے شاذ ہی کسی قیدی کے فرار کا واقعہ پیش آتا تھا۔ بہترین حفاظتی اور نگرانی کے انتظامات کی وجہ سے ریاست اور ریاست کے باہر سے بھی

خطرناک قیدی اس جیل میں بھیجے جاتے تھے۔ خاص طور پر ایسے قیدی جنہیں عمر قید کی سزا ہو چکی ہوتی تھی اور اب وہ جیتے جی جیل سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ ایسے قیدیوں کے فرار کا امکان بہت زیادہ ہوتا تھا اور وہ مستقل اسی فکر میں رہتے تھے کہ ان کو موقع ملے اور وہ جیل سے نکل بھاگیں۔ اس مقصد کے لیے وہ تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

ایسے ہی قیدیوں میں ایک اسپینش نژاد ماریو پابیکو بھی تھا۔ ماریو عادی مجرم تھا اور اس نے اپنی بتیس سالہ زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں گزارا تھا۔ جرم اس کا ذریعۂ روزگار تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس سے اپنی جبلت کی تسکین بھی کرتا تھا۔ جنوب مغرب سے تعلق رکھنے والا ماریو ایک طوائف کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں تھرڈ کلاس کال گرل تھی۔ یوں اس نے ماریو کے لاشعور میں عورت کے لیے عزت کو قطعی ختم کر دیا تھا۔ عورت اس کے نزدیک ایک کھلونا تھی جس سے کھیلا جاسکتا اور جب دل چاہے اسے توڑا بھی جاسکتا تھا۔

ماریو نے ایک نازک سی لڑکی کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ ماریو کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی دوست تھی اور جو کچھ ہوا اس کی رضامندی سے ہوا۔ لیکن لڑکی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بتاتی تھی کہ اسے انتہائی اذیت کے بعد قتل کیا گیا تھا۔ قتل کرنے سے پہلے وہ کئی بار مجرمانہ حملے کا نشانہ بنی تھی اور اس میں بھی حد درجے درندگی شامل رہی تھی۔ پولیس اور پھر جیوری نے ماریو کا موقف ماننے سے انکار کرتے ہوئے اسے فرسٹ ڈگری مرڈر کا مرتکب قرار دیا۔ اسے اغوا، آبرو ریزی اور قتل کے جرم میں مجموعی طور پر بتیس برس کی سزا سنائی گئی تھی اور اس میں بیس برس سے پہلے پیرول پر رہائی بھی ممکن نہیں تھی۔

کیونکہ ماریو نے یہ جرم آرکنساس میں کیا تھا اس لیے اسے سزا کے لیے ریاست کی جیل بھیج دیا گیا۔

بینسن مارکر گاڑی سے اتر کر جیل سے ملحق دفتر کی عمارت کی طرف آیا۔ اس نے گارڈ کو اپنا کارڈ دکھایا اور بولا۔ ”مجھے جیلر روڈی کورٹ سے ملنا ہے۔ میری اس سے ملاقات طے ہے۔“

گارڈ نے انٹرکام پر اندر رابطہ کیا اور منظوری کے بعد بینسن کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ بینسن اندر داخل ہوا اور اسے خوش گوار حیرت ہوئی جب اس نے اندر سے دفتر کو کسی جیل کے دفتر سے مختلف پایا۔ وہاں عام دفتری ماحول تھا۔ جس میں جیل کا دفتری عملہ اپنے کاموں میں مشغول تھا۔ اسے روڈی کا کمرا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ..... روڈی ایک پچاس برس کا صحت مند اور لمبے قد کا شخص تھا، اس کے چہرے سے سخت گیری عیاں تھی۔ ایک جیلر کے لیے سخت گیر ہونا لازمی تھا ورنہ وہ کوئی دو ہزار کے لگ بھگ خطرناک ترین افراد کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

”بینسن مارکر۔“ اس نے تعارف کرایا۔

روڈی نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”مجھے تمہاری آمد کی اطلاع مل گئی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب تم اس سلسلے میں کیا کرسکو گے۔ ماریو تو مر چکا ہے۔“

”ہاں یہ درست ہے۔“ بینسن نے محتاط انداز میں کہا۔ ”لیکن میں یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ ایسا کیوں ہوا اور میری رپورٹ کی روشنی میں جیلوں کے حفاظتی انتظامات کو بہتر بنایا جائے گا۔“

بینسن مارکر جیلوں کی سیکورٹی کا ماہر تھا اور اسے واشنگٹن سے خاص طور سے بلوایا گیا تھا۔ وہ ائرپورٹ سے سیدھا یہاں پہنچا تھا۔ طویل سفر کے باوجود وہ بالکل تازہ دم اور صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ جیلر روڈی کو اس کی آمد پسند نہیں آئی اور یہ فطری بات تھی کیونکہ وہ اس کے کام میں خامیاں نکالنے آیا تھا۔ روڈی نے ناپسندیدگی کے باوجود مہمان نوازی کا خیال رکھا اور ایک مگ میں کافی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟“

”مجھے اس کیس کے بارے میں تمام معلومات درکار ہیں۔“

”مجھے اس بارے میں جو معلوم ہے، وہ میں پولیس کو بتا چکا ہوں۔“

”میں نے وہ رپورٹ دیکھی ہے۔ اس کے باوجود میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

روڈی نے شانے اچکائے۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

بینسن نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا اور اسے کھول کر اس میں موجود ایک چھوٹی سی فائل نکالنے کے دوران میں اندر رکھا وائس ریکارڈر آن کر دیا اور روڈی سے بولا۔ ”میں تم سے ہونے والی گفتگو ریکارڈ کر رہا ہوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

جیلر جانتا تھا کہ وفاق کے اس نمائندے پر اعتراض کرنے کی صورت میں اسے کوئی وجہ بھی بتانا ہوگی اس لیے اس نے اعتراض سے گریز کیا۔ اس نے سر ہلایا۔ بینسن نے فائل کھول لی۔ ”سترہ ستمبر کی رات دو بج کر پینتالیس منٹ پر جیل کی آؤٹ پوسٹ کے پاس گن فائر کا ایک واقعہ ہوا جس میں قیدی نمبر دو سو بارہ، ماریو پابیکو شدید زخمی ہوگیا۔ اس وقت ماریو اپنی کوٹھری سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا اور اسے آؤٹ پوسٹ تک آنے کے لیے چار مقفل دروازوں سے

گزرنا لازمی تھا۔ میں نے ٹھیک کہا ہے؟“

روڈی نے اپنی کرسی پر پہلو بدلا۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے لیکن.....“

”ایک منٹ میں اپنی بات مکمل کرلوں۔ ماریو کو آؤٹ پوسٹ تک آنے سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا۔ چار مقفل دروازوں پر موجود گارڈز نے انکار کیا کہ ماریو ان کی پوسٹ سے گزرا تھا۔“ بینسن نے کہتے ہوئے روڈی کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی درست ہے لیکن ماریو نے جو کہانی سنائی وہ حیرت انگیز ہے۔ کیا تم نے اس کا بیان پڑھا ہے؟“

”اس کا بیان اس فائل میں موجود ہے۔“

”تب تم اس کی کیا وضاحت کرتے ہو۔ میری جیل میں کوئی بریک اپ نہیں ہوا۔“

”مگر ماریو آؤٹ پوسٹ تک کسی نہ کسی راستے سے گزر کر گیا ہوگا۔“ بینسن کے لہجے میں اصرار آگیا۔

”میں اس کی وضاحت سے قاصر ہوں۔“ روڈی نے کسی قدر بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔ ”جب یہ واقعہ ہوا تھا اور میں نے تفصیلات معلوم کی تھیں تب ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں مشکل میں پڑنے والا ہوں۔“

”یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے اگر معلوم ہو جائے کہ ماریو کس طرح آؤٹ پوسٹ تک پہنچا تھا تو تمہارے لیے آسانی پیدا ہوگی۔“

”لیکن یہ کس طرح معلوم ہوگا۔ ماریو مر چکا ہے اور مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیان میں سب بتا دیا ہے۔“

”اس کا بیان درست ماننے کی صورت میں تم کیا وضاحت کرو گے کہ یہ کس طرح ہوا؟“

”ماریو نے خود کہا ہے۔“

”اس نے جو کہا ہے کیا کوئی اتھارٹی اس کا بیان تسلیم کرے گی؟“

”یہی تو مشکل ہے۔ اس کی بات ناقابلِ یقین ہے۔“

بینسن کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”مزید بات کرنے سے پہلے میں ماریو کی کوٹھری اور جیل کا وہ بلاک دیکھنا پسند کروں گا جہاں ماریو قید تھا اور پھر وہ جگہ جہاں اسے شوٹ کیا گیا۔“

”بہتر یہی ہے تم اسے دیکھ لو۔“

روڈی نے اپنے ایک افسر کو بلا کر بینسن کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ڈیک نامی یہ افسر نوجوان اور شگفتہ مزاج تھا۔ اس نے دفتر سے باہر آنے پر بینسن سے پوچھا۔ ”اس کہانی پر واشنگٹن والوں کا کیا ردِعمل تھا؟“

”میں ان کے ردِعمل کے طور پر یہاں موجود ہوں۔ وہاں کوئی چیز بھی حقائق سے ہٹ کر نہیں لی جاتی ہے۔ کہانی سے قطع نظر واشنگٹن والے سیکیورٹی پلان میں موجود خامی جاننا چاہتے ہیں۔“

”سیکیورٹی میں کوئی خامی نہیں ہے۔“ ڈیک نے یقین سے کہا۔

”یہ تو تمہارا کہنا ہے۔“ بینسن کا لہجہ سرد ہوگیا۔ ”لیکن ماریو نے عملی طور پر اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔“

”میں نے اسے زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ اسے گردے اور ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگی تھی اور اس کا دو دن زندہ رہنا بھی حیرت انگیز تھا۔ اس حالت میں انسان کے ہوش و حواس بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس نے جو بیان دیا تھا، وہ مشکوک ہے؟“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ ڈیک نے شانے اچکائے۔ ”تم لوگ اس کے بیان کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔“

”میں اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی چیز کو اہمیت نہیں دے رہا۔ میں تمام امکانات کا جائزہ لے کر ہی کسی نتیجے پر پہنچوں گا۔“

ڈیک، بینسن کو جیل کے پرانے حصے میں لایا۔ یہ عقب

کچھ یادیں..... کچھ باتیں

سسپنس کے صفحات پر قارئین کے لیے خوبصورت تحفہ

معراج رسول صاحب

سے ایک خوشگوار ملاقات کا احوال

آپ سب کے بے حد اصرار پر

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کے بانی کی دلچسپ اور ہمہ گیر گفتگو پر مشتمل انٹرویو

سسپنس ڈائجسٹ نومبر 2010ء

کے شمارے میں ملاحظہ کریں

میں تھا لیکن اسے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پیچھے کی طرف نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کنکریٹ کی ایک فٹ موٹی دیوار نے اسے پوری طرح بند کر دیا تھا۔ یہاں سے آنے جانے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ اس سے گزر کر اس حصے میں پہنچے تھے۔ اس بلاک میں داخل ہوتے ہی بینسن کو سیلن اور بو کا احساس ہوا جیسے یہاں ہوا کا گزر کم ہوتا ہو۔ بلاک دو قطاروں پر مشتمل تھا جس میں دائیں بائیں دس دس کوٹھریاں تھیں۔ ماریو کی کوٹھری دوسری قطار میں آخری حصے میں تھی۔ یہ آخری سے پہلے والی کوٹھری تھی۔ اس قطار میں صرف دو کوٹھریوں میں قیدی تھے اور باقی ساری کوٹھریاں خالی پڑی تھیں۔

''کیا اس حصے کو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے؟''

''یہاں نمی کے ساتھ کچھ مسائل اور بھی ہیں۔'' ڈیک نے کہا۔ ''ہم نے اس کی مرمت کے لیے رقم مانگی ہے۔''

کوٹھریوں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ دیواروں سے پلاسٹر اکھڑ رہا تھا اور سیلن کے آثار نمایاں تھے۔ سلاخوں پر زنگ لگ رہا تھا۔ ڈیک اسے ماریو کی کوٹھری کے سامنے لایا۔

''وہ یہاں رہتا تھا۔''

کوٹھری کے سامنے لگا بلب بند تھا۔ ڈیک نے اسے جلانے کی کوشش کی لیکن وہ بند ہی رہا۔ ''شاید یہ خراب ہو گیا ہے۔'' وہ کھسیا کر بولا۔

بینسن نے جیب سے ٹارچ نکال کر کوٹھری میں جھانکا۔ یہ چھ بائی دس کی کوٹھری تھی اور اس میں بستر شروع میں تھا۔ آخر میں ایک واش بیسن کموڈ اور سامان رکھنے کے لیے چھوٹی سی الماری تھی۔ بینسن نے کہا۔ ''تالا کھولو مجھے اندر جانا ہے۔''

ڈیک نے تالا کھول دیا۔ اس کے پاس مخصوص چابی تھی جس سے وہ جیل کا ہر تالا کھول سکتا تھا۔ بینسن کوٹھری کے اندر آیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں بستر دیکھا، پھر الماری میں رکھے سامان کا معائنہ کیا اس میں دو جوڑے اور چند عام استعمال کی اشیا تھیں۔

''یہ چیزیں یہاں سے ہٹائی نہیں گئی ہیں؟''

''میرا خیال ہے اب ہٹا دی جائیں گی۔'' ڈیک نے دانتوں کی نمائش کی۔ ''کیا خیال ہے، چلیں؟''

بینسن کو وہاں کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی تھی پھر بھی اس نے کوٹھری کا نقشہ اور اس کے آس پاس کی تفصیلات ذہن میں محفوظ کر لی تھیں۔ اس نے ڈیک سے کہا۔ ''اب مجھے وہاں لے چلو جہاں ماریو آؤٹ پوسٹ پر زخمی ہوا تھا۔''

ڈیک اسے لے کر روانہ ہوا۔ پہلے وہ بلاک کی چیک پوسٹ سے گزرے وہاں ایک گارڈ موجود تھا۔ اس نے ان کے لیے دروازہ کھولا اور ان کے باہر نکلتے ہی بند کر دیا۔ پھر وہ پرانے حصے کی چیک پوسٹ سے گزرے، اس کے بعد جیل کی عمارت کی چیک پوسٹ تھی اور آخر میں وہ پارکنگ کی چیک پوسٹ سے گزرے۔ یہ سارا راستہ انتہائی مخصوص اور بند تھا اس سے نکل کر جیل کے کسی اور حصے میں جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ آؤٹ پوسٹ کے پاس پہنچے جہاں ڈیک نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ یہاں دیکھا گیا تھا اور وارننگ کے باوجود وہ بھاگتا رہا اس لیے گارڈز نے گولی چلا دی۔ اسے چار گولیاں لگی تھیں جن میں سے دو مہلک ثابت ہوئیں۔''

''اس کے فوراً بعد یہاں تک آنے والے راستوں اور ماریو کی کوٹھری کو چیک کیا گیا تھا؟''

''بالکل اور اس کی کوٹھری سمیت تمام جگہیں بند پائی گئی تھیں۔ تمام گارڈز اپنی ڈیوٹی پر تھے اور کسی ایک نے بھی ماریو کو دیکھنے سے انکار کیا تھا۔''

''کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ گارڈز کسی وجہ سے اپنی ڈیوٹی سے ہٹے ہوں اور ماریو کو نکلنے کا موقع مل گیا ہو۔''

''نہیں تمام چیک پوسٹس کی سی سی ویڈیو ریکارڈنگ ہوتی اور اس وقت کے لحاظ سے ریکارڈنگ نکال کر دیکھ لی گئی تھی۔ اس میں تمام گارڈز اپنی جگہوں پر نظر آ رہے ہیں۔''

''پھر ماریو کیسے باہر پہنچا؟''

''یہ بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔'' ڈیک نے انگلی سے اپنا ماتھا کھجایا۔ ''وہ پانچ تالوں سے گزر کر میدان تک کیسے پہنچا۔''

''اسپتال میں ماریو کا بیان کس نے لیا تھا؟''

''مقامی پولیس کے ایک لیفٹیننٹ نے۔''

یہ بیان بینسن کے پاس موجود تھا اور وہ واشنگٹن سے آتے ہوئے راستے میں اسے تفصیل سے پڑھ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا یہ ایک مہمل بیان ہے جو ایک مرتے آدمی نے دیا اور بعض باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس کے حواس اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ بینسن کا خیال تھا کہ جیل کا دورہ کرنے پر اصل صورتِ حال اس کے سامنے آجائے گی۔ لیکن یہاں جو صورتِ حال تھی وہ تو ماریو کے بیان سے بھی زیادہ الجھی ہوئی تھی۔ بینسن نے فیصلہ کیا کہ وہ ماریو کا بیان ایک بار پھر پڑھے گا۔ اسے ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر یہ کام کر سکے۔ ابھی اس کے پاس بہت وقت تھا۔ اس نے ڈیک سے کہا۔

''مجھے ایک جگہ درکار ہے جہاں میں تنہائی میں بیٹھ کر

سوچ سکوں۔''

''میرا دفتر حاضر ہے میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں تمہیں وہاں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

''تو چلو۔'' بینسن بولا۔ اس کا بریف کیس اس کے پاس تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس کا ارادہ ایک بار پھر روڈی سے ملاقات کرنے کا تھا۔ ڈیک کا کیبن سادہ اور پُرسکون تھا اور وہاں ایک چھوٹا سا پنکھا بھی لگا ہوا تھا۔ ڈیک اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آ کر کافی کا مگ بینسن کے سامنے رکھ دیا اور اس کے جاتے ہی بینسن نے فائل سنبھال لی جس میں ماریو کا نزاعی بیان موجود تھا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ فان مورگن جب ماریو سے بیان لینے کے لیے پہنچا تو وہ ہوش میں تھا اور شدید تکلیف میں تھا لیکن ڈاکٹر اسے کوئی سکون بخش دوا دینے کو تیار نہیں تھے انہیں خدشہ تھا کہ کہیں وہ سکون بخش دوا کے اثر میں خاموشی سے انتقال نہ کر جائے۔ ایسی حالت میں سکون بخش دوا مہلک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ بستر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کا سینہ نصف پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھنسی گولی نہیں نکالی جا سکی تھی۔ اس کے بارے میں خدشہ تھا کہ اسے نکالنے کی کوشش میں ماریو کی جان بھی جا سکتی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے معذور بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے سینے، شانوں اور بازوؤں پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں ٹیٹوز نہ بنے ہوں اور ان میں سے اکثر نہایت فحش اور بیہودہ تھے۔ ان ٹیٹوز کو دیکھ کر ماریو کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

لیفٹیننٹ مورگن نے بیان میں خود کو پوری طرح شامل رکھا تھا۔ اور پورے بیان میں جا بہ جا اس کا ذکر تھا۔ یہ کسی مجرم کے بیان کے بجائے کسی صحافی کی رپورٹ لگ رہا تھا۔ جب لیفٹیننٹ نے ماریو سے اپنا تعارف کرایا تو تکلیف کے باوجود ماریو کے چہرے پر ناگواری آگئی تھی۔

''کیا بات ہے کیوں آئے ہو؟''

''مجھے تمہارا بیان درکار ہے۔''

''مجھے بیان دینا نہیں آتا ہے۔''

''تب میں تم سے جو پوچھوں، اس کا جواب دیتے رہو۔''

''اس مشق کا فائدہ؟'' وہ زیرِ لب بولا۔ ''مجھے تو مرنا ہی ہے۔''

''لیکن تمہارے ساتھ کیا ہوا، یہ تو معلوم ہونا چاہیے۔'' مورگن بولا۔

''میرے ساتھ کیا ہوا؟'' ماریو نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

''ہاں تم اپنی کوٹھری سے نکل کر آؤٹ پوسٹ تک کیسے پہنچے جب کہ تمہاری کوٹھری تک میں تالا لگا تھا؟''

''یہ سب بروس کی ذلالت ہے۔''

''بروس کون؟''

''جیل کا ایک گارڈ اسی نے مجھے اکسایا تھا اور وہی مجھے نکال کر لے گیا تھا۔''

''بروس سے تمہاری ملاقات کب ہوئی؟''

''یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ رات کو ڈیوٹی دیتا تھا۔''

''گویا وہ تم سے رات کو ملتا تھا؟''

''ہاں وہ بارہ بجتے ہی آجاتا تھا۔''

''وہ کوٹھری کے اندر آتا تھا؟''

''ایک دو بار ایسا ہوا لیکن مجھے نہیں معلوم وہ کوٹھری کے اندر کیسے آیا؟''

''کیا مطلب تمہیں کیسے پتا نہیں چلا کیا تم سو رہے تھے جب وہ اندر آیا؟''

''نہیں وہ باہر کھڑا تھا اور میں ایک دو لمحے کے لیے دوسری طرف متوجہ ہوا اور جب اس کی طرف دیکھا تو وہ اندر تھا۔ میں نے تالا اور دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی اور نہ ہی وہ اتنی جلدی ان دونوں کو کھول کر بند کر سکتا تھا۔ میں گھبرا گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ اندر کیسے آیا؟''

''اس نے کیا جواب دیا؟''

''کچھ نہیں۔ اس کے بجائے وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں نے اس لڑکی کو کیسے قتل کیا تھا۔''

''تم نے اسے بتایا؟''

ماریو جواب دیتے ہوئے ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ''ہاں وہ شوقین لگ رہا تھا اس لیے میں نے اسے تفصیل سے سب بتا دیا۔''

''کیا بتا دیا؟''

''یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔'' ماریو نے صاف انکار کر دیا۔

''تمہاری بروس سے کتنی ملاقاتیں ہوئیں؟''

''وہ پہلی بار دو مہینے پہلے ملا تھا۔ میں سو رہا تھا جب وہ آیا اور اس نے سلاخیں بجا کر مجھے اٹھایا۔ وہ بوڑھا سا آدمی تھا۔ اس نے کہا، وہ بور ہو رہا ہے اور مجھ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔''

''تم نے کیا کہا؟''

''ظاہر ہے میں گارڈ کی بات کیسے رد کر سکتا تھا۔''

”تم نے اس سے کیا باتیں کیں؟“

”اب مجھے یاد نہیں ہے لیکن شاید میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تھا۔“ ماریو نے ذہن پر زور دیا۔

”اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا؟“

”اس وقت نہیں بتایا تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ پھر اسی طرح اچانک میری کوٹھری میں آیا تو اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔“

”کیا بتایا؟“

”یہی کہ وہ پچاس برس پہلے اس جیل میں گارڈ بن کر آیا تھا.. اور وہ جیل کے اسی حصے میں ڈیوٹی دیتا ہے اور صرف رات کی ڈیوٹی دیتا ہے۔ اس نے مجھے اپنا نام بروس بتایا تھا۔“

”ان دو مواقع ... پر وہ کوٹھری کے اندر آیا اور تم نے پوچھا نہیں کہ وہ اندر کیسے آیا؟“

”پوچھا لیکن اس نے دوسری بار بھی نہیں بتایا اور سچی بات ہے مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔“

”وہ واپس کیسے گیا؟“

”یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔ دونوں بار اس سے بات کرتے کرتے مجھے نیند سی آگئی اور جب میں جاگا تو وہ جاچکا تھا۔“

”کوٹھری کے اندر دوسری ملاقات کب ہوئی؟“

”آج سے چار دن پہلے۔“ ماریو بولا۔ ”اس کے بعد وہ اس رات آیا جب اس نے مجھے کوٹھری سے نکال کر جیل کے صحن تک پہنچا دیا تھا۔“

”تم نے اس پر اعتماد کیسے کیا؟“

ماریو سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”وہ بہت بوڑھا اور مہربان نظر آنے والا شخص ہے اس لیے میں نے اس پر اعتماد کرلیا۔“

”اس نے تم سے کتنی بار ملاقات کی؟“ مورگن نے اپنا سوال دہرایا۔

”دو مہینے میں کوئی پندرہ سولہ مرتبہ۔“ ماریو نے جواب دیا۔

”یعنی ہر چوتھے دن ایک ملاقات؟“

”نہیں کبھی وہ ہر رات آتا تھا اور کبھی ہفتہ بھر بھی نہیں آیا تھا۔“ ماریو نے ذہن پر زور دے کر بتایا۔

”اس نے تمہیں جیل سے نکالنے کی بات کب کی؟“

ماریو حیران ہوا۔ ”اس نے تو کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بس اپنی بات کرتا تھا یا میری بات کرتا تھا۔“

”پھر تم اس کے ساتھ کوٹھری سے باہر کیوں آئے کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ کوئی گارڈ سوائے ہنگامی صورتِ حال کے کسی قیدی کو اس کی کوٹھری سے نکالنے کا مجاز نہیں ہے؟“

”مجھے معلوم ہے، لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیوں کیا؟“

”او کے، اب تم مجھے بتاؤ کہ سترہ ستمبر کی رات کیا ہوا تھا؟“

”میں سو رہا تھا۔“ ماریو نے کہا۔ ”دو بجے اس نے میری کوٹھری کی سلاخیں بجائیں۔ میں جاگ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے گپ شپ کرنے آیا ہے۔ لیکن اس کے بجائے اس نے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔“

”کیسے کھول دیا، کیا اس نے تالا کھولا تھا؟“

”نہیں، میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ میں نے تالا کھلنے کی آواز نہیں سنی تھی اور نہ ہی مجھے اس کے ہاتھ میں کوئی چابی نظر آئی تھی بس ایسا لگا جیسے تالا کھلا تھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔“

”پھر وہ اندر آیا؟“

”نہیں اس نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں پریشان ہوگیا میں ہچکچایا لیکن جب اس نے دوبارہ کہا تو میں باہر آگیا۔“

”اس نے پھر کیا کیا؟“

”اس نے دروازہ بند کر دیا اور مجھ سے بولا۔ ”میرے ساتھ چلو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں چلوں؟“ اس نے کہا۔ ”جیل سے باہر.... میں تمہیں جیل سے باہر لے جارہا ہوں۔“

”اور تم اس کے ساتھ چل پڑے؟“

”ہاں نہ جانے کیا بات ہے مجھے یاد آرہا ہے اس وقت میرا ذہن سن سا ہوگیا تھا اور مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میں کتنا بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں کسی بھی گارڈ کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو وہ مجھے شوٹ کرتے وقت ایک لمحے کو بھی نہیں سوچتا۔“

”تم اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ تمہیں کہاں سے گزار کر لے گیا تھا، تمہیں راستہ یاد ہے؟“

”ہاں وہ مجھے اسی راستے سے گزار کر باہر لایا جہاں سے قیدیوں کو لایا اور لے جایا جاتا ہے۔“

”یعنی چار چیک پوسٹ والے راستے سے۔“ لیفٹیننٹ مورگن نے سوال کیا۔ وہ ماریو کے پاس آنے سے پہلے جیل جاکر تفتیش کر چکا تھا۔ اس لیے اسے معلوم تھا کہ قیدیوں کو کہاں سے لایا اور لے جایا جاتا تھا۔

”بالکل اسی راستے سے... میرے علم میں اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ ماریو بولا۔

”تم نے چیک پوسٹ پر کسی گارڈ کو دیکھا؟“

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ماریو کو ذہن پر زور دینا پڑا اور اس نے حیرت سے کہا۔ ”مجھے نہیں یاد کہ کسی چیک پوسٹ پر کسی گارڈ نے ہم کو روکا ہو یا میں نے وہاں کسی گارڈ کو دیکھا۔“

”پھر تم دونوں کے لیے دروازہ کس نے کھولا کیونکہ یہ چاروں دروازے بند ہوتے ہیں اور صرف وہاں کا گارڈ ہی انہیں کھول سکتا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم.... مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم آرام سے ٹہلتے ہوئے جیل کے صحن تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے بروس کو صرف دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ اس نے تالا کھولا یا نہیں مجھے یاد نہیں ہے۔“

”ایسا کیسے ممکن ہے، کیا تمہیں احساس نہیں ہوا کہ وہ تمہیں جیل سے باہر لے جارہا ہے جو سراسر غیر قانونی ہے۔“

”میں نے کہا نا اس وقت مجھے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا اور یوں لگا تھا جیسے میرا ذہن مفلوج ہوگیا ہو۔“

”او کے وہ تمہیں باہر لے آیا اس کے بعد کیا ہوا؟“

صحن میں تیز روشنی تھی۔ وہ مجھے ایک دیوار کی آڑ میں لے آیا اور اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا۔ اچانک وہاں تیز روشنی ہوگئی اور میگا فون پر وارننگ دی گئی۔ میں بے ساختہ بھاگا اور پھر کسی نے مجھ پر فائرنگ کردی۔ مجھے لگا کہ کئی گولیاں میرے جسم میں اتر گئی ہیں اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔“

”جب روشنی ہوئی اور وارننگ دی گئی تو بروس کہاں تھا؟“

”مجھے بالکل نہیں معلوم بس یہ احساس ہوا تھا کہ وہاں میں اکیلا تھا اور شاید اسی وجہ سے میں بھاگا تھا میرا ارادہ جیل سے فرار کا نہیں تھا۔“

”اس کے باوجود تمہارا رخ جیل کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔“ مورگن نے کہا۔ ”پھر تمہیں ہوش آیا تو تم یہاں اسپتال میں تھے؟“

”ظاہر ہے۔“ ماریو بے زاری سے بولا۔ وہ جواب دے دے کر تھک گیا تھا۔

”باہر آتے ہوئے تم نے چیک پوسٹ پر کسی گارڈ کو نہیں دیکھا لیکن کیا جیل کے دوسرے حصوں میں بھی تمہیں کوئی گارڈ نظر نہیں آیا؟“

”نہیں صحن میں آنے تک مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ ہم نے سارا راستہ بالکل کھلے میں طے کیا تھا اور ہمیں کسی وقت بھی دیکھا جاسکتا تھا لیکن مجھے خطرے کا احساس بھی نہیں تھا۔ جب صحن میں سرچ لائٹ روشن ہوئی تب مجھے ہوش آیا تھا۔“

”بروس کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“

”یہی کہ وہ جیل کا پرانا گارڈ ہے اگر وہ پچاس برس پہلے بھرتی ہوا تھا تو اس وقت کم سے کم ستر برس کا تو ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اتنے بوڑھے آدمی کو ریٹائر کیوں نہیں کیا گیا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جیل میں اتنی عمر کا آدمی گارڈ نہیں رکھا جاتا ہے لیکن ماریو میرے پاس تمہارے بلاک میں ڈیوٹی دینے والے گارڈز کی مکمل فہرست ہے جو دن رات میں وہاں ہوتے ہیں اور ان میں بروس نامی کوئی گارڈ نہیں ہے۔ نہ ہی ستر برس کا کوئی گارڈ ہے۔“

ماریو دنگ رہ گیا۔ پھر اس نے قسم کھا کر یقین دلایا۔

”بروس ہے۔ میں اس سے اتنی بار ملا ہوں۔“

”اس کا حلیہ بتاؤ؟“

ماریو نے بروس کا حلیہ بتایا۔ مورگن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس حلیے کا کوئی گارڈ نہیں ہے۔ کسی نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے اور مروانے کی کوشش کی ہے۔“

”لیکن کس نے؟“ ماریو تکلیف سے بولا۔

”ہم اس کا پتا چلا لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم بروس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”یہی کہ وہ جیل کا گارڈ ہے اور اس کا اس دنیا میں سوائے ایک بیٹی کے کوئی نہیں ہے۔ وہ سگریٹ بہت پیتا ہے اور اس کا برانڈ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ پیکٹ سے یہ بہت پرانا برانڈ لگتا رہا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے ایک پیکٹ بھی دیا تھا۔ ہمیں ماچس رکھنے کی اجازت نہیں ہے جب وہ رات کو آتا تو اپنی سگریٹ سلگانے کے ساتھ میری بھی سلگا دیا کرتا تھا۔“

”برانڈ کا نام کیا ہے؟“

”اپاچی نام تھا۔“

”میں نے کبھی اس نام کی سگریٹ نہیں دیکھی ہے۔“ مورگن نے کہا۔ بروس نے اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ بتایا؟“

”زیادہ نہیں، بس اتنا بتایا کہ وہ بہت خوب صورت ہے اور وہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”اس نے یہ بتایا کہ اسے تم میں کیا دلچسپی ہے؟“

”نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مجرمانہ حملوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کی گفتگو کا بڑا حصہ اس بارے میں ہوتا تھا۔“

”وہ تمہارے جرم پر بھی بات کرتا تھا؟“

”ظاہر ہے۔“ ماریو نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ ”کبھی کبھی وہ مجھے نفس پرست آدمی لگتا تھا جو خود تو کچھ کر نہیں سکتا ہے لیکن اس قسم کی باتوں سے لذت حاصل کرتا ہے۔“

اس کے بعد مورگن نے مزید کچھ سوال کیے لیکن وہ اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ اس نے بڑی مہارت سے ماریو سے سب گلوا لیا تھا لیکن ماریو کی کہانی ناقابلِ یقین تھی۔ مورگن کا ارادہ اس سے ایک اور ملاقات کا تھا لیکن اس سے پہلے ہی ماریو کی حالت بگڑ گئی اور وہ بے ہوشی میں چلا گیا اور

چوبیس گھنٹے اسی حالت میں رہنے کے بعد مر گیا۔ مورگن اس سے مزید معلومات حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے اس کی رپورٹ یہیں تک محدود رہی۔ البتہ ماریو کے بیان سے ہٹ کر بھی پولیس رپورٹ میں کئی دلچسپ چیزیں تھیں۔ ماریو کے بیان نے جیل حکام میں مزید کھلبلی مچا دی تھی کیونکہ ابھی تک یہی وضاحت نہیں ہو پائی تھی کہ ماریو اپنی کوٹھری سے نکل کر چار چیک پوسٹس عبور کر کے جیل کی آؤٹ پوسٹ تک کیسے پہنچا اور اس دوران میں کسی نے اسے چیک کیوں نہیں کیا۔

جیل حکام کے مطابق جیل میں اول تو بروس نامی کوئی گارڈ نہیں تھا۔ دوسرے قوانین کے مطابق کوئی گارڈ ساٹھ سال سے زیادہ کا ہو کر نوکری نہیں کر سکتا۔ اس لیے کسی ستر سالہ شخص کے گارڈ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بروس سراسر ماریو کے دماغ کی اختراع تھا۔ پھر پولیس نے جیل کے سابق ملازمین کا ریکارڈ کھنگالا تو اس میں ایک بروس نامی گارڈ نکل آیا اور مزے کی بات تھی کہ وہ اسی بلاک میں اور ان ہی کوٹھریوں کی نگرانی کرتا تھا جہاں ماریو کو رکھا گیا تھا۔ وہ عام طور سے رات کی شفٹ میں کام کرتا تھا۔ لیکن یہ کوئی چالیس برس پہلے کی بات تھی۔ لیفٹیننٹ مورگن نے جو تحقیق کی، اس کے مطابق اس بروس نامی گارڈ کی ایک سولہ سال کی بیٹی بھی تھی لیکن ایک رات جب وہ ڈیوٹی پر تھا تو کسی شقی القلب شخص نے اس کے گھر میں گھس کر اس کی معصوم بیٹی کو نہایت درندگی کا نشانہ بنا کر مار ڈالا۔ بروس گھر واپس گیا تو بیٹی کی لاش دیکھ کر حواس کھو بیٹھا... وہ کئی مہینے اسپتال میں داخل رہا اور بالآخر اس نے وہاں سے نکلنے کے بعد ایک دن اپنے گلے میں چمڑے کے گیلے تسمے باندھ کر خودکشی کر لی۔ بروس کو مرے ہوئے چالیس برس ہونے کو آئے تھے اور ظاہر ہے وہ کسی طرح بھی ماریو کے پاس نہیں آسکتا تھا۔

ماریو کی کوٹھری والی راہداری میں مزید دو قیدی تھے لیکن وہ اس کی کوٹھری سے خاصے فاصلے پر تھے۔ ان کا بیان تھا کہ انہوں نے نہ تو کسی بروس نامی گارڈ کو دیکھا اور نہ ہی انہوں نے ماریو کو کسی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ ماریو کی کوٹھری آخر میں تھی اور وہاں تک جانے والے گارڈ کو ان کی کوٹھریوں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ انہوں نے رات۔۔ کبھی کسی گارڈ کو اس حصے میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ گارڈ صرف راہداری کے ساتھ گلی میں چکر لگا لیتے تھے۔ وہ راہداری میں نہیں آتے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ ماریو نے کہیں سے بروس نامی اس گارڈ کے بارے میں سنا تھا اور اس کی مدد سے پوری کہانی تیار کر لی۔ اگرچہ اس کہانی میں بہت سارے سقم تھے۔ بینسن نے ڈیک کے کمرے میں فائل کو از سر نو پڑھا۔ اس نے چند نکات اپنے پاس نوٹ کر لیے۔ اس کے بعد وہ ڈیک کے ساتھ ان گارڈز سے ملا جن کی ڈیوٹی رات کو چیک پوسٹس پر تھی اور ان سب کا حلفیہ بیان تھا کہ انہوں نے ماریو کو چیک پوسٹ سے گزرتے نہیں دیکھا۔ بلکہ اندر والی چیک پوسٹ سے تو کوئی گارڈ بھی باہر نہیں گیا تھا۔ یعنی ماریو کسی کے بھیس میں بھی باہر نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن بہ ظاہر قصور ان گارڈز کا لگ رہا تھا۔ ان سے تفصیلی بیان لینے کے بعد بینسن نے ایک بار پھر جیلر روڈی کے دفتر کا رخ کیا۔ وہ کچھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے بینسن کی آمد پر مسکرانے کی کوشش نہیں کی لیکن اسے بینسن کو وقت تو دینا تھا۔ البتہ بات شروع ہونے سے پہلے اس نے بینسن سے کہا۔

''جب مقامی پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکی تو تم کیا کر لو گے مسٹر مارکر؟''

''یہ دیکھنا میرا کام ہے۔'' بینسن نے نکات والا نوٹ پیپر سامنے رکھا۔ ''مسٹر روڈی میں یہ دیکھنے نہیں آیا ہوں کہ ماریو کسی پُراسرار طریقے سے اپنی کوٹھری سے نکل کر آؤٹ پوسٹ تک جا پہنچا اور اگر وہاں کے گارڈ چوکنا نہ ہوتے تو یقیناً وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔''

روڈی نے بھویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے اس معاملے میں جیل کا عملہ قصوروار ہے؟''

''بالکل... میرا یہی مطلب ہے۔ تمہاری جیل کے حفاظتی انتظامات میں سقم پایا گیا ہے۔ ایک شخص چار چیک پوسٹس کراس کر کے آؤٹ پوسٹ تک جا پہنچتا ہے اور اس سے پہلے اسے کوئی نہیں دیکھتا ہے، وہ بھوت نہیں تھا جو دیواروں سے گزر جاتا۔''

''کیا تم بھوتوں پر یقین رکھتے ہو مسٹر مارکر؟'' روڈی کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے دنیا میں اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں آخر انسان بھی تو مرنے کے بعد کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتا ہے تو بھوت کیوں نہیں ہو سکتے؟'' بینسن نے کہا۔ ''لیکن اس کا اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تب اس واقعے کی کیا وضاحت پیش کی جا سکتی ہے؟''

''وضاحت بہت آسان ہے۔ جن لوگوں کے ذمے قیدیوں کو فرار سے روکنا تھا، وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہے۔''

''لیکن کس طرح... جبکہ وہ اپنی ڈیوٹی پر موجود

رہے تھے؟''

''کیا کوئی ڈالرز کے عوض نہیں بک سکتا ہے؟''

''بیک وقت چار آدمی...؟''

''میں نے دولت کی خاطر پورے گروہ کو بکتے دیکھا ہے۔'' بینسن کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''تمہارے حفاظتی سسٹم میں ایک بڑا نقص راہداریوں کا بنا کسی کیمرے کے ہونا ہے۔ چیک پوسٹ پر لگا کیمرا صرف یہ بتا رہا ہے کہ گارڈ اپنی ڈیوٹی پر ہے یا نہیں ہے۔ وہ وہاں سے گزرنے والے افراد کو نہیں دکھا رہا ہے۔ دوسرے تم نے پرانے حصے بغیر کسی جدت کے یونہی استعمال کر رہے ہو... جس کی وجہ سے سیکیورٹی کے مسائل پیدا ہوئے۔ اس پرانے حصے میں گارڈز رات کو مستقل گشت نہیں کرتے ہیں۔''

''پھر تم کیا کرو گے؟''

''میں ان چار گارڈز کو معطل کرنے کی سفارش کروں گا۔ جیل کے پرانے حصے میں قیدیوں کو نہ رکھنے کی سفارش کروں گا اور جب تک اس کی نئے سرے سے تعمیر نہیں ہو جاتی، اسے استعمال بھی نہیں کیا جائے گا۔''

روڈی نے اپنی ہلکی داڑھی کھجائی۔ ''یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں لیکن ریاست اس کام کے لیے فنڈز فراہم نہیں کر رہی ہے۔''

''میری سفارش میں سب سے پہلے جیل کو ری نیو کے لیے فنڈز کی فراہمی بھی شامل ہو گی۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو ہمارا بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' روڈی مسکرایا۔ ''لیکن یہ بتاؤ رپورٹ میں میرے خلاف تو کچھ نہیں ہے؟''

''نہیں اس میں تم براہ راست شامل نہیں ہوا اگرچہ یہ سب تمہاری جیل میں ہوا ہے۔'' بینسن نے کہا اور فائل و نوٹ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

روڈی نے سکون کا سانس لیا۔ ''اس کا مطلب ہے میرے ریکارڈ پر دھبا نہیں آئے گا۔''

''اس طرح سے نہیں آئے گا کہ کوئی قیدی تمہاری جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔''

''ایسا آج تک نہیں ہوا ہے۔'' روڈی نے فخر سے کہا۔ ''مجھے اس جیل کا چارج سنبھالے دس سال ہو گئے ہیں اور اس دوران میں ایک بھی قیدی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔''

بینسن نے سر ہلایا اور بولا۔ ''سرکاری کام ختم ہو گیا۔ اگر تمہارے پاس وقت تو ہے اس معاملے پر ذرا تبادلۂ خیال کر لیا جائے۔''

روڈی ہچکچایا۔ ''کیا اس کی ضرورت ہے؟''

''ہاں کچھ باتیں وضاحت طلب ہیں۔'' بینسن نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم بات کرو۔'' روڈی نے سر ہلایا۔

''ماریو کو اس کا کیا فائدہ ہوا؟''

روڈی چونکا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''پولیس نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ ماریو نے کہانی اپنی طرف سے بنائی ہے اور وہ کسی طریقے سے جیل کے صحن تک آنے میں کامیاب رہا تھا۔ سوال یہ ہے اگر یہ سب ماریو کی کوشش تھی تو اس نے پلان کے آخر میں کیوں مات کھائی؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں... ممکن ہے اس سے اندازے کی غلطی ہو گئی ہو۔''

''چار چیک پوسٹس کامیابی سے عبور کرنے والے شخص سے ایسی غلطی کی توقع کی جا سکتی ہے؟''

''غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔'' روڈی نے کسی قدر فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''تم اسے ماریو کے بجائے بروس کے بھوت کی کارستانی کیوں نہیں سمجھتے جبکہ تم ان کے وجود پر یقین بھی رکھتے ہو۔''

بینسن نے کہا۔ ''اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ بروس کا بھوت ماریو کی مدد کر رہا تھا اور وہی اسے اندر سے نکال کر لایا تھا تو اس نے عین موقع پر ماریو کو مرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا؟''

روڈی نے سوچا اور بولا۔ ''اگرچہ میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا ہوں... اگر اس بات کو مان لیا جائے تو بڑا سیدھا سا معاملہ ہے۔ بروس کی بیٹی کو کسی شخص نے زیادتی کر کے مار دیا اور اس نے ذہنی توازن کھونے کے بعد خودکشی کر لی لیکن اس کی روح بھٹکتی رہی۔ پھر وہ ایسے مجرموں کا دشمن بن گیا جو کسی لڑکی یا عورت کی آبروریزی اور قتل کے جرم میں سزا پا رہے ہوں۔''

''جیسا کہ ماریو تھا؟'' بینسن لقمہ دیا۔

''بالکل وہ اس کے لیے موزوں ترین شکار تھا۔ ایک تو وہ اسی جرم کا مرتکب ہوا تھا جس کا شکار بروس کی بیٹی ہوئی تھی۔ دوسرے وہ جیل کے اس حصے میں قید تھا جہاں بروس گارڈ ہوا کرتا تھا اس لیے اس نے ماریو کو اس دنیا سے رخصت کرنے کا سوچا اور اسے کوٹھری سے نکال کر وہاں لے آیا جہاں گارڈز نے ماریو کو آزاد پا کر شوٹ کر دیا۔''

''بروس اتنا طاقت ور بھوت تھا کہ اس نے تمہاری جیل

کے حفاظتی انتظامات کو تقریباً ناکارہ کر دیا... پھر اسے ماریو کو ٹھکانے لگانے کے لیے اتنا لمبا چوڑا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی، وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر اسے اس کی کوٹھری میں بھی ٹھکانے لگا سکتا تھا۔''

''ہاں وہ ایسا کر سکتا لیکن اس طرح وہ قوانینِ قدرت میں مداخلت کرتا اس لیے اس نے یہ لمبا راستہ اپنایا اور اس میں کامیاب رہا۔''

''خوب۔'' بینسن کا لہجہ تعریفی ہو گیا۔ ''بھوتوں پر یقین نہ کرنے کے باوجود تم ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔''

روڈی ایک لمحے کو چپ ہو گیا پھر اس نے کہا۔ ''کیا تمہاری آف دی ریکارڈ بات ختم ہو گئی۔''

''نہیں، میرے پاس بھی ایک تھیوری ہے اور میں اسے آف دی ریکارڈ تمہارے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔'' بینسن نے کہا۔ ''یہاں آنے سے پہلے میں نے تمہاری... جیل کے بارے میں کچھ تحقیق کی تھی۔ یہ آرکنساس کی سب سے پرانی جیل ہے اور یہ بہت محفوظ بھی ہے اس کا ریکارڈ امریکا کی جیلوں میں سب سے اچھا کہا جا سکتا ہے۔''

''شکریہ مسٹر مارکر۔'' روڈی نے بے چینی سے کہا۔ ''کیا تم اپنی بات مختصر نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے صرف دس منٹ درکار ہوں گے۔''

''مجھے امید ہے تم اس سے زیادہ وقت نہیں لو گے۔''

''ہاں تو میں جیل کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ یہ پرانی ہے اور اس کا نصف حصہ ابھی بھی پرانے طرزِ تعمیر اور سہولتوں پر مشتمل ہے۔ نئی تعمیرات اور سہولتوں میں تمام قیدیوں کی گنجائش نہیں ہے اس لیے تمہیں مجبوراً پرانی عمارات بھی استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ تمہاری اور عملے کی خواہش ہے کہ پوری عمارت کی جگہ نئی اور جدید عمارتیں بنیں جن میں قیدیوں کو رکھنا اور ان سے نمٹنا آسان ہوتا ہے۔ میں درست کہہ رہا ہوں نا؟''

روڈی نے صرف سر ہلایا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بینسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم گزشتہ چار سال سے ریاست کو فنڈز کی درخواست دے رہے ہو لیکن بہ وجوہ یہ درخواست مسترد ہو جاتی ہے اور اس سال بھی اس کے منظور ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جیل کے پرانے حصے سے ایک قیدی اپنی کوٹھری سے نکل کر آؤٹ پوسٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ پرانی جیل محفوظ نہیں ہے اور اس میں بند قیدی کسی وقت بھی فرار ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل مقامی ٹی وی اور اخبارات کا موضوع یہی ہے۔ ماریو کے مارے جانے سے یہ بھی واضح ہے کہ جیل کے جدید حصے کے انتظامات بہترین ہیں اور کوئی قیدی ان کو توڑ کو فرار نہیں ہو سکتا ہے۔''

روڈی کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''اگر جیل حکام چاہیں تو کوئی قیدی اپنی کوٹھری سے نکل کر آؤٹ پوسٹ تک آ سکتا ہے لیکن صرف آؤٹ پوسٹ تک، اس سے آگے جانے کی اسے اجازت نہیں ہو گی۔''

روڈی کا چہرہ مزید سفید ہو گیا۔ ''لیکن تم ماریو کی کہانی کی کیا وضاحت پیش کرو گے؟''

''کوئی گارڈ بروس کے حلیے میں اس سے مل سکتا ہے۔ اسے اپنے مافوق الفطرت ہونے کا یقین دلا سکتا ہے۔ جیسا کہ وہ اچانک کوٹھری میں آ جاتا تھا۔ اصل میں دروازے کا لاک پہلے ہی کھلا ہوتا تھا اور وہ اندر آنے سے پہلے ماریو کو سگریٹ سلگانے کا موقع دیتا تھا جس میں خفیف سا نشہ ہوتا تھا۔ اس لیے ماریو اس کی چالاکی محسوس نہیں کر پاتا اور سمجھتا کہ وہ اچانک ہی اندر آ گیا ہے پھر وہ پوری سگریٹ پی کر مدہوش ہو جاتا تو گارڈ خاموشی سے باہر چلا جاتا۔ سگریٹ کا نشہ یقیناً ایسا ہوتا ہو گا جس سے انسان کے حواس سلب ہو جائیں اور وہ اپنی عقل سے بیگانہ ہو کر دوسرے کے کہنے پر چلے۔ اس کیفیت میں اسے باہر آؤٹ پوسٹ تک لانا مشکل نہیں تھا۔''

''لیکن اس کا مقصد؟'' روڈی نے اعتراض کیا۔

''جیل کی تعمیر کے لیے فنڈز کا حصول اور مجھے یقین ہے میری رپورٹ کے بعد جیل کے لیے فنڈز منظور ہو جائیں گے۔''

روڈی کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نے بھی اچھی کہانی بنائی ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''تبھی میری رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر بھی نہیں ہو گا۔'' بینسن مسکرایا۔ ''اس بارے میں تم بے فکر رہو۔''

روڈی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا تم مجھ سے متفق ہو؟''

بینسن کھڑا ہو گیا اور بریف کیس اٹھا لیا۔ ''اس حد تک مسٹر روڈی کہ ماریو جیسے درندوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ گڈ بائے۔''

بینسن دروازے کی طرف چل پڑا اور روڈی اسے جاتا دیکھتا رہا... اب اس کے چہرے پر اطمینان لوٹ آیا تھا۔

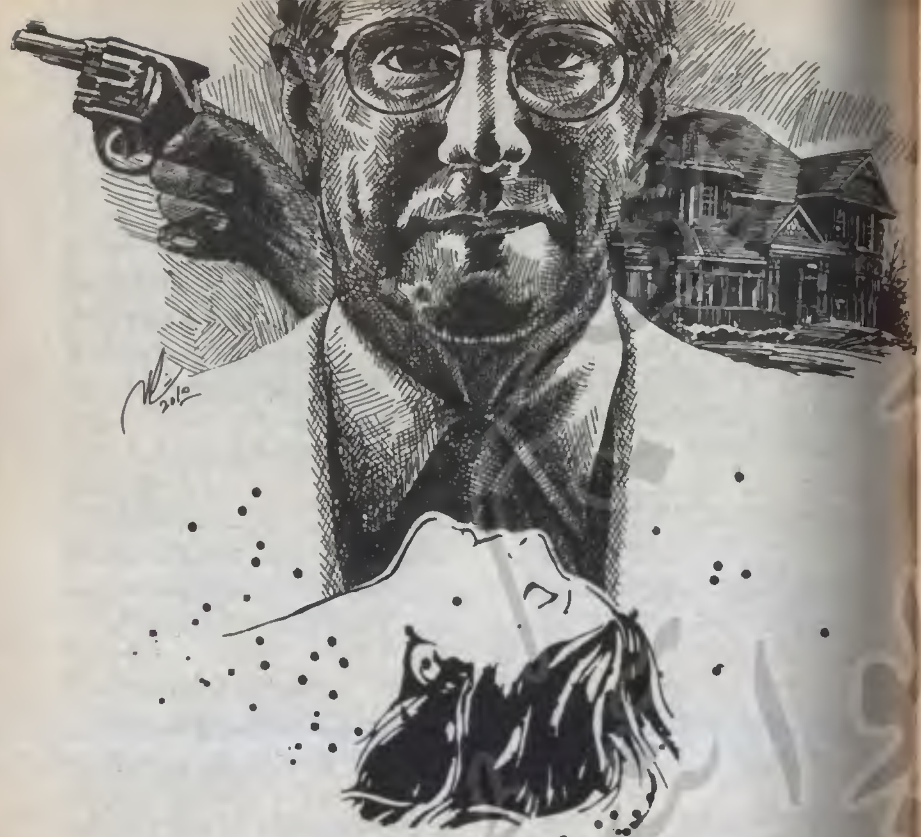

کرتب

سلیم انور

کامیاب ڈکیتی کرنے والے ناکام مجرم کا قصہ۔ اسے پہچان لیے جانے کا خوف تھا۔ اسی خوف کے خاتمے کے لیے وہ ایک خاص شب کا انتخاب کر بیٹھا۔

پولیس اور مجرم کے درمیان کھیلی جانے والی دلچسپ آنکھ مچولی......

یہ اکتیس اکتوبر کی رات تھی۔ ہیلووین کی رات!

اس نے اپنا وار کرنے کے لیے اسی شب کا انتخاب کیا تھا۔ اس واردات کے لیے اس نے پوری احتیاط کے ساتھ پلاننگ کی تھی۔ یہ ایک بھرپور اور اپنے لحاظ سے ایک مکمل پلاننگ تھی۔

عام طور پر اندھیرا پھیلنے کے بعد یہ علاقہ ویران ہو جاتا تھا۔ یوں بھی یہ ایک نواحی علاقہ تھا اور اس کا شمار پُرسکون اور پُرامن علاقوں میں ہوتا تھا۔ لیکن اس رات اس کی سڑکوں، فٹ پاتھوں پر چہل پہل لازمی تھی۔ بچوں کو کینڈی کی تلاش میں نکلنا تھا اور بڑوں کو پارٹیوں میں شرکت کرنا تھی۔ اور کسی کو ماسک پہنے دیکھ کر کوئی کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عجیب و غریب قسم کے لباس اور چہروں پر ماسک پہننا اس تہوار کی خصوصیت تھی۔

اور سب سے عمدہ چیز کسی بھی دروازے پر پہنچ کر

''ٹرک یا ٹریٹ'' کے الفاظ ادا کرتا تھے۔ یہ الفاظ سن کر ہر کوئی بہ خوشی اپنا دروازہ کھول دیتا تھا۔ کسی کے گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو سکتی تھی کہ دروازے پر آنے والا فرد کینڈی طلب کرنے نہیں آیا بلکہ قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔

طاقتور جسم کا مالک روڈی ایک بے رحم قاتل اور پیشہ ور ڈکیت تھا۔ اس کی عمر چالیس برس تھی اور وہ بیس برس سے اسے پیشے سے وابستہ تھا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور احتیاط پسندی کی بنا پر وہ آج تک پکڑا نہیں گیا تھا اور یہی حوالہ اس کی شہرت کا سبب تھا۔

روڈی نے حال ہی میں ایک بینک میں ڈاکا ڈالا تھا اور بینک کا کیشیئر اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ روڈی اس واردات میں بھی صاف بچ نکلا تھا اور پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے میں ناکام رہی تھی۔

لیکن بعد میں اسے یہ سن کر ایک جھٹکا سا لگا تھا کہ پولیس کو ایک ایسا عینی گواہ مل گیا ہے جو اس کے خلاف شہادت دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔

یہ عینی گواہ روڈی کو عمر بھر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا تھا۔

روڈی کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔

روڈی نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے تعلقات اور رابطوں کے ذریعے جونی سمز نامی ایک مقامی بے ایمان پولیس افسر کو تلاش کر لیا جو دس ہزار ڈالرز کے عوض اس عینی گواہ کا نام اور پتا بتانے پر رضامند ہو گیا جس نے روڈی کو بینک ڈکیتی کی واردات میں کیشیئر کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اور روڈی اس وقت اسی گواہ کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

مکان کی تمام لائٹس آن تھیں۔ پورچ میں گھیے کے خشک خول میں ایک بڑی سی شمع روشن تھی۔ مکان کے اندر اسے ہلچل سی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

او کے، اس نے سوچا۔ اب اس کام کو بھی جلد نمٹا دیا جائے۔

اس نے چہرے پر ماسک پہنا اور سر پر مخصوص ٹوپی اوڑھ لی۔ جیب میں موجود ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

کچن میں اینی جنجر بریڈ کو کیز کو بیٹھے کی شکل میں سجا رہی تھی۔ اینی نے اس وقت وہ کاسٹیوم زیب تن کیا ہوا تھا جو اس کے بچوں نے اس کے لیے منتخب کیا تھا... یہ مشہور کردار ممجا کا کاسٹیوم تھا۔ فی الوقت اینی نے کاسٹیوم کا ہڈ نہیں پہنا ہوا تھا کیونکہ وہ بیکنگ میں مصروف تھی۔

سنہری زلفوں والی پینتیس سالہ اینی کو اس وقت اپنے بچے یاد آ رہے تھے جو اپنے دوستوں کے ہمراہ ''ٹرک یا ٹریٹ'' کرنے نکلے ہوئے تھے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس وقت وہ بھی ان کے ہمراہ ہوتی لیکن اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھی۔

اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔

اینی ہاتھ میں کوکیز کی پلیٹ اٹھا کر ہال وے سے گزرتے ہوئے دروازے کی جانب چل پڑی۔ اس وقت دروازے پر کون آ سکتا ہے؟ وہ سوچ رہی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ یہ ہیلووین کی شب ہے۔ بچے ''ٹرک یا ٹریٹ'' کرنے آئے ہوں گے۔ اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

اور پھر اس کی چیخ نکل گئی۔

سیاہ ماسک اور ٹوپی پہنے ہوئے ایک شخص نے اس کے چہرے کے سامنے ریوالور لہراتے ہوئے اسے اندر دھکیلا اور خود بھی اندر آنے کے بعد دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔

کوکیز کی پلیٹ اینی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی اور پورسلین کے ٹکڑوں کے ساتھ جنجر بریڈ کے ٹکڑے بھی ٹائل کے فرش پر بکھر گئے۔

☆☆☆

''تمہارا نام کیا ہے؟'' روڈی نے غراتے ہوئے پوچھا۔ ساتھ ہی کھڑکیوں کے پردے اور بلائنڈز گرا دیے۔

''تم کون ہو؟'' اینی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''نام بتاؤ؟'' روڈی نے ترش لہجے میں کہا۔

''اینی۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟'' روڈی نے ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

مکان کا صرف یہ حصہ روشن تھا۔ باقی پورا مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اینی کے چہرے پر خوف و دہشت کے سائے منڈلانے لگے۔ وہ اپنے ممجا کے ڈھیلے ڈھالے سیاہ رنگ کے کاسٹیوم میں سمٹ گئی۔ ''وہ باہر گیا ہوا ہے۔'' اینی نے کانپتی آواز میں بتایا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''وہ کب واپس آئے گا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''بتاؤ!'' روڈی نے غراتے ہوئے کہا۔

اینی پر کپکپی طاری ہو گئی۔

''مجھے معلوم ہے کہ وہ سات بجے اپنے کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اسے اس وقت تک گھر لوٹ آنا چاہیے تھا۔'' روڈی نے ایک بار پھر اپنا ریوالور لہرایا۔

''چھٹی کے بعد اسے چند کاغذات کہیں پہنچانے تھے۔ اس لیے اس کی واپسی ساڑھے آٹھ بجے تک ہو گی۔'' اینی نے بتایا۔

ابھی ساڑھے آٹھ بجنے میں چالیس منٹ باقی تھے۔ روڈی نے سوچا کہ وہ اس وقت تک انتظار کر سکتا ہے۔

اینی آنکھیں پھاڑے روڈی کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

روڈی ...... اینی کے شوہر کی آمد کا منتظر تھا۔ ان کے درمیان کافی دیر تک خاموشی رہی۔

پھر اینی گویا ہوئی۔ ''سنو! کیا تم وہی شخص ہو جس کے خلاف میرا شوہر عدالت میں گواہی دینے والا ہے؟''

''مطمئن رہو، میں کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' روڈی نے اسے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ اس نے بینک میں جو کچھ دیکھا تھا اسے فراموش کر دے۔ وہ تعاون کرے گا تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔'' پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میری بات دھیان سے سنو، اینی! اسی طرح مصروف اور نارمل رہو جیسے کہ تم عام طور پر رہتی ہو۔ اگر بچے تمہارے دروازے پر آتے ہیں تو مسکراتے ہوئے انہیں کینڈی پیش کرنا اور کہنا کہ تمہیں ان کے کاسٹیوم پسند آئے۔ پھر انہیں جلدی سے چلتا کر دینا۔ کیا سمجھیں؟''

''میرے پاس کینڈی نہیں ہے۔ میں کوکیز دیتی ہوں۔ یہ ہماری روایت ہے۔'' اینی کی آواز رندھ گئی اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

''جو کچھ بھی بچوں کو پیش کرتی ہو، وہی پیش کر دینا۔ بس اپنا کام کرتی رہو۔ اور ہاں، یہ گندگی صاف کر دو۔'' روڈی نے فرش پر بکھرے ہوئے ٹوٹی ہوئی پلیٹ اور جنجر بریڈ کے ٹکڑوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اینی نے جلدی جلدی فرش صاف کیا پھر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔

وہ کوکیز کی ایک اور پلیٹ سجانے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرہ ڈیکوریٹ کرنے والی آئسنگ کے

ایک افریقی ملک میں جہاں ٹیلی وژن کی نشریات صرف ایک چینل پر تھیں اور صرف حکومت کے پسندیدہ پروگرام نشر ہوا کرتے تھے، لوگوں کے احتجاج پر حکومت نے دوسرے چینل پر بھی پروگرام شروع کرنے کا حکم دے دیا۔

ایک رات چینل نمبر ایک پر سربراہ مملکت کی تقریر ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ طویل تقریر سے تنگ آ کر ایک صاحب نے اپنے ٹی وی پر دوسرے چینل کا بٹن دبا دیا۔ اسکرین پر ایک پولیس والا نظر آیا جو ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''چینل نمبر ایک لگاؤ ورنہ گولی مار دوں گا!''

مانند سفید ہو رہا تھا۔

''تیز تیز ہاتھ چلاؤ۔'' روڈی نے حکم دیا۔

تبھی اچانک ڈور بیل ..... بج اٹھی۔ ساتھ ہی ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''ٹرک یا ٹریٹ!''

اینی نے تیار کی ہوئی کوکیز ایک بڑی سی پلیٹ میں رکھ دیں اور پلیٹ اٹھا کر ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے دروازے کی جانب چل پڑی۔

ابھی وہ دروازے کے نزدیک ہی پہنچی تھی کہ روڈی نے اسے آواز دی۔ ''اے اینی! ابھی رک جاؤ۔'' پھر وہ لپک کر اس کے پاس پہنچا اور دانت نکالتے ہوئے پلیٹ میں رکھا ہوا سب سے اوپری بسکٹ اٹھا لیا۔ پھر اس نے اس بسکٹ کو پلٹ دیا۔

اس بسکٹ پر آئسنگ سے پیغام لکھا ہوا تھا۔ ''384 ایلم... پولیس کو فون کر دو۔''

اینی کے شانے لٹک گئے۔ وہ خوف زدہ نظروں سے روڈی کو دیکھنے لگی۔

''عمدہ کوشش ہے۔'' روڈی نے ستائشی لہجے میں کہا۔ پھر باقی تمام کوکیز کو بھی پلٹ کر چیک کرنے لگا۔ کسی پر بھی کوئی پیغام نہیں تھا۔ ''اب تم دروازہ کھول سکتی ہو۔'' اس نے دروازے کی آڑ لیتے ہوئے کہا۔ البتہ اس کے ریوالور کا رخ بدستور اینی کی جانب تھا۔

لڑکی کو ٹریٹ دینے کے بعد اینی نے دروازہ بند کر دیا اور پلٹ آئی۔ روڈی نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ بسکٹ جس پر

مدد کا پیغام درج تھا، کھانے لگا۔ بسکٹ واقعی ذائقے دار تھا۔
''مزے دار بسکٹ تھا۔'' روڈی نے ستائشی لہجے میں تبصرہ کیا۔
دونوں خاصی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ لیونگ روم میں صرف پرانے..... زمانے کے کلاک کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔ اس وقت آٹھ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔
پھر ان کے درمیان چھائی ہوئی خاموشی کو اینی نے توڑا۔ وہ اب اپنے حواسوں پر قابو پا چکی تھی۔ ''تم اچھے خاصے اسمارٹ دکھائی دیتے ہو۔ تم لوگوں کو لوٹتے کیوں ہو؟''
''تم کوکیز کیوں بناتی ہو؟''
''معلوم نہیں کیوں۔'' اینی نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے اچھے لگتے ہیں اور میں انہیں عمدگی سے بناتی ہوں۔''
یہ سن کر روڈی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔''
اینی یہ سن کر سراسیمہ ہو گئی۔ ''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟ تمہارے جواب سے تو ایسا لگتا ہے جیسے .... یہ بھی کوئی مشغلہ یا جاب ہو۔''
''میرے لیے یہ ایک مشغلہ ہی ہے اور جاب بھی۔'' روڈی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''لیکن بینک ڈکیتی کی واردات کے موقع پر میرے شوہر نے ایک کیشیئر کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔'' اینی نے کہا۔
''وہ میری غلطی نہیں تھی۔''
''تمہاری غلطی نہیں تھی؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسے تمہارے ساتھی نے گولی ماری تھی؟''
اس جملے پر روڈی کو اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ وہ تنک کر بولا۔ ''میں اپنا کام تنہا سرانجام دیتا ہوں۔ میں نے آج تک کبھی کسی کو اپنا پارٹنر نہیں بنایا اور نہ ہی کسی کو پارٹنر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ میری غلطی نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے اسے الارم استعمال کرنے سے منع کیا تھا لیکن اس نے الارم کا بٹن دبانے کی کوشش کی تھی۔''
''سو یہ اس کی غلطی تھی؟''
''ہاں، اسے جو کچھ کرنے کو کہا گیا تھا، اس نے نہیں کیا۔ تب مجھے اس کو قتل کرنے کا حق مل گیا تھا۔''
''تم بیمار لگتے ہو۔''
''نہیں، میں بیمار نہیں بلکہ ایک پیشہ ور ہوں۔'' روڈی نے اینی کے جملے کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

ان کے درمیان دوبارہ خاموشی چھا گئی۔
پھر جونہی گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے، انہیں گیراج کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔
آواز سنتے ہی اینی روہانسی ہو گئی۔
''تم کچن میں جاؤ۔'' روڈی نے اینی سے کہا۔
اینی ہچکچاتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ روڈی بھی اس کے پیچھے کچن میں آ گیا اور کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اب اینی اور کچن کا وہ دروازہ جو گیراج میں کھلتا تھا اور جس سے اینی کے شوہر کی کچن میں آمد متوقع تھی، دونوں ہی روڈی کے نشانے کی زد میں تھے۔
البتہ روڈی نے اپنا ریوالور اپنی کمر کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اینی خوف زدہ ہو کر کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کر دے۔ البتہ اس کا ارادہ یہی تھا کہ جونہی اینی کا شوہر اندر قدم رکھے گا، وہ پلک جھپکتے میں ریوالور نکال کر ان دونوں کو قتل کر دے گا۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔
کچن کے دروازے میں گیراج کی سمت سے تالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔
روڈی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے اپنے کام کی تکمیل میں صرف دس سیکنڈ کی مہلت درکار تھی۔ پھر اس کی تمام الجھنیں ہمیشہ کے لیے حل ہو جاتیں...
لیکن پھر کچھ نہیں ہوا۔
دروازہ نہیں کھلا تھا۔ گیراج کی سمت مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
روڈی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے...؟''
لیکن اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس کے عقب سے ایک درشت آواز ابھری۔ ''رچرڈ روڈولف عرف روڈی! پولیس۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ تم پوری طرح ہماری زد میں ہو۔''
روڈی دھیرے دھیرے آواز کی سمت گھوم گیا۔ البتہ اس نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے تھے۔
سامنے بلٹ پروف جیکٹوں میں ملبوس تین پولیس افسر اس پر پستولیں تانے الرٹ کھڑے تھے۔
''ہاتھ اوپر اٹھا لو، روڈی!'' اینی کی غراہٹ نما آواز گونجی۔
روڈی نے ایک اچٹتی نگاہ اینی پر ڈالی۔
اینی نے بھی اپنا پستول نکال لیا تھا۔ جو اس نے اپنے

نِنجا کاسٹیوم کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ اس کے پستول کا رخ بھی روڈی .... کی جانب تھا۔ اس کی سرد آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اس نے اینی کا حکم نہ مانا تو وہ اس پر گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گی۔ وہ اسے اتنی ہی آسانی سے شوٹ کر دے گی جس آسانی سے اس نے کوکیز پر آئسنگ پھیلائی تھی۔

☆☆☆

روڈی کچن کے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ چکی تھیں اور اسے نصف درجن سراغ رسانوں اور باوردی پولیس افسران نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ روڈی کی نظریں درمیانی عمر کے ایک دبلے پتلے سراغ رساں پر جمی ہوئی تھیں جو ان سب کا انچارج دکھائی دے رہا تھا۔
یہ سراغ رساں جونی سمز تھا جس سے روڈی نے دس ہزار ڈالرز کے عوض بینک ڈکیتی کے اس عینی شاہد کا نام اور گھر کا پتا حاصل کیا تھا۔
روڈی کینہ توز نگاہوں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔
''ہائے روڈی!'' جونی سمز نے اسے اپنی جانب متوجہ پا کر مسکراتے ہوئے کہا۔
''تو تم نے مجھے پھنسایا ہے؟'' روڈی نے غراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے خود کو بے ایمان ظاہر کرتے ہوئے یہ جال پھیلایا جبکہ حقیقت میں اس قتل کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا... ہے نا؟''
''نہیں۔'' جونی سمز نے کہا۔ ''ہم نے صرف یہ بات پھیلا دی تھی کہ ہمیں موقع واردات کا عینی گواہ مل گیا ہے اور تم ہمارے اس جال میں پھنس گئے۔''
''اور یہ مکان؟''
''یہ مکان ہم نے ایک ریٹائرڈ سراغ رساں اور اس کی بیوی سے مستعار لیا ہے۔ وہ دونوں آج کل فلوریڈا میں ہیں اور تعطیلات منا رہے ہیں۔ ہم نے ایک پورا دن یہاں پر ویڈیو کیمرے نصب کرنے میں لگایا تھا۔ ہماری ٹیکنیکل ٹیم نے نہایت عمدگی سے کام کیا ہے۔ تمہیں کچھ بھی پتا نہیں چل سکا۔ نہ ہی کسی قسم کا شبہ ہوا۔''
روڈی کو پتا چلا کہ اینی بھی ایک پولیس سراغ رساں اور جونی سمز کی پارٹنر ہے۔ اس کا پورا نام ..... اینی بیرو تھا۔ اس کا مشن روڈی کو گھیرنا اور اس سے ٹیپ پر یہ اعتراف کرانا تھا کہ اس نے نہ صرف بینک لوٹا تھا بلکہ کیشیئر کو قتل بھی کیا تھا۔
اور روڈی اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس نے خوشی خوشی تمام حقائق اگل دیے تھے اور اعتراف کر لیا تھا۔
وہ غیر یقینی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ بسکٹ جس پر تم نے آئسنگ سے مدد کا پیغام تحریر کیا تھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟''
اینی نے شانے اُچکا دیے۔ ''مجھے تمہیں یہ یقین دلانا تھا کہ میں کوئی پولیس وومن نہیں ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس گمان میں رہو کہ میں حقیقت میں تم سے خوف زدہ ہوں۔''
روڈی غراتے ہوئے بولا۔ ''او کے، تم نے مجھے گھیر لیا... لیکن تم لوگ پاگل ہو! ذرا ان تمام بچوں کا خیال کرو جن کی زندگی کو تم نے آج شب خطرے میں ڈال دیا تھا۔ میں فائرنگ بھی کر سکتا تھا...؟''
جونی نے تیوریاں چڑھا لیں۔ ''ہم نے کسی کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا۔ جس لمحے تم نے اس گھر میں قدم رکھا تھا اسی لمحے ہم نے اس پورے بلاک کو سیل کر دیا تھا۔ یہاں نہ کوئی آ سکتا تھا اور نہ ہی یہاں سے نکل سکتا تھا۔''
''لیکن جو بچے دروازے پر ''ٹرک یا ٹریٹ'' کے لیے آتے رہے تھے، وہ؟'' روڈی پھٹ پڑا۔ ''میں نے خود ان کے ''ٹرک یا ٹریٹ'' کے الفاظ سنے تھے۔''
''اوہ، وہ بچے...'' ایک نوجوان پولیس وومن نے کہا۔
''وہ میں تھی!'' اس عورت کی آواز بالکل نوعمر بچی کی سی تھی۔ ''میں ہی پانچ مرتبہ مختلف کاسٹیوم پہن کر یہاں آئی تھی کہ اگر تم جھانک کر دیکھ رہے ہو تو تمہیں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔'' پھر وہ پولیس وومن اینی کی جانب گھوم گئی۔ ''باّئی دی وے کوکیز بڑی زبردست تھیں۔ میں نے سب کی سب کھا لی تھیں۔''
تب اینی نے روڈی کی طرف دیکھتے ہوئے ایک قہقہہ بلند کیا۔
''ایسی کیا مضحکہ خیز بات ہے جو تم قہقہہ لگا رہی ہو؟'' روڈی بڑبڑایا۔
''مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ تم نے اپنا وار کرنے کے لیے آج کی رات کی منصوبہ بندی کی تھی۔''
''ہاں، تو پھر؟''
''یہ ہیلووین کی رات ہے۔ ٹھیک؟ ویل، لگتا ہے کہ ہمیں ٹریٹ مل گئی اور تمہارے حصے میں ٹرک آ گئی۔ ''ٹرک یا ٹریٹ'' دونوں ہی باتیں پوری ہو گئیں۔'' پھر وہ باوردی پولیس افسران کی جانب گھومتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی.... ''او کے! اسے پولیس اسٹیشن لے جاؤ اور پرچہ کاٹ دو!''
یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

باب

اسماقادری

سترھویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بالائر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کتنے رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسرشاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ شہریار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو گود دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیرآباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہا گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب انہیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہریار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پاکر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوشے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کراتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ۔۔۔ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نورپور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ ادھر چودھری شہریار کو پھنسانے کے لیے چالیں چلتا ہے، مگر کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرِعتاب آجاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماہ بانو تنہا اس برف زار میں بھٹکتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار نیویارک سے واپس آکر رانی پر بے انتہا تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پاکر چودھری کے ریوالور سے خود کو ختم کر لیتی ہے۔ شہریار نورپور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اتائی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ جگو مل جاتا ہے اور وہ شہریار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری افتخار ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ شہریار کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ڈیرے پر ریڈ کرتا ہے مگر آفتاب کو بازیاب نہیں کرا پاتا۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلائمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ آفتاب کی حالت خاصی خراب ہوتی ہے۔ اسے لاہور کے اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر کشور بھی صدمے سے بے ہوش ہوتی ہے۔ تاہم آفتاب کے وہاں پہنچنے پر اس کی حالت میں بہتری آنے لگتی ہے۔ دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو پاکستان بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہریار فوراً اسکردو پہنچ

جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اسے یہ کہہ کر منع کر دیا جاتا ہے کہ انویسٹی گیشن جاری ہے تاہم وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کرنے کا منصوبہ بنا لیتا ہے۔ ادھر صحافی افضل پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے لیکن وہ زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچ جاتا ہے۔ اسپتال میں ایک میل نرس اسے میڈیسن دینے آتا ہے مگر وہ اسے دوائیں دینے نہیں بلکہ موت کے گھاٹ اتارنے آتا ہے۔ افضل اپنے بچاؤ کے لیے سائڈ ٹیبل پر رکھی شیشی اسے مارتا ہے جو اس کی آنکھ پر لگتی ہے مگر دشمن کے ہاتھ میں موجود پسٹل سے فائر ہو چکا ہوتا ہے۔ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گولی سینے میں داخل ہونے سے قبل افضل نے حملہ آور کو پہچان لیا تھا۔ وہ یقینی طور پر مہتاب کا وہی کزن تھا جس کو اس کا نام نہاد منگیتر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اپنے اس نیم خواندہ اور آوارہ گرد کزن کو اس کی بدکرداری کے سبب چھوڑ کر مہتاب نے افضل کا انتخاب کیا تھا۔ قبائلی رسم و رواج میں جکڑی مہتاب سیدھے راستے سے افضل کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی تھی، چنانچہ اس نے بہت خاموشی سے اپنا گھر چھوڑ کر افضل سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ افضل اور اس کے مابین تعلقات کا... کسی کو علم نہیں تھا اس لیے اس کے خاندان والوں کے لیے ... افضل تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ ان دونوں میاں بیوی کی احتیاط پسندی بھی تھی جس نے اتنے برسوں تک انہیں محفوظ رکھا تھا لیکن مہتاب کا کزن یقیناً اتنے برسوں میں بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا اور انتقام کے جنون میں آخرکار اس نے ان لوگوں کا کھوج لگا ہی لیا تھا۔ اب وہ افضل کی پھینکی ہوئی بوتل سے آنکھ پر چوٹ کھانے کے بعد بھی جنونی انداز میں ہنس رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھ سے بہتے خون کے بجائے افضل کے سینے سے ابلتا خون کا فوارہ اور اس کا تکلیف سے تڑپتا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ یہ منظر اس کے سینے میں برسوں سے جلتی انتقام کی آگ کے لیے باعثِ تسکین تھا۔

اپنی اس جنونی کیفیت میں وہ کمرے کے دروازے کا کھلنا محسوس نہیں کر سکا۔ وہ ایک نرس تھی جو ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آئی تھی لیکن دروازہ کھولتے ہی اسے جو منظر نظر آیا، اس نے پل بھر کے لیے اسے ساکت کر دیا۔ اس کے سکتہ زدہ وجود میں پہلی حرکت ہاتھوں کی لرزش کی صورت میں پیدا ہوئی جس کے باعث اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے گر پڑی۔ ٹرے گرنے کے ساتھ ہی اس کا منہ کھلا اور اس نے ایک زوردار چیخ ماری۔ ٹرے گرنے اور نرس کے چیخنے کی آوازیں سن کر جنونی قاتل دروازے کی طرف متوجہ ہوا اور تیزی سے نرس کی طرف قدم بڑھائے لیکن اس مرحلے پر نرس نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور پھرتی سے باہر نکل کر دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ نرس کی حرکت نے افضل کے قاتل کو یہ احساس دلایا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے... اس نے دیوانہ وار دروازے پر لاتیں اور مکے برسانے شروع کر دیے۔

ادھر نرس بھی مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس ہنگامے نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر دیا۔ اسپتال میں موجود گارڈز بھی دوڑے آئے اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن خوف زدہ نرس سوائے چیخنے اور بند دروازے کی طرف اشارہ کرنے کے کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھی۔ بہرحال اس کے اشارے نے اتنا تو گارڈز کو سمجھا ہی دیا کہ جو بھی گڑبڑ ہے، وہ افضل کے کمرے کے اندر ہے۔ خاص طور پر دروازے کے ساتھ اندر سے کی جانے والی زورآزمائی بڑی معنی خیز تھی۔ گارڈز نے اپنی گنز سمیت دروازے کے باہر پوزیشن لے لی۔

''اندر جو کوئی بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئے۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔'' ایک گارڈ نے بلند آواز میں حکم جاری کیا۔ دوسری طرف خوف زدہ نرس کو اس کی دو ساتھی نرسیں مل کر سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا اور اس کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ صورتِ حال ایسی تھی جس نے اچھے خاصے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور اسپتال کے عملے کے علاوہ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے کافی لوگوں کا بھی وہاں ہجوم لگ گیا تھا۔

''آپ سب لوگ یہاں سے ہٹ جائیں۔ ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔'' گارڈ بلند آواز میں چلایا۔ اس کی بات سن کر ہجوم منتشر ہونے لگا لیکن تجسس کے مارے دو چار افراد اب بھی ایسے تھے جو وہاں سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گارڈ نے انہیں ایک بار پھر تنبیہ کی اور کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ طے کیا اور پھر ان میں سے ایک نے کنڈی ہٹا کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی اندر سے آئی اور کاؤنٹر سے لگ کر کھڑے نوجوان کے سر میں گھس گئی۔ وہاں موجود لوگوں کی منظر دیکھ کر چیخیں نکل گئیں اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے والے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

گارڈز ان لوگوں کی طرف سے بے نیاز اندر موجود شخص سے نمٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ اندر موجود شخص مسلح ہے اور کوئی نیک ارادہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ گارڈز کو بھی اپنی گنز کا استعمال کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا اور وہ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس گئے۔ جواب میں اندر سے بھی گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن گارڈز کی چلائی گئی گولیاں اپنا کام دکھا چکی تھیں چنانچہ اندر موجود شخص کو دو سے زیادہ فائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔

مسلح گارڈز جب کمرے کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بستر پر موجود مریض اپنے ہی خون میں نہایا ہوا ساکت پڑا ہے جبکہ دوسرے شخص کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے دائیں شانے اور پیٹ میں گولیاں لگی تھیں۔ ایک آنکھ سے بھی خون بہہ رہا تھا جو اس کے چہرے پر پھیل کر اسے کافی بھیانک بنا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر فرش پر پڑا پسٹل ظاہر کر رہا تھا کہ کچھ دیر قبل وہی اس پسٹل کو استعمال کر رہا تھا لیکن گارڈز کی چلائی گئی گولیوں نے کام دکھایا اور وہ پسٹل استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا۔ حملہ آور کو بے دست و پا پا کر گارڈز نے امدادی کارروائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ فوراً ہی اسپتال کے منتظم کو بہتر صورتِ حال کی اطلاع کر دی گئی اور پھر اس کے حکم پر ڈاکٹرز اور پیرا میڈیکل اسٹاف حرکت میں آ گیا۔ افضل کے سرسری معائنے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سینے میں لگنے والی گولی کام دکھا چکی تھی اور اس کی روح کا جسم سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا جبکہ زخمی حملہ آور نازک حالت میں ہونے کے باوجود زندہ تھا۔ اس شخص کے قاتل ہونے سے قطع نظر اسے طبی امداد دی جانے لگی۔ اتفاق سے تھانہ، اسپتال سے قریب ہی تھا اور یہ سارا ہنگامہ شروع ہوتے ہی وہاں اطلاع کر دی گئی تھی۔ چنانچہ پولیس خلافِ عادت کافی جلدی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پولیس والوں کی موجودگی اور اجازت نے اسپتال کی انتظامیہ کے لیے حملہ آور کو بروقت طبی امداد پہنچانا آسان کر دیا تھا لیکن جب ڈاکٹرز نے اس کا ٹریٹمنٹ شروع کیا تو انہیں احساس ہو گیا کہ ان کی کوششیں کارگر ثابت نہیں ہوں گی اور کسی بھی لمحے یہ شخص اپنی زندگی ہار جائے گا۔ انہوں نے پولیس کارروائی کے لیے وہاں رکے ہوئے پولیس آفیسر کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹرز کی زبانی یہ جاننے کے بعد کہ حملہ آور فی الحال زندہ ہے اور بیان دینے پر رضامند بھی نظر آتا ہے، اس نے فوراً کارروائی کے لیے کمر باندھ لی۔ اس کے ساتھی پہلے ہی جائے وقوعہ کی تفصیلات جمع کرنے، آلۂ قتل کو اپنے قبضے میں لینے اور عینی شاہدین کے بیانات لینے کا کام کر رہے تھے۔ حملہ آور کی گولی کا شکار ہو جانے والے نوجوان کی لاش بھی کاؤنٹر کے پاس سے اٹھوالی گئی تھی لیکن ان کارروائیوں سے بڑھ کر حملہ آور کا بیان تھا۔ اس کے بیان سے صورتِ حال واضح ہو جاتی اور پولیس کو زیادہ مغز ماری کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ چنانچہ انکوائری آفیسر ڈاکٹرز کی طرف سے اشارہ ملتے ہی فوراً اپنے معاون کے ساتھ قریب المرگ حملہ آور کے پاس جا پہنچا۔

''میرا نام صائب خان ہے۔ صحافی افضل اور اس کے بیوی بچوں کا قتل میں نے ہی کیا ہے اور مجھے اپنے اس عمل پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔'' پولیس والوں کو دیکھتے ہی حملہ آور نے انہیں کسی سوال کی مہلت دیے بغیر خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''تم نے ان لوگوں کو کیوں قتل کیا؟ کیا تمہاری افضل سے کوئی دشمنی تھی؟'' انکوائری آفیسر نے تیزی سے سوال کیا جس کے جواب میں صائب خان کے چہرے پر نفرت چھا گئی۔

''افضل نے میری غیرت کو للکارا تھا۔ افضل کی بیوی مہتاب میری بچپن کی منگ تھی لیکن اس نے نہ جانے کب اسے ورغلا کر اپنے ساتھ بھاگنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے یہ کام اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ مجھ سمیت کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا کہ مہتاب کو ورغلا کر لے جانے والا وہ ہے۔ بہرحال میں نے قسم کھائی تھی کہ جس کسی نے بھی یہ کام کیا ہے، میں مرتے دم تک اسے تلاش کروں گا اور اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔'' صائب خان کے ہر لفظ سے زہر ٹپک رہا تھا۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ نفرت و غصے کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ درحقیقت اپنے قول کے مطابق اس نے مرتے دم تک اپنی غیرت کو للکارنے والے سے دشمنی نبھائی تھی۔

''پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ افضل ہی تمہاری کزن مہتاب کو بھگا کر لے گیا تھا؟'' پولیس آفیسر کو صائب خان کی اکھڑتی سانسوں سے زیادہ ساری کہانی جان لینے میں دلچسپی تھی۔

''ایک دن میں... ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہا تھا، تب میں نے افضل کو دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ ایک بار یہ صحافی ہمارے ہاں آ کر رکا تھا۔ اگرچہ یہ مہتاب کے غائب ہونے سے بہت پہلے کی بات تھی لیکن پھر بھی میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس سارے معاملے کے پیچھے افضل ہو۔ اپنے شک کی بنیاد پر میں افضل کو تلاش کرتا ہوا لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے اس کے دفتر کا پتا معلوم کرنے میں

زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ دفتر ہی سے میں نے اس کے گھر کا پتا حاصل کر لیا اور خاموشی سے وہاں پہنچ کر نگرانی کرنے لگا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر مہتاب ہی افضل کی بیوی ہے تو وہ کسی وقت تو گھر سے باہر نکلے گی اور میں اسے پہچان لوں گا۔ مہتاب گھر سے باہر تو نہیں نکلی لیکن افضل کے گھر پہنچنے پر اس نے گیٹ کھولا تو مجھے اس کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ اسے دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس وقت تو وہاں سے واپس آ گیا لیکن آدھی رات کے بعد پھر وہاں پہنچا۔ میرا ارادہ تھا کہ سوتے میں خاموشی سے افضل اور مہتاب کا کام تمام کر دوں گا لیکن اس رات جب میں ان کے گھر میں داخل ہوا تو افضل گھر پر نہیں تھا۔ میں نے مہتاب اور اس کے بچوں کو گولی مار کر ختم کر دیا اور اس کے بعد افضل کی تاک میں رہنے لگا۔ ایک بار مجھے موقع ملا تو افضل کو اس کی قسمت نے بچا لیا لیکن وہ کب تک بچتا؟ دیکھ لو! آخرکار میں نے اس سے اپنا انتقام لے ہی لیا۔'' اپنی بات کے اختتام پر صائب خان نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا لیکن..... اپنے قہقہے کی تاب نہیں لا سکا۔ اس کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں میں اس قہقہے نے اکھاڑ پچھاڑ مچا دی۔ وہاں موجود ڈاکٹر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کی زندگی سے پہلے ہی مایوسی ظاہر کر دینے کے باوجود ڈاکٹر کو اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری تو نبھانی ہی تھی۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ صائب خان نے اتنا لمبا چوڑا بیان کس طرح دے دیا؟ یقیناً یہ اپنے مقصد میں کامیابی کا نشہ... تھا جو اس نے موت کی آغوش میں جاتے جاتے بھی بڑے فخر سے اپنا سارا کارنامہ سنا ڈالا تھا۔

☆☆☆

''میں نے حادثے کے متعلق معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اب میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہم اپنا اتنا اہم ٹھکانا کھو بیٹھے۔'' لنڈا نیو پارک میں موجود ڈیوڈ کو رپورٹ پیش کرنے کے لیے تیار تھی۔ میجر ذیشان سے اس نے ایک رات میں ہی اتنا کچھ اگلوا لیا تھا کہ اس پر صورتِ حال واضح ہو گئی تھی۔

''گڈ! مجھے تم سے اسی تیز رفتاری کی امید تھی اسی لیے تو میں نے تمہاری جدائی گوارا کر کے تمہارا پاکستان جانا منظور کر لیا تھا۔'' اس کی طرف سے کامیابی کی نوید سن کر ڈیوڈ کھل اٹھا۔

''میں جانتی ہوں ڈارلنگ! اگر یہاں میری اتنی ضرورت نہیں ہوتی تو میں خود بھی تم سے دور رہنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن مجھے اس معاملے کے ساتھ ساتھ چودھری کو بھی تو دیکھنا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم چودھری کو جس پروجیکٹ کے

جی ہاں! یہ کینوس بالکل سادہ ہیں کیونکہ آج کل میں چھٹی پر ہوں

لیے استعمال کر رہے ہیں، وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔'' اس کی بات پر مسکراتے ہوئے لنڈا نے اسے جواب دیا۔ موساد کے لیے خدمات انجام دیتے ہوئے اگرچہ وہ بے شمار مردوں کو اپنی جسمانی قربت سے فیض یاب کر چکی تھی لیکن ڈیوڈ کا معاملہ سب سے جدا تھا۔ وہ واقعی ڈیوڈ سے محبت کرتی تھی۔

''میں سب سمجھتا ہوں۔ تم باقی باتیں جانے دو اور فی الحال مجھے اس معاملے کی تفصیلات بتاؤ کہ تم نے کیسے اور کیا معلومات حاصل کیں؟''

''اپنے مقامی نمائندے سے ہمیں یہ تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ اس کیس کی تحقیقات آرمی انٹیلی جنس کا ذیشان نامی ایک میجر کر رہا ہے۔ بس میں اس میجر کو اپنے دام میں لے آئی اور توقع کے خلاف ایک رات میں ہی اس سے بہت کچھ اگلوا لیا ہے۔ بے چارہ شاید عرصے سے عورت کی قربت کے لیے ترسا ہوا تھا اسی لیے فوراً ہی میرے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ میجر ذیشان اور اپنے آدمیوں سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق ہمارے نقصان کا سبب وہ لڑکی ماہ بانو بنی ہے جسے تم نے اغوا کروا کر پہاڑی ٹھکانے پر قید... کیا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل نے چونکہ اسے اپنی ذمے داری پر بلتستان بھجوایا تھا، چنانچہ وہ اس کے اغوا کا سن کر بہت پریشان ہوا اور اس نے اپنے ڈرائیور مشابرم خان کو بھائی کی تدفین میں شرکت کے علاوہ ماہ بانو کی تلاش کے لیے بھی بلتستان روانہ کر دیا۔ مشابرم خان خود بھائی کی موت کا انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا چنانچہ اس نے دل و جان

سے ماہ بانو کو اغوا کرنے والوں کی تلاش شروع کر دی۔ ہمارے لوگ اس کی ساری کارروائیاں دیکھ رہے تھے لیکن انہیں امید نہیں تھی کہ مشابرم خان ماہ بانو تک پہنچ سکے گا لہٰذا انہوں نے اسے چھیڑنا غیر ضروری سمجھا اور دور سے ہی اس پر نظر رکھے رہے۔ وہ اپنی تلاش کے سلسلے میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا، تب بھی کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی خیال تھا کہ وہ کسی صورت پہاڑی ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکتا اور ناکام ہو کر خود ہی واپس پلٹ جائے گا۔ لیکن مشابرم خان کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ٹھکانے پر جا پہنچا۔ وہاں اس کی ہمارے آدمیوں سے جھڑپ ہوگئی اور کچھ اس طرح کی صورتِ حال پیش آئی کہ پہلے وہاں موجود ایندھن میں پھر اسلحے کے ذخیرے میں آگ لگ گئی جس کا نتیجہ دھماکوں کی صورت میں نکلا اور وہاں موجود تقریباً سارے ہی لوگ مارے گئے۔ چند ایک افراد کے ساتھ مشابرم خان زخمی حالت میں زندہ بچ نکلا اور اس نے آرمی والوں کو ساری تفصیلات سنا دیں۔ باقی زخمیوں میں سے دو آدمی...... زخموں کی تاب نہ لاکر مر گئے جبکہ تین کو ہمارے آدمیوں نے باری باری خفیہ طور پر موت کی نیند سلا دیا تاکہ وہ کوئی بیان دینے کے لیے باقی... نہ رہیں۔ مشابرم خان تک البتہ ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر آرمی انٹیلی جنس والوں نے اسے بہت خفیہ طور پر اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ خود میجر ذیشان بھی اب اپنے آفیسر کرنل توحید کو مطلع کیے بغیر اس سے ملاقات نہیں کر سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ماہ بانو بھی اب زندہ نہیں رہی ہے۔'' ساری تفصیلات سننے کے بعد ڈیوڈ نے تبصرہ کیا۔

''یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے اور اسے تو ہم نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ وہ وہاں موجود تھی تو اس کو بھی باقی لوگوں کے ساتھ مرنا ہی تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے جسم کے اتنے ٹکڑے ہو گئے ہوں گے کہ دھماکوں کے بعد وہاں کارروائی کرنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا ہوگا کہ مرنے والوں میں کوئی عورت بھی تھی...... مجھے میجر ذیشان نے بتایا ہے کہ جو لوگ غار کے اندر رہ گئے تھے، ان کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہے۔ ماہ بانو لازمی بات ہے کہ غار کے اندر ہی تھی اس لیے اس کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ تمہیں ان تھرڈ ورلڈ کنٹریز کے کام کرنے کا انداز تو معلوم ہی ہے۔ یہ لوگ اتنی محنت کہاں کرتے ہیں کہ ملبے سے ملنے والے ایک ایک عضو کا تجزیہ کریں۔ انہوں نے تو بس سب کچھ سمیٹ کر ایک اجتماعی قبر میں دفنا دیا ہوگا۔ ویسے بھی آرمی انٹیلی جنس اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے اس حادثے کی اصلیت چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے میڈیا والوں کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی ہے کہ اصل ماجرا کیا تھا۔'' لنڈا کے لہجے میں وہی تحقیر تھی جو ترقی یافتہ ممالک کا شاید ہر فرد تیسری دنیا کے افراد کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اپنے اسی طرزِ فکر کی وجہ سے اس نے میجر ذیشان کو ماہ بانو کے سلسلے میں کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اس کی معلومات زیادہ مکمل اور مستند ہوتیں۔

''پاکستان آرمی انٹیلی جنس کا شک کس پر ہے؟ وہ اس سیٹ اپ کے پیچھے کس کا ہاتھ سمجھ رہے ہیں؟''

''ہماری پلاننگ کے مطابق ان کا شک انڈیا پر ہی گیا ہے۔ اسلحہ اور دیگر ساز و سامان چونکہ زیادہ تر ہم نے انڈیا سے ہی اسمگل کروا کر وہاں پہنچایا تھا اس لیے انہوں نے انڈیا کو ہی اس کا ذمے دار سمجھا ہے۔ ویسے بھی دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی اتنی گہری ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک میں ہونے والی ہر تخریبی کارروائی کا ذمے دار ایک دوسرے کو ہی ٹھہراتے ہیں۔'' لنڈا کا یہ جواب کافی حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر.... انہوں نے یہ منصوبہ بندی کی تھی کہ اگر کبھی ان کا بنایا سیٹ اپ پکڑا بھی جائے تو شک انڈیا پر ہی رہے۔ پہاڑی ٹھکانے کے علاوہ ان کے تیار کردہ جو دہشت گرد ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے، ان کے پاس بھی زیادہ تر بھارتی ساختہ اسلحہ ہی ہوتا تھا۔ البتہ ساتھ ہی کچھ روسی ساز و سامان بھی اس کے ساتھ شامل تھا اور وہ بھی اس لیے کہ انڈیا والوں کو انہوں نے یہ تسلی دینی ہوتی تھی کہ وہ انڈیا اور روس کے پاکستان کے قریبی ممالک ہونے کی وجہ سے ان کی مصنوعات استعمال کروا رہے ہیں کیونکہ اس طرح مال اسمگل کرنے میں سہولت کے ساتھ ساتھ اخراجات بھی کم آتے ہیں۔

''چلو کم از کم یہاں تو ہم کامیاب رہے ورنہ یہ سوچ سوچ کر کہ پہاڑی ٹھکانے کی تباہی کے ساتھ ساتھ ہماری اس پر کی گئی کثیر سرمایہ کاری بھی برباد ہو گئی ہے، میرا سر پھٹنے لگا تھا۔ عام آبادی سے ہٹ کر بالکل الگ تھلگ اور محفوظ لوکیشن دوبارہ ملنا اور پھر وہاں نیا سیٹ اپ قائم کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس پروجیکٹ پر تو ہم نے انڈیا کو یہ لالچ دے کر بھی اچھی خاصی سرمایہ کاری ان سے کروائی تھی کہ کبھی پاکستان اور اس کے درمیان جنگ چھڑی تو پہاڑی ٹھکانے پر موجود جنگجو اس کے بہت کام آئیں گے۔'' ڈیوڈ کا دکھ کسی طرح کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

''جو ہوا اسے جانے دو۔ سب کچھ بہرحال ختم نہیں ہوا

ہے۔ ہمارے تربیت یافتہ لوگ پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور انہیں کبھی بھی کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' لنڈا نے ڈیوڈ کو تسلی دی اور یہ تسلی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ وہ لوگ واقعی بھارتی ایجنسی کے ساتھ مل کر اپنا بہت وسیع نیٹ ورک قائم کر چکے تھے۔ عملاً یہ نیٹ ورک بھارت کے ہی کنٹرول میں تھا لیکن را اور موساد کا آپس کا گٹھ جوڑ اتنا مضبوط تھا کہ اگر وہ لوگ کوئی فرمائش کرتے تو را کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو؟'' ڈیوڈ نے اپنا ذہن ہونے والے نقصان کی طرف سے ہٹاتے ہوئے اس کا آئندہ کا لائحہ عمل جاننا چاہا۔

''میں اسکردو سے نکل گئی ہوں۔ ویسے تو میں نے میجر ذیشان کو پوری طرح نشے میں مدہوش کرنے کے بعد اس سے ساری معلومات حاصل کی تھیں اور مجھے امید ہے کہ اسے بالکل بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ مجھے کیا کچھ بتا چکا ہے...... پھر بھی میرا مزید یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں فوری طور پر نکل گئی۔ ویسے بھی مجھے اب چودھری کو نمٹانا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر میں جلد از جلد واپس تمہارے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔''

''او کے، وش یو بیسٹ آف لک۔ تم جلد از جلد اپنا کام مکمل کر کے واپس آؤ۔ میں یہاں بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' ڈیوڈ نے بھی جواباً اس پر اپنی محبت جتائی اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس سے رابطہ ختم ہونے کے بعد لنڈا ایک اور شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔

''حکم کیجیے میڈم! آج آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی؟'' مخصوص کوڈ ورڈ کی ادائیگی کے بعد جب دوسری طرف.... موجود شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ لنڈا ہے تو اس نے بڑے خوشامدی لہجے میں پوچھا۔ وہ ان لوگوں میں سے.... تھا جنہیں لنڈا کا قرب حاصل کرنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا.... ایک بار کی قربت میں ہی وہ اس حد تک اس کا گرویدہ ہو گیا تھا کہ اس کے کہنے پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ویسے تو اگر لنڈا کی جگہ کوئی بدصورت عورت ہوتی، تب بھی اسے اس کے حکم کی پیروی کرنی ہی ہوتی کہ ...... موساد کی ٹاپ ایجنٹ کو ٹالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''یاد کی بھی تم نے خوب کہی نارائن! ہمارا جو اتنا بڑا نقصان ہوا ہے اس کے بعد بھی کیا ہم تمہیں یاد نہ کریں؟'' لنڈا نے کاٹ دار لہجے میں مخاطب سے سوال کیا۔

''بالکل میڈم بالکل! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو کچھ ہوا، وہ آپ سے بڑھ کر ہمارا نقصان ہے۔'' نارائن فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

''تو پھر کوئی ایسا کام کرو کہ نقصان کی تلافی بے شک نہ ہو لیکن ہمارا دشمن بھی بری طرح بلبلا اٹھے۔'' اس نے یوں فرمائش کی جیسے اپنے کسی عاشق سے کسی عمدہ ریسٹورنٹ میں ڈنر کا وعدہ لے رہی ہو۔

''آپ فکر نہ کریں میڈم! یہ کام ہو جائے گا۔ ہم خود بھی پہلے سے اس کی پلاننگ کر رہے ہیں۔'' نارائن نے اسے تسلی دی۔

''بہت خوب! تمہاری عمدہ کارکردگی کا انعام... سمجھو کہ مجھ پر ادھار رہے گا۔ جب بھی ہمارا ملنا ہوا، میں تمہیں یہ انعام دینے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔'' لنڈا نے اسے کسی لالچی بچے کی طرح لالی پاپ دکھایا۔ اسے یقین تھا کہ دوسری طرف موجود نارائن کی ابھی سے رال ٹپکنے لگی ہوگی۔ را کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے کام کرنا اپنی جگہ لیکن مستقبل میں لنڈا کی قربت کا وعدہ اسے کئی گنا فعال کر دیتا اور نارائن جیسے سفاک فطرت آدمی کی اعلیٰ کارکردگی میں اتنی سفاکی تو بہرحال ہوتی کہ پاکستانیوں کو ایک لمبی مدت تک اپنے زخم چاٹنے پڑتے۔

☆☆☆

شہریار بڑی گہری نیند سو رہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد اسے اتنی پُرسکون نیند آئی تھی ورنہ ماہ بانو کے اغوا کے بعد سے تو اس کے لیے..... اطمینان سے سونا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ بے شمار الجھنیں، مسائل اور پریشانیاں اپنی جگہ لیکن سب سے زیادہ ماہ بانو کا غیاب... تھا جس نے اس کے دل کو بے کل سا کر رکھا تھا۔ وہ اپنے دل میں ماہ بانو کے لیے موجود جذبے کا چاہے خود سے اعتراف کرنے سے گریز کرتا تھا لیکن محبت کو ایسے کسی اعتراف کی ضرورت بھی کب ہوتی ہے؟ وہ تو خود اپنا آپ تسلیم کروا کر چھوڑتی ہے۔ یہ محبت کی زور آوری ہی تو تھی جو آج وہ دل میں یہ اطمینان محسوس کرنے کے بعد کہ ماہ بانو اپنے دشمنوں کی دسترس سے دور ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود ہے اور ایک بار پھر اپنی زندگی کو قرینے سے شروع کر سکتی ہے، چین کی نیند سو رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کراچی جیسے پُرہجوم شہر میں ماہ بانو کا وجود اس طرح گم ہو جائے گا کہ اگر کوئی ڈھونڈنا بھی چاہے گا تو نہ ڈھونڈ سکے گا...... ویسے بھی، اب کسی کا اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ

سمجھ لیا گیا تھا کہ ماہ بانو مر چکی ہے۔ اس کے زندہ ہونے کے راز سے چند ہی لوگ واقف تھے اور یہ چند لوگ ایسے تھے جن کی زبان پر حقیقت آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ چنانچہ اگر وہ مطمئن ہو کر گہری، پُرسکون نیند سو رہا تھا تو یہ اس کا حق تھا۔ اس نے بہت سی راتیں یونہی بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے بھی تو گزاری تھیں اور اپنے ان رت جگوں کا کسی کے سامنے ذکر تک نہیں کر سکا تھا۔ بہت سے رت جگوں کے بعد اسے آج کہیں جا کر سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی لیکن دشمنوں کو اس کا یہ سکون گوارا نہیں تھا۔ یک دم ہی اس کے موبائل کی گھنٹی... بجنے لگی اور کمرے کی پُرسکون فضا میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ وہ بہت بے مزہ ہو کر نیند سے جاگا اور سائڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کو ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔ اسکرین پر پیر آباد کے ماسٹر منیب کا نام آ رہا تھا۔

ابھی کچھ دن قبل ہی اس کے اور منیب کے درمیان موبائل نمبرز کا تبادلہ ہوا تھا۔ آفتاب کی اسکول سے غیر موجودگی میں ضروری تھا کہ کوئی ایسا بندہ اس سے رابطے میں رہتا جس کے ذریعے وہ پیر آباد کے حالات کے بارے میں خیر خبر لیتا رہتا۔ اسی مقصد کے تحت اس نے منیب کو اپنا براہِ راست رابطہ نمبر دے دیا تھا۔ وہ اسکول میں کام کرنے والے استادوں میں سے سب سے زیادہ سینئر ہونے کے علاوہ آفتاب کے قریب رہنے کی وجہ سے بھی اس کے لیے زیادہ قابلِ بھروسا تھا اور اب اتنی رات گئے منیب اس کے موبائل پر کال کر رہا تھا تو یہ ایک تشویش ناک بات تھی۔ دل میں سخت پریشانی محسوس کرتے ہوئے اس نے کال ریسیو کر لی لیکن بہرحال اس کی آواز میں ایسی کوئی علامت موجود نہیں تھی جس سے دوسری طرف موجود شخص اندازہ لگا سکتا کہ وہ پریشان ہے یا گہری نیند سے جاگا ہے۔

''خیریت تو ہے منیب! تم نے اتنی رات کو کس سلسلے میں فون کیا ہے؟'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے سر! صورتِ حال بہت خراب ہے۔'' دوسری طرف سے منیب کی ہیجان زدہ آواز سنائی دی۔

''کیوں... کیا ہو گیا ہے؟'' اپنے اندیشوں کو درست ثابت ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''چودھری کے بندوں نے اسکول کی عمارت کو آگ لگا دی ہے۔ انہوں نے یہ کام چھپ چھپا کر کرنے کے بجائے کھلم کھلا کیا ہے اور اب اس مکان کو گھیرے کھڑے ہیں جس میں ہم ٹیچرز رہائش پذیر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم سب ابھی فوری طور پر گاؤں چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ سب مسلح ہیں اور بری طرح دروازہ پیٹ رہے ہیں لیکن میں اور میرے ساتھی خوف زدہ ہیں۔ اگر ہم ان کے کہنے پر ابھی گاؤں چھوڑنے کے لیے مکان سے باہر نکلتے بھی ہیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے... لیکن ہم زیادہ دیر اس مکان میں بند رہ کر بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ لوگ چاہیں تو بہت آرام سے دروازہ توڑ کر اور دیواریں پھلانگ کر اندر آ سکتے ہیں۔'' منیب نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور یقیناً یہ صورتِ حال بے حد گمبھیر تھی۔ شہر یار نے اپنی سماعت پر تھوڑا سا زور دیا تو اسے بھی وہ آوازیں سنائی دینے لگیں جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ منیب کے بیان کے مطابق مکان کے دروازے کو بری طرح پیٹا جا رہا ہے۔

''تم موبائل آف مت کرنا منیب! موبائل آن رکھتے ہوئے... تم دروازے کے قریب جاؤ اور باہر موجود لوگوں سے مذاکرات کر کے انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرو کہ تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے کے لیے صبح تک کی مہلت دے دی جائے۔ اگر وہ صبح تک انتظار کے لیے راضی نہ ہوں تو ان سے کم سے کم دو ڈھائی گھنٹے کی مہلت لے لو۔ اس دوران میں تمہاری مدد کے لیے کوئی بندوبست کرتا ہوں۔'' اس نے منیب کو ہدایات جاری کیں اور خود لینڈ لائن پر ایس پی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی سماعتیں اگر ایک طرف جاتی رنگ ٹون کو سن رہی تھیں تو دوسری طرف اس نے منیب کی آواز پر بھی کان لگائے ہوئے تھے۔

''میری بات سنو! رک جاؤ۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ ہم یہ جگہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' وہ اس کے حسبِ ہدایت دروازے کے قریب جا کر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''چلے نہیں جائیں گے، ابھی باہر نکلو اور اپنی راہ لو۔'' جواب میں دروازہ دھڑ دھڑانے کا سلسلہ رکا اور ایک سخت کھردری آواز سنائی دی۔ عین اسی وقت ایس پی کی طرف سے شہر یار کی کال ریسیو کر لی گئی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ایس پی صاحب! فوری طور پر ایک ٹیم پیر آباد روانگی کے لیے تیار کریں۔ وہاں اسکول کی عمارت میں آگ لگا دی گئی ہے اور ساتھ ہی اسکول ٹیچرز اپنی رہائش گاہ پر سخت خطرے سے دوچار ہیں۔ ان کے مکان کو چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا ہے اور مسلسل انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔'' اپنے موبائل کے ماؤتھ پیس والے حصے کو مکمل طور پر ہتھیلی سے........ بند کرتے ہوئے اس نے ایس پی کو احکامات جاری کیے اور.... صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ منیب اس کی آواز نہ سن سکے۔ اگر وہ یہ سن لیتا کہ شہر یار کے نزدیک بھی ان لوگوں کی زندگی کے لیے خطرہ تھا تو اس کا حوصلہ پست ہو جاتا۔ ابھی تو وہ دل میں اچھی امید رکھتے ہوئے چودھری کے کارندوں سے مذاکرات کر کے انہیں اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگ انہیں صبح تک کی مہلت دینے پر تیار ہو جائیں۔ شہر یار ان مذاکرات کو اپنے موبائل پر سن سکتا تھا۔

''میں آرڈر جاری کرتا ہوں سر! اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کرتا ہوں کہ ہمارے محکمے کے جو لوگ پیر آباد میں تعینات ہیں، کسی طرح ان سے رابطہ ہو سکے۔ جب تک یہاں سے پولیس پارٹی پہنچے، وہ لوگ صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔'' ایس پی کافی مناسب آدمی تھا چنانچہ اس کا حکم سن کر کوئی حیل و حجت کرنے کے بجائے فوراً مستعد ہو گیا اور اپنی طرف سے ایک تجویز بھی پیش کی۔

''آپ کوشش کر کے دیکھ لیں لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ لوگ کچھ کر سکیں گے۔ ایک تو وہ تعداد میں ہی دو تین سے زیادہ نہیں ہیں، دوسرے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوگی کہ چودھری کے کارندوں کے مقابلے پر کھڑے ہو سکیں... بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ خود بھی چودھری کے ہی نمک خوار ہوں۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں ایک نہایت تلخ حقیقت بیان کی۔

''اوکے سر! پھر میں ویسا ہی کرتا ہوں جیسا آپ نے کہا ہے۔'' ایس پی نے بھی فوراً اس کی بیان کردہ حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ ایس پی کی کال سے فارغ ہو کر وہ... منیب اور چودھری کے کارندوں کے درمیان ہونے والی بحث کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔

''دو گھنٹے کیا ہم دو منٹ کے لیے بھی تم لوگوں کو اس گاؤں میں برداشت نہیں کر سکتے۔ فوراً باہر نکلو اور جس حال میں بھی ہو، یہاں سے نکل پڑو... ورنہ تمہارا وہ حال کریں گے جسے دیکھ کر کسی میں ہماری گل ماننے سے انکار کی جرأت ہی نہیں رہے گی۔'' منیب نے یقیناً اس کی ہدایت کے مطابق مذاکرات کو آگے بڑھایا تھا لیکن چودھری کے کارندے بھی اسی کی طرح ضد... اور ہٹ دھرم تھے چنانچہ چیختی ہوئی آواز میں منیب کو یہ دھمکی دی گئی۔ شہر یار نے بھی اپنے موبائل پر ایک ایک لفظ سنا اور اپنا وارڈروب کھول کر اس میں سے لباس نکالنے لگا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا چنانچہ باہر نکلنے سے پہلے لباس کی تبدیلی ضروری تھی۔ رات کے اس پہر کوئی پُرتکلف لباس منتخب کرنے کے بجائے اس نے لائن سے استری کر کے ٹنگے ہوئے کپڑوں میں سے ایک سادہ سی شرٹ اور جینز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس لمحے اچانک... اس کی موبائل پر گرفت کمزور ہو گئی اور موبائل اس کی انگلیوں سے پھسلتا ہوا نیچے زمین کی طرف گرنے لگا۔ اس نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موبائل کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی دوبارہ پکڑ لیا لیکن جب موبائل اس نے کان سے لگایا تو اس میں سے ہر قسم کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ اس نے موبائل کی اسکرین آنکھوں کے سامنے کی۔ منیب سے اس کی کال منقطع ہو چکی تھی۔ یقیناً گرتے ہوئے موبائل کو کیچ کرنے کے چکر سرخ بٹن پش ہو گیا تھا جس کے باعث لائن کٹ گئی تھی۔

اس نے لباس نکال کر وارڈروب بند کی اور دوبارہ رابطے کی کوشش کرنے لگا لیکن منیب کی طرف سے کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ شاید چودھری کے کارندوں کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ شہر یار نے تیزی سے.... کپڑے تبدیل کیے اور ایک بار پھر کال ملا کر دیکھی۔ اب بھی وہی صورتِ حال تھی۔ منیب کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے عبدالستان کا نمبر ملایا اور اسے فوری طور پر پیر آباد روانگی کے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے چند منٹوں میں تیار ہونے کی ہدایت کی۔ وہ اتنی عجلت میں تھا کہ اس نے عبدالستان کو اپنے وہاں جانے کی وجہ سے بھی آگاہ نہیں کیا... اور صرف ڈائریکٹ حکم سنا دیا... عبدالستان بھی اس کا مزاج آشنا ہو چلا تھا چنانچہ کوئی سوال نہیں کیا اور صرف ''یس سر'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ جب شہر یار اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس کو لینے پہنچا تو وہ بالکل تیار تھا۔ گاڑی رکتے ہی وہ خاموشی سے اس میں سوار ہو گیا۔ شہر یار فوری طور پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بجائے اپنے موبائل پر مصروف رہا۔ پہلے اس نے منیب کا نمبر ملا کر دیکھا۔ پچھلی تمام کوششوں کی طرح اس بار بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال پر سخت تشویش محسوس کرتے ہوئے اس نے ایس پی سے رابطہ کیا۔ اس سے گفتگو کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ پولیس پارٹی ان لوگوں سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھی اور ان کے مقابلے میں پولیس پارٹی کے پیر آباد جلدی پہنچنے کا امکان تھا۔

ایس پی کے اتنے تعاون کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شہر یار نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ منیب اور اس کے ساتھیوں کو بچانے کے لیے جو اقدامات کر سکتا تھا، وہ کر

چکا تھا لیکن اسے خود بھی شک تھا کہ اس کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوگی۔ نئے ایس پی کو تارڑ کے مقابلے میں کافی فرض شناس پانے کے باوجود اس نے اس موقع پر خود پیرآباد جانے کا فیصلہ بھی اس لیے کیا تھا کہ اس کی موجودگی پولیس کے لیے سپورٹ کا باعث بن سکے اور وہ چودھری کے دباؤ میں آکر کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوجائیں... لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ان لوگوں کے پیرآباد پہنچنے تک کچھ باقی بچے گا؟ اسکول کی جلتی عمارت اور اپنی رہائش گاہ پر محصور منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کہیں ان کے پہنچنے سے قبل ہی۔ اپنی ہستی نہ کھو بیٹھیں....؟ انہی خدشات اور سوالات کے درمیان گھرے تیز رفتاری سے پیرآباد کی طرف رواں دواں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے عبدالسنان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ اس بات کا تو پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ پیرآباد میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے جو رات کے اس پہر شہریار نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن موجودہ صورتِ حال اس اعتبار سے زیادہ تشویش ناک تھی کہ تین انسانی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ اسکول کی عمارت اگر جل کر تباہ بھی ہوجاتی تو اس نقصان کا ازالہ ہوسکتا تھا۔ مالی نقصانات عموماً قابلِ تلافی ہوتے ہیں لیکن انسانی جان کا نعم البدل تو کسی صورت حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جان کے خطرے سے دوچار وہ تین اساتذہ اپنی ذات میں تنہا تو نہیں تھے۔ ان تین افراد کے ساتھ تین خاندان بھی جڑے ہوئے تھے۔ ان تینوں کو کوئی نقصان پہنچتا تو دراصل یہ تین خاندانوں کا نقصان ہوتا۔ صورتِ حال کی گمبھیرتا کو محسوس کرکے عبدالسنان کی اپنی پیشانی بھی شکن آلود ہوگئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''میرے خیال میں سر اس صورتِ حال سے نمٹنے کا ہمارے پاس ایک ہی طریقہ ہے۔'' کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد وہ شہریار سے مخاطب ہوا۔

''کیا؟'' اس نے صرف ایک لفظی سوال کیا۔

''ہم چودھری افتخار سے رابطہ کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ کچھ نامعلوم افراد نے ہمارے اسکول ٹیچرز کی رہائش گاہ کو گھیر لیا ہے۔ ہمارے لیے فوری طور پر انہیں امداد پہنچانا ممکن نہیں چنانچہ آپ مہربانی کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ان ٹیچرز کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ ظاہر ہے، چودھری نہ تو انکار کرسکے گا اور نہ ہی یہ اعتراف کرسکے گا کہ دراصل وہ اس کے آدمی... ہیں جنہوں نے اسکول ٹیچرز کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ناچار اسے ہماری خواہش پر اپنے آدمیوں کو وہاں سے ہٹانا پڑے گا۔ اس کے لیے ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑا بہت ڈراما بھی کرے اور کچھ ایسا...... ...کر ڈالے جس سے یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے آدمیوں نے جدوجہد کرکے حملہ آوروں کو مار بھگایا ہے... لیکن اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا کام نکل جائے گا اور ہم بھی چودھری کو منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے اس ''تعاون'' کے لیے شکریہ کہہ کر واپس آجائیں گے۔'' عبدالسنان نے اپنا پورا منصوبہ اس کے گوش گزار کیا۔

''تجویز تو اچھی ہے۔ کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔'' پہلی بار شہریار کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اسے عبدالسنان کی اس تجویز کو سن کر چور کو کوتوال بنا دینے والا محاورہ یاد آگیا تھا۔ اس نے عبدالسنان کو چودھری کا نمبر ملانے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پاکر وہ نمبر ڈائل کرنے لگا لیکن شہریار دیکھ رہا تھا کہ اس کی بار بار کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ آخر اس نے نمبر ڈائل کرنے کا سلسلہ روک دیا۔ شہریار نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''چودھری کا موبائل آف ہے اور حویلی کی لینڈ لائن والا نمبر مسلسل انگیج جارہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ریسیور ہی ہٹا کر رکھ دیا گیا ہو۔'' عبدالسنان نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ جو تجویز عبدالسنان کے ذہن میں آئی تھی، وہ شاید پہلے ہی چودھری کے ذہن میں تھی چنانچہ اس نے چالاکی سے یہ بندوبست کرلیا تھا کہ اس سے رابطہ ہی نہ کیا جاسکے۔ اب ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ.... پیرآباد پہنچنے تک منیب اور دیگر اساتذہ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا جائے چنانچہ شدید تناؤ کے عالم میں خاموشی سے ان کا سفر جاری رہا۔

ڈرائیور جو بظاہر کسی بے جان مورتی کی طرح بے تاثر چہرہ لیے بالکل خاموشی سے ڈرائیو کررہا تھا درحقیقت اس ساری صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اپنی تمام تر مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے بہت تیزی سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس کی اس کارکردگی کی وجہ سے پیرآباد تک کا فاصلہ تیزی سے سمٹ رہا تھا لیکن ابھی وہ پیرآباد سے کچھ دور ہی تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ راستہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ایک طرف سڑک کی حالت مخدوش تھی تو دوسری طرف روشنی کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ مجبوراً ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار کم کرنی پڑی۔ صورتِ حال کی گمبھیرتا کے باوجود شہریار کا ذہن ان باتوں کو نوٹ کرتا چلا گیا۔ ویسے تو اپنے علاقے کے یہ مسائل پہلے ہی اس کے نوٹس میں تھے اور وہ ان کے حل کے لیے کچھ کرنا بھی چاہتا تھا لیکن بہرحال وہ لامحدود

اختیارات اور وسائل کا مالک نہیں تھا۔ ان چیزوں کی بہتری کے لیے اسے جو فنڈز درکار تھے، وہ ابھی تک گورنمنٹ نے منظور نہیں کیے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کوئی پیش رفت مشکل سے ہوتی تھی کہ علاقے کے منتخب نمائندے مکمل طور پر اپنے فرائض سے غافل تھے اور مشکل سے ہی کبھی یہاں پائے جاتے تھے... ورنہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاہور شہر ہی ان کا مستقل ٹھکانا بنا ہوا تھا جہاں وہ خود بھی عیش و آرام سے رہتے تھے اور ان کے بچوں کو بھی بہترین تعلیمی اور دیگر سہولیات میسر تھیں۔

خدا خدا کرکے ان کا سفر تمام ہوا اور گاڑی پیرآباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اس مکان کی طرف بڑھ گئی جہاں اسکول کے اساتذہ کی رہائش تھی۔ شہریار نے دور ہی سے اس مکان کے سامنے کھڑی پولیس کی جیپ دیکھ لی۔ بارش کے باعث علاقے کی بجلی غائب تھی لیکن پولیس جیپ کی جلتی بتیوں نے کسی حد تک ماحول کو روشن کررکھا تھا۔ اس روشنی میں جو کچھ نظر آرہا تھا، وہ اتنا خوش کن نہیں تھا۔ دو پولیس والے مکان کے اندر سے کسی شخص کو اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر شہریار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ جس شخص کو باہر لایا گیا تھا، وہ اس کے بارے میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا.... کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن ...... یہ طے تھا کہ وہاں کچھ برا ہوچکا ہے۔ ان کی گاڑی پولیس جیپ کے پہلو میں جا کر رکی تو منظر کچھ اور واضح ہوگیا۔ اب وہ لوگ دیکھ سکتے تھے کہ مکان کی دیواریں سیاہ ہورہی ہیں۔ یقیناً اسے آگ لگائی گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے آگ تو بجھ گئی تھی لیکن سیاہی کی صورت آگ لگائے جانے کا واقعہ مکان کے در و دیوار پر لکھا صاف نظر آرہا تھا۔ گاڑی رکی تو ایک پولیس والا تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف لپک کر آیا۔ شہریار نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈی ایس پی منظور تھا۔

''السلام علیکم سر! ایس پی صاحب نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ وہ راستے میں ہی ہیں۔ بارش کی وجہ سے مشکل پیش آرہی ہے لیکن ان کی کوشش ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں پہنچ جائیں۔'' اسے سلام جھاڑتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنے آفیسر کا پیغام پہنچایا۔ شہریار اس پیغام پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر گاڑی سے باہر نکل گیا۔ اس کے لیے ایس پی کا یہاں موجود ہونا یا نہ ہونا اتنا اہم نہیں تھا جتنا وہاں موجود افراد کی زندگی کی اہمیت تھی۔

''کیا صورتِ حال ہے؟'' اپنی نظروں کو ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے اس نے مختصر الفاظ میں سوال کیا۔ تیز جھکڑ ...... کے ساتھ برستی بارش نے لمحوں میں ہی اسے شرابور کر ڈالا تھا لیکن اس وقت اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈرائیور اور عبدالسنان بھی گاڑی سے نکل آئے تھے اور اب وہ سب اجتماعی طور پر اس بارش میں بھیگ رہے تھے۔

''ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مکان کو آگ لگائی جا چکی تھی۔ دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی اس لیے اندر والوں کے لیے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ پھر شاید بارش شروع ہونے کی وجہ سے آگ خود بخود ہی بجھ گئی لیکن یقیناً آگ اتنی زیادہ تھی کہ بجھتے بجھتے بھی ڈھیروں دھواں اگل گئی۔ اندر موجود تینوں افراد آگ میں جل کر نہیں بلکہ دھوئیں سے دم گھٹنے کے باعث اپنی جان سے چلے گئے۔'' ڈی ایس پی منظور کی پیش کردہ رپورٹ نے واضح کردیا کہ انہیں مدد کے لیے وہاں پہنچنے میں بہت دیر ہوگئی ہے۔ اس رپورٹ کو سن کر وہ کچھ لمحوں کے لیے سکتہ زدہ سا رہ گیا اور خالی خالی نظروں سے دوسری لاش کو مکان سے باہر لایا جاتا دیکھنے لگا۔ پولیس والے جب اس شخص کو اٹھا کر جیپ کے قریب پہنچے تو ہیڈ لائٹس کی روشنی نے اس کا چہرہ نمایاں کردیا۔ وہ منیب تھا جس نے اسے مدد کے لیے فون کیا تھا۔ کیا جرم تھا اس کا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کا؟ وہ لوگ ایک محدود سی تنخواہ کے عوض انتہائی مخدوش حالات میں معصوم بچوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کرنے کی .... کوشش کررہے تھے۔ یہ کوئی ایسا جرم تو نہیں تھا جس کی سزا میں ان کی زندگی کا چراغ ہی گل کردیا جاتا۔ وہ تو روشنی کے سفیر تھے جنہیں کسی کے ظلم و جبر نے تاریک رات میں نگل لیا تھا۔

''ایس پی صاحب کو میں نے صورتِ حال بتا دی تھی۔ انہی کی ہدایت پر میں ان لاشوں کو مرکزِ صحت تک منتقل کروا رہا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں سے صبح ایمبولینس کے ذریعے لاشیں نورکوٹ کے اسپتال میں شفٹ کردی جائیں گی۔ ابھی اتنی تیز بارش میں تو ایمبولینس کا پہنچنا بھی ممکن نہیں۔'' اسے خاموش پا کر ڈی ایس پی خود ہی آگے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس بار بھی وہ چپ ہی رہا۔ ایمبولینس ابھی لاشوں کو لے کر اسپتال جاتی یا صبح... اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ جنہوں نے مدد کے لیے پکارا تھا، ان کی مدد سے بے نیاز ہوچکے تھے۔ اب ان کی لاشیں چند گھنٹوں کی تاخیر سے اسپتال، گھر اور آخری آرام گاہ پہنچائی جاتیں بھی تو کیا فرق پڑ جاتا؟ اصل میں تو تاخیر اس وقت نہیں ہونی چاہیے تھی جب وہ زندہ تھے اور ان کے دلوں میں زندگی کی امید روشن تھی۔

''آپ نے کوئی ایسا عینی شاہد تلاش کیا جو بتا سکے کہ یہاں آگ لگانے والے لوگ کون تھے؟'' مرنے والے مر چکے تھے۔ اب کچھ بھی کرلیا جاتا، ان کے بے جان جسموں میں دوبارہ زندگی کی رمق پیدا نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن ان کا خونِ ناحق تو انصاف کے لیے پکار رہا تھا۔ ان کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی شاید اب ان کی روحوں کی بے قراری دور کی جاسکتی تھی۔

''موقع پر کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ ہم یہاں پہنچے تو صورتِ حال بالکل ایسی ہی تھی جیسی آپ ابھی دیکھ رہے ہیں۔ البتہ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہماری جیپ یہاں سے ذرا فاصلے پر تھی، تب کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا تھا۔ شاید مکان کو آگ لگانے والے باہر رہ کر نگرانی کررہے تھے کہ کوئی ان لوگوں کی مدد کے لیے نہ آسکے اور یقیناً اسی وجہ سے کوئی یہاں موجود بھی نہیں تھا۔ اگر میرے پاس دو گاڑیاں ہوتیں تو میں ایک فرار ہونے والی گاڑی کے پیچھے بھیج دیتا لیکن پہلے یہاں کی صورتِ حال دیکھنا ضروری تھا۔ پھر کوئی گاڑی نظر بھی نہیں آئی تھی، بس مجھے آواز ہی محسوس ہوئی تھی۔ اس اندھیرے اور برسات میں ہم کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہو پاتے۔'' ڈی ایس پی منظور اسے حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہر عمل کی وضاحت بھی پیش کرتا جارہا تھا۔ ان سوال جواب کے دوران پولیس جیپ لاشوں کو لے کر مرکزِ صحت کی طرف روانہ ہوچکی تھی اور وہ لوگ ابھی تک مکان کے باہر ہی کھڑے مسلسل برستی بارش میں بھیگ رہے تھے۔

بے بسی اور دکھ کی انتہائی کیفیت سے دوچار شہریار نے اپنے قدم آگے بڑھائے اور مکان میں داخل ہوگیا۔ بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب اس میں کچھ جیتے جاگتے انسان موجود تھے اور اب یہ مکان ویران ہوچکا تھا۔ وہ گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ مکان میں دھوئیں کے ساتھ ساتھ واضح طور پر پیٹرول کی بو بھی محسوس ہورہی تھی۔ یقیناً آگ لگانے والوں نے باہر سے پیٹرول چھڑک کر مکان کو آگ دکھا دی تھی اور نتیجے میں یہ مکان اپنے رہائشیوں کی مقتل گاہ بن گیا۔ وہ دل پر بہت بھاری بوجھ لیے مکان کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک دیوار کے پاس اسے موبائل سیٹ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے جھک کر وہ موبائل اٹھالیا اور بٹن پش کر کے اسے چیک کرنے لگا۔ کال رجسٹر میں اسے متعدد مس کالز نظر آئیں جو کہ اس کے موبائل سے ہی کی گئی تھیں۔ یعنی یہ موبائل منیب کا تھا اور جانے کیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

''ڈی ایس پی صاحب! آپ اس واقعے کی رپورٹ لکھیں۔ ان مظلوم مقتولوں کی طرف سے میں مدعی ہوں اور میں عدالت میں گواہی دوں گا کہ انہیں قتل کرنے والے لوگ کون تھے۔'' موبائل پر نظریں جمائے وہ دھیمی مگر اندرونی رنج و غصے سے دہکتی آواز میں ڈی ایس پی سے مخاطب ہوا۔

☆☆☆

''یہ یہاں سے اسلام آباد کے لیے ڈائیوو کے ٹکٹ اور میری خالہ کے گھر کا ایڈریس ہے۔ ایڈریس زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آپ کسی بھی ٹیکسی والے کو بتائیں گے تو وہ آپ کو پہنچا دے گا لیکن بالفرض کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں نے ایڈریس کے ساتھ ہی اپنے کزن کا موبائل نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ آپ اسے فون کرلیجیے گا، وہ آپ کو خود لینے آجائے گا۔'' افضل کے صحافی دوست نے دو ٹکٹ اور پتا لکھا ہوا ایک کاغذ گم صم بیٹھے آفتاب کی طرف بڑھایا۔ یہ افضل کا وہی دوست تھا جس نے افضل کے کہنے پر کشور کو پہلے والے اسپتال سے یہاں منتقل کروایا تھا۔ اب افضل کی موت کے بعد بھی وہ اپنے دوست سے دوستی نبھانا نہیں بھولا تھا اور ان دونوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ یوں تو آفتاب بھی کسی حد تک صحافت کے میدان کا ہی بندہ تھا اور ایک کالم نگار کی حیثیت سے اسے کافی پسند کیا جاتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اس کا دماغ کچھ اس طرح ماؤف ہوگیا تھا کہ اس کی قوتِ عمل ہی جواب دے گئی تھی ورنہ اگر وہ چاہتا تو اپنے ذاتی تعلقات سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ دوست! بغیر کسی تعلق کے بھی تم نے ہمیں یاد رکھا اور ان مشکل حالات میں ہماری مدد کے لیے آئے... ورنہ تو آج کل لوگ بنا غرض کے کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔'' چہرے پر ایک بجھی ہوئی سی مسکراہٹ لیے آفتاب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ افضل کی موت نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ افضل اس کا سب سے قریبی دوست تھا اور اس دوست کے پورے خاندان سمیت دنیا سے اٹھ جانے کا واقعہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے فراموش کردیتا۔ افضل اور اس کے بیوی بچوں کا قاتل صائب خان مرنے سے قبل جو بیان دے گیا تھا، اس سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ اس حادثے میں چودھری کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ وضاحت آفتاب اور کشور کے لیے کسی حد تک اطمینان کا سبب بنی تھی۔ افضل اور اس کے اہلِ خانہ کی موت کے غم کے ساتھ اگر یہ احساس بھی ساتھ ہوتا کہ وہ لوگ ان کی وجہ سے چودھری کے عتاب کا نشانہ بنے ہیں تو یقیناً صدمے کی شدت کئی گنا بڑھ جاتی....

''تعلق تو تم نے خود ہی مجھ سے طے کرلیا ہے۔ دوست کہہ کر پکارا ہے تو پھر اب دوست ہی سمجھو اور تمام تر تکلفات کو چھوڑ دو۔ ویسے اگر تم یہ تعلق نہ بھی جوڑتے تو میں افضل کے دوست کی حیثیت سے تمہیں اپنا دوست ہی سمجھتا۔ افضل سونے کا آدمی تھا۔ اس جیسا دوست ہونا آدمی کے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اسے کھویا ہے تو لگتا ہے زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے اور یہ خلا شاید کبھی پُر ہو بھی نہیں سکتا۔'' مرد ہونے کے باوجود ان لمحات میں اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اُمڈ آئی تھی۔

''تم نے اس کے بارے میں بالکل صحیح رائے دی۔ وہ واقعی بہت زبردست انسان تھا۔ تمہاری صورت مجھے ایک اچھا دوست مہیا کر کے وہ تو جاتے جاتے مجھ پر ایک اور احسان کر گیا ہے۔'' آفتاب کی آواز بھی بھیگ گئی۔

''اسے لوگوں پر احسان کرنے کے سوا کام ہی کیا تھا۔ ایسا مخلص اور بے لوث آدمی میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ میں تمہیں بتاؤں، دو سال پہلے میرے والد کا بائی پاس ہونا تھا۔ گورنمنٹ اسپتال میں آپریشن کروانے کو میرا دل نہیں مانتا تھا اور پرائیویٹ کی رقم پوری نہیں تھی۔ اس وقت افضل نے مجھے بتائے بغیر اپنی بالکل نئی کار بیچ کر رقم فراہم کردی۔ حالانکہ اس نے وہ کار بہت شوق اور مشکل سے خریدی تھی۔ مزاج کا بادشاہ تھا اس لیے اچھی خاصی انکم ہونے کے باوجود اس کا بینک بیلنس کبھی قابلِ ذکر نہیں رہا۔ عموماً اس کی آمدنی دوسروں کی مدد کرنے میں ہی خرچ ہوجاتی تھی۔ بیگم بھی اس کو اپنی ہم مزاج ہی ملی تھیں اس لیے بھی عادتیں بدل نہیں سکیں۔ میں والد کے آپریشن کے بعد اس کے گھر شکریہ ادا کرنے گیا تھا، تب میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے افضل کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر تھوڑی خفگی دکھائی کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اپنی نئی گاڑی کیوں بیچ ڈالی... تو افضل سے پہلے وہ بولیں کہ بھائی! گاڑی کا کیا ہے، ہم نے اس کی جگہ دوسری سیکنڈ ہینڈ کار لے لی ہے اور وہ بھی ٹھیک ٹھاک چلتی ہے لیکن اگر آپ کے والد کا بروقت آپریشن نہ ہو پاتا اور خدانخواستہ وہ اس وجہ سے اپنی جان سے چلے جاتے تو ان کا نعم البدل کہاں سے آتا؟ اس وقت میں نے افضل کی قسمت پر رشک کیا تھا کہ اس کی بیوی جیسی عورتیں تو دنیا میں کہیں کہیں ہی ہوتی ہیں۔ ورنہ عموماً تو عورتوں کو روپے پیسے کے معاملے میں شوہروں سے لڑتے ہوئے ہی پایا جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں.... ستائش اور ایک طرح کی عقیدت مندی تھی۔

''صحیح کہا یار تم نے۔ وہ دونوں ہی میاں بیوی اپنی جگہ انمول تھے، شاید اسی وجہ سے مختصر عمر لکھوا کر لائے تھے۔ اچھے لوگ اس دنیا میں کم ہی لمبی عمر پاتے ہیں۔'' آفتاب جو افضل سے متعلق اس طرح کے کئی واقعات کا پہلے بھی گواہ تھا، ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا پھر گویا دونوں کے درمیان بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا اور وہ چند لمحے کے لیے یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

''اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم اپنی مسز کے ساتھ کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکلنے کی کوشش کرنا۔ تمہاری مسز کی تو خیر ہے۔ میں ان کے لیے جو برقع لایا ہوں، اسے پہن کر وہ کسی کے نوٹس میں آنے سے بچ جائیں گی لیکن تمہارے لیے مجھے یہ ڈر ہے کہ کسی نے ذرا غور سے دیکھ لیا تو کہیں پہچان نہ لے۔ یہ داڑھی مونچھیں تم نے اسپتال میں رہ کر ہی بڑھائی ہیں، صرف رنگ آج تبدیل کیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اسٹاف کے وہ لوگ جن سے تمہارا زیادہ واسطہ پڑا ہے، اس تبدیلی کو نوٹ کر کے کہیں تمہیں پہچان نہ لیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا یہ نیا حلیہ کسی کے علم میں ہو کیونکہ ہوسکتا ہے، تمہیں ڈھونڈنے والے اسپتالوں کو بھی چھانتے پھر رہے ہوں۔ تم جتنی زخمی حالت میں لائے گئے تھے، اس کے بعد یہ خیال تو خود بخود ہی ذہن میں آتا ہے کہ بندہ علاج کے لیے کسی اسپتال میں بھی ہوسکتا ہے اس لیے وہاں ڈھونڈنا چاہیے۔ بے شک تمہارا اور تمہاری مسز کا اصل نام اسپتال کے ریکارڈ میں نہیں لکھوایا گیا ہے لیکن کیا معلوم تمہیں تلاش کرنے والے تمہاری تصویریں ہاتھ میں لے کر..... ڈھونڈتے پھر رہے ہوں... اور یہاں کوئی انعام وغیرہ کے لالچ میں بتا ڈالے کہ ہاں جناب، یہ دونوں یہیں داخل تھے اور اب فلاں فلاں حلیے میں یہاں سے روانہ ہوچکے ہیں۔'' اس نے آفتاب کو احتیاط کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اپنے خدشات سے بھی آگاہ کردیا۔ اس کے یہ خدشات نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھے چنانچہ آفتاب نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی یقین دہانی کرواتے ہوئے مختصر سامان پر مشتمل اپنا اور کشور کا مشترکہ بیگ شانے سے لٹکا لیا۔

''تم مسز کو لے کر باہر نکلو۔ باہر میری نیلے رنگ کی سوزوکی مہران کھڑی ہے۔ یہ اس کی چابی ہے۔ تم دونوں گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتے ہوئے ریسیپشن پر بل بنانے کے لیے کہہ کر آیا تھا، وہ ادا کر کے آتا ہوں۔'' آفتاب کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھماتے ہوئے اس نے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ آفتاب نے بھی اس کی تقلید میں اپنا کمرا چھوڑ دیا اور

کشور کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ اس کے حسبِ ہدایت برقع پہن کر تیار تھی۔ باہر نکل کر اس نے آفتاب کا بازو تھام لیا۔ ابھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا تھا اور چلنے کے لیے اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ کشور نے بازو تھاما تو اسے مزید سہارا مل گیا۔ وہ دونوں ہی اتنے محتاط تھے کہ اسپتال سے باہر نکلنے سے قبل ایک دوسرے سے بھی بات نہیں کی۔ ان دونوں کو ساتھ ساتھ باہر نکلتے بہت سے لوگوں نے دیکھا لیکن یہ سرسری نظریں تھیں۔ دیکھنے والوں نے اگر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم بھی کی ہوگی تو یہی کہ وہ کسی مریض کے ملاقاتی ہیں اور اس سے ملاقات کر کے واپس جا رہے ہیں۔ ان کے ہمدرد نے انہیں دیگر رسمی کارروائیوں سے تو بچا ہی لیا تھا ورنہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کا بھی ایک مکمل طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اگر اس طریقہ کار پر عمل کیا جاتا تو وہ اس نئے حلیے میں کم از کم ڈاکٹر کی نظر میں تو آ ہی جاتے۔

باہر نکلتے ہی انہیں نیلے رنگ کی مہران نظر آ گئی۔ وہ گاڑی کا لاک کھول کر اس کی پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے اور نظریں اسپتال کے خارجی دروازے پر ٹکا دیں۔ ابھی مشکل سے ڈھائی تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک تیز رفتار لینڈ کروزر اسپتال کے دروازے کے عین سامنے آ کر رکی...... لینڈ کروزر رکھا چانک لگائے جانے والے بریکس کی آوازیں فضا میں دور تک سنائی دیں۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ آفتاب اور کشور تو دیکھ ہی اسی طرف رہے تھے چنانچہ جب لینڈ کروزر سے دو صورت سے ہی بدمعاش نظر آنے والے افراد نیچے اترے تو وہ دونوں ہی چونک گئے۔ ان دو میں سے ایک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا۔ وہ چودھری کے کارندوں میں سے ایک تھا۔ ڈرائیور کو گاڑی میں ہی چھوڑ کر وہ دونوں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تو وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رک بھی گئے۔ آفتاب اور کشور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی آوازیں نہیں سن سکتے تھے لیکن اتنا اندازہ بہرحال انہیں ہو رہا تھا کہ چوکیدار ان لوگوں سے ان کی آمد کی غرض و غایت دریافت کر رہا ہے۔

''یہ لوگ یقیناً ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہوں گے۔ انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم یہاں ہیں۔'' اس منظر کو دیکھتی کشور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور یک دم ہی گاڑی کا لاک کھول کر نیچے اترنے لگی۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' آفتاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی سے باہر نکلنے سے روکا۔

''ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آفتاب! ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' اس نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ اس کا یہ اضطراب اور بے چینی بے وجہ نہیں تھا۔ اگر چودھری کے گماشتوں کی نظر ان دونوں پر پڑ جاتی تو یقیناً وہ بری طرح پھنس جاتے۔ آفتاب خود بھی تذبذب میں پڑ گیا۔ چودھری کے آدمیوں کا جو انداز تھا، اس سے اس نے اتنا تو اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی مبینہ اطلاع پر یہاں تک نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے طور پر اسے اسپتالوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس اس کی وہاں موجودگی کی کوئی اطلاع ہوتی تو وہ بہت زیادہ جارحانہ رویے کا مظاہرہ کرتے اور یوں گیٹ پر رک کر چوکیدار کے سوالوں کا جواب دینے کی زحمت نہ اٹھاتے۔ اس نے کشور کا ہاتھ تھامے تھامے ہی ایک بار پھر رخ موڑ کر اسپتال کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ چودھری کے آدمی اب اندر داخل ہو رہے تھے اور افضل کا دوست بابر باہر نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسپتال کے سامنے کھڑی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی توجہ بھی اسی طرف تھی اور اس نے ایک بار بھی رخ موڑ کر مہران کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ گمان ہی نہیں کر سکتا تھا کہ جن لوگوں کی تلاش میں وہ یہاں تک آئے ہیں، وہ ان سے اتنے نزدیک کھلی فضا میں بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

''کیا بات ہے... کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟'' بابر جو دور ہی سے ان لوگوں کو دیکھتا ہوا آ رہا تھا، قریب پہنچنے پر گاڑی کے کھلے دروازے اور اترنے کے لیے پر تولتی کشور پر سوالیہ نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔

''ابھی یہاں سے چلو۔ تفصیلات میں بعد میں بتاتا ہوں۔'' آفتاب نے کچھ فاصلے پر کھڑی لینڈ کروزر پر ایک اضطراری نظر ڈالتے ہوئے بے چینی سے کہا تو بابر نے اس کے لہجے کے غیر معمولی پن کو محسوس کر کے فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اسپتال کی حدود سے کافی دور نکل چکے تھے۔

''اب بتاؤ کیا مسئلہ تھا؟''

''ابھی جب تم اسپتال کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو تم نے دو افراد کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہو گا؟ گیٹ کے بالکل سامنے ایک لینڈ کروزر بھی تمہیں نظر آئی ہو گی؟'' آفتاب نے جواباً اس سے پوچھا۔

''ہاں ہاں... میں نے دیکھا تھا۔ ان دونوں افراد میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر بھی تھی۔ شاید وہ اس تصویر کی مدد سے کسی کو تلاش کر رہے تھے۔''

''وہ کسی کو نہیں، مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ چودھری کے کارندے تھے جو میری تلاش میں مارے مارے پھرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے..... اگر ہمیں اسپتال سے روانہ ہونے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت ہم بری طرح پھنس چکے ہوتے۔'' آفتاب کے جواب نے بابر کو ششدر کر دیا۔ اس قسم کے خدشات ذہن میں ہونے کے باوجود وہ یہ امید نہیں کر رہا تھا کہ اتنی جلدی چودھری کے کارندے اسپتال تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقتاً اس وقت وہ بال بال بچے تھے۔ بہت مشکل حالات میں قسمت نے ایک بار پھر ان کا ساتھ دیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ قسمت کی یہ یاوری کب تک ان کا ساتھ دیتی؟

☆☆☆

اس نے کھڑکی پر پڑے بلائنڈز ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر بارش اسی شدومد سے برس رہی تھی۔ رات ان کے پیرآباد پہنچنے سے پہلے شروع ہونے والی بارش دوسرے دن کی شام ہو جانے کے باوجود کسی طور رکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ تین مظلوموں کی دردناک موت نے آسمان کو بھی رلا ڈالا ہو۔ شہریار کل رات ہی وہاں سے واپس لوٹ آیا تھا اور صبح دفتر پہنچتے ہی ایک نئی مصروفیت نے اسے گھیر لیا تھا۔ محکمۂ موسمیات کی طرف سے کسی پیشگی اطلاع کے بغیر شروع ہونے والے بارش کے اس سلسلے نے معمولاتِ زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور کئی چھوٹے موٹے حادثات کی اطلاعات اس کے دفتر تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان اطلاعات پر فوری امدادی کارروائیوں کے احکامات جاری کرنے کے علاوہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت دیر تک مزید احتیاطی اقدامات کے سلسلے میں مشاورت بھی کرتا رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے قبل اس نے خود باہر نکل کر اردگرد کے علاقوں کا جائزہ بھی لیا تھا۔ اس جائزے نے اسے بہت شدت سے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کے زیرِ نگرانی ضلع میں قدرت کی کسی سختی اور آزمائش کو سہنے کی سکت بہت ہی کم ہے اور مرے پر سو درے کے مصداق ان کے پاس وسائل بھی اتنے تسلی بخش نہیں کہ صورتِ حال زیادہ بگڑ جانے پر کوئی تدارک کیا جا سکے۔ ان حالات میں اسے یہی سمجھ آیا تھا کہ صوبائی حکومت سے رابطہ کر کے ان سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کی اس درخواست کا وہاں سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا تھا بلکہ ایک طرح سے اسے یہ جتایا گیا تھا کہ وہ معمولی بارش کو غیر معمولی اہمیت دے رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر وہ خاصا کبیدۂ خاطر ہوا تھا لیکن اپنے ہاں کے اداروں کی بے حسی بھی اس کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ متعلقہ ادارے اس وقت تک حرکت میں آنا بیکار سمجھتے ہیں جب تک کوئی بڑا حادثہ پیش نہ آ جائے اور لوگ بلبلا کر چیخ نہ اٹھیں۔ صوبائی حکومت کی طرف سے کسی اچھائی کی کم ہی امید رکھتے ہوئے اس نے ممکنہ حد تک اپنے انڈر میں موجود افراد کو متحرک کر دیا تھا اور خود دفتری اوقات ختم ہو جانے کے باوجود ابھی تک اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ دفتر کے دروازے پر ہلکی سی دستک ابھری تو وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اس طرف متوجہ ہوا۔ آنے والا عبدالمنان تھا۔

''حالات کیسے ہیں عبدالمنان؟'' وہ پلٹ کر اپنی کرسی تک آیا اور.... بیٹھتے ہوئے عبدالمنان سے دریافت کیا۔

''مسلسل بارش کی وجہ سے حالات بتدریج خرابی کی طرف جا رہے ہیں سر! اطلاع ملی ہے کہ ایک جگہ بجلی کے تار گرنے کی وجہ سے پانچ افراد زد میں آ گئے ہیں۔ ان پانچوں میں سے دو نے تو موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا جبکہ باقی تین کو بھی کافی نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ اس حادثے کے بعد سے بجلی کی سپلائی مکمل طور پر منقطع کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے مزید مشکلات کا سامنا ہے۔ دیکھا جائے تو نظامِ زندگی بری طرح درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ اکثر دیہاتوں کی صورتِ حال بہت خراب ہے۔ نہر میں بھی پانی کی سطح بہت بلند ہو چکی ہے اور خدشہ ہے کہ پیرآباد اور اردگرد کے چند اور گاؤں زیرِ آب آ سکتے ہیں۔'' عبدالمنان نے اسے جو رپورٹ دی وہ بہت ہی تشویش ناک تھی جسے سن کر وہ کچھ دیر تک اپنے کمرے میں جلتی واحد ٹیوب لائٹ کو خاموشی سے تکتا رہا۔ یہ ٹیوب لائٹ بھی جنریٹر کی وجہ سے روشن تھی۔

روشن ٹیوب لائٹ سے نظریں ہٹا کر اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیاں لیاقت رانا کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ ان کی بیماری اور صدمات سے چور حالت دیکھ کر اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی معاملے میں انہیں زحمت نہ دے لیکن یہ بہت سے لوگوں کی زندگیوں کا معاملہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ لیاقت رانا کی کوشش سے اسے وہ سہولیات میسر آ سکتی ہیں جو اس کی درخواست کے باوجود صوبائی حکومت نے فراہم نہیں کی تھیں۔ لیاقت رانا فون لائن پر آیا تو اس نے بہت اطمینان سے اس کی پوری بات سنی اور یقین دلایا کہ وہ حتی الامکان اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ سیاست داں سہی لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے ماموں کا اس سے کیا ہوا یہ

وعدہ کوئی سیاسی وعدہ نہیں ہے۔ سیاست کے کیچڑ بھرے میدان میں رہ کر وہ بے شک اپنے دامن کو مکمل طور پر چھینٹوں سے محفوظ تو نہیں رکھ پایا تھا لیکن بہرحال فطرتاً وہ ایک اچھا اور ہمدرد انسان تھا اور اب اس کے ذاتی دکھوں نے تو اسے اور بھی زیادہ نرم دل کر دیا تھا۔ اپنی پوتی شینا اور بیٹے سجاد رانا کی موت کے بعد اس کی سیاست میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ روگ کی طرح جان سے لگ جانے والی بیماریوں نے انہیں اس لائق ہی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ لے سکے لیکن بہرحال اب بھی اس کی حیثیت اس ہاتھی سے کم نہیں تھی جو مر کر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے۔ اب بھی اس میں اتنا دم خم تو تھا کہ اس کے مطالبات پورے کروا سکے۔ اس کی طرف سے وعدہ کیے جانے کے بعد شہریار خاصا مطمئن ہو گیا اور اس اطمینان نے اسے دوسرے امور کی یاد دہانی کروانا شروع کر دی۔

''منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی لاشوں کا کیا ہوا؟ انہیں پیرآباد کے ہیلتھ یونٹ سے شفٹ کیا جا سکا؟''

''یہ کام صبح دس گیارہ بجے کے درمیان کر لیا گیا تھا۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد ضروری قانونی کارروائی کے بعد انہیں ورثا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ہم نے ورثا تک اطلاع پہنچا دی ہے۔ منیب اور ایک ماسٹر کے ورثا یہاں پہنچ بھی گئے ہیں جبکہ تیسرے کے ورثا کی طرف سے ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ شاید بارش کی وجہ سے انہیں یہاں تک پہنچنے میں مشکل پیش آ رہی ہو۔'' عبدالمنان نے اسے جواب دیا۔

''اس طرف دھیان رکھنا۔ اگر وہ لوگ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکیں تو خود اپنی ذمے داری پر ڈیڈ باڈی ان کے گھر بھجوا دینا۔ ان بے چاروں پر جتنا بڑا دکھ ٹوٹا ہے اس میں ہم سے جہاں تک ہو سکے' ان کی مدد کرنی چاہیے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مقتولین کے ورثا کی مناسب مالی امداد بھی کی جا سکے۔ جو جان چلی گئی اس کے نقصان کا مداوا تو خیر کسی صورت نہیں کیا جا سکتا لیکن کمانے والوں کی موت کے بعد پیدا ہونے والے معاشی مسائل کا حل تو نکالا جا سکتا ہے۔'' وہ منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی موت سے بہت دکھی تھا۔ اس کا بس چلتا تو فوری طور پر چودھری کو کڑی سزا دلوا ڈالتا لیکن موجودہ حالات میں تو وہ ابھی تک اسے گرفتار بھی نہیں کروا سکا تھا۔

ایک تو اس کے پاس کوئی عینی شاہد نہیں تھا جو عدالت میں یہ بیان دے سکتا کہ اسکول و گھر کو نذرِ آتش کرنے والے چودھری کے ہی گرگے تھے، دوسرے موسم کی خراب صورتِ حال نے بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی اور وہ فوری طور پر درپیش مسائل کے تدارک میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ چند ہدایات دینے کے بعد عبدالمنان کے ساتھ موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تبادلۂ خیال کرنے لگا۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کا ضلع بھر سے رابطہ رہے۔ مواصلاتی نظام کے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں مکمل طور پر کامیاب تو نہیں تھے لیکن جہاں سے بھی ان کا جتنا بھی رابطہ ہو پا رہا تھا، وہاں سے کوئی اچھی اطلاعات موصول نہیں ہو رہی تھیں۔ رات آٹھ بجے کے قریب انہیں اطلاع موصول ہوئی کہ نہر میں پانی کی سطح بہت بلند ہو چکی ہے اور خدشہ ہے کہ اگلے ڈھائی تین گھنٹے میں پانی پیرآباد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہو اٹھا۔

''مجھے..... فوری طور پر امدادی کارکنوں کے ساتھ پیرآباد پہنچنا چاہیے۔ اگر فوری مدد نہیں کی گئی تو کئی انسانی جانوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔''

''میرے خیال میں سر... آپ خود وہاں جانے کے بجائے امدادی ٹیم کو بھجوا دیں۔ اس وقت راستے بہت خراب ہیں، کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔'' عبدالمنان نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''خراب راستوں کے ڈر سے میں اپنی جان بچا کر بیٹھ جاؤں اور دوسروں کی زندگیاں داؤ پر لگا دوں... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ امدادی ٹیم کے ساتھ میں خود جاؤں گا تاکہ ان لوگوں کے حوصلے بھی بلند ہو سکیں۔ تمہیں البتہ یہیں دفتر میں ہی رہنا ہو گا تاکہ ملنے والی اطلاعات پر مناسب اقدامات کر سکو۔'' اس نے تیز لہجے میں عبدالمنان کو جواب دیا۔ اس کے اس انداز پر عبدالمنان نے بہ غور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ برہم ضرور تھا لیکن بہرحال اسے دفتر میں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کسی ناراضی کے باعث نہیں بلکہ انتظامی نقطۂ نظر سے تھا۔ اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد وہ اس کے حسبِ ہدایت ایسی ہی کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے تیار کردہ ریسکیو ٹیم کے افراد کو احکامات جاری کرنے لگا۔ اس دوران شہریار نے ایک بار پھر لیاقت رانا سے رابطہ کر کے انہیں تازہ صورتِ حال بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم کیا کہ وہ کب تک اسے مطلوبہ امداد فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کی طرف سے خاصا امید افزا جواب موصول ہوا۔ اس جواب کو سن کر وہ قدرے مطمئن سا ہو کر اپنے دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ چوبیس گھنٹوں کے

اندر یہ اس کا پیرآباد کی طرف دوسری دفعہ سفر تھا لیکن اس بار وہ اپنی ذاتی گاڑی کے بجائے ایک جیپ میں روانہ ہوا تھا۔ راستے کے بارے میں جو خدشات تھے، ان کے پیشِ نظر جیپ میں سفر کرنا ہی مناسب تھا۔

امدادی ٹیم کے ارکان ایک سفید رنگ کے شہزور پر سوار تھے۔ دونوں گاڑیاں برستی بارش میں، رات کے مہیب اندھیروں اور سناٹوں کا بڑے عزم سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئیں۔ راستہ واقعی بہت خراب ہو چکا تھا اور ڈرائیورز کو مشکل پیش آ رہی تھی لیکن انہوں نے بے پناہ ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑیوں کی رفتار کم نہ ہونے دی۔ بالآخر آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں نے کسی نہ کسی طرح پیرآباد تک کا درمیانی راستہ طے کر ہی لیا۔ جب وہ لوگ پیرآباد میں داخل ہوئے تو شہریار نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے آتے شہزور کی لائٹیں ایک... جگہ رک گئی ہیں اور ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو جیپ روک کر صورتِ حال معلوم کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ شہزور کا ایک پہیا کچی زمین میں دھنس گیا ہے جس کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا۔ امدادی ٹیم کے ارکان نے امید ظاہر کی کہ وہ جلد ہی اس مصیبت سے نجات حاصل کر لیں گے۔ جتنے افراد اس کی جیپ میں سما سکتے تھے، انہیں اپنے ساتھ سوار کر کے وہ باقی کو پھنسے ہوئے ٹرک کو نکالتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ آبادی کی حدود شروع ہوتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سارا گاؤں جاگ رہا ہے۔ بجلی کی سپلائی تو یہاں بھی منقطع تھی لیکن لالٹینوں وغیرہ کی مدھم روشنی جگہ جگہ نظر آ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں وہ پریشانی سے چیختے چلاتے لوگوں کو ادھر ادھر بھاگتے دیکھ سکتا تھا۔ ان پریشان حال لوگوں نے ضلع کے اے سی کو اپنے درمیان پایا تو ان کے چہروں پر حیرت کے ساتھ ساتھ امید کی کرنیں بھی نظر آنے لگیں۔

ان کی زندگیوں میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اتنی جلدی کوئی سرکاری افسران کے درمیان پہنچ گیا تھا ورنہ اس طرح کے لوگ تو اس وقت... پہنچتے تھے جب وہ اپنا مال و متاع گنوانے کے ساتھ ساتھ کئی پیاروں کو بھی زمین میں دفنا چکے ہوتے تھے۔ ان لوگوں سے اسے اطلاع ملی کہ نہر کی سطح خطرناک حد تک بلند ہو چکی ہے اور پانی کسی بھی لمحے گاؤں میں داخل ہو سکتا ہے۔ نہر گاؤں کے مشرقی حصے میں تھی اور یہ حصہ نشیب میں تھا جبکہ گاؤں کا مغربی حصہ کافی بلند اور محفوظ تھا۔ وہ لوگ اپنے اہلِ خانہ اور مال مویشی مغربی حصے میں منتقل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہریار کے ساتھ آئے ہوئے امدادی کارکن اس کام میں ان کی مدد کرنے لگے۔ ان کے پاس طاقتور ایمرجنسی لائٹس اور اس طرح کے کاموں کا تجربہ تھا چنانچہ کام میں تیزی آ گئی۔ شہریار نے اپنی جیپ بھی ان لوگوں کے حوالے کر دی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر کچی زمین میں دھنس جانے والا شہزور بھی میدان میں اتر آیا تھا جس کی وجہ سے لوگوں اور مال و اسباب کی منتقلی کا کام اور بھی تیزی سے ہونے لگا۔ تاہم اب نہر کے پانی نے اپنی حد پھلانگ کر گاؤں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ منہ زور پانی پہلے ہی بارش کی وجہ سے جل تھل زمین کو تیزی سے غرق کرتا جا رہا تھا۔

''اس واری پانی کے تیور الگ ہی ہیں۔ پانی کا وڈا ریلا چودھری سرکار کی زمینوں کی طرف چلا گیا ہے۔'' وہ ایک چھتری سر پر تانے اپنے ساتھ لائے گئے واحد بڑے سے خیمے میں عورتوں اور بچوں کے بہ مشکل سمانے کا منظر دیکھ رہا تھا کہ کسی طرف سے اسے یہ آواز سنائی دی۔ معلوم نہیں بولنے والے کی آواز میں تشویش تھی یا طمانیت... وہ اندازہ نہیں لگا سکا لیکن پھر فوراً ہی ہوا کے دوش پر سفر کر کے اس تک پہنچنے والی دوسری آواز نے اس کی الجھن دور کر دی۔ کہنے والا کہہ رہا تھا۔ ''ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کل رات چودھری نے وڈا ظلم کمایا۔ بے قصور لوگوں کی جان لے ڈالی۔ اب دیکھ لو، کب سے اس کے بندے کوشش کر رہے تھے کہ حفاظتی باڑھ بنا کر پانی کو چودھری کی زمینوں کی طرف آنے سے روک سکیں لیکن پانی اتنی تیزی سے آیا کہ لحہ بھر میں سب ملیامیٹ کر دیا۔ تین چار بندوں کو تو میں نے خود ریلے کی زد میں آ کر ڈوبتے دیکھا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے میں ان کی شکلیں تو نہیں پہچان سکا لیکن تھے تو وہ چودھری ہی کے نمک خوار جو ہمیں مصیبت میں چھوڑ کے خود اپنے آقا کی زمینیں بچانے میں لگے ہوئے تھے۔ وچارے خود اپنی جان بھی نہیں بچا سکے۔'' وہ افسوس کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں افسردگی نہیں تھی۔ خود شہریار نے بھی اپنے دل میں ایسی ہی کیفیت محسوس کی۔ اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے پانی میں ڈوب کر مر جانے والے افراد بھی ان بھیڑیوں میں شامل ہوں جنہوں نے کل رات منیب اور اس کے نہتے ساتھیوں کو گھیر کر موت کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ یہ ناممکن تو نہیں تھا کہ اپنے آقا کے اشارے پر یہ ظلم کرنے والے آج خود انتقامِ قدرت کے گھیرے میں آ گئے ہوں۔ اپنی اس گہری سوچ سے وہ کسی شے کے چھنکنے کی وجہ سے باہر آیا۔ وہ آواز کے ماخذ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابتر حلیے والا شاید چالیس بیالیس سال کا کوئی مخبوط الحواس شخص تھا جو

ایک امدادی کارکن کے سہارے اپنے پیر میں پڑی زنجیریں چھنکاتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ اس کے پیروں میں موجود زنجیروں نے شہریار کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ بے اختیار ہی اس کی طرف بڑھا۔

''اس شخص کے پیروں میں زنجیریں کیوں ہیں؟'' اس نے سہارا دینے والے امدادی کارکن سے سوال کیا۔

''معلوم نہیں سر! ہم لوگوں کو ریسکیو کر رہے تھے جب ہمیں ایک مکان کے اندر سے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ اندر جاکر دیکھا تو یہ آنگن میں ایک درخت کے ساتھ زنجیروں سے بندھا چلا رہا تھا۔ پانی مکان میں داخل ہو چکا تھا چنانچہ ہم نے بڑی مشکل سے زنجیر کو درخت سے نکالا اور اسے اسی حالت میں یہاں لے آئے۔'' امدادی کارکن نے جواب دیا جبکہ پیروں میں زنجیریں پہنا شخص ہر طرف سے بے نیاز اپنے میل بھرے ناخنوں کو چباتے میں مصروف تھا۔

''اس کے گھر والے کہاں ہیں، ذرا ان کو تلاش کر کے مجھ سے ملواؤ۔'' اس نے مخبوط الحواس شخص کی آنکھوں سے جھلکتی .... ذہانت کی چمک کو بہ غور دیکھتے ہوئے حکم دیا تو امدادی کارکن ''یس سر'' کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ ایک عورت کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

''یہ نسیمہ بی بی ہے۔ اس شخص کی بھرجائی۔'' گہری سانولی رنگت والی، دبلی پتلی سی اس عورت کے ہر نقش سے غربت چھلک رہی تھی۔

''یہ شخص جس کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں، تمہارا دیور ہے؟'' امدادی کارکن تعارف کی مختصر رسم نبھا کر آگے نکل گیا تو اس نے عورت سے سوال کیا۔

''ہلاں جی! برسوں سے میرے متھے لگا یہ پاگل میرا دیور ہی ہے۔'' عورت نے بیزاری سے اعتراف کیا۔ اس کے لہجے کی بیزاری اس بے پروائی سے بالکل ہم آہنگ تھی جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ایک ذہنی معذور انسان کو اپنے گھر کے آنگن میں لگے درخت سے بندھا چھوڑ کر خود اپنی جان بچا کر نکل پڑی تھی... بلکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بے پروائی سے بھی بڑھ کر سنگدلی کا مظاہرہ کرتی ہوئی جان بوجھ کر اسے ڈوب مرنے کے لیے چھوڑ آئی ہو تا کہ ہمیشہ کے لیے جان ہی چھوٹے۔

''نام کیا ہے تمہارے دیور کا؟'' عورت کی نیت کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنے کے بجائے اس نے اس سوال کیا۔

''بشیر محمد۔'' عورت نے اسی بیزاری سے جواب دیا۔

''تم نے اسے زنجیروں سے درخت کے ساتھ کیوں باندھ رکھا تھا؟'' شہریار نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''تسی دیکھ ہی سکدے ہو سرکار کہ یہ پگلا ہے۔ اب میں اکیلی جان محنت مزدوری کروں، اپنے معذور منڈے کی دیکھ بھال کروں یا اس پاگل کے پیچھے لور لور پھروں؟'' اس کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے وہ اپنی بیزاری کو قائم نہیں رکھ سکی اور لہجے میں مظلومیت بھر کر بولی۔

''کیوں... اس کا بھائی اور تمہارا خاوند کہاں ہے؟''

''وہ بارہ سال ہوئے مر گیا۔ سارا کیا دھرا اسی منحوس کا ہے۔ اسی کی وجہ سے میرے خاوند کی جان گئی اور بالکا معذور پیدا ہوا۔'' عورت نے تلخی سے جواب دیا لیکن شہریار کی سمجھ میں اس کی بات کا سر پیر نہ آسکا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''مطلب کیا ہونا ہے جی... اس کی بدعقیدگی میرے ہنستے بستے گھر کو کھا گئی۔ نہ یہ پیر کے مزار کی بے حرمتی کرتا اور نہ ہی میرا ہنستا بستا گھر اجڑتا۔ اس کی لمبی زبان میری ساری خوشیوں کو کھا گئی۔'' عورت بھی گویا بھری بیٹھی تھی۔ بشیر محمد کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی اور پھر پے در پے اسے کئی کوسنے دیتی چلی گئی۔

''نسیمہ بی بی! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا گزری ہے؟'' شہریار کی دلچسپی پیر سرکار کا نام سن کر اس قصے میں مزید بڑھ گئی۔

''تفصیل کی ہونی ہے جی! چنگا بھلا ہنستا بستا گھر تھا میرا اور صغیر محمد کا۔ کوئی کمی تھی تو بس اولاد کی۔ ویاہ کو چھ برس گزرنے کے بعد بھی رب سوہنے نے میری گود خالی رکھی ہوئی تھی۔ صغیر محمد کی ماں اٹھتے بیٹھتے مجھے بے اولادی کے طعنے دیتی تھی بلکہ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب ایک برس ہور میری گود خالی رہی تو وہ صغیر محمد کا دوجا ویاہ کر دے گی۔ میری پریشانی دیکھ کر ایک پڑوسن نے مشورہ دیا کہ اگر میں پیر سرکار کے مزار پر جا کر چڑھاوا دوں اور منت مانوں تو میری گود ضرور بھر جائے گی۔ میرے پاس ہور تو کچھ نہیں تھا۔ ماں پیو نے جہیز میں سونے کے جھمکوں کی ایک جوڑی دی تھی۔ اولاد کی خاطر میں وہ جھمکے قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صغیر محمد بھی راضی ہو گیا اور وڈے عرس والے دن ہم دونوں میاں بیوی مزار پر جا پہنچے۔ میرا یہ دیور بشیر محمد ان دنوں شہر میں رہتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کا وڈا شوق تھا۔ اس چکر میں یہ شہر میں رہ کر خود ہی محنت مزدوری کر کے اپنی تیم (تعلیم) حاصل کر رہا تھا۔ اسی شہری تیم نے اس کا متھا خراب کر دیا.... عرس

والے دن یہ شہر سے گاؤں پہنچ گیا اور ماں سے یہ سن کر کہ میں اور صغیر محمد چڑھاوا دینے مزار پر گئے ہوئے ہیں، خود بھی ہمارے پیچھے وہیں آگیا اور لگا نصیحتیں کرنے۔ کہتا تھا قبروں سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا۔ جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو۔ میں نے اور صغیر محمد نے اسے وڈا سمجھایا کہ تو واپس گھر چلا جا اور ہمیں ہماری مرضی پر چھوڑ دے لیکن یہ نہیں مانا اور زور زور سے بولنے لگا۔ وڈی گستاخی کی اس روز اس نے پیر سرکار کی شان میں۔ انہیں جعلی پیر اور جانے کیا کیا کہنے کے ساتھ یہ بھی کہہ گیا کہ چودھری صاحب نے غریبوں کو لوٹنے کے لیے یہ عرس کا چکر چلایا ہوا ہے اور ان پڑھ گاؤں والوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا بتائیں جی! چودھری صاحب کو کس چیز کی کمی تھی جو وہ ہم کمی کمینوں کو لوٹتے؟ بشیر محمد کی باتیں سن کر مزار کی خدمت کرنے والے مجاوروں کو غصہ آگیا۔ انہوں نے مار پیٹ کر اسے باہر نکالا اور کہیں لے جا کر بند کر دیا۔ بعد میں چودھری صاحب نے اسے اس کی گستاخی کی یہ سزا سنائی کہ اسے گھر میں ہی برگد کے درخت سے باندھ کر رکھا جائے اور کہیں آنے جانے نہ دیا جائے۔ صغیر محمد نے چودھری صاحب کا حکم مان کر ایسا ہی کیا لیکن بشیر محمد نے ہمارا جینا حرام کر دیا۔ دن بھر چیختا چلاتا رہتا۔ کبھی چودھری صاحب کو تو کبھی وڈے پیر سرکار کو گالیاں دیتا۔ اس کی باتیں سن کر میں ہولتی رہتی کہ ضرور ہم پر کوئی مصیبت پڑنے والی ہے۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے میں اسے پورا پورا دن کھانا نہیں دیتی کہ چپ چاپ پڑا رہے گا تو روٹی ملے گی ورنہ بھوکا رہنا پڑے گا۔ میری اس دھمکی کا اس پر کیا اثر ہونا تھا۔ اس کی ماں کبھی چپکے سے اور کبھی مجھ سے لڑ جھگڑ کر اپنے پتر کو روٹی کھلا دیتی تھی۔ میں خود پیر سرکار کی کرامت سے ویاہ کے چھ برس بعد ماں بننے والی تھی اس لیے زیادہ اپنی ساس کے منہ نہ لگتی۔ لیکن بشیر محمد کے کیے کا عذاب تو ہمارے گھر پر اترنا ہی تھا۔ ایک رات میری ساس ایسی سوئی کہ صبح اٹھ ہی نہیں سکی۔ اس کے مرنے کے بعد بشیر محمد کی زبان کو کچھ لگام لگی لیکن کیا فیدہ تھا جی۔ ہم تو پیر سرکار کی ناراضی کے گھیرے میں آگئے تھے۔ میرے گھر اتنا سوہنا پتر پیدا ہوا لیکن غریب پیدائشی طور پر دونوں پیروں سے معذور تھا۔ میں وڈی تڑپی، چیخی چلائی، بشیر محمد کو مارا پیٹا بھی لیکن اس سے کچھ ہونے تو والا نہیں تھا۔ آخر صبر کر کے بیٹھ گئی لیکن ہم پر پڑی نحوست ختم کہاں ہوئی تھی، جبھی دو سال بعد صغیر محمد کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ وہ وہیں چٹ پٹ ہو گیا۔ اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ بشیر محمد کو اپنے آنگن میں رہنے نہیں دوں گی۔ میں دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیتی لیکن چودھری صاحب کا حکم ملا کہ بشیر محمد کو اسی طرح رہنے دو۔ اس کی گستاخی کی سزا یہی ہے کہ ساری حیاتی اسی طرح کھلے آنگن میں بندھا رہے اور گرمی سردی برداشت کرے۔ مجھے حکم ماننا پڑا۔ پچھلے پندرہ سال سے میں اس منحوس کو اپنے آنگن میں برداشت کر رہی ہوں۔ اپنا اور اپنے پتر کا پیٹ بھرنے کے لیے کھیت میں مزدوری کرتی ہوں۔ کچھ بچ جائے تو اس نحوست کے مارے کے آگے بھی ڈال دیتی ہوں۔ کم بخت ایسا ڈھیٹ ہے کہ ساری سختیاں سہہ کر بھی جیے جا رہا ہے۔ سات آٹھ سال سے تو اس کے دماغ نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے لیکن منحوس کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں۔ اب بھی دیکھ لو کہ بجائے وہیں ڈوب کر مر جاتا، میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے ایک واری فیر بچ کر آگیا ہے۔'' نسیمہ بی بی کے لہجے میں بشیر محمد کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ شہریار نے سر گھما کر اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سے بے نیاز بشیر محمد کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی افراتفری اور شور شرابے پر کان دھرے بغیر سر جھکائے زمین پر بیٹھا تھا۔

''سزا ملنے کے وقت کتنی عمر ہو گی بشیر محمد کی؟'' وہ چودھری کے ظلم کا شکار بشیر محمد سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر نسیمہ بی بی کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہی کوئی سترہ اٹھرہ برس۔'' نسیمہ بی بی کے لہجے میں پھر بیزاری اترنے لگی۔ اس کی بیزاری کی پروا کیے بغیر شہریار حساب کرنے لگا۔ سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان اپنی عمر کے پندرہ سال ایک غیر انسانی سزا بھگتنے کے بعد آج یقیناً تینتیس سال کا تھا لیکن اس نے زندگی کی جو سختیاں سہی تھیں، انہوں نے اس کی عمر کو کہیں آگے دھکیل دیا تھا اور وہ چالیس سال سے زیادہ کا ہی نظر آتا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں میں کون کون سے خواب سجے ہوں گے اور وہ پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتا ہو گا؟ لیکن اپنی حق گوئی اور بے باکی کے جرم کے باعث انسانوں کے بجائے جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ اپنا ذہنی توازن نہ کھوتا تو کیا ہوتا؟ لیکن جہالت کی گود میں پلنے والی عقیدت نے اس کی اس حالت کو بھی پیر سرکار کا عتاب جانا تھا۔

''میں جاؤں صاحب! اپنے پتر کو ایک عورت کے پاس چھڈ کر آئی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان ہو رہا ہو گا۔'' اسے نسیمہ کی آواز نے اپنے خیالات سے چونکایا۔

''ہاں جاؤ۔'' اس نے اسے اجازت دی اور خود بشیر محمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے بہت سے مصیبت زدہ لوگوں

کی مدد کے علاوہ بشیر محمد کو بھی اس منجدھار سے نکالنا تھا جس میں وہ پچھلے پندرہ سال سے پھنسا ہوا تھا۔

☆☆☆

میجر ذیشان نے اگلے روز پھر اس ہوٹل کا رخ کیا... جس میں اس نے ایملی پارکر نامی ساحرہ کے ساتھ بڑا سرور انگیز وقت گزارا تھا اور اپنے دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ وہ عورت حیرت انگیز تھی۔ اس سے ایک بار ملنے کے بعد دوبارہ ملنے کے لیے دل تڑپتا تھا اور وہ اس کی قربت کی خواہش دل میں لیے... دوبارہ اس سے ملنے پہنچا تھا۔ اس بار اس نے دن کی روشنی کے بجائے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایملی سے اس کی ملاقاتیں کسی کی نظر میں آئیں لیکن ہوٹل پہنچ کر اسے اس وقت شدید دھچکا لگا جب اسے معلوم ہوا کہ ایملی کل دوپہر ہی یہاں سے رخصت ہوگئی ہے۔ اسے ایملی نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ سیاحوں کے کسی گروپ کے ساتھ آگے سفر کا ارادہ رکھتی ہے لیکن اس کے جو ضروری کاغذات غائب ہو گئے تھے، ان کی غیر موجودگی میں اس کا سفر کے لیے آگے چلے جانا حیرت انگیز تھا۔ کسی غیر ملکی سیاح کے لیے دیارِ غیر میں سفر و رہائش کے اخراجات کے علاوہ اس کے شناختی کاغذات کی جو اہمیت ہوتی ہے، اس سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ ان حالات میں ایملی کا بنا کسی اطلاع کے اسکردو سے روانہ ہو جانا اس کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ اس نے ہوٹل انتظامیہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس گروپ کے ساتھ اور کہاں کے لیے روانہ ہوئی ہے اور جواب میں اسے یہ تعجب خیز بات معلوم ہوئی کہ ایملی کسی گروپ کے ساتھ روانہ نہیں ہوئی۔ وہ اکیلی ہی ہوٹل سے نکلی تھی اور اس نے اپنی منزل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس کی اس حرکت پر حیرت کا شکار میجر ذیشان مایوسی کے عالم میں اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ گیا۔ ایملی کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے سے اسے دھچکا لگا تھا۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ اس کی ایک بار کی قربت کے بعد آدمی کی طلب مٹ جاتی۔ وہ تو میجر ذیشان کے اندر اپنی قربت کی پیاس بھڑکا کر چلی گئی تھی۔ اس پیاس کو بجھانے کے لیے اس نے شراب کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ عادی شرابی نہیں تھا لیکن کبھی کبھی شغل کے طور پر مے نوشی میں حرج بھی نہیں سمجھتا تھا چنانچہ اس کی رہائش گاہ پر ہمہ وقت شراب کی ایک دو بوتلیں موجود رہتی تھیں۔ اس وقت بھی اس نے ایک بوتل کھولی اور مے نوشی شروع کر دی۔ ابھی پہلا ہی جام اس کے حلق سے نیچے اترا تھا کہ وہ بری طرح چونکا۔ کل اس نے ہوٹل کے کمرے میں ایملی کے شباب کے ساتھ ساتھ.... شراب پی تھی اور اب اسے دھندلا دھندلا سا کچھ یاد آرہا تھا۔ شراب اور شباب کے نشے میں چور اس کی زبان سے ایملی کے سامنے کچھ ایسی باتیں نکلی تھیں جو نہیں نکلنی چاہیے تھیں بلکہ اب اسے یاد آرہا تھا کہ وہ باتیں اس کی زبان سے خود بخود نہیں نکلی تھیں، ایملی نے کرید کرید کر اس سے معلوم کی تھیں۔

وہ جام ہاتھ سے رکھ کر مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جوں جوں وہ اس معاملے پر غور کرتا جا رہا تھا، ایملی کا کردار مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ ایملی کا اس سے ملنا، اپنے ساتھ واردات کی کہانی سنانا، پھر ہوٹل میں اپنے کمرے تک لے جانا اور وہاں یک دم ہی اسے اپنے حسن کے سحر میں جکڑ کر بے بس کر دینا... کچھ بھی تو اب حقیقی نہیں لگ رہا تھا۔ اس ساری تفصیل میں ایک ڈرامائی سا عنصر تھا جسے میجر ذیشان کے تربیت یافتہ ذہن کو بہت پہلے محسوس کر لینا چاہیے تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی عام مردوں کی طرح ایملی کے حسن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے اس طرح پھنسنے پر خود کو بری طرح ملامت کرتا گہری تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس عورت کے جال میں پھنسا تھا، وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ وہ موساد کی اسپیشل ایجنٹ لنڈا تھی جو بڑے بڑے ذہین مردوں کی عقل خبط کرنے میں خصوصی مہارت رکھتی تھی۔ اگر اس نے میجر ذیشان کو الو بنا دیا تھا تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔ اسے اس کام کی بھرپور تربیت دی گئی تھی کہ وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ حسن کو کس طرح ہتھیار بنا کر انہیں زیر کر سکتی ہے۔

حیران پریشان میجر ذیشان پر جب اپنے آپ کو بے وقوف بنائے جانے کا انکشاف ہوا تو وہ فوراً ایکٹیو ہو گیا۔ اسے خود سے چند اہم راز اڑا کر لے جانے والی ایملی پارکر کو تلاش کرنا تھا لیکن یہ کام کوئی آسان نہیں تھا۔ ایملی کو ہوٹل سے چیک آؤٹ کیے تیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور تیس گھنٹے کسی کے منظر سے غائب ہو جانے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کروائیں تو معلوم ہوا کہ ایملی نے اسکردو سے واپس جانے کے لیے ہوائی جہاز کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ دوسری صورت زمینی راستے کی..... ایک ایسی جگہ پر جہاں مسلسل غیر ملکی سیاحوں کا آنا جانا لگا رہے، ایک عورت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ نہ تو اس عورت کے اصل نام سے واقف تھا اور نہ ہی اس کے پاس اس کی کوئی تصویر وغیرہ

موجود تھی۔ اس کے حکم پر اس کے ماتحت صرف حلیے کی بنیاد پر ایملی کے بارے میں تحقیقات کرتے رہے تھے۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں بالآخر انہیں اتنا تو معلوم ہو گیا کہ بیان کردہ حلیے سے کسی قدر ملتی جلتی عورت نے اسکردو سے اسلام آباد تک سڑک کے ذریعے سفر کیا تھا۔ وہاں سے آگے وہ عورت کہاں گئی تھی، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس رپورٹ نے میجر ذیشان کو پوری طرح باور کروا دیا کہ وہ بہت بڑی لغزش کا مرتکب ہو گیا ہے۔ پچھتاوے اور احساسِ ندامت سے گھرے میجر ذیشان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کو اپنی اس کوتاہی سے آگاہ کر دے۔ چنانچہ پوری رات کی شب بیداری کے بعد صبح جب وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا ہوا کرنل توحید کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

کرنل توحید کو اپنے ذہین اور محبِ وطن آفیسر کی اس کوتاہی نے شدید صدمہ تو پہنچایا لیکن وہ چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس سے ایک ایک تفصیل معلوم کرتا رہا۔ کئی سوالات کے نتیجے میں اسے یہ معلوم ہو گیا کہ میجر ذیشان نے بے شک بیشتر تفصیلات جاسوس لڑکی کو بتا دی ہیں لیکن ماہ بانو کا معاملہ کھل کر سامنے نہیں آیا۔ بہرحال، میجر ذیشان کے..... پیش آنے والے واقعے نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ جو کچھ پیش آیا، اس کا ذمے دار مکمل طور پر بھارت کو سمجھنا شاید ان کی ایک غلطی ہے... کیونکہ جو لڑکی میجر ذیشان سے ٹکرائی تھی، اس کا ایشیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی غیر ایشیائی لڑکی کا بھارتی خفیہ ایجنسی کے لیے کام کرنا اگرچہ ناممکن تو نہیں تھا لیکن اس پورے معاملے میں کچھ ایسا تھا جو کرنل توحید کی چھٹی حس کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ بات ان کے روایتی دشمن بھارت سے کہیں آگے کی ہے... وہ گہری فکر میں ڈوب گیا اور اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

☆☆☆

ملک کے تین بڑے شہروں میں پے در پے قیامت ٹوٹی تھی۔ پہلا واقعہ کراچی میں پیش آیا۔ وہ کسی نیم سیاسی مذہبی جماعت کا سالانہ اجلاس تھا۔ جماعت کا دعویٰ تھا کہ ان کا مقصد محض اسلام کی سربلندی، تبلیغ و ترویج ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ جماعت ایک سیاسی جماعت کو درونِ خانہ ٹھیک ٹھاک سپورٹ کرتی تھی۔ مذہبی جماعت سے وابستہ، اس کے نظریات و عقائد سے متاثر لوگ اپنے ووٹ عموماً اسی سیاسی جماعت کے نمائندوں کو دینا پسند کرتے تھے۔ جواب میں لازمی ہے کہ سیاسی جماعت کی طرف سے بھی کافی کچھ کیا جاتا تھا، یوں مل جل کر دونوں کا کاروبار چل رہا تھا۔ مذہبی جماعت نے اپنا سالانہ جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا تو اپنی حمایتی سیاسی جماعت کی مدد سے انہیں من پسند جلسہ گاہ بھی میسر آ گئی اور جلسے کے شرکا کو شہر کے مختلف حصوں سے لانے لے جانے کے لیے گاڑیوں کے علاوہ دیگر انتظامات بھی بہترین طریقے سے انجام پا گئے۔ جلسے کا باقاعدہ آغاز تو نمازِ مغرب کے بعد ہونا تھا لیکن لوگوں کو سہ پہر تین بجے سے وہاں جمع کیا جانے لگا۔ عصر تک جلسہ گاہ کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی بڑی تعداد میں جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ اسٹیج پر بھی بڑی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ملک کے کئی بڑے نعت خواں اس موقع پر مدعو کیے گئے تھے جو وقفے وقفے سے اسٹیج پر آ کر نعتیں پڑھ رہے تھے۔ ان کی خوب صورت آوازوں پر جھومتے شرکائے جلسہ جب وقتاً فوقتاً بلند کیے جانے والے نعروں کا جواب دیتے تو فضا گونج اٹھتی۔

ایک جوش اور سرور کا عالم تھا جس میں لوگ ڈوبے ہوئے تھے اور انہیں اپنا کئی گھنٹے قبل جلسہ گاہ میں جمع کیا جانا بھی کوفت زدہ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ وہ عورتیں جن کی گود میں چھوٹے بچے تھے اور ماؤں کو پریشان کر رہے تھے، تھوڑی سی جھنجلاہٹ کا شکار تھیں۔ پہلے پہل وہ روتے پریشان کرتے بچوں کو مختلف ترکیبوں سے بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتیں۔ اگر بچہ بہل جاتا تو ٹھیک ورنہ آخر میں اس کا انجام یہ ہوتا کہ ماں سے دو چار دھموکے کھا کر تھوڑی دیر ریں ریں کرتا پھر ہار مان کر یا تو چپکا بیٹھ جاتا یا ماں کی گود میں ہی دبک کر سو جاتا۔ بچے کو قابو میں کر لینے والی ماں ایک بار پھر اطمینان اور پوری عقیدت کے ساتھ نعت کے ساتھ جھومنے لگتی۔ مغرب سے ذرا قبل جماعت کے اکابرین نے جلسہ گاہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ ان کی آمد کے بعد تو جلسہ گاہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ لوگوں کے جوش و عقیدت میں کئی گنا اضافہ نظر آنے لگا۔ جلسہ گاہ مذہبی نعروں کے ساتھ ساتھ استقبالی نعروں سے بھی گونج اٹھی۔ مغرب کی اذان شروع ہوئی تو یہ شور ذرا تھما اور اعلان کیا گیا کہ نماز کے بعد امیرِ جماعت حاضرین جلسہ سے خطاب فرمائیں گے۔ نماز کے لیے صفیں ترتیب دی جانے لگیں۔ اسلامی بھائی چارے اور مساوات کا پرچار کرتے رہنے کے باوجود اکابرین جماعت کی صفیں اوپر اسٹیج پر بنیں اور عوام کے حصے میں وہی مٹی سے اٹی دریاں آئیں جہاں وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے براجمان تھے۔

صف بندی کے بعد ابھی امام نے اللہ اکبر کہنے کے

لیے ہاتھ بلند ہی کیے تھے کہ کان پھاڑ دھماکوں کی آوازوں سے فضا لرز اٹھی۔ ہر طرف چیخ و پکار اور آہ و بکا سنائی دینے لگی۔ ایسی افراتفری اور ہاہا کار مچی کہ کسی کو کوئی ہوش نہیں رہا۔ خون اور انسانی اعضا سے پٹ جانے والی جلسہ گاہ میں ایسی بھاگ دوڑ مچی کہ کئی لوگ پیروں تلے بھی آ کر کچلے گئے۔ پولیس اور امدادی کارکنوں کے حرکت میں آنے تک بہت بڑی تعداد میں انسانی زندگیاں دم توڑ چکی تھیں اور کئی لوگ طبی امداد کے لیے اسپتال پہنچنے سے پہلے ختم ہو گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی دہشت گردی نہیں تھی۔ جلسہ گاہ میں چند سیکنڈوں کے وقفے سے تین دھماکے ہوئے تھے اور ان دھماکوں میں عوام کے ساتھ ساتھ جماعت کے اکابرین میں سے بھی کئی افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ان اکابرین کی موت نے شہر بھر میں قیامت بپا کر دی۔ مذہبی جماعت کی حمایتی سیاسی جماعت بھی میدان میں اتر آئی۔ ایک طرف انتظامیہ کی ناقص کارکردگی اور سیکیورٹی کے خراب انتظام کی نشان دہی کرتے ہوئے حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا تو دوسری طرف شہر بھر میں جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ احتجاجی مظاہرے کر کے دہشت گردوں کو پکڑنے اور سزا دیے جانے کے مطالبات کیے جانے لگے۔ جلسہ گاہ میں جو قیامت برپا ہوئی تھی سو ہوئی تھی، اس کے بعد بھی کئی دن تک شہر جلتا رہا... لوگ مرتے رہے اور بے پناہ معاشی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ اللہ کر کے مذاکرات، دعوؤں اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے ہفتے بھر میں کراچی میں کاروبارِ زندگی معمول پر لایا ہی گیا تھا کہ لاہور میں ایک دوسری قیامت کھڑی ہو گئی۔

وہ ایک ایسا وقت تھا جب شہر کے بیچوں بیچ واقع ریلوے ٹریک پر سے بہ یک وقت دو ٹرینوں کو گزرنا تھا۔ ٹرینوں کا اس ٹریک پر سے گزرنا معمول کی بات تھی۔ جس وقت ٹرین کو اس مقام سے گزرنا ہوتا، دونوں طرف سے پھاٹک بند کر کے ٹریک کو روک دیا جاتا۔ معروف شاہراہ پر ٹریفک کی روانی کچھ دیر کے لیے منقطع ہوتی اور پھر ٹرین کے گزر جانے کے بعد ایک بار پھر ٹریفک رواں دواں ہو جاتا۔ اس روز جانے کیا ہوا کہ ٹرینوں کے گزرنے کے وقت پھاٹک بند نہیں کیا گیا۔ اسپیڈ میں آتی کئی گاڑیاں ٹرینوں کی آمد سے بے خبر ریلوے ٹریک کو کراس کر کے آگے کی طرف گامزن ہونے کے لیے آگے بڑھیں تو دونوں طرف سے آتی ٹرینوں کی زد میں آ گئیں۔ موقع پر ایک قیامت سی مچ گئی۔ گاڑیوں کے مسافر تو تیز رفتار ٹرینوں کی زد میں آ کر اپنی گاڑیوں سمیت جو قیمہ بنے سو بنے، ٹرینوں میں سفر کرنے والے بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک ٹرین کی کئی بوگیاں ٹریک سے اتر گئیں جبکہ دوسری ٹرین کے ڈبے ایک دوسرے کے اندر اس بری طرح دھنسے کہ اندر موجود مسافر پس کر رہ گئے۔ موقع پر وہی معمول کی افراتفری مچ گئی۔ پولیس موبائلز اور ایمبولینسوں کے سائرن، نیوز چینلز کے نمائندوں کی بھاگ دوڑ، سیاسی و سماجی لیڈروں کے مذمتی بیانات، موقع پرستوں کا مردہ و زخمی افراد کے مال و اسباب کو لوٹنا... یہ سب ہو چکا تو سوال اٹھا کہ آخر مقررہ وقت پر ریلوے پھاٹک کیوں بند نہیں کیا گیا تھا؟ سرکاری اہلکار اس سوال کے جواب میں گول مول بیانات دیتے رہے لیکن بہرحال تحقیق کرنے والے بہت سے حقائق سے واقف ہو چکے تھے۔

انکوائری کے نتیجے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ریلوے پھاٹک کھولنے اور بند کرنے کے ذمے دار شخص کو قتل کر دیا گیا تھا چنانچہ وہ شخص اس قابل ہی نہیں تھا کہ اپنی ڈیوٹی انجام دے سکتا۔ ریلوے کے اس ملازم کی موت نے ثابت کر دیا کہ جو حادثہ پیش آیا، وہ محض حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک بڑی سازش تھی جس کا شکار ہو کر کئی لوگ لقمۂ اجل بن گئے اور کئی کے نصیب میں عمر بھر کی معذوری لکھ دی گئی۔ تحقیقات کا دائرہ مزید وسیع کیا گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ صرف گاڑیوں کے ٹرینوں سے تصادم کی سازش کا تانا بانا نہیں بُنا گیا تھا بلکہ ٹریک پر ایک ٹائم بم بھی نصب کیا گیا تھا۔ بم بہت زیادہ طاقتور نہیں تھا لیکن بہرحال ایسا ضرور تھا کہ اس نے ریل کی پٹریوں کو اکھاڑ ڈالا تھا۔ یہ بم ٹھیک اس وقت پھٹا تھا جب ٹرینیں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ یعنی سازش تیار کرنے والوں نے پورا انتظام کیا تھا کہ اگر گاڑیوں اور ٹرینوں کا آپس میں تصادم نہ بھی ہو تو وسیع پیمانے پر تباہی پھیل سکے۔

تحقیقات کرنے والے خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے اگرچہ میڈیا کو حقائق کی بھنک نہیں پڑنے دی لیکن خود ان کی کارروائیاں جاری رہیں اور وہ اس دہشت گردی میں ملوث ہاتھوں تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ اس جدوجہد نے انہیں قبائلی علاقوں تک پہنچا دیا۔ کچھ ایسے نام سامنے آئے جو اسمگلرز کی حیثیت سے پہلے ہی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھے لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر خفیہ ادارے ہمیشہ انہیں طرح دیتے رہے تھے۔ ان افراد کے بارے میں قبائلی علاقوں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ پڑوسی ملک سے سامانِ آرائش، اشیائے خورونوش، کپڑا اور اسی

طرح کی دوسری چیزیں اسمگل کرتے ہیں۔ خفیہ اداروں کے پاس رپورٹ تھی کہ وہ ان اشیا کی آڑ میں اسلحہ اور منشیات جیسی اشیا بھی اسمگل کر رہے ہیں لیکن انہوں نے ان اسمگلرز پر ہاتھ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا۔

اب جو سانحۂ کراچی اور لاہور کی تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ پڑوسی ملک سے دھماکا خیز مواد انہی اسمگلرز کے ذریعے پاکستان پہنچایا گیا تھا۔ اس مرحلے پر یقیناً خفیہ ایجنسیوں کو ان کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھانا چاہیے تھا اور ملک کی جڑیں کاٹنے والے ان غداروں کی گرفتاری عمل میں آنی چاہیے تھی لیکن وہ اسمگلرز ایجنسیز کے افراد سے چند قدم آگے ہی تھے۔ وہ اپنی گردن گرفت میں آنے سے قبل ہی بیرونِ ملک فرار ہو چکے تھے چنانچہ حکومتی خفیہ اداروں کے بس میں فقط مایوسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ ہاں، اس بھاگ دوڑ کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ تحقیقی افسران کے ہاتھوں یہ خبر لگ گئی کہ دہشت گردی کا تیسرا واقعہ اسلام آباد میں پیش آنے کا امکان ہے اور اس مقصد کے لیے کچھ دہشت گرد دھماکا خیز مواد کے ساتھ اسلام آباد کی حدود میں داخل بھی ہو گئے ہیں۔

ہر طرف سیکیورٹی ہائی الرٹ کر دی گئی۔ تمام سرکاری عمارتوں، مساجد اور تعلیمی اداروں کی سخت نگرانی کی جانے لگی۔ دہشت گردوں کی تلاش میں کئی جگہ چھاپے بھی مارے گئے لیکن وہ تو گویا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھوم رہے تھے کہ کسی کی پکڑ میں نہیں آ سکے پھر انہوں نے جو کارروائی کی وہ بھی توقع کے خلاف تھی چنانچہ سارے حفاظتی انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دہشت گردوں نے اس بار اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل کو نشانہ بنایا تھا۔ ہوٹل میں دھماکا ہوا اور کئی منزلہ عمارت کو شدید نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ کئی انسانی جانیں بھی زد میں آ گئیں۔ مرنے والوں میں مقامی افراد کے ساتھ کئی غیر ملکی بھی شامل تھے چنانچہ حکومتِ پاکستان کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی اس پریشانی اور شرمندگی کے برعکس کہیں کچھ لوگ بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنا ہر ٹارگٹ بہت کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا تھا اس لیے خوش ہونا ان کا حق تھا۔ ان خوش ہونے والوں میں را کا اعلیٰ عہدے دار نارائن بھی شامل تھا جسے اسلام آباد ہوٹل کے بم دھماکے کے ٹھیک اگلے دن لنڈا کی طرف سے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ پیغام کے الفاظ تھے۔

''کامیابی مبارک۔ تمہاری کارکردگی نے ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے کا کام کیا ہے۔ تم نے ہمیں خوش کیا، جلد ہی تمہیں بھی خوش کر دیا جائے گا۔''

اس پیغام نے نارائن کی باچھیں پھیلا دیں۔ ملکی مفادات کے ساتھ ساتھ اسے انعام میں لنڈا کی ہوش ربا قربت بھی تو میسر آنے والی تھی۔ اس نوید کو سن کر وہ خوش نہ ہوتا، یہ کیسے ممکن تھا؟

☆☆☆

''ہیلو اے سی صاحب!'' وہ اپنے سامنے رکھی ایک رپورٹ کا جائزہ لے رہا تھا کہ جانی پہچانی پُرجوش آواز کے مخاطب کرنے پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ڈاکٹر ماریا تر و تازہ چہرہ لیے اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر عورت بھی موجود تھی۔ اس عورت نے لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں مفلر نما دوپٹا لپیٹ رکھا تھا۔

''ان سے ملیے، یہ میری ممی ہیں۔'' ڈاکٹر ماریا نے اپنے ساتھ موجود خاتون کا تعارف کروایا۔

''اوہ... ہیلو مسز جوزف! ڈاکٹر ماریا سے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔ ملنے کی خواہش بھی تھی لیکن بس اتفاق ہے کہ میں موقع ہی نہیں نکال سکا آپ سے ملاقات کے لیے۔'' شہریار نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ جس سیٹ پر کام کر رہے ہیں، اس کی مصروفیات ہی ایسی ہیں کہ بندہ چاہ کر بھی وقت نہیں نکال پاتا۔'' جواباً مسز جوزف نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک شان دار عورت تھی جس کے بولنے کا ناپا تلا انداز اور چہرے پر موجود وقار ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی ساری زندگی مہذب ماحول میں گزری ہے۔ شہریار کو یاد تھا کہ ڈاکٹر ماریا نے اسے اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بات بھی بتائی تھی کہ وہ ایک ملازمت پیشہ عورت تھی جس نے خود اپنی محنت سے اپنی اکلوتی بیٹی کو میڈیکل کی تعلیم دلوائی تھی۔

''آپ لوگ تشریف تو رکھیں۔'' شہریار کو خیال آیا کہ وہ دونوں ابھی تک کھڑی ہوئی ہیں تو وہ اپنے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ اس وقت پیر آباد میں موجود تھا اور ایک ٹینٹ میں قائم کردہ عارضی دفتر میں بیٹھا متاثرین کے لیے کی جانے والی امدادی کارروائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہونے والی طوفانی بارش نے پیر آباد سمیت اور بھی دیہاتوں کو متاثر کیا تھا لیکن نہر کا پانی.... گاؤں میں داخل ہو جانے کی وجہ سے پیر آباد میں نقصان نسبتاً زیادہ ہوا تھا۔ آج کل وہ ان متاثرین کی بحالی کے سلسلے

میں بری طرح معروف تھا اور باقی معاملات کی طرف سے اس کی توجہ فی الحال ہٹی ہوئی تھی۔ کبھی وہ ایک گاؤں میں ہوتا تو کبھی دوسرے گاؤں میں۔ اب بھی اسے پیر آباد پہنچے آدھے گھنٹے سے کچھ اوپر ہی وقت گزرا ہوگا۔ ڈاکٹر ماریا اور مسز جوزف کو یقیناً اس کی یہاں آمد کی اطلاع مل گئی تھی چنانچہ وہ دونوں اس سے ملنے چلی آئی تھیں۔

''بارشوں نے اچھی خاصی تباہی مچا دی ہے۔ بے چارے غریب لوگ بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ایک طرف ان کے گھر بار اور کھیت زد میں آئے ہیں تو دوسری طرف صحت کے مسائل بھی کھڑے ہو گئے ہیں۔ چھوٹے بچے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ بچوں میں پیٹ اور جلد کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ مرکزِ صحت میں علاج کے لیے لائے جانے والے زیادہ تر مریض انہی دو تکالیف کی شکایت کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اسٹاک میں موجود دواؤں کی بھی قلت ہونے لگی ہے۔'' اس کی پیشکش پر وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور بیٹھنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے حالیہ تباہ کاری پر تبصرہ شروع کر دیا۔

''مجھے دواؤں کے سلسلے میں اطلاع مل گئی تھی۔ میں نے آرڈر کر دیا ہے۔ آج شام تک آپ تک ساری ضروری دوائیں پہنچ جائیں گی۔'' شہریار نے اسے جواب دیا۔

''تھینک یو اے سی صاحب! مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طرف سے ایسے کسی کام میں تاخیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ کے پاس آنے کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو میں ممی کے اصرار پر انہیں آپ سے ملوانے کے لیے لائی تھی۔ ممی آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔'' ڈاکٹر ماریا نے بتایا تو وہ سوالیہ نظروں سے مسز جوزف کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں اسکول کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں جو کچھ پیش آیا، وہ بہت افسوس ناک تھا۔ قیمتی انسانی جانوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے بچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔ پہلے اسکول کے روحِ رواں ماسٹر آفتاب غائب ہوئے اور اب ان کے ساتھی بھی نہیں رہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ فی الحال موجودہ مصیبت سے نمٹ رہے ہیں۔ اسکول کے سلسلے میں نئے سرے سے انتظامات کرنے میں تو آپ کو کافی وقت لگ جائے گا۔'' مسز جوزف نے بولنا شروع کیا تو شہریار کے ہونٹ بھنچ گئے۔ منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کی دردناک اموات ایسی نہیں تھیں جنہیں بھلایا جا سکتا... اور اس سے بڑھ کر افسوس کا مقام یہ تھا کہ ابھی تک ان کی ناحق اموات کے لیے کسی ظالم پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا تھا۔ وہ دوسری طرف مصروف ہو گیا تھا تو گویا معاملہ دب ہی گیا تھا، حالانکہ اس نے قتل کی جو ایف آئی آر درج کروائی تھی، اس میں واضح طور پر چودھری پر شک ظاہر کیا تھا۔

''میں آج کل یہاں رہ کر ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی ہوں۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے فارغ بیٹھنے کی عادت نہیں رہی اس لیے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ ماریا کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹا دوں لیکن ظاہر ہے، میرا میڈیکل کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں اس لیے میں اس کے لیے زیادہ کارآمد بھی نہیں ہوں۔ اپنی اس بے کاری کی زندگی سے اکتا کر میں کوئی حل ڈھونڈ رہی تھی تو کل بیٹھے بیٹھے مجھے اسکول کا خیال آ گیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گاؤں کے بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دوں؟ اس طرح مجھے بھی ایک اچھی مصروفیت مل جائے گی اور بچوں کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔'' مسز جوزف کے الفاظ گویا اس کے لیے خوشی کا پیام تھے۔ وہ کھِل اٹھا۔

''تھینک یو مسز جوزف! تھینک یو ویری مچ۔ موجودہ حالات میں آپ کا یہ تعاون میرے لیے بہت بڑا احسان ہوگا۔ میں خود اس سلسلے میں پریشان تھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ اسکول کے لیے نئے اسٹاف کا تقرر کرنا خاصا دشوار مرحلہ ثابت ہوگا۔ سابقہ اساتذہ کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد کوئی دوسرا ٹیچر پیر آباد کا رخ کرتے ہوئے گھبرائے گا۔ موجودہ حالات میں آپ کی یہ پیشکش بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں آپ کی اس آفر کے لیے تہِ دل سے مشکور ہوں۔'' وہ واقعی بہت خوش تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ اسکول کی عمارت کو تالا لگتا ہوا نظر آ رہا تھا، مسز جوزف کی پیشکش اندھیرے میں امید کا دیا بن گئی تھی۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں اے سی صاحب! ہم بے شک آپ کے ہم مذہب نہیں ہیں لیکن ہم وطن تو ہیں۔ ہم بھی اس مٹی سے محبت کرتے ہیں اور اس کا قرض اپنی جان پر محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر مجھے اس قرض کو ادا کرنے کا ایک موقع مل رہا ہے تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔'' مسز جوزف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے... میں اپنے آدمیوں سے کہتا ہوں کہ اسکول کی عمارت کو دیکھ لیں اور اس لائق بنا دیں کہ بچے وہاں بیٹھ سکیں۔ دیگر سہولیات بھی آہستہ آہستہ فراہم کر

دی جائیں گی۔ آپ بتائیں، آپ کب سے کام شروع کرنا پسند کریں گی؟'' مسز جوزف کے جذبے سے متاثر شہریار کے لہجے میں بڑا جوش تھا۔

''میں تو ابھی سے کام شروع کرنے کو تیار ہوں لیکن یقیناً عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں۔'' مسز جوزف نے جواب دیا۔

''آپ مجھے آج اور کل کا دن دے دیں۔ پرسوں آپ کو آپ کا اسکول تیار ملے گا۔'' اس نے انہیں یقین دہانی کروائی۔

''ٹھیک ہے... تو پرسوں صبح میں اسکول پہنچ جاؤں گی۔ اب آپ ہمیں اجازت دیجیے۔ ماریا کو بھی اپنے مریض دیکھنے ہوں گے۔'' مسز جوزف نے کہا اور پھر وہ دونوں الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

ان دونوں کے جانے کے بعد شہریار نے سامنے میز پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

''چودھری افتخار شاہ کے خلاف منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کے الزام میں ایک ایف آئی آر درج کروائی گئی تھی ایس پی صاحب! آپ نے اس سلسلے میں کیا ایکشن لیا؟'' کال ریسیو ہونے پر مطلوبہ شخص کے لائن پر آتے ہی اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''اس سلسلے میں تو کوئی ایکشن لینے کا موقع ہی نہیں ملا سر! موسم کی خراب صورتِ حال نے ہی ساری گڑبڑ کر دی۔ آپ بھی مصروف ہو گئے۔ آپ کی سپورٹ کے بغیر تو ہم چودھری کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتے تھے... وہ بھی اس صورت میں کہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ موجود نہیں۔'' ایس پی نے گویا اس پر اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ ایس پی برا آدمی نہیں تھا لیکن بہرحال اس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ اپنے کندھوں پر ذمے داری لیتے ہوئے چودھری کے خلاف ایکشن لینے کی جسارت کر سکتا۔

''کتنے افسوس کا مقام ہے ایس پی صاحب... کہ جس قانون کو مظلوموں کا سہارا بننا چاہیے، اس قانون کے محافظ ایک ظالم کی بیخ کنی کے لیے خود سہاروں کی تلاش کریں۔ یہاں کچھ لوگ ناحق مارے گئے اور آپ میں اتنی جرأت نہیں کہ آپ قاتل کے خلاف قانونی کارروائی کر سکیں؟'' اس نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں ایس پی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''میں مجبور ہوں سر! میرے شانے اتنے طاقتور نہیں کہ اتنا بھاری بوجھ اٹھا سکیں۔ میں عمر کے اس حصے سے بھی گزر چکا ہوں جب آدمی جذبات میں آگے کچھ بھی دیکھے بغیر خود کو ہیرو ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا لیتا ہے... لیکن ابھی آپ میری بات نہیں سمجھیں گے۔ ابھی آپ بیچلر ہیں۔ کوئی بھی جرأت مندی دکھاتے ہوئے آپ کو اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں ستا سکتا لیکن ہم جیسوں کو خیال آتا ہے، ہمارے کسی قدم کا ہماری فیملی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔'' ایس پی کے لہجے میں کچھ جھنجلاہٹ اور بے بسی تھی۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو پولیس فورس چھوڑ دینی چاہیے۔'' وہ ایس پی کا جواب سن کر شدید مایوس ہوا تھا اس لیے جلے دل سے مشورہ دیا۔

''میں اگر آپ کے مشورے پر عمل کر بھی لوں تو اس سے محکمے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میری جگہ جو دوسرا شخص آئے گا، وہ بھی یا تو میری طرح مجبور ہوگا یا پھر کوئی ایسا عقل مند جو اس جنگ میں آپ کے ساتھ کھڑا ہو کر ڈراوے اور دھمکیاں سننے کے بجائے چودھری کی صف میں کھڑا ہونا پسند کرے گا۔''

''کیا بات ہے ایس پی صاحب! کیا آپ کو چودھری کی طرف سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟'' اس کے جواب نے شہریار کو چونکایا۔

''جس دن ہم نے ماسٹر آفتاب کی تلاش میں چودھری کے ڈیرے پر ریڈ کیا تھا۔ اس کے دوسرے دن سے یہ صورتِ حال ہے۔ میری بیٹی اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے تو اس کا گھر سے اسکول کے گیٹ تک تعاقب کیا جاتا ہے۔ آج بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے گراؤنڈ گیا تو وہاں اسے دو تین افراد نے ہراساں کرنے کی کوشش کی اور اس سے کہا کہ اپنے باپ سے کہو زیادہ قانون کا محافظ نہ بنے۔ جو لوگ قانون توڑنا جانتے ہیں، ان کے لیے قانون کے محافظوں کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دینا مشکل نہیں ہے۔ اب آپ بتائیں... ان حالات میں، میں پریشان نہ ہوں اور گھبراؤں نہ تو پھر کیا کروں؟ جو لوگ میرے بچوں کا تعاقب کر سکتے ہیں، انہیں دھمکیاں دے سکتے ہیں، وہ کل کو انہیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کو کوئی نقصان پہنچتا تو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں تو میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ میں آپ کے مشورے کے مطابق پولیس فورس چھوڑ دوں اور اپنے روزگار کے سلسلے میں کوئی اور بندوبست کرنے کی کوشش کروں۔'' ایس پی کے الفاظ سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ بے چارہ واقعی خوف زدہ ہے اور یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ چودھری افتخار جیسے غنڈا گیری کرنے والے وڈیرے اور جاگیردار واقعی اتنے

خطرناک ہوتے ہیں کہ ان کے لیے پورے پورے خاندانوں کو اجاڑ ڈالنا ذرا مشکل نہیں ہوتا۔ موجودہ ایس پی تو پھر بہر حال ایک شریف آدمی تھا لیکن سابقہ ایس پی رفیق تارڑ جیسا آدمی جو عرصہ دراز تک چودھری کا ہم نوالہ و پیالہ رہا تھا، وہ بھی اس کے مقابل ٹکنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنے تیسرے ساتھی فاریسٹ آفیسر باجوہ کا انجام دیکھا تھا۔ چودھری نے صرف اس وجہ سے کہ باجوہ اس کے لیے کارآمد نہیں رہا تھا اور جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی چوری کے سلسلے میں اس کی گردن جکڑی جا چکی تھی، دوستی کا لحاظ کیے بغیر بڑی خاموشی سے باجوہ کو قتل کروا دیا تھا... کہ نہ باجوہ رہے، نہ پولیس اس کی زبان سے چودھری کے خلاف کچھ اگلوا سکے۔

ایس پی رفیق تارڑ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو سوچا وہ خود بھی کسی وقت چودھری کی زد میں آسکتا ہے چنانچہ اس نے عقل مندی سے کام لیا اور وزیر اعلیٰ سے اپنی رشتے داری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تربیتی کورس کے بہانے بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر نکل گیا۔ اس طرح ایک طرف اس کی ملازمت برقرار رہی تو دوسری طرف وہ چودھری کا شکار بننے سے بھی بچ گیا۔ موجودہ ایس پی بھی خود کو اور اپنی فیملی کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ انسانی فطرت ہی یہی ہے کہ وہ یہ سوچے بغیر کہ موت کا ایک مخصوص وقت معین ہے اور اس معین وقت تک موت.... زندگی کی حفاظت کرتی ہے، خود زندگی کی حفاظت میں ہلکان رہتا ہے۔ وہ اللہ کو زبان سے ربّ العالمین تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس کے اختیارات کو اتنا محدود سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت جیسے معاملات بھی اپنے جیسے انسانوں کے ہاتھ میں تصور کرنے لگتا ہے۔ عقیدے کی یہ خرابی اور ایمان کی کمزوری اسے زندگی کے ہر شعبے میں کمزور اور ناکام بنا دیتی ہے۔

ایس پی کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ کرپٹ آدمی نہیں تھا لیکن وہ ایسا ایمان والا بھی نہیں تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی قدرت پر یقین نہ رکھتا ہو۔ شہریار نے ایس پی سے فی الحال مزید بات کرنا بے کار سمجھتے ہوئے خاموشی سے لائن کاٹ دی۔ اس کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ تھا کہ وہ جو جنگ لڑ رہا تھا، اس میں اس کا ساتھ دینے والی سپاہ کم حوصلہ اور بزدل تھی اور ان کی یہ بزدلی ظالم کے حوصلے اور بھی بلند کر دیتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ایک بار پھر اس رپورٹ کا جائزہ لینے لگا جسے ڈاکٹر ماریا اور اس کی ممی کی آمد سے قبل دیکھ رہا تھا۔ ٹینٹ میں کچھ دوسرے افراد بھی مصروفِ عمل تھے لیکن کوئی بھی اس سے غیر ضروری طور پر مخاطب ہونے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

ٹینٹ کے سامنے کے حصے میں اس کا ڈرائیور کم باڈی گارڈ مستعد کھڑا ہوا تھا۔ عبدالمنان اس کے ساتھ یہاں نہیں آیا تھا۔ اس کے ذمے اس نے نور پور کا دورہ کر کے وہاں حالیہ بارشوں کے بعد ہونے والی تباہ کاری کا جائزہ لینے اور ضروری اقدامات اٹھانے کا کام لگایا تھا۔

''اس رپورٹ کی حد تک تو آپ لوگوں کی کارکردگی خاصی تسلی بخش ہے۔ صحیح اندازہ فیلڈ میں جا کر ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہاں بھی مجھے مایوسی نہیں ہوگی۔'' رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد اس نے وہاں بہ طور انچارج کام کرنے والے شخص سے کہا۔

''آپ اطمینان رکھیں سر! ہماری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ملے گی۔'' اس شخص نے پُراعتماد لہجے میں اسے یقین دہانی کروائی۔ اس کے دعوے پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور ٹینٹ سے باہر کا رخ کیا۔ اسے باہر کی طرف آتا دیکھ کر پہلے ہی سے مستعد کھڑا ڈرائیور اور بھی ہوشیار ہو گیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا تاکہ اس کے لیے پچھلی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھول سکے۔ شہریار بھی اردگرد سے بے نیاز گاڑی ہی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یک دم ہی کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے زبردست چرچراہٹ کے ساتھ ایک لینڈ کروزر اس کے قریب رکی۔ اس نے نظر اٹھا کر لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ حسبِ توقع اس میں چودھری اپنے چیلوں کے ساتھ سوار تھا۔

''واہ جی واہ! ساڈے پنڈ کی تو قسمت ہی جگ گئی ہے۔ اے سی صاحب آج کل اِدھر زیادہ ہی نظر آرہے ہیں۔'' وہ شاید چودھری کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن چودھری بولتا ہوا اپنی گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

''کمال ہے چودھری صاحب! آپ اس تباہی و بربادی کو قسمت جاگنا کہتے ہیں؟ میں تو یہاں اس لیے چلا آتا ہوں کہ غریب گاؤں والوں کی بے آرامی اور بھوک کا خیال مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔'' اس نے تلخی سے چودھری کی بات کا جواب دیا۔

''نقصان تو ہمارا بھی بڑا ہوا ہے لیکن آپ نے ہمارے نقصان کا حساب کتاب پوچھنے کے لیے کبھی ہماری طرف آنے کی زحمت نہیں کی۔'' چودھری نے فوراً شکوہ کیا۔

''آپ اپنا نقصان پورا کرنا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں، یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ البتہ حساب کتاب واقعی مجھے آپ سے کرنا ہے اور اس کے لیے میں پہلی فرصت میں

آپ کی طرف آؤں گا۔'' وہ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔ جواب میں چودھری نے قہقہہ لگایا۔

''ہاں جی، سنا ہے آپ نے ماسٹر منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے الزام میں مجھے مجرم نامزد کیا ہے۔ آپ سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں واضح تمسخر تھا۔

''میں نے بلا جواز ایسا نہیں کیا ہے۔ مرنے سے پہلے منیب نے مجھے مدد کے لیے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کے مکان کو آپ کے گرگوں نے گھیر رکھا ہے۔ میرے موبائل فون پر مرنے سے قبل منیب کی طرف سے آنے والی کال آپ کے خلاف ایک اہم ثبوت ہے۔ آپ اتنی آسانی سے بچ کر نہیں نکل سکیں گے۔'' اس کے اور چودھری کے درمیان جو دشمنی کا رشتہ تھا، اب اس پر کسی مصلحت کا پردہ ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی چنانچہ وہ بہت کھل کر دو بدو اس سے بات کر رہا تھا۔

''ایسے ثبوت عدالت میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ کا بیان میرے اوپر ایک الزام سے زیادہ کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا... بلکہ ہو سکتا ہے جواباً میں آپ پر یہ الزام عائد کر دوں کہ پچھلے دنوں میرے ڈیرے پر جو حملہ ہوا، اس میں آپ ملوث تھے اور آپ ہی کے اشارے پر اس موقع پر پولیس نے حرکت میں آنے کی زحمت نہیں کی۔'' چودھری نے شاطرانہ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''آپ اپنی ساری چالیں چل دیکھیں لیکن یاد رکھیے گا کہ یومِ حساب زیادہ دور نہیں ہے۔ اپنے ہر ظلم اور زیادتی کا آپ کو بالآخر نتیجہ بھگتنا ہی پڑے گا۔'' اس بار وہ اپنی بات کہنے کے بعد مزید وہاں رکا نہیں اور اپنی گاڑی کے کھلے دروازے سے گزر کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیڈول کے مطابق اپنے سارے کام نمٹاتے ہوئے بھی اس کا ذہن چودھری کی باتوں میں الجھا رہا۔ چودھری نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کہ منیب کی آخری فون کال اس کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ وہ قتل کے اس مقدمے میں چودھری کو گھسیٹ کر عدالتی کارروائیوں میں تو الجھا سکتا تھا لیکن اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری اور اس کے گرگے قتل کے اس الزام سے صاف بچ نکلتے جبکہ ان مظلوم اساتذہ کا خون اس سے پکار پکار کر یہی مطالبہ کر رہا تھا کہ ان کے خونِ ناحق کا بدلہ ضرور لیا جائے۔ غم و غصے کی شدید کیفیت میں مبتلا جب وہ سارا دن کا تھکا ہارا واپس اپنے دفتر پہنچا تو انتقامی جذبات سے پوری طرح مغلوب تھا۔ اپنے اندر بھڑکتے اس آتش فشاں کو سرد کرنے کے لیے یک دم ہی ایک نام اس کے ذہن کی اسکرین پر جھلملایا... ''جگو!''

اس نام کے ذہن میں آتے ہی اس کے اندر جیسے سکون سا اتر آیا اور انگلیاں بے تابی سے جگو کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

جگو ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور اس جماعت کے مفاد کے لیے ہر وہ کام کرتا تھا جسے کوئی غنڈا کر سکتا تھا۔ اس کی حیثیت کسی سڑک چھاپ غنڈے کی نہیں تھی۔ نہ وہ ہر ایک کے ہاتھوں بکنے والا تھا لیکن جب سے شہریار نے اس کے بیمار بیٹے کو بے یار و مددگار دیکھ کر اپنی گاڑی میں اسپتال پہنچایا تھا اور اس کی زندگی بچانے کا ذریعہ بنا تھا، جگو اس کا بے دام غلام بن گیا۔ اس نے شہریار کو پیشکش کی تھی کہ وہ جب چاہے، اس کو کسی کام کے لیے حکم دے سکتا ہے۔ اس کے کہنے پر آفتاب کو چودھری کی قید سے چھڑا کر وہ اپنی وفاداری ثابت بھی کر چکا تھا۔ اب ایک بار پھر اس کے دعوے کو آزمانے کا موقع آگیا تھا اور شہریار کو یقین تھا کہ جگو اسے مایوس نہیں کرے گا۔

☆☆☆

''ہیلو۔'' ناریل کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ اردگرد چلتی پھرتی لڑکیوں کو آپس میں خوش گپیاں کرتے دیکھنے میں مصروف تھی کہ اپنے قریب سے ابھرنے والی اس آواز پر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ دبلی پتلی سی ایک خوش شکل لڑکی تھی جو ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس سے مخاطب تھی۔ ماہ بانو نے بھی اپنے چہرے پر جوابی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔

''میرا نام راحیلہ ہے۔ میں تمہاری کلاس فیلو ہوں۔ کئی دنوں سے تمہیں اپنی کلاس میں نئے اضافے کی صورت دیکھ رہی ہوں۔ سلام دعا کی نوبت اس لیے نہیں آسکی کہ میں اپنی اسٹڈیز کے معاملے میں اچھی خاصی کریزی ہوں اور اس سے ہٹ کر مشکل سے ہی کہیں وقت خرچ کرتی ہوں۔ اصل میں ڈاکٹر بننا میرا جنون ہے اور میں ذرا بھی وقت ضائع کر کے یہ رسک لینے کو تیار نہیں ہوتی کہ میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے میرٹ بنانے سے محروم رہ جاؤں... لیکن تم میں کچھ خاص بات ہے۔ دل خود بخود ہی تم سے بات کرنے کی خواہش کرتا ہے چنانچہ ابھی جو فری پیریڈ ملا تو میں نے سوچا کہ کچھ دیر تم سے گپ شپ کر لی جائے۔ ویسے تم بھی مجھے اپنے قبیلے ہی کی فرد

لگتی ہو۔ تمہیں بھی میں نے ہر وقت کتابوں میں سر گھسائے رکھنے کے سوا ادھر ادھر کہیں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔ اگر میرا تمہارے بارے میں اندازہ درست ہے تو ہم یقیناً اچھے دوست بن سکتے ہیں۔'' راحیلہ نام کی وہ لڑکی نان اسٹاپ بولتی ہوئی اس کے قریب ہی بیٹھ چکی تھی۔ ماہ بانو کو اس دوران سوائے مسکرانے کے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ویسے وہ راحیلہ سے واقف تھی۔ اپنی اس کلاس فیلو کو اس نے کلاس میں بھی بہت ایکٹیو دیکھا تھا۔ لیکچرز کے دوران کوئی نہ کوئی سوال اٹھاتے رہنے اور ٹیچرز کے پوچھے گئے سوالوں کے نہایت اعتماد سے درست جوابات دینے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کلاس میں بہت نمایاں رہتی تھی۔ اس کی یہ خود اعتمادی اور ٹیچرز کا اس سے مشفقانہ سلوک گواہی دیتا تھا کہ وہ ایک ذہین طالبہ ہے۔

''اسی طرح بیٹھی مسکراتی رہو گی یا اپنا تعارف بھی کرواؤ گی؟'' راحیلہ کو اپنے بے تحاشا بولنے کا تو یقیناً احساس نہیں تھا لیکن ماہ بانو کی خاموشی اس نے محسوس کر لی تھی چنانچہ اپنے بے ساختہ انداز میں اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

''میرا نام مہرین ہے۔ پنجاب سے مائیگریٹ ہو کر یہاں آئی ہوں۔ تمہاری طرح مجھے بھی ڈاکٹر بننے کا بہت شوق ہے۔ اب دیکھو، یہ شوق پورا ہوتا ہے یا نہیں۔'' ماہ بانو نے اپنے لیے شہر یار کے تجویز کردہ نئے نام سے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''بندے کے اندر اپنے ارادے پورے کرنے کا دم ہونا چاہیے پھر اس کی کوئی خواہش ادھوری نہیں رہتی۔ یہ میں نہیں میرے بڑے بھائی صاحب فرماتے ہیں اور درست ہی فرماتے ہیں۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک کبھی انہیں ناکام ہوتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے بچپن میں ہی ٹھان لیا تھا کہ ڈاکٹر بننا ہے اور اپنا یہ شوق پورا کر کے رہے حالانکہ ہمارے والد کی بہت معمولی سی جاب تھی اور میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی لیکن بھائی نے اسکالرشپس لے لے کر اس مشکل کو آسان کر دیا۔ آج کل وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کر رہے ہیں۔ مزید تعلیم کے لیے ان کا امریکا جانے کا ارادہ ہے، فی الحال حالات اس بات کی اجازت نہیں دے رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ عرصہ حالات بھائی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے اور وہ جلد ہی اپنی خواہش کے مطابق امریکا میں ہوں گے۔'' راحیلہ بہت مان اور فخر سے اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''واقعی تمہارے بھائی تو بہت باہمت انسان ہیں۔ ان کے بارے میں سن کر مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟'' راحیلہ کی زبانی اس کے بھائی کے بارے میں سن کر اس نے تبصرہ کرتے ہوئے یونہی اس کا نام بھی پوچھ ڈالا۔

''طارق... ڈاکٹر طارق نام ہے میرے بھائی کا۔'' راحیلہ نے اسے بتایا پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''آؤ، ہماری دوستی ہونے کی خوشی میں چل کر چنوں کی چاٹ کھاتے ہیں۔'' ماہ بانو خاموشی سے اس باتونی لڑکی کے سنگ چل پڑی لیکن پھر اس کا رخ کالج کے گیٹ کی طرف دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ اس طرف کیوں جا رہی ہو؟ کینٹین تو پیچھے کی طرف ہے نا؟'' اس نے راحیلہ کو ٹوکا۔

''ارے کینٹین کی بدمزہ چاٹ کون کھائے گا؟ ہم تو گیٹ کے باہر کھڑے ہوئے ریڑھی والے سے چاٹ لیں گے۔ سچ... بہت مزے کی چاٹ بناتا ہے وہ۔'' راحیلہ نے یوں چٹخارا لیا جیسے چاٹ سے بھری پلیٹ اس کے سامنے رکھی ہو۔ ماہ بانو اس کے اس انداز پر مسکرا دی اور اس کے ساتھ ہی چوکیدار سے ذرا سی بحث و تکرار کے بعد کالج سے باہر نکل آئی۔ یہاں گیٹ کے بالکل سامنے ہی تین چار ریڑھی والے کھڑے ہوئے تھے۔ راحیلہ اسے لیے ایک ریڑھی کی طرف بڑھ گئی۔ ماہ بانو بہت دنوں بعد زندگی کا یہ رنگ دیکھ رہی تھی اس لیے اسے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ وقت کے ان لمحات میں وہ اپنے سارے مسائل اور دکھ وقتی طور پر فراموش کر بیٹھی تھی۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ وہ کالج کی حدود کے باہر احتیاط کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چہرے کو نقاب سے ڈھانپ لینے کا معمول اختیار کر چکی ہے... اس وقت وہ اس معمول کے خلاف کھلے چہرے کے ساتھ بے فکری سے کھڑی راحیلہ کو ریڑھی والے کو نمک، مرچ اور کھٹائی کے تناسب کے سلسلے میں ہدایات جاری کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''اللہ کے نام پر دے دے بے بی! تیرے لیے چاند سے دولہا کی دعا کروں گی۔'' یک دم ہی اس کے عقب سے بھونڈی آواز میں یہ صدا لگائی گئی اور ساتھ ہی تالی کی مخصوص آواز بھی سنائی دی۔ وہ بے ساختہ ہی پیچھے کی طرف گھومی اور بھڑکیلے لباس اور شوخ میک اپ والے ایک خواجہ سرا کو اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر لرز سی گئی۔ اسے لگا کہ اس کی قسمت کے گرداب نے ایک بار پھر اسے گھیر لیا ہے اور وہ ان آزاد فضاؤں سے ایک بار پھر کسی قید خانے میں پہنچائی جانے والی ہے۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

قسمت ظریف

کاشف زبیر

آسائشات و تعیشات بھری زندگی بسر کرنا ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے ... اور دولت کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے ... لیکن کبھی کبھی قدرت کسی کو ایسا موقع ضرور فراہم کرتی ہے ... راجا اور جلیل کی دولت مند بننے کی خواہش کا دلچسپ و پر اثر ماجرا۔

جلیل کا نیا کارنامہ...... لبوں پہ مسکراہٹیں بکھیر دینے والا سلسلۂ ہنگامہ

مرزا بخت عرف بد بخت کی صورت اتنی جلدی دکھائی دے گی، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے میرا نام کرنے کے بعد مجھ سے اپنی سونے کی پلیٹیں وصول کیں اور بہت دیر تک ان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''یہ اصلی ہیں نا؟''

''پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے تیری ولدیت کی طرح ہوں... یعنی اصلی نقلی کا پتا ہی نہ ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''تو اچھی طرح جانتا ہے، جلیل ہیرا پھیری کرتا ہے... لیکن ان کے ساتھ جوا سے چکر دیں۔''

مرزا اتنی آسانی سے اعتبار کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ مجھے لے کر ایک سنار کے پاس پہنچ گیا اور جب سنار نے تصدیق کر دی کہ پلیٹیں اصلی ہیں، تب اس نے میری جان چھوڑی۔ ان پلیٹوں کا وزن ایک کلوگرام سے زیادہ تھا... یعنی ان کی مالیت کوئی چالیس لاکھ روپے تھی۔ میں نے مرزا بد بخت سے صرف تین لاکھ والا کام لیا تھا اور چاہتا تو اس کی پلیٹیں ہضم کر جاتا، اس کا باپ بھی قبر سے آ کر مجھ سے یہ پلیٹیں نکلوا نہیں سکتا تھا۔ میں نے پلیٹیں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''مرزا! معاملہ کلیئر ہے لیکن تجھے راجا کا حساب دینا ہوگا۔''

"کیسا حساب؟"
"بھول گیا... تو نے اسے استعمال کیا اور پھر غائب ہو گیا۔ اس کا حساب..."
"لے سکتے ہو تو لے لینا۔"
"تو فکر نہ کر، راجا تجھے پاگل کتے کی طرح تلاش کر رہا ہے۔ وہ تو میں نے اسے روک رکھا تھا۔"
مرزا نے دانت نکالے۔ "اسے تلاش کرنے دو... اب میں یہاں ہوں گا تو وہ مجھے تلاش کر سکے گا۔"
"کیا تو دبئی جا رہا ہے؟"
مرزا چونکا۔ "تجھے کیسے پتا چلا؟"
"میں نے تو تکا مارا تھا۔ ویسے تو سچ مچ دبئی جا رہا ہے... وہاں کرے گا کیا؟"
"جو ساری دنیا کرتی ہے۔ بزنس کروں گا۔"
"اے بزنس اور ہوتا ہے اور جو تو کرتا ہے، وہ کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں شرطے الٹا لٹکا کر ماریں گے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔
"سارے چکر یہیں تک ہیں۔" مرزا نے پھر دانت نکالے۔ "وہاں تو میں حاجی بن کر رہوں گا۔"
"یعنی دھوکا ضرور کرے گا۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔
"میں چلا۔" مرزا بولا۔ "راجا سے میری طرف سے معذرت کر لینا۔"
اس وقت ہم کیفے ڈی پھونس میں تھے۔ جیسے ہی مرزا نے کیفے سے باہر قدم رکھا، دو افراد منکر نکیر کی طرح اس کے دائیں بائیں نمودار ہوئے۔ انہوں نے مرزا کو بازوؤں سے پکڑا اور کشاں کشاں ایک گاڑی کی طرف لے گئے۔ مرزا نے میری طرف دیکھا تو میں نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی اور مرزا سے اپنا حساب بے باق کرنے کے لیے اسے لے جا رہا تھا۔
"بیٹا خوش رہو۔" میں نے دل میں کہا۔
جس طرح مجنوں کو لیلیٰ کی خوشبو آ جاتی تھی، چاہے لیلیٰ ایک مہینے سے نہ نہائی ہو اور جس طرح بلی کو دودھ کی مہک آ جاتی ہے... چاہے وہ خلیل کی بڈحرام بانو کیوں نہ ہو، اسی طرح راجا کو مجھ سے مال کی خوشبو آ جاتی تھی۔ آج میں خوش تھا اور اتنا خوش تھا کہ راجا کی صورت دیکھنے کو بھی تیار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کیفے ڈی پھونس میں ٹائم دیا ہوا تھا مگر راجا آیا تو اس کے منہ پر بارہ بج رہے تھے۔ وہ آتے ہی دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور پوچھا۔
"کیا تیرے باپ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے؟"
"اگر اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہوتا تو میں اتنا پریشان ہوتا؟" ناخلف راجا نے سچ کہا۔
"ہو سکتا ہے اگر تیرا باپ بچ جائے تو..."
راجا نے سرد آہ بھری۔ "شاید کبھی ایسا ہو لیکن ابھی تو وہ اپنے گدھے سے بھی زیادہ صحت مند ہے۔"
"تب کیا عارفہ نے بالآخر تجھے عاق کر دیا ہے... کسی بھی لائق نہ رہ جانے کی وجہ سے؟"
اس پر راجا نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا اور ایک گلاس پانی نکال کر پیا۔ "عارفہ سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔"
"بے شک، تیرے اس سے جس قسم کے تعلقات ہیں ان کو کسی صورت اچھا نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔
"جلیل! مجھے ڈرامے سے کٹ کر دیا گیا ہے۔" راجا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔
"عارفہ نے؟" میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "وہ جو تیرے ساتھ محبت کا ڈراما کھیلتی ہے... اس نے تجھے کٹ کر کے کسی اور کو سائن کر لیا ہے۔"
"بکواس نہ کر۔" راجا غرایا۔ "یہ تیرے ساتھ کسی دن شنو کرے گی۔"
"بیٹا! وہ عارفہ نہیں ہے۔"
"لیکن ایک عورت تو ہے، کب تک تیرا انتظار کرے گی؟" راجا خباثت سے بولا۔ اس بار میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔
"راجا! شنو وفا کی پتلی ہے۔ میرے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔"
"وفا کی پتلی؟" راجا ہنس کر بولا۔ "یہ کیا ہوتی ہے؟"
اس پر بھنا کر میں نے راجا کو ناقابلِ بیان الفاظ میں بتایا کہ وفا کی پتلی کیا ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ "چھوڑ جلیل! میرا تو دنیا سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔"
"اور جلد تو بھی دنیا سے اٹھ جائے گا۔" میں نے اسے مطلع کیا۔
"اب تو یہی دل چاہتا ہے۔" فتو کے چھوٹے کو دو کڑک کا کہہ کر راجا پھر دیوداس والے موڈ میں آ گیا۔
"اگر تجھے عارفہ نے کٹ نہیں کیا ہے تو پھر کس نے کیا ہے؟"
"تجھے بتایا نہیں تھا کہ مجھے ایک ڈرامے میں چانس ملا تھا؟"

"ہاں، وہ کوئی اندھا پروڈیوسر ہے۔" مجھے یاد آیا۔
"اندھا تو نہیں ہے... اس وقت اس کی عینک کھو گئی تھی اور پھر بالکل ہی کھو گئی۔"
"اس کا مطلب ہے، اب مل گئی ہے؟"
"ہاں۔" راجا رونے والے انداز میں بولا۔ "اس کمینے نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔"
"چل کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "آج کل اندھے پروڈیوسرز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ڈراموں میں آنے والے بعض مرکزی کرداروں کو دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کو منتخب کرنے والا نابینا ہے۔"
"ہاں، یہ تو ہے۔" راجا امید سے بولا۔ "یہ بتا کہ تجھے ناز دے سے کچھ ملا؟"
"ہاں، ملا تو ہے۔" میں نے بادل ناخواستہ اقرار کیا۔
"تب اس میں سے میرا حصہ نکال دے۔" راجا بولا۔ "شاید اسی سے میرے غم کا مداوا ہو جائے۔"
میں نے مزید دل پر جبر کرتے ہوئے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے پانچ ہزار نکال کر راجا کے حوالے کیے۔ "یہ تیرا حصہ بنتا ہے۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تو پانچ دے رہا ہے تو میرا حصہ کم سے کم دس بنتا ہے۔"
"لا... یہ بھی واپس دے۔ میں تجھے ڈھائی دیتا ہوں۔" میں نے ہاتھ آگے کیا تو راجا نے پھرتی سے نوٹ کہیں غائب کر دیے۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے چائے پیتے ہی وہ خود بھی غائب ہو گیا اور میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی مجھے ٹیلر شاپ کا سودا کرنا تھا اور بائیک لینی تھی۔ یہ کام کل ہی ہو سکتا تھا اس لیے میں گھر روانہ ہو گیا۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ شنو کے لیے کچھ لے لوں لیکن اسے بھنک پڑ جاتی کہ میرے پاس رقم ہے تو وہ اسے اپنے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتی۔ میں گلی میں داخل ہوا تو چاند میاں اپنی چمکتی دمکتی بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی بائیک سے زیادہ چمکتی دمکتی بیوی یعنی چاند بانو اس کے پاس کھڑی تھی۔ وہ کہیں جا رہے تھے۔ بائیک نے عین موقع پر اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔
"کیا ہوا چاند بھائی؟" میں نے چاند بانو کی طرف دیکھ کر کہا۔
"میں ادھر ہوں۔" چاند میاں بولا اور چاند بانو سے کہا۔ "تم اندر جاؤ، میں رکشا لے کر آتا ہوں۔"
"تالا کھولنا پڑے گا۔" چاند بانو نے اٹھلا کر کہا۔

جدید ترین فیشن کے اس کوٹ کی خوبی یہ ہے کہ کسی طرح بھی دھویا جائے، داغ دھبے بالکل مدھم نہیں ہوں گے

"بائیک تو اندر کھڑی کرنی ہے۔" چاند میاں نے کہا اور دروازے کا تالا کھولنے لگا۔ میں نے بائیک کا معائنہ کیا۔ یہ نئے ماڈل کی ہنڈا سی ڈی آئی تھی۔ لگتا تھا چاند میاں کو بیوی کے ساتھ بائیک بھی سنبھالنی نہیں آتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو چاند بانو بادل ناخواستہ اندر چلی گئی۔ میں نے تاریک ہو جانے والی گلی دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی اور چاند میاں سے کہا۔
"اپنی چاندی بنو بیچو گے؟"
"کیا؟" وہ اچھلا۔ "یہ کیا بکواس کرتا ہے؟"
مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے جلدی سے کہا۔ "چاند بھائی! بائیک کی بات کر رہا ہوں۔"
"اچھا اچھا۔" اس نے خفگی سے کہا۔ "ابھی تو لی ہے۔"
"لیکن تم سے چلے گی نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"بہتر ہے بیچ دو۔"
چاند میاں نے مجھے نہایت غلط نظروں سے دیکھا اور بائیک اندر لے گیا۔ اس کے بعد وہ رکشا تلاش مہم پر نکلا جو فی زمانہ رشتہ تلاش کرنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ چاند میاں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے چائنا میں اسمبل کیا گیا ہے لیکن اس کی قسمت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے سرکاری محکمے میں کلرک کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا جہاں رشوت مون سون کی بارش کی طرح برستی تھی۔ یعنی آدمی بے شک کتنا ہی ایمان دار کیوں نہ ہو، اس بارش سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ پھر اسے

چاند بانو جیسی بیوی مل گئی۔

''اے جلیل!'' چاند بانو کی آواز آئی تو میں چونکا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ ''تو بائیک لینا چاہتا ہے؟''

''ہاں، ارادہ تو ہے۔'' میں نے شنو کی چھت کی طرف دیکھا کیونکہ میں چاند بانو سے بات کرتا تھا تو اسے نہ جانے کیسے پتا چل جاتا تھا۔

''پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

''بس آگئے... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' میں اس کے قریب چلا آیا۔ چاند بانو کو قریب سے دیکھنا ایک ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح تھا۔

''مجھے بائیک پسند نہیں ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''اس پر بیٹھ کر میری کمر میں درد ہو جاتا ہے۔'' اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ کہاں درد ہوتا ہے۔ یہ بڑا نازک مقام تھا۔ ''میں چاہتی ہوں، وہ کار لے لے... لیکن مانتا ہی نہیں ہے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''یہ مت کہو... بھلا تمہاری بات کوئی ٹال سکتا ہے۔''

وہ شرمائی۔ ''ہاں، ٹالتا تو نہیں ہے لیکن یہ بات نہیں مان رہا۔''

''تو منواؤ نا... میں بائیک خریدنے کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔'' اس نے کہا۔۔۔ بدقسمتی سے چاند میاں کو رکشا جلدی مل گیا تھا۔ اس کی آمد کے آثار دیکھ کر میں نے گھر کا رخ کیا۔ اماں کڑاہی بنا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہا۔ ''جلیل! صبح سے کام کر کے میرے بازو دکھ گئے ہیں... جا کر روٹیاں لے آ۔''

''اماں! تم کہو تو بہو لے آؤں؟'' میں نے دانت نکالے۔ ''سارے کام کر دیا کرے گی۔''

''بکواس نہ کر... پہلے روٹی کھلانے والا تو بن جا پھر گھر والی لانے کی بات کرنا۔''

''تمہاری مرضی... تمہارے بھلے کو کہہ رہا تھا۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اماں نے پیچھے سے طنز مارا۔ ''میرے بچے... میں جانتی ہوں تجھے میرا کتنا خیال ہے۔''

☆☆☆

میں نے ٹیلر شاپ والے معاملے کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اگلے روز خاموشی سے سودا کر کے میں نے دکان اپنے نام کرالی۔ مالک ڈیڑھ لاکھ مانگ رہا تھا لیکن ایک بیس پر سودا ہو گیا۔ فتو اور اس کا ایک پہلوان سالا گواہ بنے تھے۔ پرانے مالک کو انگلینڈ کا ورک ویزا مل گیا تھا اور اسے ولایت جا کر گوریوں کے کپڑے سینے کی جلدی تھی اس لیے وہ ایک بیس میں مان گیا... ورنہ جگہ بہت موقع کی اور چلتی ہوئی دکان تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جا کر مجھے بھی یو کے بلانے کی کوشش کرے گا اور ممکن ہے مجھ سے پارٹنر شپ کر لے۔ گو کہ مجھے سلائی نہیں آتی تھی لیکن میں ناپ تو لے سکتا تھا۔ گوریوں کا ناپ لینے کا تصور ہی سنسنی خیز تھا۔ دکان... ماسٹر اور دو کاری گر چلا رہے تھے۔ مجھے صرف نگرانی کرنا تھی۔

اب میرا ارادہ ایک عدد بائیک اور موبائل لینے کا تھا لیکن میں یہ کام کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ٹیلر شاپ کو تو میں راز میں رکھ سکتا تھا لیکن موبائل اور بائیک نہیں چھپا سکتا تھا اور شنو کو پتا چل جاتا تو وہ ظالم حسینہ مجھ سے حقیقت اگلوا لیتی اور پھر ساری رقم بھی وصول کر لیتی اور میں پھر لنڈورا رہ جاتا۔ اس لیے میں یہ دونوں چیزیں لینے سے پہلے کوئی اچھی ترکیب سوچ لینا چاہتا تھا جس سے شنو کو مطمئن کر سکوں۔ میں شام تک دکان پر رہا۔ ماسٹر اور اس کے کاری گروں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ میں نے پاس کی ایک دکان سے لان کا سوٹ لیا اور ایک ذرا مشکل ڈیزائن کے ساتھ اسی وقت سلوایا۔ سوٹ شنو کے لیے تھا۔

میں گھر آیا تو شنو چھت پر میری منتظر تھی۔ میں اماں کی نظر بچا کر براہ راست چھت پر پہنچ گیا۔ شنو یوں تیار تھی جیسے کسی شادی کی تقریب میں جا رہی ہو۔ گرین لہنگا اور اسی رنگ کی ہلکی کرتی میں وہ ہوش ربا حد تک حسین لگ رہی تھی۔ کرتی لگتا تھا کہ اس کے تناسب کے حساب سے سلی ہے۔ اوپر سے بھری بھری اور نیچے کمر سے تنگ تھی۔ شنو ان دنوں اپنے وزن میں کمی کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا تھا۔ میں دم بہ خود سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ شرما گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے سرد آہ بھری۔ ''یہ پوچھو کیا کیا نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اتنی تیاری میرے لیے تو ہو نہیں سکتی۔ کیا تم کسی تقریب میں جا رہی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میری سینٹر کی ایک دوست کی شادی ہو رہی ہے۔ آج اس کی مہندی ہے۔ کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے گھوم کر خود کو دکھایا۔ وہ شوخ ہو رہی تھی۔ میں نے دوسری سرد آہ بھری۔

''کاش! آج تمہاری مہندی ہوتی اور میں کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک مکھڑے پر سہرا اڈالے اور گھوڑا بھگاتا آتا اور تمہیں لے جاتا اور پھر تمہیں عملی طور پر بتاتا کہ کیسی لگ رہی ہو۔''

وہ شرمائی۔ ''ابھی وہ وقت دور ہے۔''

میں نے حسرت سے اسے دیکھا۔ ''شنو! مجھے لگ رہا ہے جیسے میں صدیوں سے تجھ سے محبت کر رہا ہوں۔ پاکیزہ والی... اور لگتا ہے جب تک زندہ ہوں اسی قسم کی محبت کرتا رہوں گا۔''

شنو بھی اداس ہو گئی۔ وہ ذرا قریب آئی۔ ''تو خالہ کو بول نا ضد چھوڑ دے۔ تو نہ تو کام کرے گا اور نہ ہماری شادی ہو گی۔''

''اگر اماں نہیں مان رہی ہیں تو خالہ کیا کم روڑے اٹکا رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ اماں سے دوٹوک بات کریں تو اماں کیوں نہیں مانیں گی؟''

''اماں ڈرتی ہے کہ دوٹوک بات کرنے پر خالہ انکار نہ کر دے۔''

''اماں انکار نہیں کر سکتی۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ ''مجھے شادی تجھ سے ہی کرنی ہے۔ بس بہت ہو گیا۔ میں آج ہی اماں اور خالہ کو ایک ساتھ بٹھا کر بات کرتا ہوں۔ ہم کب تک اپنے ارمانوں کا خون کرتے رہیں گے۔''

''آہستہ...'' شنو نے گھبرا کر کہا۔ ''اماں نے سن لیا تو میرا خون ہو جائے گا۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ ہم دونوں کی مائیں سخت قدامت پرست اور ظالم تھیں۔ لڑکیاں اور لڑکے اجنبی ہوتے ہوئے بھی عشق لڑاتے تھے اور ڈیٹ مارتے تھے۔ ہمیں منگیتر ہوتے ہوئے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور ڈیٹ پر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سرد آہ بھری۔ ''قدرت نے ایسی مائیں ہمارے نصیب میں لکھ دی ہیں... لیکن میں بات ضرور کروں گا۔''

''ابھی نہیں۔ دو دن بعد میری دوست کی شادی ہو جائے پھر کرنا ورنہ اماں شادی میں بھی نہیں جانے دیں گی۔''

''چل دو دن بعد سہی۔'' میں نے ایک بار پھر اسے حسرت سے دیکھا۔ ''وہ دن کب آئے گا جب تو میری خاطر اس طرح سے تیار ہو گی؟''

''پتا نہیں۔'' شنو روہانسی ہو گئی۔ ''جلیل! اگر تیری اور میری اماں نہ مانیں تو...؟''

''اگر انہوں نے اب بھی اپنی ضد برقرار رکھی تو تجھے میرا ساتھ دینا ہو گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

شنو فکرمند ہو گئی۔ ''کیا مطلب؟''

''پھر ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔''

''کورٹ میرج!'' شنو ڈر گئی۔ ''اماں میرے ٹکڑے کر دے گی۔''

''وہ تو میری اماں بھی کر دے گی۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''ویسے بھی ہم کون سا سچ مچ کر لیں گے... بس ان کو ڈرائیں گے۔''

''اچھا۔'' شنو نے سکون کا سانس لیا اور دوبارہ فکرمند ہو کر بولی۔ ''مسئلہ تو وہی ہے تو کچھ کرتا ہی نہیں، ہمارا گزارہ کیسے ہو گا؟''

''اس کی تو فکر نہ کر اور جہاں تک شادی کے اخراجات کا تعلق ہے، تیرے پاس کافی رقم ہو چکی ہے۔ اور کوئی کمی بھی ہے تو شادی سادگی سے بھی کی جا سکتی ہے۔''

''سچ!'' شنو خوش ہو گئی۔ ''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے ہماری شادی ایک سوپ سیریل ہے جس کا کوئی انجام نہیں ہوتا۔''

شنو ان دنوں ٹی وی پر سوپ سیریل شوق سے دیکھ رہی تھی۔ یہ علت اب ہمارے چینلز نے بھی شروع کر دی ہے۔ شنو کو انڈین چینلز کا شوق نہیں تھا اس لیے اس نے پہلے

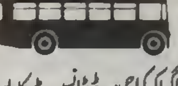

رفیق نامی ایک شخص جب حصولِ ملازمت کے لیے دفترِ روزگار پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ کراچی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں ایک بس ڈرائیور کی جگہ خالی ہے۔

''لیکن مجھے تو ڈرائیونگ نہیں آتی۔'' رفیق نے کہا۔

''اس کی فکر مت کرو، وہ تمہیں ٹریننگ بھی دیں گے۔'' کلرک نے جواب دیا اور رفیق کو تعارفی کارڈ دے کر بس ڈپو بھیج دیا۔ چند روز کی تربیت کے بعد رفیق کو ڈیوٹی مل گئی جب وہ پہلی مرتبہ بس لے کر جانے لگا تو انسپکٹر نے بتایا کہ کمپنی میں کنڈکٹروں کی قلت کے باعث بس کے مسافروں سے کرایہ بھی اسے خود ہی وصول کرنا پڑے گا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بس ڈپو کے منیجر کو ایک دکان دار کا فون ملا۔

''آپ فوراً یہاں آجائیے۔ آپ کی ایک بس میری دکان میں گھس آئی ہے۔''

منیجر فوراً وہاں پہنچ گیا۔ وہ رفیق کی بس تھی جو دکان کے شیشے توڑتی ہوئی اندر جا گھسی تھی۔ خوش قسمتی سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔

''یہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا؟'' ڈپو منیجر نے رفیق سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' رفیق نے جواب دیا۔ ''جس وقت یہ حادثہ پیش آیا اس وقت میں پچھلے حصے میں مسافروں سے کرایہ وصول کر رہا تھا۔''

کبھی اس قسم کے ڈرامے نہیں دیکھے تھے مگر آج کل وہ پاکستانی چینلو سے دیکھ رہی تھی اور اس کے بعد مجھ سے ان پر تبصرہ بھی کرتی تھی۔ اسے دیکھنے کی خاطر میں اس کے تبصرے بھی برداشت کر لیتا تھا اور دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ شادی ہوتے ہی سب سے پہلے ٹی وی سے یہ چینلو غائب کر دوں گا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''نہیں، انجام ہوگا... بس مجھے اماں اور خالہ سے بات کرنے دو۔''

شنو کو کچھ یاد آیا اور وہ سابقہ موڈ میں آگئی۔ ''اماں اور خالہ سے تو تم اس وقت بات کرو گے جب اس سامنے والی حرافہ کی جان چھوڑو گے۔ جب دیکھو، اس کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے رہتے ہو۔''

''ظاہر ہے جب اپنی منگیتر لفٹ نہیں کرائے گی تو آدمی دوسرے کے دروازے کے سامنے ہی کھڑا ہوگا۔''

''وہ شادی شدہ ہے۔'' شنو نے یاد دلایا۔

''حالانکہ لگتی کہیں سے بھی نہیں ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''بلکہ دن بہ دن خوب صورت ہوتی جا رہی ہے اور ایک تم ہو...''

''کیوں؟'' وہ برہم ہوگئی۔ ''کیا کمی ہے مجھ میں؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''کمی تو نہیں بلکہ کچھ زیادتی ہے۔''

''بدتمیز!'' وہ برہمی سے شرمائی۔ ''اب تم مجھے اس کی بات کرتے نظر آئے تو میں اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔''

''یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔'' میں خوش ہو کر بولا اور پھر دیوار کود کر شنو کو اینٹ کا ٹکڑا اٹھانے سے روکا جو اس نے شاید میرے لیے ہی رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگایا۔

''جلیل کہیں کے... چھوڑ مجھے۔''

''تم بھی زبان سے بات کرو، یہ کیا احتجاجی مظاہرہ اور پتھراؤ شروع کر دیتی ہو۔''

''تمہاری زبان قابو میں کہاں رہتی ہے۔'' وہ جل کر بولی۔ ''اب واپس جاؤ۔''

''اتنی محنت سے آیا ہوں، اتنی جلدی واپس چلا جاؤں؟''

''اماں آجائیں گی۔'' شنو نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' میں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا اور اچانک اسے دبوچ لیا۔

''جلیل!'' شنو دنگ رہ گئی۔ ''پاگل ہوگئے ہو؟''

''شاعر نے مغلِ اعظم میں کیا خوب کہا ہے... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟''

اسی لمحے نیچے سے خالہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز آئی۔ ''شنو! کہاں مر گئی ہے... مہندی میں نہیں جانا؟''

شنو کی جان نکل گئی۔ ''اماں آرہی ہے۔''

خالہ کی آواز سنتے ہی میں بدحواسی میں ایک لمحے کے اندر دیوار پھلانگ کر دوسری طرف پہنچا اور شنو مجھے گھورتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ نیچے جانے سے پہلے اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا لیکن خلیل کا لقا کبوتر سہم گیا۔ شنو کی آنکھ میں قدرتی نااتفاقی ہے۔ کبوتر سمجھا کہ یہ نظرِ شرربار اس کے لیے تھی۔ خالہ کی آواز سیڑھیوں کے پاس سے آئی تو میں بھی نیچے کی طرف لپکا اور تب مجھے یاد آیا کہ میں شنو کو سوٹ دینے آیا تھا اور وہ میرے پاس ہی رہ گیا تھا۔ اسے اماں کی نظر سے بچانا تھا۔ میں شنو کو دکھا کر اماں کے حوالے کرتا اور وہ اسے خالہ لاؤڈ اسپیکر کے حوالے کرتیں... اس طرح وہ سوٹ تھرو پراپر چینل شنو کے پاس پہنچ جاتا جو وہ پہلے دیکھ کر اور ممکن ہوا تو پہن کر بھی چیک کر چکی ہوتی۔

میں نیچے آیا اور سوٹ الماری میں چھپا رہا تھا کہ خالہ شنو سمیت آگئیں۔ میں سمجھا کہ آج معاملہ خالہ تک پہنچ گیا ہے۔ خالہ کی گونجتی ہوئی آواز آئی۔ ''یہ جلیل کہاں ہے؟''

''اس نے کہاں جانا ہے؟ کمرے میں ہوگا۔'' اماں نے سرد آہ بھری۔ ''ماشاء اللہ آج بہت پیاری لگ رہی ہے۔ نفیسہ! اسے کالا ٹیکا لگاؤ۔''

''ہاں... اسے مہندی میں جانا ہے، ذرا دور ہے۔ جلیل سے کہو اسے چھوڑ آئے اور رات کو لے آئے۔''

''کیوں نہیں... ابھی چھوڑ کر آتا ہے... اے جلیل!'' اماں نے پکارا تو میں فوراً حاضر ہوگیا۔ شنو کا منہ پھولا ہوا تھا۔

''جی اماں!'' میں نے کہا۔

''شنو کو مہندی میں جانا ہے۔''

''میں چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے مستعدی سے کہا اور خوشی خوشی خلیل کی بائیک نکالی اور شنو کو چھوڑنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ ابھی اوپر میں نے کیا حرکت کی تھی اور اس پر شنو کا موڈ خوفناک ہو رہا تھا۔ اس نے روانہ ہوتے ہی پہلی چٹکی کاٹی تو میں اچھل پڑا۔ بائیک لہرائی اور پہلوان اللہ رکھی کے ہڈحرام کتے کی دُم پر سے گزر گئی جسے وہ رات کو سڑک پر بڑے اہتمام سے بچھا کر رکھتا تھا۔ جہاں کسی نے اس کی دُم پر پاؤں رکھا، وہیں اس نے لپک کر غلطی کرنے والے کی ٹانگ پکڑی۔ یہ اس کا مشغلہ تھا۔ خود میں بھی ایک بار جوتا اس کے منہ میں چھوڑ کر بھاگا تھا۔ ستر کلوگرام

کی بائیک پھر پچھتر کلوگرام کا جلیل اور تقریباً ساٹھ کلوگرام کی شنو...! دُم کو مجموعی طور پر دو سو کلوگرام وزن برداشت کرنا پڑا تھا۔ کتے نے فلک شگاف آواز نکالی اور عادت کے مطابق لپک کر ٹانگ لینے کی کوشش کی۔ بائیک اتنی دیر میں گزر چکی تھی اور بدقسمتی سے اللہ رکھی نے کتے کے واویلے پر ہڑبڑا کر دکان سے نیچے قدم دکھایا اور کتے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ دوسری چیخ پہلوان اللہ رکھی نے ماری تھی۔ ایک چیخ شنو نے بھی ماری تھی لیکن یہ شوقیہ چیخ تھی جو خواتین بلاوجہ مارتی ہیں۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے گلی سے نکلنے کے بعد غرا کر کہا۔

''کون سی حرکت؟'' شنو نے معصومیت سے پوچھا۔

''اچھا یہ والی...'' اس نے پھر چٹکی کاٹی اور اس بار میں ایک گدھا گاڑی میں گھستے گھستے بچا۔

''شنو، الو کی پٹھی...! ابھی بائیک کہیں گھس جائے گی اور دونوں مریں گے۔''

''کیوں، تمہیں خود کی طرح بائیک پر بھی کنٹرول نہیں ہے؟'' اس نے کہا اور پھر چٹکی کاٹی۔ وہ چٹکی بھی بڑی ظالم کاٹتی تھی۔ میں نے بلبلا کر کہا۔

''دیکھ شنو! اب تُو نے مجھے چٹکی کاٹی نہ تو میں...''

''کیا کر لے گا؟'' شنو نے چٹکی کاٹ کر پوچھا۔

اشتعال میں میں نے اسے وہ سنائیں جو کوئی شوہر ہی اپنی بیوی کو سنا سکتا ہے۔ لیکن وہ شنو ہی کیا جو کسی کی سنے؟ اس نے سارے راستے مجھے چٹکیاں کاٹنے کا سلسلہ جاری رکھا... بس یہ احتیاط کی کہ رش والی جگہ نہیں کاٹتی تھی۔ اس کی سہیلی کا گھر آتے آتے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ میں نے اسے مہندی والے گھر پر اتارا۔

''اب یہیں مرو... خود آجانا، میں لینے نہیں آؤں گا۔''

وہ ادا سے ہنسی۔ ''تمہارے تو اچھے بھی آئیں گے۔''

میں ایک لمحے کو مبہوت رہ گیا اور اس کی چٹکیاں بھی بھول گیا۔ میری محویت دیکھ کر وہ اندر کی طرف لپکی۔ اس کے غائب ہونے پر میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اس نے صحیح کہا تھا کہ میرے اچھے بھی آئیں گے۔ اگر وہ راستے میں مجھے خنجر بھی گھونپ دیتی، تب بھی میں اسے لینے جاتا۔

☆☆☆

میں دکان پر تھا۔ ماسٹر اکرم مجھے بتا رہا تھا کہ دکان کو کچھ مرمت کی ضرورت ہے اور پھر مشینیں بھی ٹھیک کرانی تھیں۔ میں حساب کتاب کر رہا تھا کہ کتنا خرچ ہوگا۔ ماسٹر اکرم چرسی تھا اور ماسٹر چرسی کی عرفیت سے مشہور تھا۔ دن میں دو تین بار اسے سوٹے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن دکان پر نہیں پیتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی، مارکیٹ کے پاس چرسیوں کے لیے مخصوص گلی میں چلا جاتا اور دم لگا کر آجاتا تھا۔ چرسی ہونے کے باوجود وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ میرے سامنے اس نے آنے والی دو خواتین اور ایک لڑکی کا ناپ لیا۔ لڑکی کا ناپ اس نے بالکل شرافت سے لیا تھا لیکن خواتین کا ناپ دوسرے انداز میں لیا تھا اور وہ بھی اسے انجوائے کر رہی تھیں۔

''ماسٹر! یہ کیا حرکت تھی؟'' میں نے خواتین کے جانے کے بعد پوچھا۔ وہ مسکرانے لگا۔

''بس جی یہ بات آپ کی سمجھ نہیں آئے گی۔ یہ ذرا مختلف بات ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہمیں تو اپنے کام سے مطلب ہے، اب جیسے بھی ملے۔''

جواب دے کر ماسٹر نے پھرتی سے دو سوٹ کاٹے اور پھر سوٹا لگانے چلا گیا۔ کاریگر اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ میں لنچ کے لیے جانے کا سوچ رہا تھا کہ مرزا کو غیر متوقع طور پر سامنے پا کر دنگ رہ گیا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور باہر لے آیا۔ ''تجھے اس جگہ کا کیسے پتا چلا؟''

''میں مرزا ہوں۔'' اس نے بازو چھڑا کر کہا۔ ''اور تو کوئی جرم کر رہا ہے جو یاروں سے چھپا رہا ہے؟''

مرزا کل جس طرح گیا تھا مجھے اس کی واپسی... بلکہ صحیح سلامت واپسی کی امید کم ہی تھی۔ لیکن بہ ظاہر تو وہ ٹھیک نظر آرہا تھا۔ ہاں، اس کے اعضائے رئیسہ کو کوئی نقصان ہوا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ ''وجہ ہے یار... میں نے تجربے کے طور پر دکان لی ہے اور تو کیسے بچ کر نکلا؟ تجھے لے جانے والے قسائی لگ رہے تھے۔ میں تو سوچ رہا تھا چند دن بعد تیرے سری پائے الگ الگ ملیں گے۔''

مرزا نے اضطرابی انداز میں میرا بازو پکڑا۔ ''جلیل! میں بری طرح پھنس گیا ہوں اور مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فی الحال میں لنچ کرنے جا رہا ہوں۔''

''میرے ساتھ چل... آج میں تجھے ایسی نہاری کھلاؤں گا کہ جاوید کی نہاری بھی بھول جائے گا۔''

''اگر تو کھلا رہا ہے تو چلتا ہوں۔'' میں راضی ہوگیا اور مرزا مجھے ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے گزارتا ہوا ایک خستہ حال ہوٹل تک لے آیا۔ میں نے شک سے کہا۔ ''مرزا! کیا تو بدلہ لینے کے لیے یہاں لایا ہے؟ یہاں کھانا کھایا تو اسپتال جانا پڑے گا۔''

''ظاہر پر مت جا... ابھی کھائے گا، تب پتا چلے گا۔'' مرزا نے آرڈر دے کر کہا۔ نہاری اور روٹی فوراً آ گئی تھی اور جب میں نے کھانا شروع کیا تو مرزا کی بات درست نکلی۔ واقعی نہاری لاجواب تھی۔ میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا اور جب اوپر سے دو گلاس پانی انڈیلا تو سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ اس کے بعد مرزا نے مجھے ایک نزدیکی ہوٹل سے دودھ پتی پلائی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مرزا کی مہربانی بے سبب نہیں۔ وہ تو بلا مطلب اپنے باپ کو بھی ایک گلاس پانی تک کا نہ پوچھے۔ چائے پی کر میں نے جماہی لی۔

''مرزا! مجھے نیند آ رہی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو کل مجھ سے مل لے؟''

''کل!'' مرزا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ''کل تک بہت دیر ہو جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں... تُو پرسوں رکھ لے۔''

''پرسوں میرا سوئم ہوگا۔'' اس نے بھنا کر کہا۔

''انشاء اللہ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو... لیکن تیرے انتقال بے ملال کی وجہ کیا ہوگی... وہی قسائی پارٹی؟''

مرزا نے سر ہلایا اور رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہاں وہی... وہ قسائی نہیں ہیں لیکن قسائی بھی ان کے آگے رحم دل ہوگا۔ وہ وڈیرا مراد خان کے آدمی ہیں۔''

''وڈیرا مراد خان... یہ کون ہے اور کہاں پایا جاتا ہے؟''

''بہت بڑا زمیندار ہے۔ ٹھٹھہ حیدر آباد میں اس کی بڑی زمینیں ہیں۔''

''لیکن تیرا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے جلیل... اور اب میں پھنس گیا ہوں۔'' مرزا نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ''اگر میں نے اس کا کام نہیں کیا تو میں ضرور مارا جاؤں گا۔''

کیونکہ مجھے مرزا کی وفات سے بہت دلچسپی تھی اس لیے میں اس کی بات سننے پر آمادہ ہو گیا۔ ''اسے تجھ سے کیا کام ہے؟''

''اسے اپنے وارث کی تلاش ہے۔''

''مراد خان کو...؟''

''ہاں... اس نے چار شادیاں کی ہیں اور ان سے اس کی سترہ لڑکیاں ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''سترہ لڑکیاں؟''

''ہاں اور لڑکا ایک بھی نہیں ہے۔ ابھی جب میں اس کی حویلی میں تھا تو اس کی سترھویں لڑکی ہوئی تھی۔''

''تُو وہاں کس سلسلے میں تھا؟''

''وہ... ایک چکر ہے۔ اس کا اصل مسئلے سے تعلق نہیں ہے۔ مراد خان بیٹے کے لیے مرا جا رہا ہے۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ شہر میں پڑھ رہا تھا تو اس نے ایک شادی یہاں بھی کی تھی۔''

''پانچویں شادی؟'' میں دنگ رہ گیا۔

''نہیں یار! اس وقت پڑھ رہا تھا گاؤں میں۔ اس کی صرف دو بیویاں تھیں۔ ایک باپ کے خاندان سے اور ایک ماں کے خاندان سے۔''

''تیسری اس نے یہاں کر لی؟''

''ہاں، وہ بے چاری غریب گھر کی تھی۔ اس نے گھر سے بھاگ کر مراد خان سے کورٹ میرج کر لی۔ اس نے لڑکی کو فلیٹ لے کر دیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''جب مراد خان تیسری دفعہ بی اے کے امتحان میں فیل ہوا تو اس کے باپ نے اسے واپس بلا لیا کہ آ کر زمین سنبھالے۔''

''لڑکی کا کیا ہوا؟''

''وہ امید سے تھی لیکن مراد خان اسے نہیں لے جا سکتا تھا اس لیے مجبوراً اسے طلاق اور فلیٹ دے کر چلا گیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مراد خان کے سترہ نہیں اٹھارہ بچے ہیں؟''

''ہاں... اور اسے امید ہے کہ یہ بچہ لڑکا ہوگا۔''

''مراد خان تجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

''وہ چاہتا ہے کہ میں اس لڑکے کو تلاش کروں۔''

''وہ وڈیرا ہے اور اثر و رسوخ والا بندہ ہوگا۔ اس نے خود کیوں نہیں تلاش کر لیا؟''

''وہ تو پچھلے بائیس سال سے تلاش کر رہا ہے لیکن لڑکی اس کے جاتے ہی فلیٹ بیچ کر غائب ہو گئی تھی۔ وہ ماں باپ کے پاس بھی نہیں گئی تھی۔''

''مراد خان چاہتا ہے کہ تُو اس کی بیوی اور بچے کو تلاش کرے؟''

''صرف لڑکے کو۔'' مرزا نے کہا۔ ''اس کی بیوی کا پتا چل گیا تھا، وہ اسپتال میں لاوارث کینسر سے مری تھی اور اس کی تدفین ایدھی نے کی تھی۔ اس کے بچے کا نہیں پتا چل رہا ہے۔''

''بچہ کس کے پاس تھا؟''

''یہ اسپتال والے بھی نہیں جانتے کہ بچہ کس کے پاس تھا۔ بس وہ اتنا جانتے تھے کہ مرنے والی عورت کا بچہ لے کر ایک عورت اس سے ملوانے آتی تھی۔ یہ لڑکا تھا اور اس وقت چھ سات سال کا تھا۔''

''جب مراد خان اسے نہیں تلاش کر سکا تو تُو کہاں سے اسے ڈھونڈ سکتا ہے؟''

''میں پھنس گیا ہوں۔'' مرزا کا منہ لٹک گیا۔

میں نے غور کیا اور بات سمجھ گیا۔ ''بیٹے... تُو نے اسے جھانسا دیا ہوگا کہ تُو اس کے بیٹے کو تلاش کر کے لا سکتا ہے اور تُو نے یقیناً اس سے خاصی رقم بھی بٹور لی ہوگی؟''

مرزا نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ ''ہاں اور پھر میں...''

''غائب ہو گیا۔'' میں نے جملہ مکمل کیا۔

مرزا نے ایک دفعہ پھر بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ ''میں بھاگ گیا تھا...''

''لیکن وڈیرے کے گرگوں نے تجھے تلاش کر لیا؟''

''ہاں اور وڈیرے نے مجھے بلا کر خبردار کیا ہے کہ اگر میں نے اس کے بیٹے کو تلاش نہیں کیا تو اس کے آدمی مجھے... تلاش کر کے اس کے پاس لے آئیں گے اور وہ مجھے اپنے کتوں کے آگے ڈلوا دے گا۔''

''یعنی وہ ایک روایتی وڈیرا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تب اس نے تجھے اتنی آسانی سے بغیر پٹے کے... میرا مطلب ہے آزاد چھوڑ کیسے دیا؟''

مرزا کی حالت ایک بار پھر روہانسی ہو گئی اور دل میں شاید وہ دھاڑیں مار کر رو بھی رہا تھا پھر اس نے بلبلا کر کہا۔ ''جلیل! اس نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو تُو نے کیا تھا۔''

''میں نے؟... میں سمجھا نہیں۔''

''اس نے مجھ سے سونے کی پلیٹیں چھین لی ہیں اور جب تک میں اسے اس کا بیٹا تلاش کر کے نہیں دوں گا، وہ مجھے پلیٹیں واپس نہیں کرے گا۔''

میں نے ہمدردی سے مرزا کو دیکھا۔ ''تیرے ساتھ واقعی برا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سونا تیرے لیے منحوس ہے اس لیے تُو اس کا خیال دل سے نکال دے۔''

مرزا اچھل پڑا۔ ''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، چالیس لاکھ کا سونا ہے۔''

''چل ٹھیک ہے پھر وڈیرے کا لڑکا تلاش کر اور سونا واپس لے لے۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

مرزا بھی کھڑا ہو گیا اور گھگیا کر بولا۔ ''جلیل! خدا کے لیے میری مدد کر ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔''

''انشاء اللہ... میرا مطلب وہی ہے۔ یعنی اگر خدا نے چاہا اور نہیں چاہا تو تُو برباد نہیں ہوگا اور جہاں تک مدد کا تعلق ہے تو میں نے آج کل خدمتِ خلق بند کر دی ہے۔ مطلب یہ کہ مفت میں کچھ نہیں کرتا۔''

''تو کیا مجھ سے معاوضہ لے گا؟'' مرزا نے مرے مرے انداز میں کہا۔

''اول تو میں نے یہ کام کرنا ہی نہیں ہے۔ میں وڈیرے ٹائپ کی چیزوں سے دور رہنا پسند کروں گا اور اگر تیرے کام آنے پر آمادہ ہو بھی جاؤں تو کیا تُو میری خالہ کا لڑکا ہے جس کی بلائیں میں مفت میں اپنے سر لے لوں؟'' میں نے کہا اور وہاں سے روانہ ہونے لگا۔

''جلیل! تجھے شنو کا واسطہ۔'' پیچھے سے مرزا نے دہائی دی اور کس ظالم کی دی تھی۔ میں بادل ناخواستہ پلٹ آیا۔

''مرزا خبیث! شنو کا نام کیوں لیا؟'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''اب فافٹ دو کڑک اور ایک گولڈ لیف کا پیکٹ منگوا۔ اس کے بعد سوچتے ہیں کہ تیرے مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے۔''

''حل میرے پاس ہے۔'' مرزا نے کہا اور دوڑ کر چائے کا کہہ کر اور سگریٹ کا پیکٹ لے کر آ گیا۔

''یعنی تو نے پہلے سے ہی سب سوچ رکھا ہے کہ مجھے کس طرح استعمال کرنا ہے؟'' میں نے ایک سگریٹ نکالی اور پیکٹ جیب میں رکھ لیا۔

''ہاں۔'' مرزا کھسیا گیا۔ ''لیکن میں نے جو ترکیب سوچی ہے اس میں تیرا بھی فائدہ ہے۔''

''اس پر بعد میں بات کریں گے۔ پہلے یہ بتا کہ تُو مراد خان کے سپوت کو تلاش کیسے کرے گا؟''

''میں اسے کیسے تلاش کروں گا جبکہ اس کا باپ بھی یہ کام نہیں کر سکا ہے۔'' مرزا نے مایوسی سے کہا۔

''تب مراد خان سے اپنی مراد... میرا مطلب ہے سونا کیسے حاصل کرے گا؟''

اس دوران میں چائے آ گئی اور میں نے پیالی اٹھائی تھی کہ مرزا نے کہا۔ ''تجھے اس کا بیٹا بنا کر!''

میں اچھل پڑا اور گرم چائے میری ران پر گر گئی۔ وہ تو شکر ہے کہ جینز خاصی موٹی تھی اس لیے اندر تک معمولی سا اثر ہوا۔ میں نے بے یقینی سے مرزا کو دیکھا۔ ''تیرا دماغ درست ہے؟ میں وڈیرے کا بیٹا کہاں سے ہونے لگا؟ میں سو فی صد اپنے باپ کی اولاد ہوں۔''

''میرا مطلب ہے، تجھے بنا کر پیش کروں گا۔''

رومال سے پتلون صاف کرتے ہوئے میں نے بھنا کر کہا۔ ''اور وہ مان لے گا؟''

”یہ کام تُو مجھ پر چھوڑ دے۔“ مرزا نے کہا۔ ”اس کا تو باپ بھی مانے گا۔ بس تو وہی کر جو میں کہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے راجا جیسا گدھا مت سمجھ کہ... تو جو کہے میں مان لوں۔ اپنا کام نکال کر تُو نو دو گیارہ ہو جائے اور گردن میری پھنسے گی۔“

”نہیں پھنسے گی۔“ اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”کیسے؟ مجھے بتا تیرا پلان کیا ہے اور مراد خان کس طرح یقین کرے گا کہ میں اس کا بیٹا ہوں؟ کیا میری شکل اس سے ملتی ہے؟“

”نہیں تو... وہ تو سیاہ رنگ کا اور چھوٹے قد کا شخص ہے۔“ مرزا نے کہا۔

”تو اس کا بیٹا بھی ایسا ہی ہوگا۔“

”لیکن بیٹا ماں پر بھی تو جا سکتا ہے اور اس کی ماں یقیناً خوب صورت عورت ہوگی ورنہ مراد خان کا دل کیسے آتا۔“

”چل مان لیا لیکن وہ تجھ سے کچھ ثبوت تو مانگے گا؟“

”ثبوت میں نے تلاش کر لیے ہیں۔“ مرزا نے کہا۔ ”دراصل، میں نے اس کی ماں کے گھر والوں کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ مراد خان کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے طلاق کے بعد اپنی بیٹی کو پناہ دی تھی لیکن جب پتا چلا کہ مراد خان اسے تلاش کر رہا ہے تو عورت اپنے بیٹے کو لے کر کہیں چلی گئی تھی۔ جاتے ہوئے وہ مراد خان کے دیے کچھ تحفے اور کپڑے چھوڑ گئی تھی۔ میں نے وہ چیزیں حاصل کر لی ہیں۔“

”کیسے حاصل کر لیں؟“

”نوٹوں سے!“ مرزا مسکرایا۔ ”نوٹ خرچ کرو تو سب مل جاتا ہے۔“

”چل مان لیا تُو نے وڈیرے کی اپنی بیوی کو دی ہوئی کچھ چیزیں تلاش کر لی ہیں... لیکن ان سے کیا اس کی تسلی ہو جائے گی؟“

”کیوں نہیں ہوگی؟ جب میں ان چیزوں کے ساتھ تجھ جیسے ہونہار سپوت کو اس کے سامنے پیش کروں گا تو وہ ضرور مان جائے گا۔“ مرزا نے یقین سے کہا۔

”اس کے بعد؟“

”میں اپنا سونا اس سے وصول کروں گا اور ہم وہاں سے نکل جائیں گے۔“ مرزا نے بات مکمل کر دی۔

”کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟“ میں نے طنز کیا۔ ”تو پہلے بھی نکل گیا تھا پھر اس نے تجھے کیسے قابو کر لیا؟ وہ دوبارہ تجھے اور مجھے نہیں پکڑ واسکتا؟“

”مجھے وہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں پایا جاتا ہوں لیکن تیرے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ تیرا نام بھی فرضی رکھ لیں گے۔“

”اور اس کے مطابق کاغذات بھی بنوا لیں گے۔“ میرا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔ ”مرزا! تو کسے بے وقوف بنا رہا ہے؟ اس اسکیم میں صرف تیرا فائدہ ہے۔ اس بار تُو سرے سے غائب ہو جائے گا... چیچو کی ملیاں یا ٹمبکٹو چلا جائے گا جہاں مراد خان تجھے تلاش نہیں کر سکتا... لیکن مجھے تو اسی شہر میں رہنا ہے۔“

مرزا نے ہمت نہیں ہاری۔ ”تُو حلیہ بدل سکتا ہے۔“

”کاغذات کا مسئلہ پھر بھی رہے گا۔ آج کل تو جعلی شناختی کارڈ بھی نہیں بنتا۔“ میں پھر کھڑا ہو گیا۔ ”سوری مرزا! تیرے مسئلے کا میرے پاس کوئی حل نہیں ہے اور اب شنو کی قسم دی تو...“

”میری بات تو سن۔ میں شنو کی قسم نہیں دوں گا۔“ مرزا اٹھ کر مجھ سے چمٹ گیا۔ ”اچھا، ایک تہائی سونے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

میں رک گیا اور بے یقینی سے مرزا کی طرف دیکھا۔ ”تُو مجھے سونے کی ان پلیٹوں میں سے...... پیش کش کر رہا ہے؟“

”ہاں۔“ وہ رونے والے انداز میں بولا۔ ”بزرگوں نے کہا ہے کہ جب پورا جاتا دیکھیو تو آدھا دیجیو بانٹ۔“

”لیکن تو ایک تہائی دے رہا ہے؟“

”تیرہ لاکھ بھی تو کم نہیں ہوتے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ واقعی تیرہ لاکھ کم نہیں تھے۔ اس میں تو میں چار پانچ ٹیلرز شاپس کھول سکتا تھا۔ اس کے بعد آرام سے بیٹھ کر کھاتا۔ مگر سچی بات ہے، مجھے اس کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ وڈیرے خطرناک ہوتے ہیں اور مراد خان کے پاس خطرناک آدمی تھے جن کو میں خود ملاحظہ کر چکا تھا۔ اگر وہ میرے پیچھے پڑ جاتا تو میرے پاس کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ لیکن ایک ہی جھٹکے میں تیرہ لاکھ روپے بھی کم نہیں تھے۔ پھر مجھے ایک خیال آیا اور میں نے مرزا سے کہا۔

”اگر تُو تیرہ کے بجائے پندرہ لاکھ کر لے تو میں سوچ سکتا ہوں۔“

”تیرہ بہت ہیں۔“ اس نے کہا تو میں پھر کھڑا ہو گیا۔

”تو پھر اللہ حافظ!“

”اچھا جلیل... میری بات تو سن۔“ مرزا نے پھر مجھے روک لیا۔ ”چل پندرہ لاکھ سہی لیکن تُو نے کام کرنا ہے۔“

”ابھی میں نے حامی نہیں بھری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آج رات سوچوں گا اور کل بتاؤں گا۔ شام سات بجے فتو کے ہوٹل آجانا۔“

”میں تیرا انتظار کروں گا۔“ وہ بے تابی اور امید سے بولا۔

میں گھر کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں مجھے موبائل لینے کا خیال آیا اور میں نے صدر کی موبائل مارکیٹ کا رخ کیا۔ وہاں سے میں نے نیا کلر اسکرین کیمرے والا زبردست سا موبائل لیا۔ سم میرے پاس تھی۔

گھر کے سامنے پہنچا تو چاند میاں بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو حسبِ معمول اڑیل گھوڑا بنی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پاس رک کر کہا۔ ”چاند بھائی! یہ بھی تمہارے بس کی چیز نہیں ہے۔ مجھے بیچ دو۔“

”اور کون سی چیز میرے بس کی نہیں ہے؟“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”ابھی چھ مہینے پہلے تو لی ہے۔“

”بیٹے! تم نے چار سال پہلے شادی بھی کی تھی اور اب تک والد بزرگوار نہیں بنے ہو... صرف بزرگوار بن گئے ہو۔ اس عمر میں جوان بیوی اور نئی بائیک نہیں سنبھالی جاتی۔“ یہ میں نے دل میں کہا۔ منہ سے کہتا تو چاند میاں اپنی پیرانہ سالی کے باوجود مجھے قتل کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ چاند میاں کک مار رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”لاؤ مجھے دو۔“

اس نے گھور کر دیکھا لیکن پھر ہینڈل میرے حوالے کر دیا اور میں نے دو کک مار کر بائیک اسٹارٹ کر دی۔ ”چاند بھائی! ایسا کرو جس قیمت پر لی تھی، اس سے پانچ کم میں مجھے دے دو... اور تم کوئی ویسپا لے لو۔ وہ تمہارے لیے ٹھیک رہے گی۔“

”چلو چلو... اپنا کام کرو۔“ چاند میاں نے فوراً بائیک مجھ سے لے لی۔ ”اتنی کم میں نہیں دوں گا۔“

”مرضی تمہاری۔“

ابھی چاند میاں چند قدم دور گیا تھا کہ بائیک پھر بند ہو گئی اور وہ پھر سے اسے کک مارنے میں لگ گیا۔ میں مسکرایا اور گھر میں گھس گیا۔ میں نے جاتے ہی اماں کو موبائل دکھایا۔ ”کیسا ہے؟“

”اچھا ہے، پر تیرے پاس پیسے کہاں سے آئے؟“ اماں نے تعریف کر کے فوراً مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”جہاں سے آتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جلیل! تو نہیں سدھرے گا۔ اسی وجہ سے تیری شادی بھی نہیں کر رہی ہوں۔“

”مت کرو۔ کسی دن اس موبائل کی طرح شنو بھی میرے ہاتھ میں ہوگی اور تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔“

اماں دہل گئیں۔ ”بے غیرت! کورٹ میرج کرے گا... باپ دادا کی عزت کو بٹا لگائے گا۔“

”اگر انہوں نے کوئی جگہ بٹے سے خالی چھوڑ دی ہو تو۔“ میں نے کہا اور شنو کا سوٹ لے کر فوراً چھت کا رخ کیا کیونکہ اماں کی صلواتیں شروع ہو گئی تھیں۔ شنو غائب تھی۔ کل اسے رات دو بجے مہندی سے لایا تھا تو وہ نیند میں اتنی مدہوش تھی کہ دو بار بائیک سے گرتے گرتے بچی اور میں نے اسے ہوشیار ہونے کو نہیں کہا تھا کیونکہ پھر وہ مجھ سے چمٹ کر نہ بیٹھتی۔ گھر آکر میں نے سرد آہ بھری۔ ”کم بخت اتنا سا راستہ تھا۔ یہ تمہاری سہیلی کہیں کورنگی یا یونیورسٹی روڈ پر نہیں رہ سکتی تھی؟“

شنو نے منہ بنایا۔ ”پتا نہیں کیا بک رہے ہو۔“ اس نے کہا اور دروازہ بجایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کے دروازے کے سامنے کھڑا کیا۔

”تمہارا دروازہ یہ ہے اور اس میں جانے کے لیے فی الحال تمہیں تین الفاظ کہنے تک انتظار کرنا ہوگا۔“

”کیا؟“ وہ بولی۔

”قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔“

شنو نے مجھے گھورا اور دروازہ کھلتے ہی اندر چلی گئی۔ امکان یہی تھا کہ وہ پڑی سو رہی ہوگی یا ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی ہو گی اس لیے مجھے بلّے کی آواز میں سگنل دینا پڑا۔ وہ کچھ دیر بعد جھنجلاتی ہوئی آئی۔ ”کیا ہے؟ اتنا زبردست سین تھا۔“

”تمہاری بات پر مجھے شادی کے بعد کا عبرت ناک سین دکھائی دے رہا ہے۔ شوہر اور بچے بھوک سے وفات پانے والے ہوں گے اور تم بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہوگی۔“

”بکو مت۔“ وہ ذرا سرخ ہو گئی۔ ”کیوں بلایا ہے بے وقت؟“

”یہ دیکھو۔“ میں نے موبائل ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے کیا تو وہ اچھل پڑی۔

”واہ! کتنا خوب صورت ہے۔ میرے لیے ہے؟“

”سوچا تو یہی تھا کہ تمہیں گفٹ کروں گا لیکن خالہ کو پتا چل جانے کے ڈر سے ارادہ ملتوی کر دیا۔“ میں نے چالاکی سے کہا۔

شنو کا منہ لٹک گیا۔ ”ہاں، اماں کسی صورت مجھے موبائل نہیں رکھنے دے گی۔“

”بس ایک بار شادی ہو جائے تو پھر اس سے بھی اچھا موبائل لا دوں گا۔“ میں نے کہا اور اس کی تصویر اتاری۔

''ہائے اللہ! کیمرا بھی ہے۔'' شنو پُرجوش ہوگئی۔ ''اب تو روز میری تصویریں اتارے گا؟''

''تو موقع دے گی تو کیوں نہیں اتاروں گا۔''

''اور مجھے اپنی فرینڈز سے بات کرنے کے لیے بھی دے گا؟''

''چل تو بات بھی کرلینا۔ کیا یاد کرے گی کہ کس منگیتر سے پالا پڑا تھا۔'' میں نے فراخ دلی سے کہا۔ ''ایک چیز اور ہے۔ تجھے بعد میں تھرو پراپر چینل ملے گی لیکن دیکھ لے اور ہوسکے تو مجھے پہن کر بھی دکھادے۔'' میں نے اسے سوٹ کا شاپر تھمایا۔

''سوٹ... میرے لیے؟''

''سلا ہوا ہے۔'' میں نے فخر سے کہا۔ ''دو گھنٹے میں خرید کر سلوا بھی لیا۔''

اس نے شاپر سے سوٹ نکال کر دیکھا۔ ''بہت اچھا ہے۔'' وہ بدن سے لگا کر دیکھنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا۔ ''لیکن تُو نے ناپ کیسے بتایا؟''

''زبانی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تیرے سارے نشیب و فراز مجھے زبانی یاد ہیں۔''

شنو حسبِ معمول خوش اور خفا ہوگئی۔ ''بدتمیز!'' اس نے زیرِ لب کہا۔

''اگر ہوسکے تو پہن کر دکھا دے اور پھر واپس کر دے۔ میں اماں کو دے دوں گا، وہ خالہ کو دے جائیں گی۔''

''میں آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور نیچے غائب ہوگئی۔ خالہ شاید مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں اور شنو نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سوٹ پہن کر دکھا دیا بلکہ اپنی تصویریں بھی بنوا لیں۔ سوٹ اسے پوری طرح فٹ آیا تھا۔

''دیکھا، میں نے کہا تھا کہ مجھے سب ازبر ہے۔'' میں نے اس سے شاپر لیتے ہوئے کہا۔ اس پر شنو گھورتی ہوئی واک آؤٹ کرگئی۔ میں نیچے آیا اور شاپر اماں کو تھما دیا۔ ''اس میں تمہاری ہونے والی اور شاید کبھی نہ ہونے والی بہو کے لیے سوٹ ہے۔''

''یہ تو تجھ پر ہے کہ وہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔'' ہمیشہ کی طرح اماں نے ملبا میرے سر ڈال دیا تھا۔

میں باہر آیا تو آپے سے باہر چاند میاں، بائیک کو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگانے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی تو خلافِ توقع اس نے کہا۔ ''لاؤ ابھی لاؤ... چالیس کی لی تھی پینتیس میں دے رہا ہوں۔''

''سچ۔'' میں اچھل پڑا کیونکہ بائیک بالکل نئی جیسی تھی۔ کہیں ایک خراش تک نہیں تھی، بالکل چاند بانو کی طرح نئی نکور تھی۔ چاند میاں اسے چلاتا تو اس کا کچھ بگڑتا۔ ''ایک منٹ... میں ابھی رقم لاتا ہوں۔''

میں بھاگ کر گھر سے رقم لایا اور گن کر پینتیس ہزار چاند میاں کے حوالے کیے۔ اس نے مجھے بائیک اور اس کے کاغذات دیے۔ ''کل میرے ساتھ چل کر اسے اپنے نام کرا لینا۔'' اس نے کہا۔ ''چاہو تو رقم بھی تب دے دینا۔''

''مجھے تم پر اعتماد ہے چاند بھائی۔'' میں نے کہا اور بائیک اسٹارٹ کرکے روانہ ہوگیا۔ راجا کا اپنے گھر میں پائے جانے کا اتنا ہی امکان تھا جتنا ہمارے صدرِ محترم کا ملک میں پائے جانے کا ہوتا ہے لیکن میں نے اس کی تلاش کی مہم کا آغاز وہیں سے کیا۔ بدقسمتی سے راجا کے بجائے اس کا ظالم باپ نکل آیا جو راجا اور اس کے دوستوں سے یکساں سلوک کا قائل تھا۔

''وہ نکما صبح سے غائب ہے... کپڑے دینے کو کہا تھا، وہ بھی ابھی تک پڑے ہیں...'' اس نے راجا کی قصیدہ خوانی کا آغاز کیا تھا کہ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ راجا کا دوسرا ٹھکانا عارفہ یعنی نادر شاہ کا گھر تھا۔ باپ تھانے میں لوگوں کو مرغا بناتا تھا اور بیٹی گھر میں راجا اور اس کے قبیل کے کئی عشاق کو الو بناتی تھی۔ دونوں باپ بیٹی پرندے بنانے میں ماہر تھے۔ راجا کی جیب میں جب بھی نوٹ آتے تو وہ سیدھا اس کے گھر کا رخ کرتا اور تب تک وہیں رہتا جب تک سارا مال عارفہ پر لٹا نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعد عارفہ کسی بہانے اسے لات مار کر نکال دیا کرتی تھی۔

راجا کو میں نے اس کا حصہ دیا تھا اس لیے راجا مجھے عارفہ کے گھر میں مل گیا۔ کال بیل کے جواب میں عارفہ نے خود آکر باہر جھانکا اور مجھے دیکھتے ہی غرائی۔ ''تُو کہاں سے آگیا؟''

''راجا کو بھیجو۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تمہارا حلیہ بتا رہا ہے کہ راجا یہیں ہے۔'' میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ عارفہ نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ ''اگر دو منٹ کے اندر اندر راجا باہر نہیں آیا تو میں تمہارے باپ کو کال کرنے جا رہا ہوں۔'' میں نے اسے موبائل نکال کر دکھایا۔

اس نے منہ بند کرلیا اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ اگرچہ نادر شاہ اپنی دخترِ بداختر کے کرتوت بخوبی جانتا تھا لیکن فی الوقت نادر شاہ کی آمد سے عارفہ کے رنگ میں بھنگ پڑ جاتا۔ اس لیے اس نے راجا کو باہر بھیجنا ہی مناسب سمجھا۔ راجا سخت تپا ہوا آیا کیونکہ اس کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی تھی۔

''کیا ہے؟'' اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت آمرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''معاف کرنا یار۔'' میں نے دانت نکالے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تو مصروف تھا لیکن ابھی میں ایک ضروری اور مفید کام سے آیا ہوں۔''

''اس وقت میں فرشتۂ اجل کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اپنے باپ کے ساتھ تو جا سکتا ہے۔ وہ بھی تجھے تلاش کر رہا ہے۔''

باپ کے نام پر راجا کڑک لٹھے سے اچانک ململ میں بدل گیا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ''ابا کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو بول کیا کام ہے؟''

''راجا! تیرے فائدے کا کام ہے۔''

''اس وقت بھی میں خسارے میں نہیں ہوں۔'' اس نے اندر کی طرف دیکھا۔ ''عارفہ پچھلے خراب رویّے کی تلافی کر رہی ہے۔''

''دیکھ راجا! تیرے پاس جب نوٹ ہوں گے، عارفہ پچھلے رویّے کی تلافی کر دے گی۔ اصل اہمیت نوٹوں کی ہے اور نوٹ کمانے کا موقع یہی ہے۔''

''کتنے نوٹوں کا موقع ہے؟'' راجا نے سوال کیا۔

''کم سے کم دو لاکھ روپے... ممکن ہے اس سے زیادہ بھی مل جائیں۔''

راجا اچھل پڑا۔ ''دو لاکھ روپے!'' اس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کہیں تُو نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟''

''بیٹے! میں خواب نہیں دیکھتا، ان کی عملی تعبیر تلاش کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتا کہ تُو چل رہا ہے یا میں کسی اور کو تلاش کروں؟ میں نے سوچا تھا کہ پہلے دوست کا بھلا کروں لیکن تُو عارفہ...'' اس سے آگے میں نے نہایت واہیات جملہ ادا کیا۔

''میں عارفہ کو بتا کر آتا ہوں۔'' راجا نے کسی فرماں بردار اولاد کی طرح کہا۔ لیکن عارفہ دروازے سے لگی کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی اور ظاہر ہے، اس نے اپنے بارے میں میرا جملہ سن لیا تھا جو بیان کے قابل نہیں تھا۔ اور پھر اس نے جو کہنا شروع کیا، اسے بھی ناقابلِ اشاعت سمجھا جائے۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور راجا سے کہا۔

''میں اب سے ایک گھنٹے تک کینفے ڈی پھونس میں تیرا انتظار کروں گا۔''

میں روانہ ہوا تو عارفہ کی آواز گلی کے کونے تک آتی رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ راجا کو آنے نہیں دے گی لیکن راجا اسے چکما دے کر آ بھی سکتا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب راجا ہانپتا ہوا کینفے ڈی پھونس میں داخل ہوا اور اس نے میرے پاس آکر جو فرمایا، وہ فتو کے ڈیک کے شورِ قیامت میں بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر راجا نے ایک گلاس پانی پیا اور کرسی پر گر کر اس گھوڑے کی طرح ہانپنے لگا جو ریس میں آخری نمبر پر آیا ہو۔

''جلیل... تو میرے ہاتھوں قتل ہوجائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس فٹ پاتھی نجومی کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی جس نے کہا تھا...''

''کیا کہا تھا؟'' راجا نے پوچھا تو میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اس نے کہا تھا کہ میری موت کسی کمینے اور گھٹیا شخص کے ہاتھوں ہوگی۔''

راجا نے نجومی کی شان میں بھی گستاخی کی۔ وہ واضح طور پر مشتعل تھا اور اگر میں نے لاکھوں کی بات نہ کی ہوتی تو وہ کسی صورت یہاں نہ آتا۔ میں نے فتو کے چھوٹے کو بلایا۔ ''دو دودھ پتی لے آ... لیکن دودھ بھینس کا... ڈبے والا نہیں چلے گا۔''

''جلیل! جلدی بک، کیا بات ہے؟'' راجا واپس جانے کے لیے بے چین لگ رہا تھا۔

''راجا! فرض کر تُو اپنے باپ کا نہیں، کسی وڈیرے کا... گمشدہ بیٹا ہے؟''

راجا بالکل بھی مشتعل نہیں ہوا۔ ''تیرے منہ میں گھی شکر۔''

''اور وڈیرا کئی ہزار ایکڑ زمین کا مالک بھی ہو؟''

''تیرے منہ میں موتی!'' راجا مزید خوش ہوگیا۔ ''کیا ایسا سچ کوئی چانس ہے؟''

''بالکل... ورنہ مجھے پاگل کتے نے کاٹا تھا جو اس حرافہ کے کوٹھے کا رخ کرتا۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''اسے سمجھا لے... میرے منہ لگی تو بہت برا ہوگا۔''

''تیرے ساتھ ہی ہوگا۔'' راجا نے دانت نکالے۔ ''اس کے باپ کو جانتا ہے نا؟''

''اب تُو واپس نہیں جائے گا اور ہم کل مرزا سے ملیں گے۔''

''اس سے تو مجھے بھی ملنا ہے۔ میرا خیال ہے زمین کو

مرزا جیسے شخص سے پاک کر دینا چاہیے۔''
''احمق! مرزا ہی تو تجھے وڈیرے کا سپوت بنائے گا۔''
یہ سن کر راجا نے انکار کر دیا۔ مرزا نے اسے ایک بار ڈسا تھا اور وہ دوبارہ ڈسے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ''اگر مرزا مجھے اوباما کا بیٹا بنا دے، تب بھی میں نہیں مانوں گا۔''
میں نے غور کیا۔ ''تو اوباما کا بیٹا بھی بن سکتا ہے، بس ذرا نقوش اس سے خوب صورت ہیں۔ لیکن سنا ہے کہ شکل و صورت کے لحاظ سے وڈیرا ابھی تیرا والد ماجد لگتا ہے۔''
راجا کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شکل سے وڈیرے کی اولاد نظر آتا جو بہ قول مرزا، سیاہ رو اور پستہ قد تھا۔ پھر راجا مشکل حالات اور آزمائشوں کا پروردہ بھی لگتا تھا۔ حالانکہ اس کی سب سے بڑی مشکل اس کا باپ خود تھا اور اب اسے موقع ملا تھا تو وہ ایک منٹ میں باپ بدلنے کو تیار ہو گیا تھا۔ بس مرزا کا نام سن کر بدکا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے راضی کر لیا۔ ''تو مرزا کو مار گولی... بس سمجھ لے کہ میرے لیے کام کر رہا ہے۔''
''تب میں دو لاکھ روپے تجھ سے لوں گا۔''
''مجھے ملیں گے تو میں تجھے کیوں نہیں دوں گا میرے گہن لگے چاند!'' میں نے پچکار کر کہا۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا اور نومبر کا مہینا تھا لیکن دن ابھی بھی گرم ہوتا تھا۔ ایک طویل اور گرد آلود سفر نے ہم سب کا برا حال کر دیا۔ بس میں سب سے پیچھے جگہ ملی تھی۔ بس مکمل اے سی تھی یعنی کسی کھڑکی میں شیشہ نہیں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ہوا سے زیادہ مٹی اندر آ رہی تھی۔ اس روتی اور ہونکتی بس نے چار گھنٹے بعد نیشنل ہائی وے پر ٹھٹھہ کے قریب ہمیں وہاں اتارا جہاں سے مراد خان کا گاؤں ڈیرا مراد خان چند میل کے فاصلے پر تھا۔ سورج اس وقت بالکل سر پر تھا اور آگ برسانے کے موڈ میں تھا۔
''اتنی گرمی...'' راجا نے زبان نکال کر کہا۔ ''مرزا! کہیں تو کسی سازش کے تحت تو ہمیں یہاں نہیں لایا ہے... ڈاکوؤں سے ساز باز کر کے؟''
مرزا نے برا مان کر کہا۔ ''لانا ہوتا تو کھاتے پیتے لوگوں کو لاتا، تم کنگلوں سے ڈاکوؤں کو کیا ملے گا؟ الٹا کھانا کھلانا پڑ جائے گا۔''
''یہاں سے گاؤں تک جانے کے لیے کوئی سواری نہیں مل سکتی؟'' راجا نے فریاد کی۔ وہ بخت ہڈ حرام تھا اور محنت والے کسی بھی کام سے اس کی جان نکلتی تھی... سوائے اس محنت کے جو وہ عارفہ کے پاس کرتا تھا۔
''یہاں سواری نہیں ملتی۔'' مرزا نے کہا۔ ''ویسے میں مراد خان کو کہہ دیتا تو وہ کراچی اپنی پجیرو بھیج دیتا۔''
اس بار راجا کے ساتھ میں بھی بھنا گیا۔ ''تو کہا کیوں نہیں؟''
''میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔''
راجا نے مرزا کے سرپرائز کے بارے میں اپنے پاکیزہ خیالات ظاہر کیے اور میں نے اس کی تائید کی۔ مرزا الو کا پٹھا ہمیں بلاوجہ خوار کروا رہا تھا جبکہ ہم مراد خان کی گاڑی میں نہایت ٹھاٹ سے سفر کر سکتے تھے۔ راجا صحیح کہہ رہا تھا۔ مرزا... بدبخت ہم سے انتقام لے رہا تھا۔ چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور پیٹ میں چوہوں کے پیچھے دوڑتی بلیاں تک نڈھال ہو گئی تھیں۔ مرزا ہر بار پوچھنے پر گاؤں کے کچھ دور ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اس نے کوئی درجن ویں بار یہی کہا تو میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔
''مرزا! گاؤں کہاں ہے؟''
''یہ رہا سامنے۔'' اس نے گردن چھڑانے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ نہ جانے کس وقت گاؤں آ گیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی گاؤں دیکھے تھے لیکن جتنی خوشی اس گاؤں کو دیکھ کر ہوئی تھی، اس سے پہلے کسی گاؤں کو دیکھ کر نہیں ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا سا اور سادہ سا گاؤں تھا جس کے چاروں طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔
''مراد خان کی حویلی کہاں ہے؟''
''گاؤں کے دوسری طرف!'' مرزا نے اشارہ کیا۔ ''کچھ دور اور چلنا ہو گا۔''
اگرچہ میری اور راجا کی ہمت کی ٹنکی بالکل خالی ہو گئی تھی اور ریزرو کے بھی چند قطرے رہ گئے تھے اور ہم اس روبوٹ کی طرح چل رہے تھے جس کا بیٹری سیل بس آخری دم پر ہو... لیکن مرزا کے کہنے پر ہمیں حرکت میں آنا پڑا۔ جیسے تیسے ہم مراد خان کی حویلی تک پہنچے۔ مرزا نے چوکیدار سے کہا۔
''سائیں کو اطلاع کرو کہ مرزا ابخت بیگ آیا ہے۔''
چوکیدار نے اندر اطلاع کی اور ہم اس دوران میں اس کی چارپائی پر گر کر ہانپتے رہے۔ پھر فی کس دو دو گلاس ٹھنڈے پانی کے پی کر ہمارے حواس بحال ہوئے۔ کچھ دیر بعد اندر سے ہماری طلبی ہوئی۔ حویلی کی فصیل باہر سے سادہ سی تھی لیکن اندر سے یہ خاصی پُرشکوہ عمارت ثابت ہوئی تھی۔ یہ سرخ اینٹوں سے بنی تھی۔ مراد خان برآمدے میں نہایت اشتیاق سے ہمارا منتظر تھا۔ اس نے پُرشوق نظروں سے ہمیں

دیکھا اور مرزا کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ غالباً وہ اپنے لختِ جگر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مرزا نے مجھ سے آگے کھڑے راجا کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ عین موقع پر آگے ہو گیا اور مراد خان سمجھا کہ مرزا میری طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ میری طرف لپکا اور وفورِ جذبات سے چمٹ گیا۔
''میرا پت... میرا بچہ۔'' اس نے مجھے چومنے کی کوشش کی اور میں نے بچنے کی۔
''سائیں! میں... نہیں ہوں۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔
مراد خان کا منہ اتر گیا اور اس نے خفگی سے کہا۔ ''تم نہیں ہے... بابا کیوں نہیں ہے؟''
''کیونکہ میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔'' میں نے راجا کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارا بیٹا یہ ہے۔''
مراد خان حقیقتاً کپے رنگ کا اور عام سے نقوش والا شخص تھا اور راجا اس سے میچ کر رہا تھا لیکن مراد خان نے نہایت قیمتی سوٹ اور جوتا پہن رکھا تھا۔ اس کی کلائی میں اصلی رولیکس تھی اور ایک انگلی میں شاید ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ راجا خستہ حال تھا لیکن مجھے اس کی قسمت پر رشک آیا۔ عارضی ہی سہی لیکن وہ بے حد دولت مند باپ کی اولاد بن گیا تھا۔ مراد خان اس سے چمٹ گیا اور نیم جان راجا کو نچوڑنے لگا۔ دبلے پتلے...... ہونے کے باوجود مراد خان میں کافی جان تھی۔ آخر وہ دیہات کی خالص خوراک پر پلا ہوا تھا۔ جب راجا فوت ہونے کے قریب ہو گیا تو اس نے اسے چھوڑا۔ پھر اس نے مرزا سے کہا۔
''تو نے بڑا کام کیا ہے بابا... بول کیا انعام مانگتا ہے؟''
اس سے پہلے کہ لالچی مرزا کچھ کہتا... میں نے دخل اندازی کی۔ ''سائیں! اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو ہم تمہارے مہمان ہیں۔ حضور بخش تھک گیا ہے، اسے اندر لے جاؤ۔''
مراد خان کو یہ تجویز پسند آئی اور وہ راجا کو اندر لے گیا۔ یہاں آنے سے پہلے ہم نے راجا کو پکا کر دیا تھا۔ اس کا نام حضور بخش تھا اور اس کی ماں اس وقت کینسر سے مر گئی تھی جب وہ سات سال کا تھا اور پھر زمانے کی ٹھوکروں میں پلتا

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

معرکہ 350/-

اندھیری رات کے مسافر 325/-

کی تلاش 150/-

380/-

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
شیرِ میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 350/-
انگریز کی اسلام دشمنی، ہندو کی عیاری و منافقت اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد 200/-

پردیسی درخت 325/-

یوسف بن تاشفین 325/-

معظم علی 325/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 350/-
سکھی، ترکی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 300/-
غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 350/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 300/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 180/-

انسان اور دیوتا 280/-

پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-

آخری چٹان 325/-

سو سال بعد 150/-

سفید جزیرہ 225/-

شاہین 325/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
042-37220879 051-35539609 061-4781781
041-2627568 021-2765086 022-2780128

رہا۔ اس پر راجا نے سرد آہ بھر کر کہا تھا۔ ''میرے ماں باپ کو نکال دو تو یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔''

میں اور مرزا برآمدے میں اکیلے رہ گئے۔ مرزا نے تشویش سے کہا۔ ''راجا احمق ہے... کہیں اس کے منہ سے کچھ غلط سلط نہ نکل جائے۔''

''فکر مت کرو، وہ صرف عارفہ کے معاملے میں احمق ہے۔'' میں نے کہا اور برآمدے میں رکھی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ ''فی الحال تو میری فکر کر... میں بھوک سے فوت ہونے والا ہوں۔''

''میرا حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔''

شکر ہے، مراد خان نے ہمیں یاد رکھا اور خادمہ کو بھیج دیا جو ہمیں مہمان خانے میں لے آئی۔ کمرے میں پہنچا کر اس نے شوخی سے اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے مزید خدمت کا پوچھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے مختلف نوعیت کی خدمات بہم پہنچانے کا بھرپور تجربہ تھا اگرچہ اس کی عمر ابھی بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سب سے پہلے کھانے کا کہا۔

''سائیں! تم لوگ نہا لو پھر کھانا لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی لمبی قمیص لہراتی ہوئی وہاں سے رخصت ہوگئی۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا اور جب تک مرزا کپڑے نکالتا، میں دوڑ کر اندر جا چکا تھا۔ اچھی طرح گرد میل اتار کر میں باہر آیا تو کھانا آگیا تھا بلکہ پورا دسترخوان تھا جس پر ہر قسم کا گوشت تھا۔ مرزا نہانے کے لیے بے تاب تھا اور وہ غسل خانے کی طرف گیا تو میں نے کھانا شروع کردیا۔ ملازمہ وہیں تھی۔ اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ''سائیں! تو کون ہے؟''

''میں حضور بخش کا دوست ہوں۔''

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''آپ چھوٹے سائیں کے دوست ہو؟''

اس موقع پر میں نے ایک بار پھر راجا سے حسد محسوس کیا۔ وہ اس طرح دار حسینہ کے لیے چھوٹا سائیں بن گیا تھا۔

''ہاں، وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔'' میں نے کھانوں سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اس لیے مجھے بھی زبردستی ساتھ لے آیا۔''

مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کی ملازمائیں نہ صرف معلومات کا ذریعہ ہوتی ہیں بلکہ ان کی مدد سے کوئی بات پھیلائی بھی جا سکتی ہے اس لیے میں دل کھول کر چھوڑ رہا تھا۔ پھر میں نے راجا کے بارے میں پوچھا۔ ''راجا کیا کر رہا ہے؟''

''کون راجا؟''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''میں حضور بخش کی بات کر رہا ہوں... پیار سے میں اسے راجا کہتا ہوں۔''

''وہ اندر زنان خانے میں اپنی ماؤں بہنوں سے مل رہا ہے۔''

مجھے راجا کی طرف سے فکر تھی لیکن یہ فکر زیادہ دیر برقرار نہیں رہی کیونکہ حلق تک مرغن بھرنے کا فطری نتیجہ بے ہوشی کی نیند کی صورت میں برآمد ہوا اور میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ مرزا بھی سو گیا تھا۔ پھر ہمیں اسی طرح دار خادمہ نے اٹھایا۔ ''تم لوگوں کو بڑا سائیں یاد کر رہا ہے۔''

منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر ہم بڑے سائیں یعنی مراد خان کے سامنے پیش ہوئے۔ حویلی کے بڑے سے لان میں کرسیاں لگی تھیں اور ان پر کوئی درجن بھر مقامی معززین تھے جن کے سامنے مراد خان راجا کی تقریب رونمائی کر رہا تھا۔ میں راجا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے مراد خان اسٹائل کا شان دار شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ نہا دھو کر اور بال ڈشیو بنوا کر وہ باقاعدہ چمک رہا تھا۔ اس نے سرسری سی نظر سے مجھے اور مرزا کو دیکھا اور پھر سیدھا بیٹھ گیا۔ راجا کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے سچ مچ خود کو مراد خان کا سپوت سمجھ لیا ہے۔ مرزا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''اس کے تیور بدلے ہوئے نظر آرہے ہیں۔''

''یہ کون سی نئی بات ہے؟'' میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ''موقع ملنے پر راجا طوطے کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔''

کیونکہ ہم راجا کے ساتھی تھے اس لیے ہمیں اس کے پاس جگہ دی گئی۔ مراد خان معززین گاؤں کو بتا رہا تھا کہ بالآخر وہ اپنی دولت اور زمین کا وارث تلاش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ میں نے راجا سے کہا۔ ''لگتا ہے تو نے سچ مچ ولدیت بدلنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟''

''جلیل! اپنا منہ بند رکھ۔'' راجا نے آہستہ سے کہا۔

''اب تو جلیل کو حکم بھی دے سکتا ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''دولت مند باپ پا کر تو اپنی اوقات بھول گیا ہے۔''

راجا نے مجھے خونی نظروں سے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔ مراد خان کے تعارف کے بعد معززین گاؤں راجا سے ہاتھ ملانے کے لیے ایک دوسرے پر چڑھے جا رہے تھے۔ مرزا حیرت سے منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ شاید راجا کی پذیرائی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ تعارف کی تقریب کے بعد مراد خان نے معززین کو رخصت کیا اور پھر راجا سے کہا۔ ''تو اندر جا۔''

راجا بھی اندر جانے کے لیے بے تاب لگ رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کی سترہ عدد ''بہنوں'' کے علاوہ کوئی ایک درجن کزنز بھی تھیں جو صرف اس سے ملنے آئی تھیں اور ان میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین تھی۔ راجا کا دل باہر کیسے لگتا؟ اس کے جانے کے بعد مراد خان نے مرزا سے کہا۔ ''مرزا بخت! تو نے مجھ پر سب سے بڑا احسان کیا ہے۔ مجھ سے میرے بچھڑے بیٹے کو ملوا دیا ہے۔ بول بابا! کیا چاہتا ہے؟''

مجھے حیرت تھی کہ مراد خان نے راجا کو اتنی آسانی سے تسلیم کرلیا تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ چیزیں تھیں جو مراد خان کی شہری بیوی سے تعلق رکھتی تھیں اور مراد خان ان کو پہچانتا تھا اس لیے اس نے راجا کو بیٹا مان لیا۔ پھر بھی مجھے اس کی سادہ لوحی پر حیرت تھی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے مرزا کو سمجھایا تھا کہ وہ صرف اپنی سونے کی پلیٹوں کے چکر میں نہ رہے بلکہ مراد خان سے مزید کھینچنے کی کوشش بھی کرے۔ وہ کروڑپتی آدمی تھا۔ آسانی سے دس بیس لاکھ اسے انعام میں دے سکتا تھا۔ مرزا نے مجھ سے کہا تھا۔

''مجھے سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بات کرنا جانتا ہوں۔''

''یہ بھی یاد رکھنا کہ مزید جو ملے گا، اس میں سے بھی پچاس فی صد میرا ہوگا اور تو فوراً ادا کرے گا۔''

''اس میں سے کیوں؟'' مرزا نے اچھل کر کہا۔ ''تیرا حصہ صرف سونے کی پلیٹوں میں ہے۔''

''نہیں، اوپر سے ملنے والی رقم میں سے بھی ہوگا ورنہ تو جانتا ہے کہ میں راجا کی اصلیت ایک منٹ میں کھول سکتا ہوں اس کے بعد مراد خان فراڈ کرنے کے جرم میں تجھے کتوں کے سامنے ڈال دے گا۔''

مرزا... مراد خان کے کتے ملاحظہ فرما چکا تھا اس لیے اس نے جلدی سے کہا۔ ''جلیل! تو بڑی جلدی ناراض ہو جاتا ہے۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی ہوگا۔''

''اسی میں تیری اور سب کی بہتری ہے۔''

مراد خان نے مرزا کے سامنے کھلی پیش کش رکھی تو اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''سائیں! آپ بادشاہ ہیں... میرے سونے کے علاوہ جو چاہیں انعام دے دیں۔''

''سونے کو بھول جا۔'' مراد خان نے بے نیازی سے کہا۔ ''اس کے بدلے مجھ سے قیمت لے لے۔''

''سائیں! وہ ایک سو دس تولے سونا ہے۔ آج کے حساب سے چالیس لاکھ کا ہے۔'' مرزا نے دبی زبان میں کہا۔

''بس چالیس لاکھ کا!'' مراد خان حقارت سے بولا۔ ''تو مجھ سے پچاس لاکھ لے لے۔''

مرزا کا مارے خوشی کے برا حال ہوگیا بس مراد خان کے قدموں میں لوٹنے کی کسر رہ گئی تھی۔ اس نے مراد خان کے ہاتھ چومے اور بولا۔ ''سائیں! آپ دیالو ہو۔''

''ابھی تو ہمارا مہمان ہے۔''

''نہ سائیں! مجھے جانا ہے... بہت ضروری کام ہے۔''

''کوئی ضروری کام نہیں ہے۔'' مراد خان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تجھے اور مولا بخش کو دو دن یہاں رکنا ہوگا۔ ابھی تو کل جشن ہوگا۔''

انصاف

استاد نے اپنے گھر کے دروازے پر یہ شعر لکھ کر لٹکایا ہوا تھا:

ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

میں نے ایک دن پوچھا۔ ''استاد! آپ کو یہ شعر اتنا پسند کیوں ہے؟''

بولے۔ ''کس کافر کو پسند ہے اگر پسند ہوتا تو میں اسے لٹکاتا کیوں، میں تو اس شعر کے خالق کو بھی اسی طرح اپنے دروازے پر لٹکانا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''استاد، میں آپ کی بات کچھ سمجھا نہیں۔''

فرمایا۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو۔ بادشاہوں کا بھلا عدالت سے کیا تعلق ہوسکتا ہے اور جب تعلق نہیں ہوتا تو کسی کے کہنے پر زنجیر ہلانے کی حماقت کا کیا جواز ہے؟ جس عدالت سے انصاف کی توقع نہ ہو، اس کا دروازہ کھٹکھٹانا اسے تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔''

اس پر میں نے استاد مرحوم کے ہاتھ چوم لیے اور کہا۔ ''آپ کی وساطت سے اس شعر کے سقم مجھ پر پہلی بار آشکار ہوئے ہیں مگر بادشاہوں کے دروازے پر لگی زنجیر ہلانے سے کچھ لوگوں کو تو انصاف ملتا ہی ہوگا ورنہ لوگ بار بار یہ زنجیر کیوں ہلاتے؟''

فرمایا۔ ''تم ابھی بچے ہو ایک سو غلط فیصلوں کے بعد ایک صحیح فیصلہ سنانے سے لوگوں کا عدالت پر اعتماد قائم ہوتا ہے جس کے نتیجے میں باقی فیصلے بادشاہ سلامت اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔''

(عطاء الحق قاسمی کی ''ہنسنا رونا منع ہے'' سے انتخاب... ولید بلال)

مولا بخش یہ خاکسار تھا۔ مراد خان کے اندر جانے کے بعد میں نے مرزا سے کہا۔ ''یہ اتنی آسانی سے رقم نہیں دے گا۔ تجھے اور مجھے دو دن یہاں رکنا ہوگا۔''

''فائدہ...؟ چالیس میں سے پندرہ تو تُو لے جائے گا۔''

''پچاس میں سے انیس۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''مرزا! تُو سچ مچ کمینہ ہے۔ تیرا سب ڈوب رہا تھا اور جیسے ہی تیرا کام بنا تُو آنکھیں پھیر رہا ہے۔ لیکن یاد رکھ، کام ابھی پوری طرح بنا نہیں ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''بھلے تو انیس کی جگہ بیس لے لے۔''

لیکن میں مرزا کے لہجے سے دھوکا کھانے والا نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر اسے موقع مل گیا تو وہ مجھے اور راجا کو چونا لگا کر نکل جائے گا۔ مجھے پوری طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا۔ ''مرزا! یہ راجا کسی اور چکر میں ہے۔''

''وہ لالچ میں آگیا ہے۔ حالانکہ یہ کھیل چلنے والا نہیں ہے۔ اس کی اصلیت کھل گئی تو مراد خان اسے زندہ دفن کردے گا یا کتوں کے آگے ڈال دے گا۔''

''راجا عقل مند ہے لیکن اکثر اوقات مفاد سامنے دیکھ کر اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔'' میں بھی فکر مند ہو گیا تھا۔

''جلیل! اسے سمجھا ورنہ یہ اپنے ساتھ تجھے بھی مروا دے گا میں تو ملک سے نکل جاؤں گا۔''

مرزا کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مراد خان سے بچنے کے لیے کم سے کم یہ شہر تو چھوڑ دے گا... لیکن میں اور راجا کہاں جاتے اس لیے ہمارا اس معاملے سے نکل جانا ضروری تھا۔ جب ہم غائب ہوتے تو مراد خان لازمی ہمیں تلاش کرواتا اور اسی بنا پر ہم نے نہ صرف نام بدل لیے تھے بلکہ کسی قسم کی کوئی شناختی دستاویز بھی نہیں لائے تھے۔ ہم یہ طے کر کے آئے تھے کہ جیسے ہی مرزا کو سونا واپس ملے گا، ہم یہاں سے نکل جائیں گے... لیکن راجا کے تیوروں نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ میں نے مہمان خانے میں واپس آنے کے بعد طرح دار ملازمہ سے کہا۔

''حضور بخش سے کہنا کہ مولا بخش اس سے ملنا چاہتا ہے۔''

''میں کہتی ہوں سائیں۔'' اس نے کہا اور رخصت ہو گئی۔ راجا ایسا زنان خانے میں گھسا تھا کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ظاہر ہے، وہاں چاروں طرف حسین چہرے تھے اور راجا کو ہم مرد کہاں یاد آتے؟ ملازمہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئی۔ البتہ رات کے کھانے پر اوطاق میں مراد خان کے ساتھ راجا موجود تھا۔ میں اس سے گرم جوشی سے لپٹ گیا۔

''یار! تم مجھے بھول ہی گئے ہو یہاں آکر۔'' میں نے کہا اور اس کے کان میں بولا۔ ''راجا! اپنی اوقات میں رہ۔''

''پہلی بار گھر والوں سے ملا ہوں تو باہر آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔'' راجا نے وضاحت کی اور مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں تُو کس لیے باہر نہیں آرہا ہے۔ کھانے کے بعد شرافت سے میرے ساتھ ملاقات کرلے۔''

مراد خان بڑی محبت سے راجا کو دیکھ رہا تھا۔ دسترخوان ..... پر ایک بار پھر تمام چرند پرند دست بستہ حاضر تھے اور ہم نے دل کھول کر ان سے انصاف کیا تھا۔ کھانے کے بعد ایک راگ رنگ کی محفل بھی ہوئی جس میں کلاسیکی شعرا کا کلاسیکی کلام پیش کیا گیا۔ پھر مراد خان اٹھ گیا تو راجا بھی اٹھنے لگا۔ میں نے اس کی کلائی دبوچ لی اور سرگوشی میں کہا۔

''بیٹھا رہ... ورنہ ابھی تجھے تیرے اصل نام سے پکارنا شروع کردوں گا۔''

بادلِ ناخواستہ راجا بیٹھ گیا۔ اس نے مراد خان سے کہا۔ ''بابا سائیں! میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔''

''جلدی آجانا پت۔'' مراد خان نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے راجا کو ڈانٹا۔

''ابے بابا سائیں کی اولاد... کیا تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے جو تو اس ڈرامے کو حقیقت سمجھ رہا ہے؟''

راجا نے ڈر کر چاروں طرف دیکھا کہ کوئی میری بات نہ سن لے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''باہر چل... یہاں بات کرنا خطرناک ہوگا۔''

ہم باہر آئے تو مرزا ابھی ہمارے پیچھے تھا۔ میں نے مرزا سے کہا۔ ''تو جا کر آرام کر... میں راجا کو سمجھا کر آتا ہوں۔''

''میں بھی سمجھاؤں گا۔'' اس نے ڈھٹائی سے انکار کر دیا۔

ہم باہر لان میں آئے جہاں جھینگر اپنا میوزک نائٹ پروگرام چلا رہے تھے اور کہیں دور گیدڑ اس میں بیک گراؤنڈ ساؤنڈ ایفیکٹس دے رہے تھے۔ راجا برہم تھا۔ ''تم دونوں کا دماغ خراب ہے کیا... مجھے مراد خان کا بیٹا بنا کر لائے ہو تو میں اس کا بیٹا نہ بنوں... تم لوگوں کے پاس گھسا رہوں؟''

میں حیران ہوا۔ ''تو یہ سب اداکاری ہے؟''

''اور کیا... اب میں وڈیرے مراد خان کا اکلوتا بیٹا ہوں اور مجھے اپنا اسٹائل ویسا ہی رکھنا چاہیے۔''

''لیکن تیرے انداز سے تو لگ رہا ہے تُو نے خود کو سچ

سچ مراد خان کا بیٹا سمجھ لیا ہے۔'' مرزا نے شک سے کہا۔

''بیٹے! اسی کو تو اداکاری کہتے ہیں۔'' راجا نے مرزا کو گھورا۔ ''اور فرض کر میں مراد خان کا بیٹا بننے کے بارے میں سوچ بھی رہا ہوں تو اس سے تجھے کیا مسئلہ ہے؟ تو نے تو اپنا سونا لے کر نو دو گیارہ ہو جانا ہے۔''

''میرا تو مسئلہ نہیں ہے لیکن تم دونوں مارے جاؤ گے۔ اگر مراد خان کو پتا چل گیا تو...'' مرزا کا لہجہ شرارت آمیز ہو گیا۔

''لیکن ابھی سونا ملا تو نہیں ہے۔'' راجا نے اسے جوابی دھمکی دی۔

مرزا فوراً راہِ راست پر آگیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ...''

''مرزا! تم اپنا مطلب اپنے پاس رکھو اور اب جا کر سو جاؤ۔'' میں نے کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر مہمان خانے کی طرف گھما دیا۔ مرزا مجبوراً روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی راجا نے کہا۔

''جلیل! یہ ہمیں مروا دے گا۔''

''تُو فکر نہ کر، میں ہوں نا... لیکن جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا ورنہ یہ تو نہیں تُو خود کو اور مجھے مروا دے گا۔ مرزا بہت کمینہ ہے، کسی نہ کسی طرح بچ جائے گا۔''

راجا سوچ رہا تھا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''یار جلیل! اگر ایسا ہو جائے کہ میں مراد خان کا بیٹا بن کر رہوں؟''

''راجا! اگر یہ کام آسان ہوتا تو میں خود تجھے مشورہ دیتا اور تیری زندگی بن جاتی لیکن تُو خود سوچ یہ تو سر پر تلوار لٹکانے والی بات ہوگی۔ ہم مرزا کو ہمیشہ اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے اور ایک بار وہ اپنا سونا لے کر نکل گیا تو شرارت کرنے کے لیے آزاد ہوگا۔ ہمیں اس کے ساتھ ہی نکلنا ہے۔''

راجا مایوس نظر آنے لگا۔ ''یعنی اپنے نصیب میں وہی دو لاکھ ہوں گے۔''

''وہ بھی اگر مرزا کو اس کا سونا مل گیا تو۔''

''اگر مجھے کچھ عرصہ مل جائے تو میں مراد خان سے لمبا مال کھینچ سکتا ہوں۔''

''تو لمبا مال تو کھینچ سکتا ہے لیکن جب غائب ہوگا تو مراد خان شدومد سے تیری تلاش کرے گا۔''

میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ راجا یہاں رکنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''یار! ہمیں خطرہ مرزا سے ہے نا؟''

''ہاں... اور کس سے ہوگا؟ کسی کو اس بارے میں پتا ہی نہیں ہے۔''

خوراک دشمن

ایک شخص نے بابو ہوٹل میں آرڈر دیا۔ ''چھ پلیٹ مرغی، چار پلیٹ دال، آٹھ پلیٹ سبزی، پانچ پلیٹ قورمہ، ایک ڈش پلاؤ اور پچاس روٹیاں۔'' تھوڑی دیر بعد یہ آرڈر میز پر سجا دیا گیا اور وہ شخص چشم زدن میں یہ سب کچھ چٹ کر گیا۔ کسی سرکس کا مالک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس نے اس نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''سرکس میں کام کرو گے؟'' نوجوان نے پوچھا۔ ''کام کیا ہے؟'' مالک نے کہا۔ ''یہی جو تم ابھی کر رہے تھے!'' نوجوان نے ہامی بھرلی۔ چنانچہ اس نے جب پہلے شو میں اس ''خوراک دشمنی'' کا مظاہرہ کیا تو حاضرین نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سرکس کا مالک خوشی سے ہانپتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''نوجوان!'' اگر تم دوسرے شو میں بھی اپنے اس فن کا مظاہرہ کرو تو میرے اور تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے کیونکہ سارے شہر میں تمہاری دھوم مچی ہوئی ہے اور لوگ ٹکٹ خریدنے کے لیے اُمڈے آرہے ہیں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم خوراک کا انتظام کرو۔'' چنانچہ دوسرے شو میں بھی اس نے چھ پلیٹ مرغی، چار پلیٹ دال، آٹھ پلیٹ سبزی، پانچ پلیٹ قورمہ، ایک ڈش پلاؤ اور پچاس روٹیاں چشم زدن میں صاف کر ڈالیں جس پر پنڈال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ سرکس کا مالک شو کے اختتام پر اس کے پاس آیا اور کہا۔ ''نوجوان! اگر میری مانو تو تم تیسرا شو بھی کر ڈالو کہ کاروباری لوگ دکانیں بند کر کے اب فارغ ہوئے ہیں، انہوں نے تمہارے فن کے مظاہرے کی دھوم سنی ہے اور وہ سب سرکس کا رخ کر رہے ہیں، میں تمہاری فیس چار گنا کر دوں گا۔ تم تیسرا شو ضرور کرو!'' یہ سن کر نوجوان نے کاندھے سکیڑے اور کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں جناب! اب میں مزید کوئی شو نہیں کروں گا، آخر گھر جا کر کھانا دانا بھی تو کھانا ہے۔''

(عطاء الحق قاسمی کی ''ہنسنا رونا منع ہے'' سے ایک شگوفہ ...انتخاب... ولید بلال)

''اگر مرزا نہ رہے تو مراد خان کو بتانے والا بھی کوئی نہیں رہے گا۔'' راجا نے کہا تو میں اچھل پڑا۔

''تیرا مطلب ہے مرزا کا انتقال بے ملال؟''

''ہاں، مرزا ایک فانی انسان ہی تو ہے اور اس نے دنیا سے کبھی نہ کبھی تو جانا ہے۔ اگر ابھی چلا جائے تو...''

''وہ بالکل نہیں جائے گا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اپنی مرضی سے تو ہرگز نہیں جائے گا۔''

''اپنی مرضی سے کون جانا پسند کرتا ہے؟'' راجا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بھیجنا پڑتا ہے۔''

راجا کی بات سن کر میں دنگ رہ گیا۔ ''تیرا مطلب ہے کہ ہم اسے دنیا سے رخصت کر دیں؟''

''بالکل... اگر اپنی جان بچانی ہے تو یہ کام کرنا ہوگا۔''

راجا نے سر ہلایا۔

''تو جانتا ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ ایک انسان کو قتل کرنے کی بات کر رہا ہے۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''اول تو مرزا انسان نہیں ہے، دوسرے اگر ہم نے اس کا پتا صاف نہ کیا تو وہ ہمارا پتا صاف کر دے گا۔ مراد خان کو پتا چل گیا کہ میں فراز ہوں اور تو بھی اس میں شامل ہے تو کیا وہ ہمارے مرڈر سے کم پر راضی ہوگا؟''

راجا درست کہہ رہا تھا۔ مرزا کی بچھو فطرت کے بارے میں تو میں نے سوچا نہیں تھا۔ وہ موقع ملنے پر لازمی ڈنک مارتا اور ہم اسے روک نہیں سکتے تھے۔ اسے روکنے کا واحد طریقہ یہی تھا لیکن قتل... میں نے بوکھلا کر اپنے بھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور راجا سے کہا۔ ''یار! ہم چکر بازی کر سکتے ہیں کسی کا مرڈر نہیں کر سکتے... اور سوچ سمجھ کر تو بالکل نہیں کر سکتے۔''

''چل تو نہیں کر سکتا لیکن میں تو کر سکتا ہوں۔'' راجا نے سرد لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا، اپنا لنگوٹیا راجا تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے لان میں چکر لگاتے ہوئے پوچھا۔

''تو کیسے کر سکتا ہے؟''

راجا مسکرایا۔ ''تو بھول رہا ہے۔ اب میں وڈیرے مراد خان کا اکلوتا وارث ہوں اور میرے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس کام کے لیے یہاں بہت بندے ہیں۔ کسی کو اشارہ کر دوں تو راتوں رات مرزا غائب ہو جائے گا اور اس کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔''

میں ایک بار پھر دم بہ خود رہ گیا۔ راجا کسی جدی پشتی وڈیرے کے انداز میں بات کر رہا تھا۔ ''تت... تو سچ مچ مرزا کو مروا دے گا؟''

''ہاں، میں نے سوچ لیا ہے۔'' راجا نے سر ہلایا۔ ''اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ صرف مجھے ہی نہیں تجھے بھی مروا دے گا۔''

میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''یار! کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟ مرزا کو کہیں قید بھی تو کیا جا سکتا ہے؟''

''اصل مسئلہ اس کی زبان بند کرنے کا ہے۔ نہیں، اس کے لیے قبر کا قید خانہ ہی ٹھیک ہے۔'' راجا فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''پر یہ کام کرے گا کون؟''

''بابا کا کمدار خیسو خان۔ وہ اس قسم کے کاموں میں ماہر ہے۔ مجھ سے آج ہی کہہ رہا تھا کہ مجھے کسی سے تکلیف ہوئی ہے تو بتاؤ۔ وہ اسے اٹھا کر لے آئے گا اور یہیں زمین میں گاڑ دے گا۔''

''تیرے ذہن میں یقیناً اپنے باپ کا نام آیا ہوگا؟''

''نہیں یار!'' راجا نے سرد آہ بھری۔ ''کچھ بھی سہی میرا باپ تو وہی ہے۔''

''راجا! مرزا کا چکر چھوڑ دے اور ہم سونا ملتے ہی یہاں سے نکل جاتے ہیں۔'' میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ذہن بنا چکا ہے۔ دوسری طرف مرزا کے بارے میں مجھے سو فی صد یقین تھا کہ وہ یہاں سے جاتے ہی مراد خان کو راجا اور میری اصلیت سے آگاہ کر دے گا۔ دوسری طرف راجا اس ملنے والے موقع سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلہ کشمیر کا کیا حل نکالا جائے۔ راجا نے جاتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے یہ مسئلہ آج رات ہی حل ہو جائے۔''

اس کا اشارہ یقیناً مرزا کی طرف تھا۔ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔ میں نے متعدد بار راجا، جمی، مرزا اور دوسرے بہت سارے افراد کو قتل کرنے کا سوچا تھا لیکن یہ صرف سوچ ہوتی تھی... اور میں حقیقت میں کسی کا مرڈر بالکل نہیں کر سکتا تھا۔ شاید راجا کر سکتا تھا یا شاید اسے جو مقام مل گیا تھا اسے برقرار رکھنے کے لیے وہ مرزا کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ میں مہمان خانے کی طرف آیا تو مرزا بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے شر پسند ذہن میں کون سے شر پسندانہ خیالات آ رہے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مشکوک لہجے میں بولا۔

''تم دونوں مجھے بھگا کر کیا سازش کر رہے تھے؟''

''ہم نے کیا سازش کرنی ہے، بس ایسے ہی سوچ رہے تھے کہ جب تجھے تیرا سونا مل جائے گا اور تو یہاں سے دفع ہو جائے گا تو اس وقت تیرے ذہن میں کیا خیالات آ سکتے ہیں۔''

مرزا کا رنگ اڑ گیا لیکن اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''میرے ذہن میں کیا خیالات آ سکتے ہیں؟''

''مرزا! بات یہ ہے کہ تو شرارتی آدمی ہے۔ جب تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا تو تجھے شرارت کرنے سے کون روکے گا؟''

''کیسی شرارت؟'' مرزا انجان بن گیا۔

''تو مراد خان کو حقیقت بتا سکتا ہے۔'' میں نے صاف کہا۔ ''تو بچ جائے گا لیکن ہم مارے جائیں گے۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے بھی یہیں رہنا ہے۔'' مرزا بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے بے وقوف مت بنا۔ جب ہم غائب ہوں گے تو وڈیرا سب سے پہلے کسے تلاش کرے گا؟ تجھے... اور جب تو اس کے ہاتھ آئے گا تو وہ تیری دُم میں نمدہ فٹ کر کے تجھ سے سب اگلوا لے گا اور اس کے بعد ہم بھی مارے جائیں گے۔''

مرزا چپ ہو گیا۔ یہ خاصی مجرمانہ قسم کی خاموشی تھی۔ یقیناً اس کا ارادہ وہی تھا جس کا راجا نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ راجا اس کتے کی دُم کے ساتھ بالکل ٹھیک کرنے جا رہا ہے لیکن میں نے جلدی سے اس خیال کو جھٹک دیا۔ یہ طے تھا کہ میں کسی کی جان نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی جان لینے میں حصے دار بن سکتا تھا۔ اب مجھے اس چکر سے خود بھی نکلنا تھا اور ان دونوں کو بھی نکالنا تھا۔ راجا میرا یار تھا اور مرزا کو اس لیے بچانا تھا کہ وہ کمینہ سہی لیکن انسان تو ہے۔ میں بستر پر دراز ہو کر غور و فکر کر رہا تھا کہ وہی خوب صورت خادمہ اندر آئی اور اس نے شوخی سے مرزا کو کہا۔

''چل سائیں! تیرے کو بڑا سائیں بلاتا ہے۔''

''صرف اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''تیرے کو بلاتا تو تجھے بھی کہتی۔'' وہ بولی اور مرزا کی طرف دیکھا۔ ''چل نا... بڑے سائیں کو انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے محسوس کیا کہ مرزا فکرمند ہو گیا ہے۔ شاید یہ بلاوا اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ خادمہ کے ساتھ چلا گیا۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی میں بھی اٹھا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مراد خان نے مرزا کو حویلی میں بلا لیا تھا تو میرا وہاں گھسنا مشکل ہی نہیں، خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا... لیکن خوش قسمتی سے مراد خان نے اسے مہمان خانے سے متصل اوطاق میں بلوایا تھا۔ میں ان دونوں کا پیچھا کرتا ہوا اوطاق تک پہنچا لیکن اندر میں سب کی نظروں سے چھپ کر مرزا اور مراد خان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا اس لیے میں نے باہر کا رخ کیا اور پائیں باغ میں اس کمرے کی کھلنے والی کھڑکی کے نیچے آ گیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو مرزا مراد خان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''سائیں! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ اب میرے کو میرا سونا اور جانے کی اجازت دو۔''

مراد خان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے دیکھا، وہ انگور کی بیٹی سے شغل کر رہا تھا۔ ''بابا مرزا! کیا میں تجھے بے وقوف نظر آتا ہوں؟''

لطیفہ

کچھ لوگ لطیفہ سنانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں پرانی شراب اور پرانے چاول کی طرح پرانا لطیفہ بھی بہت لذیذ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اکثر ایسا لطیفہ سناتے ہیں جس لطیفے کی بھویں بھی سفید ہو چکی ہوتی ہیں... مہذب سے مہذب شخص کو بھی ایسا لطیفہ پورا سننے کے بعد آخر میں اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دینے کے لیے دل پر پتھر رکھ کر ہنسنے کی اداکاری بھی کرنا پڑتی ہے!

میرے ایک دوست لطیفہ کیا سناتے ہیں پوری الف لیلا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کا کوئی لطیفہ پندرہ بیس منٹ سے کم دورانیے کا نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ تو ان کا لطیفہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔ محفل میں سنگ میل والے نیاز احمد بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے اس دوست کو درمیان میں ٹوکا اور کہا۔ ''آپ یہ لطیفہ مجھے لکھ کر دے دیں میں اسے کتابی صورت میں شائع کر دوں گا۔''

ایک صاحب اپنی بات پر خود ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ کئی دفعہ تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس کیفیت پر حاضرین بلکہ ناظرین کو بھی اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی ہے... اور یوں وہ اپنی کوشش میں اکثر کامیاب رہتے ہیں۔

(''ہنسنا رونا منع ہے'' عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

''نہیں سائیں! نظر تو نہیں آتے۔'' مرزا نے روانی میں کہا اور پھر بدحواس ہو کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے... بالکل نہیں سائیں۔''

''پھر بابا تو خود سوچ، گھر آئی دولت کون واپس کرتا ہے؟''
اس بار مرزا زیادہ بدحواس ہو گیا۔ ''سائیں! کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تو نے مجھ سے فراڈ کیا، میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب تو سونا بھول جا۔'' مراد خان نے مزے سے کہا۔

''سائیں! وہ چالیس لاکھ کا سونا ہے۔'' مرزا رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''میں کیسے بھول جاؤں؟''

''تب میرے پاس ایک اور طریقہ ہے بابا۔'' اس نے اطمینان سے کہا اور کسی کو پکارا...... ''بابا خیمسو! ادھر آنا۔''

فوراً ہی ایک لمبا تڑنگا اور صورت سے ہی خطرناک نظر آنے والا شخص اندر آیا۔ اس نے شانے سے کلاشنکوف لٹکا رکھی تھی۔ اس نے غصیلی .... نظروں سے مرزا کو دیکھا اور بولا۔ ''حکم سائیں!''

''بابا خیمسو! یہ بندہ ہماری بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اب اس کا کیا علاج کیا جائے گا؟''

''اس کا علاج ایک گولی ہے سائیں۔'' خیمسو نے کلاشنکوف اتاری۔ ''پھر آپ کے دشمنوں کے قبرستان میں ایک قبر کھود کر اسے بھی ڈال دیں گے۔''

مرزا نے لرزنا شروع کر دیا اور اچانک مراد خان کے قدموں میں گر گیا۔ ''رحم سائیں رحم...''

مراد خان نے اسے ٹھوکر ماری۔ ''بابا! رحم کہاں سے کروں... تو میری بات تو مان نہیں رہا ہے؟''

مرزا نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کر دیا۔ ''سائیں! چالیس لاکھ کا سونا ہے۔ میری ساری عمر کی کمائی ہے۔ میں لٹ جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا سائیں! کچھ تو رحم کرو۔''

''اچھا۔'' مراد خان نے مزے لیتے ہوئے کہا۔ ''بابا خیمسو! زکوٰۃ کا حساب پتا ہے؟''

''ہاں سائیں... چالیس پر ایک روپیا۔''

''چل... تو سونے کی زکوٰۃ لے لے۔'' مراد خان نے جیب سے ایک ہزار کے نوٹ کی گڈی نکال کر مرزا کے سامنے پھینک دی۔ اس نے گڈی اٹھائی اور رحم طلب نظروں سے مراد خان کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر بولا۔ ''بابا خیمسو! اسے حفاظت کے ساتھ بڑی سڑک تک چھوڑ آؤ۔ اسے کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔''

خیمسو نے مرزا کو لب کشائی کا موقع دیے بغیر بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ مراد خان ہنسا اور گلاس میں مزید بنتِ انگور ڈالتے ہوئے کہا۔ ''چریا کہیں کا... مراد خان سے سونا مانگ رہا تھا۔''

مراد خان وڈیرا ہوتے ہوئے بھی ڈاکو نکلا تھا۔ میں تیزی سے واپس آیا تو مرزا کو خیمسو ایک جیپ میں ڈال کر لے جا رہا تھا۔ اسے روکنے کا وقت تھا اور نہ ہی موقع تھا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور ناچنے کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ مجھے شبہ تھا کہ راجا نے مرزا کو راستے سے ہٹانے کے لیے خیمسو سے کہا ہوگا اور اس نے مراد خان سے کہہ دیا ہوگا۔ نتیجے میں مراد خان جو پہلے ہی مرزا سے خار کھائے ہوئے تھا، اس نے مرزا کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ اسے خیمسو کے ہاتھوں اس دنیا سے تو نہیں لیکن اپنی حویلی سے ضرور رخصت کر دیا اور.... شبہ تھا کہ مرزا جیسے ہی شہر اور کسی محفوظ جگہ پہنچے گا، وہ پہلی فرصت میں کال کر کے مراد خان کو خوش خبری سنا دے گا کہ وہ جسے اپنا لختِ جگر اور ولی عہد بہادر وغیرہ سمجھ رہا ہے، وہ اصل میں ایک دھوبی زادہ ہے۔ اس کے بعد میری اور راجا کی یہاں سے بہ عافیت تو کیا... سرے سے واپسی ہی مشکوک ہو جاتی۔ اور عین ممکن ہے، راجا نے اپنے نام نہاد بابا سائیں سے مرزا کے لیے جو خواہش ظاہر کی تھی، وہ ہمارے لیے مان لی جاتی۔ ہمیں وہ وقت آنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا تھا۔ مرزا کا سونا اسے نہیں ملا تھا اور ہماری تو جان کے لالے بھی پڑ گئے تھے۔ مجھے بہر صورت راجا سے رابطہ کرنا تھا لیکن وہ اپنی تین عدد ماؤں اور ان کی سترہ عدد بیٹیوں اور مزید درجن بھر کزنز میں راجا اندر بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان سے اس کا ماؤں اور بہنوں والا کوئی رشتہ نہیں ہے اس لیے وہ مزے کر رہا تھا۔ اوپر سے کزنز تو ویسے ہی معاف ہوتی ہیں۔ میں نے مہمان خانے میں کسی ملازم کو تلاش کیا لیکن اتفاق سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں باہر نکلا اور حویلی کی عمارت تک آیا۔ اس کے اگلے حصے میں زنان خانہ تھا لیکن وہاں تک صرف خاندان کے مردوں کی رسائی تھی اور میرا وہاں داخلہ ممکن نہیں تھا۔ میں عمارت کے آس پاس منڈلا رہا تھا کہ ایک بوڑھی ملازمہ نکل آئی۔

''تو کون ہے؟'' اس نے مجھے دیکھا۔

''میں چھوٹے سائیں کا دوست ہوں۔ اسے میرا پیغام دے دو۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا دے دوں؟'' وہ سمجھی نہیں۔

''مائی! اسے بولو اس کا دوست اس سے ملنا چاہتا

ہے۔'' میں نے کہا تو بوڑھی ملازمہ اندر چلی گئی۔ میں بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو میں بے اختیار لپکا لیکن اسی ملازمہ کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''سائیں اندر ہے، وہ کہتا ہے کہ صبح ملے گا۔''

''اندر کہاں؟''

''اندر اپنے کمرے میں... اس کے ساتھ نوری ہے۔''

نوری اسی خوب صورت ملازمہ کا نام تھا اور راجا اس کے ساتھ تھا تو مطلب واضح تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے سنائیں اور ملازمہ سے کہا۔ ''اسے بولو زندگی موت کا مسئلہ ہے... آکر میری بات سنے۔''

بوڑھی عورت نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''نہ سائیں! اس وقت چھوٹے سائیں کو چھیڑا تو وہ غصہ کرے گا۔''

میں نے اس بار دل میں چھوٹے سائیں کی ایسی کم تیسی کی جسے عورتوں سے فرصت نہیں تھی۔ وہاں عارفہ کے پاس سے نہیں نکلتا تھا اور یہاں آکر پھر زنان خانے میں جا بیٹھا تھا۔ بوڑھی ملازمہ مجھے انکار کر کے واپس چلی گئی اور میں مہمان خانے واپس آ گیا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ راجا پر لعنت بھیج کر یہاں سے چلا جاؤں۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ راجا پکڑا جاتا تو میرے بارے میں بتانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتا اور میں مراد خان کی وڈیرا فورس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر واپس لایا جاتا اور راجا کے ساتھ کسی عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتا۔ راجا کو لے کر جانا بہت ضروری تھا اور وہ میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ میں خود زنان خانے میں نہیں جا سکتا تھا اور راجا سے رابطہ بھی لازمی تھا۔

اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں نے ایک چھوٹے سے کاغذ پر ایک سطر میں لکھا۔ ''حضور بخش! مرزا واپس چلا گیا ہے... اور وہ جا کر کیا کرے گا، تم اچھی طرح جانتے ہو... مجھ سے ملو۔''

اس کے بعد میں نے اس کاغذ کو باغ سے کچھ مٹی ڈال کر ایک پڑیا کی شکل میں لپیٹا جیسے اس میں کوئی دوا ہو اور پھر عمارت کے آس پاس منڈلانے لگا۔ اس بار دوسری ملازمہ آئی۔ میں نے اس سے چھوٹے سائیں کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''سائیں! وہ تو کمرے میں ہے، دروازہ بند کر لیا ہے۔''

''اس کی دوا میرے پاس ہے، اسے ضروری دینی ہے۔'' میں نے پڑیا اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ اسے دے آؤ۔''

''نہ سائیں! وہ ناراض ہوگا۔'' ملازمہ نے کہا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسے وقت مداخلت کی جائے تو یہ سائیں لوگ کتنے ناراض ہوتے ہیں۔ میں نے اسے

صبر و شکر

- ایمان کے دو حصے ہیں۔ آدھا صبر آدھا شکر۔
- صبر ایمان سے ایسے ملا ہوا ہے جیسے سر سے جسم ملا ہوا ہے۔
- ہر شے کے ثواب کا ایک اندازہ ہے مگر صبر کے ثواب کا اندازہ نہیں۔
- صبر کی نسبت بے صبری زیادہ تکلیف دہ ہے۔
- صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔
- مصائب کا مقابلہ صبر سے اور نعمتوں کی حفاظت شکر سے کرو۔

فیاض محمود اختر، میرپور آزاد کشمیر

یقین دلایا۔

''نہیں ہوگا... یہ دوا نہ کھائی تو اس کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''اچھا۔'' ملازمہ نے ہچکچاتے ہوئے پڑیا لے لی۔ ''میں بولتی ہوں جا کر۔''

وہ اندر چلی گئی اور میں بے چینی سے ٹہلنے لگا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ راجا الو کا پٹھا میرا رقعہ دیکھ لے اور سمجھ بھی جائے۔ یہ شاید قبولیت کا وقت تھا کیونکہ کچھ دیر بعد اندر سے حیران پریشان راجا نکلا اور مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ ''جلیل! یہ کیا بکواس ہے؟''

''یہ جا کر اپنے نام نہاد باپ سے پوچھ... تو نے کیا مرزا کے بارے میں کچھ کہا تھا؟''

راجا کے چہرے پر بارہ بج گئے۔ ''میں نے تو اس کا پتا صاف کرنے کو کہا تھا۔''

''بیٹے! ہمارا پتا صاف ہونے والا ہے۔'' میں نے جل بھن کر کہا۔ ''تیرے کمینے پن کی وجہ سے۔''

راجا صورتِ حال کی سنگینی سمجھ رہا تھا۔ ''مراد خان نے اس کا سونا بھی نہیں دیا؟''

''نہیں اور اب کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں تو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھی نہیں ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''بھوتوں کو ننگا ہی بھاگنا پڑے گا۔''

''اس وقت؟'' راجا نے احمقانہ انداز میں سوال کیا۔

''نہیں، صبح آرام سے ناشتا کر کے نکلیں گے۔'' میں پھر بھنا گیا۔ ''لگتا ہے تیرے سر پر ابھی تک خادمہ کا خمار طاری ہے۔ مرزا یہاں سے جاتے ہی پہلا کام یہی کرے گا۔

ابھی وقت ہے نکلنے کا۔''

راجا کی عقل میں بات آگئی۔ ''میں کچھ چیزیں لے لوں۔'' اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''بعد میں کام آئیں گی۔''

''ضرور لے لو لیکن کوئی ایسی چیز مت اٹھالینا جس کی خاطر وڈیرا کراچی تک پہنچ جائے۔''

''لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟'' راجا فکر مند ہو گیا۔ ''چل چل کر حشر ہو جائے گا۔''

''اس سے بھی زیادہ حشر پکڑے جانے کی صورت میں ہوگا۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''کسی گاڑی کا ہونا لازمی ہے۔''

''میں آتا ہوں۔'' راجا اندر جاتے ہوئے بولا۔ اس کی ایک دن کی بادشاہت ختم ہونے کا وقت آگیا تھا۔ میں لان میں ٹہلنے لگا۔ اتنے میں وہی جیپ واپس آئی جس میں خمیسو خان مرزا کو ہائی وے تک چھوڑنے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ جیپ خمیسو خان خود چلا رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

''مرزا بدبخت کہاں ہے؟''

''اسے تو میں بڑی سڑک پر چھوڑ آیا ہوں۔''

''اسے روکنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے پاس چھوٹے سائیں کی ایک اہم چیز ہے۔''

خمیسو خان جلدی سے دوبارہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ ''اب چلو، وہ سڑک پر ہی ہوگا۔''

''ایک منٹ رک جاؤ... چھوٹا سائیں بھی آرہا ہے۔'' میں نے جیپ کے پچھلے حصے میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔ میں بے تابی سے عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کب وہاں سے راجا برآمد ہوتا ہے۔ پانچ منٹ گزر گئے اور پھر دس منٹ گزر گئے لیکن راجا برآمد نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ اندر جا کر پھر تو خادمہ میں نہیں کھو گیا ہے۔ عارفہ نے راجا کو عورت کے معاملے میں بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور اسے خود پر قابو نہیں رہتا تھا۔ لیکن جس وقت میں اسے دیکھنے کے لیے جیپ سے اترنے والا تھا، راجا اندر سے برآمد ہو گیا اور جیپ دیکھ کر سیدھا اس طرف آیا۔ میں نے اسے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔

''چھوٹے سائیں! تم فکر مت کرو... ہم مرزا کو پکڑ لیں گے۔ وہ بھاگ نہیں سکتا۔''

راجا سمجھ گیا۔ وہ خمیسو کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ٹھیک ہے... جلدی چلو۔''

خمیسو نے جیپ گھمائی اور گیٹ سے باہر لے آیا۔ اسے دیکھ کر چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کچے راستے پر تیزی سے جیپ دوڑائی۔ ہمارا جھٹکوں سے برا حال ہو گیا لیکن اس تیز رفتاری کا یہ فائدہ ہوا کہ آتے وقت جو فاصلہ ہم نے رو رو کر دو گھنٹے میں طے کیا تھا، وہ جیپ میں صرف پندرہ منٹ میں طے ہو گیا۔ جب ہم نیشنل ہائی وے پہنچے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کم سے کم مرزا نظر نہیں آرہا تھا۔ خمیسو نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے اسے یہاں چھوڑا تھا۔''

''شاید وہ آگے نکل گیا ہے۔'' راجا بولا۔ ''آگے چل کر دیکھ۔''

خمیسو نے جیپ آگے بڑھا دی اور تیز رفتاری سے کوئی پندرہ میل تک چلا گیا مگر مرزا نظر نہیں آیا۔ ظاہر ہے وہ کسی سواری میں کراچی کی طرف جا چکا تھا۔ خمیسو نے جیپ روک کر راجا سے کہا۔ ''لگتا ہے سائیں وہ جا چکا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، اب تم بھی جاؤ۔'' میں نے عقب سے کہا اور خمیسو خان کے سر پر جیک کی راڈ رسید کی۔ وار کی شدت کم کرنے کے لیے میں نے اس پر پیچھے پڑا گندا سا کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے خمیسو خان کو میری کارروائی کا علم ہی نہیں ہوا اور سر پر راڈ پڑی تو وہ بے ہنگم سی کراہ نکال کر سیٹ پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ راجا نے فکر مندی سے کہا۔

''جلیل! یہ کیا کیا؟''

''وہ نہیں کیا جو تو مرزا کے ساتھ کرنا چاہ رہا تھا اور پوری کے چکر میں آدمی سے بھی گیا۔'' میں نے کہا اور نیچے اتر کر وزنی خمیسو خان کو جیپ سے دھکیل دیا۔ پھر اسے کھینچ کر جھاڑیوں میں ڈال دیا۔ راجا ابھی تک صدمے میں تھا۔

''اپنی تو قسمت ہی خراب ہے۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

''اور رہی سہی کسر تو اپنی حرکتوں سے پوری کر دیتا ہے۔'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کرتے ہی طوفانی رفتار سے کراچی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو گھنٹے بعد میں نے قائد آباد سے کچھ پہلے ایک جگہ جیپ چھوڑ دی اور اس کے بعد میں اور راجا پیدل مارچ کرتے ہوئے لانڈھی اسٹیشن تک آئے جہاں سے ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ ڈرائیور نے صدر تک کا تاوان لے کر ہمیں گھر پہنچا دیا۔ راجا کو میں نے اس کے گھر کے سامنے دھکا دیا۔

مرزا منحوس کا تو نہیں پتا کہ کہاں گیا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دن کے لیے شہر سے دور چلا جاؤں... جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا... کیا خیال ہے آپ کا؟

کچھ لوگ کام کرتے ہیں ...... مگر اپنے کام کو نہایت دیانت داری سے فرض سمجھ کر انجام دیتے ہیں ...... مجرمانہ سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والے شخص کی ماہرانہ کارگزاری۔

ایک اصول پسند قاتل کا احوال...... قارئین کے لیے مختصر توشۂ خاص

بابر نعیم

بااصول

''کیا یہ وہی ہے؟'' برینڈن نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تاریکی کے باوجود اینڈرسن کے ہیٹ یا اس کے پائپ کی ناگوار بو کو پہچاننے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنی کمر کے بیلٹ میں لگی ہوئی نائن ایم ایم کی پستول نکالی اور اس میں سائلنسر فٹ کر دیا۔

ہم دونوں ایک محفوظ اور خفیہ مقام پر چھپے ہوئے تھے۔ میں وہاں سے نکل رہا تھا کہ برینڈن نے میرا بازو تھام لیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ''کوئی آرہا ہے؟''

میں نے دیکھا واقعی ہماری طرف آرہی تھی۔ ہم کار کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ کار کی ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ روشنی کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے ہم اپنے تاریک گوشے میں دُبک گئے۔

لیکن وہ کار اینڈرسن سے بیس فٹ کے فاصلے پر آکر رک گئی۔ کار کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک سایہ سا کار سے اُتر کر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے آگیا۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' اینڈرسن کی حیرت زدہ آواز اندھیرے میں گونجی۔

''میں تمہیں مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' ایک عورت کی آواز ابھری۔

وہ عورت بیورلی اینڈرسن تھی... اینڈرسن کی بیوی۔

بیورلی کو شک تھا کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت سے افیئر چلا رہا ہے اور وہ اپنے شوہر کو بے وفائی کے جرم میں مار ڈالنا چاہتی تھی۔ سو اس نے پچھتر ہزار ڈالرز کے عوض اجرتی قاتلوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔

میں اور برینڈن اپنے پوشیدہ مقام سے نکل کر دوڑتے ہوئے روشنی میں آگئے۔

میں نے پستول کا رخ اینڈرسن کے سینے کی جانب کردیا۔

اینڈرسن کا منہ حیرت سے کھل گیا اور پائپ اس کے منہ سے نکل کر سڑک پر گر گیا۔ اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے؟''

''تم قتل ہونے جارہے ہو۔'' بیورلی نے کہا۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے بھرپور لطف اندوز ہورہی ہے۔ خوشی کی چمک اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

''اس نے تمہیں کتنی رقم ادا کی ہے؟'' اینڈرسن نے اپنی بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ بارش کے قطروں کے مانند جگمگا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میری کار میں ایک بریف کیس رکھا ہوا ہے... اس میں پانچ لاکھ ڈالرز موجود ہیں۔ اس عورت کو مار ڈالو تو وہ رقم تمہاری ہوئی۔ بولو کیا کہتے ہو؟''

بیورلی نے یہ سنا تو اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

میں نے برینڈن کو اشارہ کیا۔ وہ اینڈرسن کی کار کی جانب بڑھ گیا۔

''تم نے پانچ لاکھ ڈالرز کی نقد رقم اپنے ساتھ کیوں رکھی ہوئی ہے؟'' بیورلی نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

اینڈرسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

برینڈن نے اس اثنا میں کار میں موجود بریف کیس کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ بریف کیس اٹھا کر میرے پاس آگیا اور بولا۔ ''پوری رقم اس بریف کیس میں موجود ہے۔''

اب اینڈرسن کے چہرے پر منڈلاتے خوف کے سائے معدوم ہوگئے اور اس کی جگہ اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''ہنی!'' وہ زہرخند لہجے میں اپنی بیوی سے گویا ہوا۔ ''یہ مردوں کا کھیل ہے جو صرف مرد ہی کھیلتے ہیں اور مرد ہی جیتتے ہیں۔''

یہ سن کر بیورلی نے ایک قدم میری جانب بڑھایا اور بولی۔ ''تم مجھ سے رقم لے چکے ہو۔ تمہیں اسے قتل کرنا ہوگا۔''

''مسز اینڈرسن! جیسا کہ میں نے تم سے کہا تھا جب میں کسی کو ٹھکانے لگانے کے لیے رقم قبول کرتا ہوں تو اس کی موت ایک اٹل حقیقت ہوتی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے اینڈرسن کے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے دو فائر کردیے۔

اینڈرسن کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی شیطانی مسکراہٹ یکدم غائب ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں حیرت اور غیر یقینی کے تاثرات اُمڈ آئے۔ اس نے اپنا سینہ تھام رکھا تھا کیونکہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔

خون اینڈرسن کی انگلیوں کے درمیان سے اُبل رہا تھا۔ وہ اپنا سینہ پکڑے دھیرے دھیرے سڑک پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ پھر مختصر سے اذیت ناک لمحات کے بعد اس کا تڑپتا ہوا جسم ساکت ہوگیا۔

پھر میں بیورلی کی جانب گھوم گیا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

تب میں نے اپنی پستول کا رخ بیورلی کے سینے کی جانب کردیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔

''یہ تم کیا کررہے ہو؟'' اس نے غیر یقینی... لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اس کی پیشکش بھی قبول کرلی تھی اور میں رقم وصول کرچکا ہوں۔'' میں نے بریف کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جیسا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میں کسی کو ٹھکانے لگانے کے لیے رقم قبول کرتا ہوں تو اس کی موت ایک اٹل حقیقت ہوتی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے ٹریگر دبا دیا۔

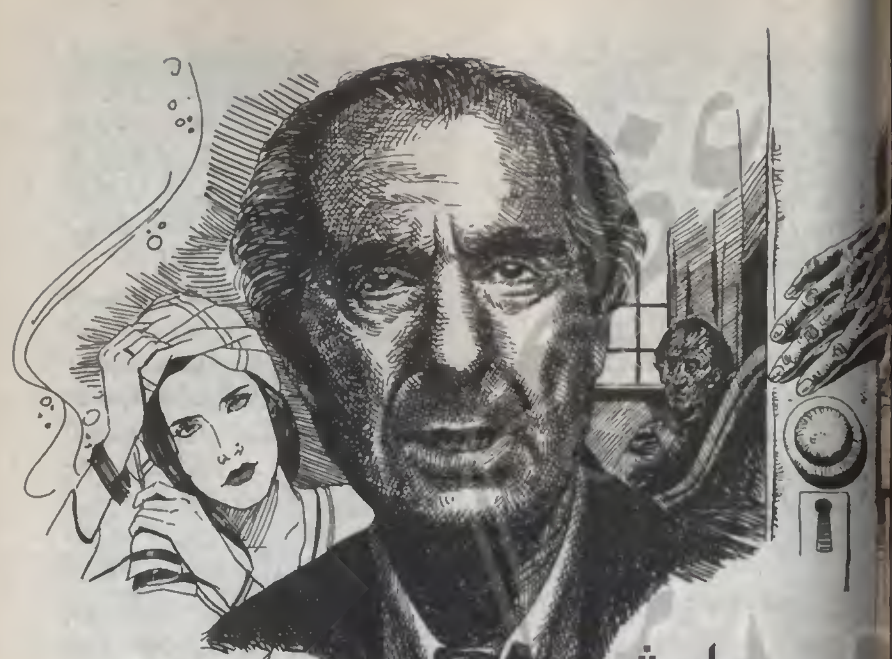

ملوث

محمد فاروق انجم

تقدیر کے آسرے پر داؤ لگانے والے دو جواریوں کا قصہ. اُس دن تقدیر ایک پر مہربان تھی مگر دوسرے کے گلے میں شکست کی مالا پہناتی رہی. ہار جیت کے اس کھیل میں اچانک ہی زندگی داؤ پر لگ گئی.

اس جھکی بوڑھے کا ماجرا جس کی بدزبانی سے سب تنگ آچکے تھے

وہ دومنزلہ مکان محلے کے بازار میں تھا۔ اس بازار میں دودھ، دہی، جنرل اسٹور، میڈیکل اسٹور وغیرہ کی دکانیں تھیں۔

اس مکان کے نیچے دو دکانیں تھیں جو کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اُوپر جانے کے لیے ایک طرف سے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں اس کے دائیں جانب ایک الگ تھلگ کمرے کا دروازہ تھا اور سیڑھیوں کے سامنے چھوٹی سی راہداری تھی اور سامنے گھر میں..... داخل ہونے کے لیے دروازہ تھا۔

اس مکان کا مالک نوشاد بیگ۔ ضعیف العمر تھا۔ اس نے جوانی میں دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اُولاد

نہیں ہوئی تھی اور دوسری بیوی کو اس کا شوہر طلاق دے چکا تھا اور اس کا پہلے شوہر سے ایک بیٹا بھی تھا۔ جب نوشاد بیگ نے دوسری شادی کی ۔۔ تو اس شادی کے ایک سال بعد ہی اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا..... دوسری بیوی سے اس کی کوئی اُولاد نہیں ..... تھی، وہی ایک بیٹا تھا جو اس کی دوسری بیوی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

نوشاد بیگ شروع سے ہی ضدی، اڑیل، سخت مزاج اور بات بات پر غصے میں آکر کسی کو بھی بے عزت کر دیتا تھا۔ وقت اور عمر کے ساتھ اس کا چڑچڑا پن بھی بڑھتا۔ جا رہا تھا۔ اس عادت سے سب ہی زچ تھے۔ وہ اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو چکا تھا اور اسے پنشن کی رقم ملتی تھی جس میں سے ایک بھی پیسا وہ اپنی بیوی اور اس کے بیٹے کو نہیں دیتا تھا۔ اس کی بیوی کی دانست میں نوشاد بیگ کے پاس کافی رقم تھی..... جس کی اس نے کبھی کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ نوشاد بیگ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ رات رات بھر باہر بھی رہتا تھا۔ وہ کہاں جاتا تھا... کیا کرتا تھا؟ اس کا بھی علم اس کی بیوی کو نہیں تھا۔ لیکن اکثر لوگوں سے یہ پتا چلا تھا کہ نوشاد بیگ گھوڑوں کی ریس میں پیسا لگاتا ہے۔ اس معاملے میں اس کی قسمت بہت تیز تھی۔

نوشاد بیگ کی اکثر اپنی بیوی شاہدہ سے لڑائی بھی ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ لڑتا تو پھر کئی کئی دن تک وہ شاہدہ سے بات نہیں کرتا تھا۔ ناراض ہونے کے بعد نوشاد بیگ اس کمرے میں چلا جاتا تھا جو سیڑھیوں کے ساتھ تھا۔ اور وہ کھانا بھی باہر سے کھاتا تھا۔ کئی دن کے بعد شاہدہ کو ہی صلح کرنی پڑتی تھی۔

شاہدہ کا بیٹا ناصر بڑا ہوگیا تھا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک وہ اپنے سوتیلے باپ کو اپنی ماں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ بازار میں بھی لوگوں سے ساتھ لڑتا ہوا۔ دیکھتا آرہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دکانوں کے دونوں کرائے دار اگر ایک دن بھی کرایہ دینے میں دیر کر دیتے تھے تو نوشاد بیگ انہیں مارنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

ناصر کو ایک کمپنی میں نوکری مل گئی تھی۔ بوڑھے نوشاد بیگ کی تلخی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ناصر اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ضرورت کے وقت ہی دونوں کے درمیان کوئی بات ہوتی تھی۔ اُس رات تینوں رات کا کھانا کھانے کے بعد ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ نوشاد بیگ نے اپنی بیوی کو چائے بنانے کا حکم دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ناصر ایک طرف بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا اور شاہدہ نے چولھے پر چائے کا پانی رکھ دیا۔ اسی اثنا میں دھوبن آگئی اور اس سے کپڑے لینے اور حساب کتاب کرنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ جونہی دھوبن گئی، شاہدہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھی لیکن کیتلی میں پڑا ہوا پانی آگ پر پکتے پکتے سوکھ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شاہدہ ایک کپ پانی کا اور ڈال کر کیتلی میں رکھتی، نوشاد بیگ کی غصے میں بھری ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”کہاں مر گئیں۔ ایک کپ چائے کا کہا تھا۔ چائے بنا رہی ہو کہ اپنے یار کے ساتھ باتیں کر رہی ہو؟“

اس وقت بازار میں رش نہیں تھا۔ نیچے دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ دکان دار اس انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کون پہلے دکان بند کرتا ہے تاکہ وہ بھی اپنی دکان کا شٹر نیچے کریں۔ یہ بات جو نوشاد بیگ نے چیختے ہوئے غصے سے کہی تھی، وہ نیچے بیٹھے ہوئے دکانداروں نے صاف سنی تھی اور سب کے کان ان کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

اس بات کو ناصر برداشت نہ کر سکا اور جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بولا۔ ”آپ کو یہ بات کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔“

”چپ کرو تم۔ خبردار جو تم میرے بیچ میں بولے۔“ نوشاد بیگ نے اسے غصے سے ڈانٹ دیا۔

”اب میں چپ نہیں رہوں گا۔ بہت برداشت کرلیا۔ جو آپ کے منہ میں آتا ہے وہ آپ میری ماں کے بارے میں بول دیتے ہیں۔“ ناصر کو بھی غصہ آگیا۔ ”ایسی گھٹیا باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔“

”تو کیا کرلو گے تم؟ بولو... جواب دو کیا کرلو گے؟ وہ میری بیوی ہے، جو چاہوں اسے کہہ سکتا ہوں۔“ نوشاد بیگ نے اکڑ کر کہا۔

”ایسے بے ہودہ الفاظ کوئی اپنی بیوی کو نہیں کہتا۔“ ناصر نے کہا۔

”اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو گھر سے نکل جاؤ۔“ نوشاد بیگ بے پروائی سے بولا۔

”ناصر! تم چپ کرو۔“ شاہدہ نے مداخلت کی۔

”بس امی، بس... اب اور نہیں۔ میں ایسی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا۔ اب ان کے ساتھ ہمارا گزارہ نہیں ہے۔“ ناصر نے دوٹوک کہہ دیا۔

”نہیں ہے گزارہ تو لے جاؤ اپنی ماں کو اور چلے جاؤ یہاں سے۔“ نوشاد بیگ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخا۔

”اس مکان میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ اس مکان کو خریدنے کے لیے میری ماں نے اپنا زیور بیچ کر آپ کو رقم دی تھی۔ اس لیے اس مکان کے آدھے حصے پر ہمارا حق ہے۔“ ناصر نے برملا کہا۔ اس نے اپنے سوتیلے باپ کے منہ سے کئی بار اپنی ماں کی تذلیل سنی اور برداشت کی تھی لیکن آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ جو کچھ اس کے اندر کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبل رہا تھا، وہ آخر باہر آگیا تھا۔

ناصر کی بات سن کر نوشاد بیگ اپنی بیوی کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”تو تم نے یہ بات اپنے پیٹ میں نہیں رکھی۔ اپنے بیٹے کو بتادی؟“

”آپ کی زبان روز بروز دراز ہی ہوتی جارہی ہے۔ مجھ سے اب اپنی ماں کی یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔“ ناصر بولا۔

”کان کھول کر سن لو... یہ مکان میرا ہے۔ میں اس کا مالک ہوں۔ ایک انچ پر بھی تم دونوں کا حق نہیں ہے۔“ نوشاد بیگ دہاڑا۔

”اس پر ہمارا بھی حق ہے۔ وہ زیور میری ماں کا ذاتی تھا۔ اسے بیچ کر یہ گھر لیا گیا تھا۔“ ناصر بولا۔ ”ہمیں ہمارا حق ادا اور الگ کردو۔“

”لیا تھا۔ اب کیا کرو گے؟ جاؤ... جو کرنا ہے کرلو۔ مجھے مارنا ہے مار دو لیکن تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“ نوشاد بیگ کہتے ہوئے شاہدہ کے پاس گیا اور بولا۔ ”تم بھی سن لو۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ تمہارا بیٹا میرے آگے بولا ہے۔ میں جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔ اپنا کھاؤں گا۔ دو، چار دن میں اپنے رہنے کا انتظام کرلو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ لے جاؤ اپنی اس نکمی اُولاد کو جو جانے کس کی ہے۔“

نوشاد بیگ چیختا ہوا پہلے اپنے اس کمرے میں گیا جہاں سوتا تھا۔ وہاں سے اپنا سامان اُٹھا کر وہ باہر نکل گیا اور راہداری عبور کر کے سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے کے مقفل دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا۔ ان کی باتیں نیچے دکانداروں نے مزے سے سنی تھیں جبکہ ناصر کو اس کی ماں نے بولنے سے روکا ہوا تھا اور ناصر تلملا رہا تھا۔

☆☆☆

شاہدہ تو اس دن کو پچھتا رہی تھی جب اس نے نوشاد بیگ سے شادی کی تھی۔ اسے اس بار نوشاد بیگ کا ان سے الگ ہونا برا نہیں لگا تھا۔ ناصر نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

یہاں سے نہیں جائیں گے بلکہ اپنا حق لے کر ہی اس جگہ کو چھوڑیں گے۔

دوسری صبح ناصر بازار سے دہی لینے کے لیے گیا تو دکان دار نے دہی تولتے ہوئے کہا۔ ”رات کو پھر ہنگامہ ہو رہا تھا؟“

”تجھے اس سے کیا؟“ ناصر نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

”میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ بیگ صاحب بہت ضدی اور غصے کے تیز ہیں۔ وہ آپ کو تھوڑا سا بھی حصہ نہیں دیں گے۔“ دہی والا بولا۔

اس کی بات سن کر ناصر نے دائیں بائیں نظر دوڑائیں، سب دکاندار اسی کی طرف ... متوجہ تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ سب نے رات گھر میں ہونے والا ہنگامہ سنا تھا۔ ناصر نے سوچا اور پھر بولا۔ ”کچھ بھی ہو، ہمارا حصہ تو انہیں دینا ہی پڑے گا۔ چاہے مجھے کوئی بھی قدم اُٹھانا پڑے۔“

ناصر دہی لے کر اندر چلا گیا اور سب دکاندار ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

☆☆☆

دن کے نو... بجے تھے جب بغل میں اخبار دبائے لعل خان سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا اور سیدھا اس کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا جہاں اب نوشاد بیگ رہتا تھا۔ نوشاد بیگ نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ وہ اس کا پرانا دوست تھا اور اسی محلے میں رہتا تھا۔ لعل خان کی کبھی بھی اپنے بیٹوں اور ان کی بیویوں کے ساتھ نہیں بنی تھی۔ وہ گھر میں الگ تھلگ رہتا تھا۔ لعل خان فطرتاً لالچی انسان تھا۔

ابھی لعل خان کو نوشاد بیگ کے کمرے میں گئے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ دودھ والا حسب عادت گنگناتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا ہوا آگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا، نوشاد بیگ نے دروازہ کھول کر دودھ والے کو اپنی کرخت آواز میں مخاطب کیا۔

”ابے سن... میرا دودھ یہاں دے کر جاؤ اور آئندہ

بھی مجھے اس کمرے میں دے کر جایا کرنا۔"

"پھر لڑائی ہو گئی ہے جناب!"

"بکواس بند کرو ورنہ ٹینٹوا دبا دوں گا۔"

"ایسی نوبت آئی تو میں تجھ سے زیادہ طاقتور ہوں۔" دودھ والا بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے؟ ابھی کیا بکواس کی ہے تم نے؟" نوشاد بیگ نے اس کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کیا کہنا ہے۔" دودھ والے نے برتن میں دودھ ڈالا اور راہداری کی طرف چل پڑا۔ وہاں دروازے میں پہلے ہی ناصر ہاتھ میں برتن لیے کھڑا تھا۔

"بیگ صاحب کیا پھر ناراض ہو گئے ہیں... اب یہ ناراضی کب تک چلے گی؟" دودھ والے نے دودھ ڈالتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک عرصے سے یہاں آرہا تھا، اس لیے کھل کر بات کر لیتا تھا۔

"اب یہ ناراضی موت تک ہی جائے گی۔" ناصر نے معنی خیز لہجے میں کہا اور دودھ لے کر اندر چلا گیا جبکہ دودھ والا ایک لمحے کے لیے کھڑا سوچتا رہا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ دودھ والے کو ناصر کا لہجہ خطرناک ہی نہیں بلکہ عجیب بھی لگا تھا۔ جب وہ نیچے جانے کے لیے... سیڑھیوں کے پاس گیا تو اندر سے لعل خان کی آواز آئی۔

"وہ ضروری بات کیا ہے جس کے لیے تم نے مجھے ابھی آنے کے لیے کہا تھا۔"

"میں تجھے بتانا چاہتا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے..." نوشاد بیگ کی آواز آئی۔ "مجھے جان سے مار دینے کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔"

دودھ والے کے قدم رک گئے۔ وہ یہ بات سن کر چونک گیا تھا۔ وہ مزید سننا چاہتا تھا کہ نوشاد بیگ کی جان کو کس سے خطرہ ہے؟ کون اسے دھمکیاں دے رہا ہے؟ نوشاد بیگ مزید بولا۔

"میں پہلے چائے بنا لوں، تم جب تک مجھے اخبار پڑھ کر سناؤ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں۔" نوشاد بیگ کی آواز دودھ والے کو سنائی دی۔

دودھ والے نے برا سا منہ بنایا۔ لعل خان زور سے اخبار پڑھنے لگا... اور دودھ والے کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ پہلے اخبار سنے اور اس کے بعد اسے پتا چلے کہ نوشاد بیگ کو کس سے خطرہ ہے۔ اس لیے وہ وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

شام کو ناصر واپسی پر بازار سے گزر رہا تھا کہ ان کے گھر کے سامنے واقع جنرل اسٹور والے لڑکے نے اشارے سے ناصر کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس کے پاس ناصر کا بیٹھنا اٹھنا بھی تھا اور فارغ اوقات میں دونوں گپ شپ بھی لگا لیا کرتے تھے۔

"کیا بات ہے؟" ناصر اس کے پاس جا کر بولا۔

"آج تیرا سوتیلا باپ تیری ماں سے خوب لڑا۔ اس کے ساتھ تیرے سوتیلے باپ کا وہ راشی پولیس انسپکٹر دوست بھی موجود تھا۔" لڑکے نے بتایا۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ میری ماں کو؟" ناصر نے فوراً غصے میں آکر سوال کیا۔

"وہی جو وہ لڑائی کے دوران کہہ دیا کرتا ہے۔"

"اور وہ راشی انسپکٹر...؟"

"وہ صرف مسکراتا رہا تھا۔"

ناصر یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور سیدھا سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا گیا اور جاتے ہی پوچھا۔ "آج وہ شخص تم سے پھر لڑا تھا؟"

"تجھے کس نے بتایا؟" شاہدہ کو اس کی بات سن کر حیرانی ہوئی۔

"مجھے بتاؤ آج اس نے لڑائی کی تھی؟ کیا کہا تھا اس نے؟" ناصر غصے سے چیخ رہا تھا اور اس کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ یقیناً اپنے کمرے میں موجود نوشاد بیگ بھی سن رہا ہوگا۔

"جو بھی کہا تھا، تم چھوڑو اور منہ ہاتھ دھو لو۔ اس کی تو عادت ہے۔" اس کی ماں نے بات ختم کرنی چاہی۔

"مجھے بتائیں امی... میں جاننا چاہتا ہوں۔" ناصر نے تلخی سے کہا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"وہ بولتا رہا اور میں اپنے کام میں دروازہ بند کر کے لگی رہی۔ میں بھول گئی ہوں، تم بھی بھول جاؤ۔" شاہدہ نے کہا۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔" ناصر تیزی سے باہر نکلا، اس کی ماں اسے روکتی... رہ گئی۔ اردگرد کے دکانداروں کے کان اور آنکھیں ان کے گھر کی طرف مرکوز ہو گئے......

ناصر نے جاتے ہی زور زور سے نوشاد بیگ کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اندر سے نوشاد بیگ کی تیز آواز آئی۔ "ابے کیا دروازہ توڑنا ہے؟"

"دروازہ کھولو۔ میں بتاتا ہوں کہ میری ماں سے لڑائی کرنے کا اب کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔" ناصر چیخا۔

"چلے جاؤ یہاں سے ورنہ برا حال کر دوں گا۔" وہ اندر سے ہی بولا۔

"دروازہ کھول... آج تیرا کام کر کے ہی یہاں سے

جاؤں گا۔ روز روز کی لڑائی آج ختم ہو جائے گی۔" ناصر چیخا اور پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹنے لگا۔ اس کی ماں اسے اپنے دروازے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کشمکش میں نہ تو نوشاد بیگ نے دروازہ کھولا اور نہ ہی ناصر کی بولتی ہوئی زبان رکی۔ جانے وہ کیا کیا کہہ رہا تھا۔ آخرکار اس کی ماں اسے اپنے کمرے تک لے... گئی اور اندر جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اب خاموشی چھا گئی تھی۔

کچھ دیر کے بعد نوشاد بیگ نے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی جسے وہ گن رہا تھا۔ نوشاد بیگ ان کے دروازے کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

رات خاموشی سے گزر گئی۔

صبح دودھ والا سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیا اور پہلے اس نے نوشاد بیگ ... دروازہ بجایا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ دودھ والے نے دروازے کو دھکا دیا تو بند دروازہ تھوڑا سا کھل گیا لیکن نوشاد بیگ کا چہرہ نمودار نہیں ہوا۔

"بیگ صاحب... بیگ صاحب!" دودھ والے نے اندر جھانکتے ہوئے آواز دی لیکن اندر خاموشی تھی۔ دودھ والے نے تھوڑا سا دروازہ اور کھول دیا۔ اور پھر جیسے ہی اس کی نظر اندر پڑی اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

نوشاد بیگ کی خون میں لت پت لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی اور آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ چھری اس کے سینے میں پیوست تھی۔ دودھ والا خوفزدہ ہو کر نیچے کی طرف بھاگا اور چیخا۔ "بیگ صاحب کو مار دیا کسی نے... بیگ صاحب کی لاش ہے اندر... خون ہو گیا ہے بیگ صاحب کا..."

فوراً ہی وہاں موجود دکاندار اپنی اپنی دکان چھوڑ کر ان کے گھر کے پاس جمع ہو گئے۔ ناصر بھی یہ سنتے ہی تیزی سے نوشاد بیگ کے کمرے کی طرف دوڑا۔ سامنے اس کی لاش ...... دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

ناصر نے پولیس کو اطلاع کی۔ پورے محلے میں قتل کی بات پھیل گئی تھی۔ مختلف باتیں اور چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ہر کوئی آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔

جب پولیس وین آئی تو انسپکٹر نواز سب سے پہلے باہر نکلا۔ وہ نوشاد بیگ کا دوست بھی تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی، پیٹ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ رہتی تھیں اور چہرہ کرخت تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ نہایت عیار اور بددیانت شخص ہے۔

انسپکٹر نواز نے کمرے میں جا کر لاش کا جائزہ لیا۔ پھر کمرے کے سامان کو دیکھا۔ اس کے بعد وہ ناصر کی طرف متوجہ ہوا۔

"کس نے کیا ہے یہ؟" اس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"مجھے پتا ہوتا تو سوال سے پہلے ہی بتا دیتا۔" ناصر نے جواب دیا۔

"تمہارا ابھی تو جھگڑا چل رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کل تم مرنے مارنے پر بھی اتر آئے تھے اور اس نے اندر سے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اس لیے وہ کل بچ گیا۔ تمہارے ہاتھ میں چھری بھی تھی۔" انسپکٹر نواز نے کہا۔

"یہ آپ کے دوست نے آپ کو بتایا ہوگا... اس لیے کہ وہ کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا۔" ناصر نے کہا۔

انسپکٹر نواز نے ایک اہلکار کو اشارہ کیا تو اس نے ناصر کو حراست میں لے لیا۔ "آپ مجھے کیوں پکڑ رہے ہیں؟"

"نوشاد کی دشمنی تم سے تھی۔ اس لیے تفتیش تم سے ہی شروع ہو گی۔ نوشاد بیگ کے قاتل تم ہو یا کوئی اور... میں اسے کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا، چاہے مجھے دل پر پتھر رکھ کر ہی کیوں نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے۔" انسپکٹر نواز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

نوشاد بیگ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ ناصر شک کی بنیاد پر حوالات میں بند تھا۔ نوشاد بیگ، انسپکٹر نواز کا دوست تھا۔ دونوں ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی تھے۔ اس لیے وہ اس کیس کو جذباتی طور پر بھی لے رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اس کے قاتل تک پہنچ کر ہی دم لے گا۔

دوپہر کے بعد اس نے ناصر کو اپنے سامنے بلا لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ناصر اس کے ہر سوال کا جواب اعتماد سے دیتا رہا۔

"ساری رات تم کہاں تھے؟" انسپکٹر نواز نے سوال کیا۔

"میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔"

"تمہارے پاس اس کمرے کی دوسری چابی بھی ہے؟"

"بالکل نہیں۔ اس نے جانے کیوں دروازے کا لاک بدل دیا تھا۔" ناصر نے جواب دیا۔

"رات اس کا میرے پاس فون آیا تھا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بہت سوچ بچار کے بعد میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم ہی

مجھے بچا سکتے ہو۔ میں نے پوچھا کس سے خطرہ ہے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا کہ تم کل میرے پاس آنا۔ میں تمھیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمھیں بتانے کے سوا اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔'' انسپکٹر کہہ کر چپ ہو گیا اور پھر بولا۔ ''یہ الفاظ تھے نوشاد بیگ کے۔ لیکن مجھے اس سے بات کرنے اور جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میری اس سے ملاقات سے پہلے اس کا خون ہو گیا۔''

''کاش... آپ کو موقع مل جاتا اور میں اس طرح مجرم کی طرح آپ کے سامنے نہ کھڑا ہوتا۔'' ناصر نے کہا۔

''تم نے موقع چھوڑا ہی نہیں اور اب تم ہوشیار بن رہے ہو۔'' انسپکٹر نواز کا لہجہ کرخت اور درشت ہو گیا تھا۔ ناصر نے کہا۔

''آپ مجھ پر الزام نہیں لگا سکتے۔ لعل خان بھی ان کے دوست تھے، آپ کا بھی ان سے تعلق تھا۔''

''لیکن جھگڑا تمہارے اور تمہاری ماں کے ساتھ تھا۔'' انسپکٹر نواز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

اسی اثنا میں لعل خان گھبرایا ہوا آ گیا۔ اسے لے کر آنے والے دو پولیس والے تھے۔ ایک سپاہی نے بتایا۔ ''اسے لاری اڈے سے پکڑ کر لائے ہیں۔''

''تم بھاگ رہے تھے؟''

''نن... نہیں... میں تو اپنی بیٹی کے پاس جا رہا تھا۔ اس کی طبیعت کئی دنوں سے ٹھیک نہیں ہے۔'' لعل خان کی گھبراہٹ بدستور برقرار تھی اور وہ اسی عالم میں بولے جا رہا تھا۔

''جب تیرا دوست قتل ہو گیا تو تب تجھے یاد آیا کہ بیٹی کی عیادت کے لیے بس پکڑ لو۔'' انسپکٹر نواز درشت لہجے میں بولا۔

''مجھے تو پتا بھی نہیں تھا۔ میں تو سویرے ناشتا کرنے کے بعد نکلا تھا۔'' لعل خان کے ہاتھ میں لرزش تھی اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

''دودھ والا بھی باہر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا نام خیرو ہے اور پانچ سال پہلے اس نے اپنے گاؤں میں ایک نوجوان کا قتل بھی کیا تھا۔'' دوسرے سپاہی نے بتایا۔ ''بازار کے ایک دکاندار نے بتایا ہے کہ لعل خان اور نوشاد بیگ نے مشترکہ طور پر گھوڑوں کی ریس میں پیسے لگائے تھے۔ دونوں پیسا ہار گئے اور لعل خان اس ہار کا سارا ذمے دار نوشاد بیگ کو ٹھہرا رہا تھا اور اپنے پیسے کا تقاضا بھی کرتا تھا۔''

''لیکن وہ بات تو طے ہو گئی تھی۔'' لعل خان فوراً بولا۔

''بس ذرا سا اختلاف ہو گیا تھا۔''

''تم پیسے کے یار ہو۔ تم نے ہارنے پر اپنے دوست کے بجائے پیسے کو ہی اہمیت دی۔'' انسپکٹر نواز نے کہا۔

''وہ بات ختم ہو گئی تھی۔'' لعل خان بولا۔

''اُس دکاندار کے سامنے یہ دونوں اُلجھ بھی پڑے تھے۔ جب نوشاد بیگ چلا گیا تھا تو لعل خان نے یہ کہا تھا کہ وہ میٹھی چھری سے اپنے پیسے نکلوائے گا۔'' سپاہی نے مزید بتایا۔ اس کی بات سن کر لعل خان کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔

''اور دودھ والے کا کیا معاملہ ہے؟'' انسپکٹر نواز نے سوال کیا۔

''اُسے کئی بار غصے سے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے لوگوں نے سنا ہے کہ وہ نوشاد بیگ کی گندی اور بات بات پر بے عزت کر دینے والی زبان سے اتنا تنگ ہے کہ اسے موقع ملے تو وہ اس کا خون کر دے۔'' سپاہی نے بتایا۔

انسپکٹر نواز اس کی بات سن کر ہولے سے مسکرایا اور گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ قاتل میرے سامنے کھڑے ہیں اور مجھے بس ان میں سے ایک کو تلاش کرنا ہے جس نے نوشاد بیگ کا قتل کیا ہے۔ مجھے کہیں اور بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

☆☆☆

شک کی بنیاد پر تینوں ہی حوالات میں بند تھے۔ انسپکٹر نواز اس محلے میں چلا گیا تھا۔ اس نے دکانداروں سے ملاقات کی، کچھ معلومات جمع کیں اور پھر وہ ناصر کی ماں کے دروازے پر چلا گیا۔ اس وقت وہ کچھ خواتین کے ساتھ اندر موجود تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی کرب نہیں تھا۔ تکلیف اس بات کی تھی کہ اس کا بیٹا ناصر حوالات میں بند تھا۔

''کیا میں آپ سے چند سوال کر سکتا ہوں؟'' انسپکٹر نواز نے پوچھا۔

''کیا میرے بے گناہ بیٹے سے پوچھ کر آپ کی تسلی نہیں ہوئی۔'' ناصر کی ماں بولی۔

''آپ کے لیے سوال الگ ہیں۔''

''پوچھیے۔''

''رات کو آپ نوشاد بیگ سے صلح کرنے کے لیے ناصر کو بتائے بغیر اس کے کمرے تک گئی تھیں؟'' انسپکٹر نواز کا سوال سن کر ناصر کی ماں چونکی۔

وہ اٹکتے اور سوچتے ہوئے بولی۔ ''نن... نہیں... میں تو نہیں گئی۔''

''آپ گئی تھیں۔ جب نوشاد بیگ نے آپ کی کوئی بات سننے کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی تو آپ واپس آ گئیں۔'' انسپکٹر نواز نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' ناصر کی ماں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''سچ ثابت کرنے کے لیے کیا میں لعل خان کو یہاں بلاؤں جس کو آپ کے جانے کے بعد نوشاد بیگ نے فون کر کے بتایا تھا؟'' انسپکٹر نواز اس کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''لعل خان جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔''

''رات کو نوشاد بیگ کے فون سے آئی ہوئی کال کا ریکارڈ اس کے موبائل فون پر موجود ہے۔'' انسپکٹر نواز بلا تامل بولا۔

''مجھے کیا پتا وہ آپس میں کیا باتیں کرتے تھے۔ کیوں ایک دوسرے کو فون کرتے تھے۔'' ناصر کی ماں کا لہجہ تیز اور پُر اعتماد ہو گیا تھا۔

اس کی بات سن کر انسپکٹر نواز چپ ہو گیا۔ اس نے ناصر کی ماں کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ مجھے آپ کو بھی تھانے لے جا کر تفتیش کرنی پڑے گی۔ ممکن ہے کہ آپ صلح کرنے کے بجائے کسی اور ارادے سے گئی ہوں اور نوشاد کو اپنی زندگی کی بازی ہارنی پڑی ہو۔''

ناصر کی ماں یہ سنتے ہی گھبرا گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور سانس بے ترتیب ہونے لگی۔ خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا اور ان باتوں کو انسپکٹر نواز کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا تھا۔

''یہ محض آپ کا خیال ہے۔ حقیقت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔'' ناصر کی ماں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''میں اُسی حقیقت کی تو جستجو میں ہوں۔'' انسپکٹر نواز کی تیز نظر ناصر کی ماں کے چہرے پر مرکوز تھی۔

''وقت آنے پر سب کچھ کھل جائے گا۔ میرا بیٹا بے گناہ ہے۔ اُسے چھوڑ دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔'' ناصر کی ماں نے کہا۔

''مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں آپ بھی بیٹے کے ساتھ حوالات میں بند نہ ہو جائیں۔'' انسپکٹر نواز نے کہا تو ایک بار پھر ناصر کی ماں کے چہرے پر تغیر آ گیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق نوشاد بیگ کو سینے پر تیز دھار چھری کے دو وار کر کے قتل کیا گیا تھا۔ نوشاد کی موت رات تین بجے کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ چھری پر کسی کی انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ ممکن تھا کہ مارنے والے نے نشان صاف کر دیے ہوں یا پھر اس نے دستانے پہن رکھے ہوں۔

نوشاد بیگ کے کمرے سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ سامان اپنی جگہ موجود تھا۔ اکلوتی الماری کا لاک لگا ہوا تھا جسے بعد میں انسپکٹر نواز نے اپنی نگرانی میں کھول کر دیکھا تھا۔ الماری میں پرانے کاغذات، اور ایک رجسٹر میں گھوڑوں کے نام، حساب کتاب اور ریس کی تاریخیں وغیرہ لکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں سے کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔

انسپکٹر نواز نے دودھ والے کو چھوڑ دیا تھا۔ تفتیش کے دوران یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ ایسا کہتا ضرور تھا لیکن محض وقتی طور پر غصے میں آ کر اور جب وہ اگلے گھر دودھ دینے کے لیے جاتا تھا تو نوشاد بیگ کی کہی ہوئی بات کو وہ بھول چکا ہوتا تھا۔

ناصر اور لعل خان کے علاوہ انسپکٹر نواز کا شک ناصر کی ماں پر زیادہ تھا۔ قتل میں اس کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا کیونکہ نوشاد بیگ سے بند دروازہ ایک عورت ہی اپنی باتوں سے کھلوا سکتی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی اور نوشاد بیگ اس کی باتوں میں آ گیا ہو گا۔ جب نوشاد نے دروازہ کھولا ہو گا تو اپنے منصوبے کے مطابق ناصر کی ماں نے چھریوں کے وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا ہو گا۔

اس خیال کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ دروازہ ناصر کی ماں نے میٹھی باتوں سے کھلوایا ہو اور حملہ ناصر نے کیا ہو...! یہ سب باتیں انسپکٹر نواز کے دماغ میں چل رہی تھیں۔

ناصر کے رہائش والے حصے کی بھی تلاشی لے لی گئی تھی لیکن کوئی مشکوک چیز نہیں ملی تھی۔ انسپکٹر نواز نے لعل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بھی جاؤ۔''

''میں جاؤں؟'' لعل خان سنتے ہی خوشی سے بولا۔

''ہاں جاؤ۔ اب یہ ماں بیٹا ہی بتائیں گے کہ ان میں سے قاتل کون ہے۔ ایک یا دونوں...!'' انسپکٹر نواز نے متانت سے ناصر کی طرف دیکھا جو اس وقت سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔

''ہم نے یہ قتل نہیں کیا۔'' ناصر بولا۔

''اب کیس عدالت میں جائے گا۔'' انسپکٹر نواز نے کہا۔

''مجھے اجازت ہے؟'' لعل خان نے ایک بار پھر پوچھا۔ ''میں جاؤں؟''

''کہا تو ہے جاؤ۔'' انسپکٹر نواز نے کہا تو لعل خان دروازے کی طرف بڑھا مگر پھر اچانک رک گیا۔ وہ واپس پلٹا اور بولا۔

''انسپکٹر صاحب! ڈر اور خوف میں ایک بات بالکل دماغ سے نکل گئی تھی کہ نوشاد بیگ نے دو دن پہلے مجھے بتایا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ آپ سے بھی ملنا چاہتا تھا اور اس نے اس کا نام جس سے اس کو اپنی جان کا خطرہ ہے، کاغذ پر لکھ کر ایک جگہ چھپا دیا ہے۔ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر ایک دو دن میں مجھے کچھ ہو گیا تو وہ پولیس کو بتا دے کہ وہ کاغذ کہاں چھپایا ہوا ہے۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ مجھے نام بتا دے لیکن اس نے نام بتانے کے بجائے بس وہ جگہ بتا دی تھی جہاں اس نے کاغذ چھپایا تھا۔''

انسپکٹر نواز اس کی بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''کچھ بھی تھا... نوشاد بیگ حساب کتاب پورا رکھتا تھا۔ چلو میرے ساتھ اور مجھے بتاؤ کہ وہ کاغذ کہاں رکھا ہوا ہے۔''

''ہاں جی چلیں۔ مجھے اس کے بعد اس کے کمرے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور پھر وہ قتل ہو گیا۔'' لعل خان بولا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' انسپکٹر نواز نے کہا اور لعل خان کو لے کر تھانے سے باہر نکل گیا جبکہ ناصر اور بھی پریشان ہو گیا۔ وہ مضطرب اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

لعل خان نے اس جگہ کی نشاندہی کی۔ دروازے کی چوکھٹ میں ایک جھری سی تھی جس میں ایک کاغذ پلاسٹک میں تعویذ کی طرح لپیٹ کر اندر پھنسایا گیا تھا۔ انسپکٹر نواز نے احتیاط سے وہ کاغذ نکالا اور اسے جیب میں ڈال کے اس کمرے سے باہر آ گیا۔ لعل خان اپنے گھر کی طرف چلا گیا اور انسپکٹر نواز جیپ میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر نواز جب نوشاد کے گھر سے نکلا تو گھر کے سامنے ایک ہٹا کٹا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نواز حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اُلجھن کا شکار تھا اور چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ انسپکٹر نواز رک گیا۔ اس کی بند مٹھی میں وہ کاغذ تھا جو وہ نوشاد کے کمرے سے نکال کر لایا تھا۔ وہ نوجوان بتانے لگا۔

''میں گھوڑوں کی ریس میں سارا پیسا ہار گیا اور نوشاد بیگ بہت سا پیسا جیت گیا۔ پھر ہم ایک جوئے خانے میں چلے گئے۔ وہاں میں نے نوشاد سے کچھ پیسے لے کر کھیلا اور ہار گیا جبکہ نوشاد کی قسمت اس دن عروج پر تھی۔ وہ اس رات نو لاکھ روپے جیت کر اس جوئے خانے سے باہر نکلا۔ میں جوئے خانے والوں کا مقروض تھا اور وعدے کے مطابق مجھے مذکورہ قرض دو دن میں واپس کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ کو کیا بتاؤں۔ آپ نے مجھے اس کام سے سختی کے ساتھ منع کیا تھا اور آپ کا دو لاکھ روپیا میں ہارا تھا۔ میں نوشاد بیگ سے رقم لے کر واپس کر دینا چاہتا تھا۔ میں اسے گھر تک چھوڑنے گیا۔ اس سے پیسے مانگے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اُس وقت تو میں واپس چلا گیا مگر دوسرے دن پھر تقاضا کیا۔ وہ اپنے انکار پر قائم رہا..... مجھے بھی رقم واپس کرنی تھی۔ مجھے ان لوگوں کی فکر تھی۔ غصے میں آ کر میں نے نوشاد بیگ کو قتل کی دھمکی دے دی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا نام اس طرح سے لکھ کر اس کا ذکر اپنے دوست سے بھی کر دے گا۔ اور جب اس نے مجھے یہ کہا کہ وہ ساری بات آپ کو بتا دے گا تو پھر میں نے رات کو جا کر نوشاد بیگ کو قتل کر دیا۔ الماری کی چابی نکال کر وہ رقم لی اور چابی لگا کر اسی جگہ رکھ دی۔ اپنا قرض ادا کیا، دو لاکھ روپے آپ کے بھی پورے کیے اور باقی رقم میرے پاس ہے۔''

نوجوان کہہ کر چپ ہو گیا۔ انسپکٹر نواز نے اپنے ماتھے سے پسینا صاف کیا۔ اس کی اُلجھن اور بھی بڑھ گئی تھی۔ تذبذب اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ بولا۔ ''اب بتاؤ میں کیا کروں؟ تم نے میرے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔''

''دیکھ لیں... آپ کی ڈیل کا پیسا میں ہی اکٹھا کرتا ہوں... ڈیل بھی میں ہی کرتا ہوں۔ آپ کے کتنے کام کرتا ہوں۔ قتل تو روز ہوتے ہیں۔ آپ اس کیس کو اسی جگہ بند کر دیں۔ یہ فائل بھی بند ہو کر مٹی میں دفن ہو جائے گی۔'' نوجوان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''نوشاد بیگ کونسا اچھا آدمی تھا۔ سب ہی اس سے تنگ تھے اور پھر اس کے باقی بچ جانے والے پانچ لاکھ روپے میرے پاس ہیں۔ سمجھ لیں، اس کیس کو ختم کرنے کے لیے آپ کو فیس مل گئی ہے۔''

وہ اس کی بات سن کر زیرِ لب مسکرایا۔ ''اب مجھے کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' انسپکٹر نواز نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ کا ٹکڑا پھاڑ کر پھینک دیا اور تھانے فون ملایا۔ ''ناصر سے بولو کہ وہ اپنا وکیل بلا کر اپنی ضمانت کا بندوبست کر لے۔ مجھے یہ بھی اس کیس میں ملوث نہیں لگتا۔'' انسپکٹر نواز نے فون بند کیا اور نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ میری تفتیش... میرے سگے بیٹے تک لے جائے گی۔ آئندہ احتیاط کرنا۔''

پہلا رنگ

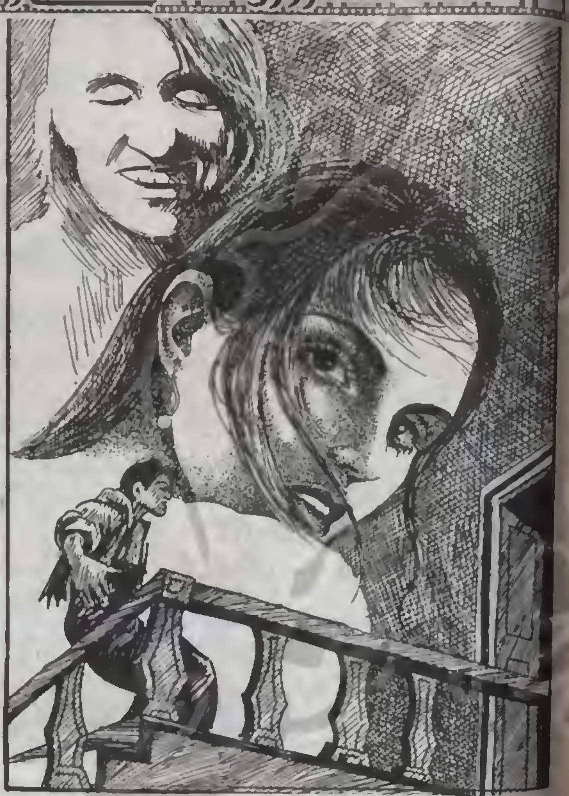

نقشِ پا

سلیم فاروقی

عمل سے گر زندگی جنت بنتی ہے تو جہنم بھی اسی کے بطن سے ہی جنم لیتا ہے...... زندگی میں عمل کی بنیاد فیصلے پر رکھی ہوتی ہے...... فیصلہ اصول پر ہو یا بد نیتی کی بنیاد پر کیا جائے اس کے نتائج برآمد ہو کر ہی رہتے ہیں پر کبھی کبھی ایک غلط فیصلہ کتنی زندگیوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے...... ہمارے اپنے معاشرے کی کہانی...... جس کے کردار بھی یہیں کہیں موجود ہیں۔

ایک اصول پسند استاد کا قصہ...... جس پر دیانت داری کا جرم ثابت ہو گیا تھا

میں تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو امی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ابو برآمدے میں پڑی چارپائی پر نیم دراز تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی اور وہ پُرامید نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے شاید انہیں میرے چہرے سے اندازہ ہو گیا کہ آج بھی میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

میں نے فائل ایک طرف رکھی اور تھکا تھکا سا ابو کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

ابو نے مجھ سے کچھ پوچھنے کے بجائے فرحانہ کو آواز دی۔ ''فرحانہ! بیٹا، بھائی کو پانی پلاؤ اور چائے بنا لو۔''

فرحانہ کچن ہی میں تھی۔ وہ فوراً پانی لے آئی اور گلاس مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”بھیا...“

ابو نے آنکھوں کے اشارے سے اسے کچھ کہنے سے شاید روک دیا تھا اس لیے وہ مزید کچھ نہ بولی۔

میں نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کیا اور فرحانہ سے کہا۔ ”ہاں، فرحانہ! کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ پہلے منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیں تو میں آپ کے لیے گرما گرم چائے لے کر آؤں۔“ فرحانہ ذہین تھی اس لیے فوراً بات بنا دی۔

میں نے اپنی ڈگریوں کی فائل اٹھائی اور کمرے میں چلا گیا۔

مجھے ایم اے کیے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے لیکن اب تک ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ابو سرکاری اسکول میں پڑھاتے تھے اور چند ماہ بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ محلے میں ان کی بہت عزت تھی۔ ہر چھوٹا بڑا ان کا احترام کرتا تھا لیکن عزت اور احترام سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ گھر میں چھ افراد کھانے والے ہوں اور صرف ایک کمانے والا تو مہنگائی کے اس دور میں گزارہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ابو نے بڑی محنت سے ہم بہن بھائیوں کو پڑھایا تھا۔ مجھ سے چھوٹی فرحانہ تھی جو اب فرسٹ ایئر میں تھی پھر عثمان اور عدنان تھے جو ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

میں نے میٹرک کے بعد سے ٹیوشنز کر کے اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کیے تھے۔ فرحانہ بھی شام کے وقت کچھ بچوں کو پڑھاتی تھی۔ یوں زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔

ابو کو امید تھی کہ مجھے ملازمت ملے گی تو گھر کے تمام دلدر دور ہو جائیں گے۔ مجھے خود بھی شرمندگی ہوتی تھی کہ ابو اس بڑھاپے میں محنت کریں اور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے بجائے ان پر بوجھ بنا رہوں۔

میں نہا دھو کر اپنے کمرے سے نکلا تو فرحانہ گرما گرم چائے لے کر آ گئی۔ میں نے چائے کا کپ لیتے ہوئے ابو سے کہا۔ ”ابو! لگتا ہے کہ اس شہر میں کسی بھی دفتر میں میری ضرورت نہیں ہے۔ میں دفتروں کے چکر لگا لگا کر تھک چکا ہوں۔“

”مایوسی کفر ہے ارسلان بیٹے!“ ابو نے کہا۔ ”اللہ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ بندے کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کوشش کرتا رہے اور فیصلہ اس ربِ رحیم پر چھوڑ دے کہ وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔“

”لیکن ابو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھ میں کمی کیا ہے؟ میں نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ مجھ میں اعتماد بھی ہے۔ انٹرویو میں ہر سوال کا جواب بھی دیتا ہوں، پھر مجھے ملازمت کیوں نہیں ملتی؟ ہر دفعہ یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ آپ کا ایڈریس اور سیل نمبر ہمارے پاس ہے، ہم آپ کو انفارم کر دیں گے۔ آج بھی یہی ہوا ہے۔“

”بیٹا!“ ابو نے کہا۔ ”میری ایک بات یاد رکھنا، جہاں انسان کی مایوسیوں کی انتہا ہوتی ہے، وہاں سے اللہ کی رحمت کی ابتدا ہوتی ہے اور ہر ناممکن، ممکن بن جاتا ہے، اگر ہمارا معبود چاہے! ملازمت آج نہیں تو کل مل جائے گی بس تم صبر سے کام لو۔“

”آپ نے بھی تو زندگی بھر صبر سے کام لیا ہے۔“ امی نے کہا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر آ گئی تھیں۔ ”آپ پچھلے پچیس سال سے پڑھا رہے ہیں۔ آپ کے بہت سے شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، آپ ان سے کہیں تو کیا وہ آپ کی بات ٹالیں گے؟“

”زبیدہ بیگم!“ ابو نے تلخی سے کہا۔ ”رشوت، سفارش اور بدعنوانی اس ملک کو گھن کی طرح چاٹ گئی ہے۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں بھی انہی لوگوں میں شامل ہو جاؤں؟ کیا میرے بیٹے میں اہلیت نہیں ہے جو اسے سفارش کی ضرورت ہے؟“

”بس شروع ہو گیا آپ کا لیکچر۔“ امی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آپ سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔“

”امی، پلیز! آپ اپنا موڈ خراب مت کریں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آج نہیں تو کل ملازمت مل ہی جائے گی۔“

”رازق تو اللہ تعالیٰ ہے زبیدہ بیگم!“ ابو نے سرد لہجے میں کہا۔ ”پھر ہم کون ہوتے ہیں اس کے فیصلوں میں دخل دینے والے... ہمارا کام ہے صرف کوشش کرنا۔“

امی وہاں سے اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ میں بھی گھر سے باہر نکل گیا۔ اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ ملازمت نہیں ملتی ہے تو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لوں لیکن اس کے لیے بھی سرمائے کی ضرورت تھی۔

اچانک میری نظر افضل چاچا پر پڑی۔ وہ ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔

میں نے سلام کیا، پھر پوچھا۔ ”کیا بات ہے چاچا! بہت تھکے تھکے نظر آ رہے ہیں... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”شکر ہے مالک کا بیٹا!“ چاچا نے کہا۔ ”طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تھکن تو مجھے اسٹال کی وجہ سے ہو گئی ہے۔“

مجھے یاد آیا کہ افضل چاچا پیر بازار میں اسٹال لگاتے تھے۔

”آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے... بازار تو آٹھ بجے تک لگا رہتا ہے؟“

”آج اللہ کے کرم سے اسٹال کا سارا مال وقت سے پہلے ختم ہو گیا۔“ افضل چاچا نے کہا۔ ”اس لیے میں یہیں آ گیا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ پیر بازار یا اتوار بازار میں اسٹال تو میں بھی لگا سکتا ہوں۔ اس میں کوئی لمبا چوڑا سرمایہ بھی درکار نہیں ہوتا۔

مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ میں بھی او اور اے لیول کے کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ گھر گھر جا کر پڑھانے میں محنت تو خاصی تھی لیکن مجھے اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ میں اپنے ساتھ ساتھ اپنے بھائیوں کے اخراجات بھی پورے کر دیتا تھا۔ میرے پاس اس وقت تقریباً دس ہزار روپے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اتنے پیسوں میں اسٹال لگایا جا سکتا ہے۔

میں نے رات کے کھانے کے بعد ابو سے کہا۔ ”ابو! اب میں ملازمت نہیں کروں گا بلکہ کاروبار کروں گا۔“

ابو مسکرا کے بولے۔ ”بیٹا! یہ تو وہی مثال ہو گئی کہ روٹی نہیں ہے تو کیا ہوا، کیک کھا کر بھی پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ کاروبار کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟“

”میں کوئی انڈسٹری لگانے نہیں جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں بہت چھوٹے پیمانے پر کاروبار کروں گا۔“

”آج کل چھوٹے سے چھوٹا کاروبار بھی لاکھوں میں ہوتا ہے بیٹا۔“ ابو نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سب سے پہلے تو دکان کے حصول میں رقم درکار ہو گی پھر اس میں سامان بھی رکھنا ہوگا۔ اگر اس دور میں کریانے کی دکان بھی کھولی جائے تو کم سے کم دو لاکھ کی تو ضرورت ہو گی۔“

”میں نے سوچا ہے کہ اتوار یا پیر بازار میں کوئی اسٹال لگا لوں۔ اس سے ہر ہفتے اتنی آمدنی تو ہو جائے گی کہ ملازمت کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟“ امی نے ...وری سے کہا۔ ”یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد اب یہ کام کرو گے؟“

”ہاں بیٹا!“ ابو نے کہا۔ ”اگر یہی کرنا تھا تو فضول اتنی تعلیم حاصل کی۔“

”ابو! آپ ہی تو کہتے ہیں کہ محنت کرنے میں عار نہیں ہونی چاہیے۔ میں بھی تو محنت ہی کروں گا اور رزقِ حلال کماؤں گا۔“

ابو میری اس بات سے لاجواب ہو گئے۔ انہوں نے زندگی بھر ہمیں اسی بات کی تعلیم دی تھی کہ کسی بھی قسم کا جائز

ایندھن

جمبو جیٹ ٹیک آف کرنے ہی والا تھا کہ ایک سہمی ہوئی بوڑھی خاتون نے قریب سے گزرتی ہوئی ایئر ہوسٹس کو روک کر پوچھا۔

”پرواز کے دوران اگر طیارے کا ایندھن ختم ہو گیا تو کیا ہو گا؟“

”کچھ نہیں۔“ ایئر ہوسٹس نے جواب دیا۔ ”سب لوگ مل کر دھکا لگائیں گے۔“

کام کرنے میں عار نہیں ہونی چاہیے۔

امی ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ ”تم اب پورے خاندان میں ہمیں ذلیل کراؤ گے۔ لوگ ہنسیں گے کہ ماسٹر صاحب کا اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا اتوار بازار میں اسٹال لگاتا ہے۔ کیا عزت رہ جائے گی ہماری؟“

”امی اس میں بے عزتی کی کون سی بات ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کیا اسٹال لگانا اتنا ہی خراب کام ہے؟ ہفتے میں صرف ایک ہی دن تو ہو گا، باقی دنوں میں ملازمت بھی تلاش کرتا رہوں گا۔“

”زبیدہ بیگم!“ ابو نے کہا۔ ”ارسلان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پھر تجارت تو یوں بھی سنت ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کاروبار میں اتنی برکت دے دے کہ اس کے ذریعے کوئی بڑا کاروبار کیا جا سکے۔“

”آپ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے بیٹھ گئے۔ یہ بھی تو سوچیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟“

”لوگوں کا کام تو صرف کہنا ہے، کوئی ہم سے آ کر یہ پوچھتا ہے کہ تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے... تم لوگ زندہ ہو یا مر گئے؟ مجھے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”میری بلا سے۔“ امی جھنجلا کر بولیں۔ ”یہ اسٹال کے بجائے سبزی کا ٹھیلا لگا لے۔“

”اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔“ ابو نے کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”بیٹا! تم اسٹال ضرور لگاؤ لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط ابو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اب ملازمت تلاش کرنے کے بجائے سی ایس ایس کی تیاری کرو۔ اس میں تمہیں پڑھنے کے لیے بھی وقت مل جائے گا۔“

”مجھے آپ کی یہ شرط منظور ہے ابو۔“ میں نے کہا۔

پھر میں نے امی اور فرحانہ کو بھی لاکھ جتن کر کے منا ہی لیا۔

دوسرے ہی دن میں افضل چاچا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اس وقت گھر میں تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں بھی اتوار بازار میں اسٹال لگانا چاہتا ہوں تو وہ بھی حیران رہ گئے لیکن میرا رویہ دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہو گئے اور بولے۔ ''میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔ کسی بھی جائز کام میں کوئی برائی نہیں ہے... لیکن بیٹا! یہ کام تمہارے لیے مشکل ہوگا۔''

''آسان تو کوئی کام بھی نہیں ہوتا چاچا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ یہ بتائیے کہ مجھے کم سے کم کتنے پیسوں کی ضرورت پڑے گی؟ یہ مشورہ بھی آپ ہی دیں گے کہ مجھے کس چیز کا اسٹال لگانا چاہیے۔ آپ تو گزشتہ کئی برس سے اس کاروبار میں ہیں۔''

میری بات سن کر افضل چاچا سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ ''میں تو ریڈی میڈ گارمنٹس اور کراکری کا اسٹال لگاتا ہوں۔ تم بھی کراکری یا کپڑے کا اسٹال لگالو۔ جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو تم اس کی فکر مت کرو۔ میں مارکیٹ سے کریڈٹ پر مال اٹھوادوں گا۔''

میں نے فوراً ہامی بھرلی۔

افضل چاچا خاصے تجربہ کار تھے اس لیے مجھے اتوار بازار میں اسٹال حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ انہوں نے نہ صرف میرا اسٹال لگوادیا بلکہ مارکیٹ سے کراکری کا سامان بھی کریڈٹ پر دلوادیا۔ مجھے تو صرف اسٹال پر جاکر بیٹھنا تھا۔

دیگر اسٹال والے بھی بہت تپاک سے ملے۔ میں صبح نو بجے سے جاکر وہاں بیٹھ گیا۔ اس وقت دوسرے دکان دار اپنا سامان سیٹ کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد افضل چاچا بھی وہاں پہنچ گئے۔

انہوں نے بہ طورِ خاص مجھے اتوار بازار کے ٹھیکے دار سے ملوایا۔ وہ چنیوٹ کا خاصا گھاگ بزنس مین تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ میں نے یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی ہے تو وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے بہت خلوص سے کہا۔ ''پتر! تجھے یہاں کوئی بھی پریشانی ہو تو سیدھا میرے پاس آجانا۔ تو بھائی افضل کا بھتیجا ہے تو میرا بھی بھتیجا ہے۔''

دس بجے وہاں گاہکوں کی آمد شروع ہو گئی اور گیارہ بجے تک تو رش بڑھ گیا۔ میں چونکہ بالکل نیا تھا اس لیے میں نے اپنی آسانی کے لیے ہر واٹر سیٹ، گلاس سیٹ، ڈنر سیٹ اور دیگر چیزوں پر مارکر سے اس کی قیمت اور منافع کوڈ ورڈ میں لکھ دیا تھا۔ مثلاً ڈنر سیٹ اگر دو سو روپے کا تھا تو میں نے اس کی قیمت دو سو بیس روپے رکھی تھی۔ اپنی یاددہانی کے لیے میں نے اس کے ڈبے پر 20-D-220 لکھ دیا تھا۔

وہ پورشن کراکری ہی کا تھا۔ مجھ سے پہلے جس شخص کا اسٹال تھا، وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھا نہیں لگا۔ ملگجے کپڑے، بڑھا ہوا شیو اور گال میں دبا ہوا پان... اس کی آنکھوں میں بھی عجیب سی خباثت تھی۔

بارہ بجے کے قریب دو فیشن ایبل سی لڑکیاں اس کے اسٹال پر آئیں۔ وہ دکان داری سے زیادہ نظربازی میں مصروف ہوگیا۔ وہ دونوں اس سے بے نیاز مختلف چیزیں دیکھتی رہیں۔ پھر انہیں امپورٹڈ گلاسوں کا ایک سیٹ پسند آگیا۔

لڑکیوں نے قیمت پوچھی تو اس خبیث نے اس سیٹ کے بارہ سو روپے بتائے۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ سیٹ میرے پاس بھی تھا اور اس کی قیمتِ خرید تھی سات سو پچیس روپے۔ میں نے اس کی قیمت نو سو روپے مقرر کی تھی۔

قیمت سن کر لڑکیوں نے منہ بنایا اور ان میں سے ایک لڑکی بولی۔ ''یہ تو آپ بہت مہنگا بیچ رہے ہیں۔''

''یہ فرانس کے گلاس ہیں باجی! آپ کہیں تو میں کوئی سستا سا سیٹ دکھادوں؟'' وہ خالص دکان دار بن گیا۔

''نہیں، اسی سیٹ کی مناسب قیمت لگائیں۔''

''قیمت تو مناسب ہی ہے۔ ایسا کریں، آپ پچاس روپے کم دے دیں۔''

''نہیں بھائی۔'' دوسری لڑکی نے کہا۔ وہ پہلی لڑکی سے زیادہ تیز تھی۔ پھر وہ دونوں میرے اسٹال کی طرف بڑھیں۔

''گیارہ سو روپے دیں گی؟'' اس نے پیچھے سے آواز لگائی لیکن وہ اس وقت تک میرے اسٹال پر آچکی تھیں۔

صبح سے لے کر اب تک میں نے ایک ایش ٹرے تک نہیں بیچی تھی۔ ان لڑکیوں کی نظر مجھ پر پڑی تو ان کے چہرے پر مجھے حیرت سی نظر آئی۔ میں جینز اور شرٹ میں ملبوس تھا اور سلیقے سے بال بنا رکھے تھے۔

''جی فرمائیے؟'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

''کوئی اچھا سا گلاس سیٹ دکھائیں۔'' ایک لڑکی بولی۔ اس کا رنگ سفید اور بال براؤن تھے۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔

''آپ کی رینج کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ امپورٹڈ دکھاؤں یا پاکستانی؟''

ان کے چہرے پر مجھے پھر حیرت نظر آئی۔ شاید آج تک وہاں کے کسی دکان دار نے ان سے اتنے مہذب انداز

میں بات نہیں کی تھی۔

''امپورٹڈ دکھائیے۔'' سیاہ لباس والی نے کہا۔

میں نے چاچا افضل کی ہدایت کے مطابق ان کے سامنے مختلف قسم کے گلاس رکھ دیے اور بتاتا رہا۔ ''یہ چائنا کا ہے، یہ فرانس کا ہے اور یہ پاکستانی ہے۔''

''شاہینہ! پاکستانی سیٹ بھی برا نہیں ہے۔'' سیاہ لباس والی نے کہا۔

''لیکن نسرین باجی! اس میں وہ فنشنگ نہیں ہے جو فرنچ سیٹ میں ہے۔'' شاہینہ نے کہا۔

''فنشنگ میں زیادہ فرق نہیں ہے میڈم!'' میں نے کہا۔ ''یہ ہماری سائیکالوجی ہے کہ امپورٹڈ چیز گھٹیا ہونے کے باوجود ہم مہنگے داموں خرید لیتے ہیں۔'' بے خیالی میں یہ پورا جملہ میں نے رواں انگلش میں ادا کیا تو ان دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''حیران مت ہوں میڈم!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بی پاکستانی اینڈ بائی پاکستانی!''

''آپ تو خاصے پڑھے لکھے ہیں۔'' شاہینہ نے ہنس کر کہا۔ ''کیا اسٹال والا آپ کو عارضی طور پر یہاں بٹھا گیا ہے؟''

''نہیں میڈم! یہ میرا اپنا اسٹال ہے۔''

''چلیے ہم دونوں سیٹ خرید لیتے ہیں۔'' نسرین نے کہا۔ ''بتائیے ان دونوں کا آپ کیا لیں گے؟''

''دیکھیے میڈم! میں بارگیننگ کا قائل نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں صرف ایک ہی قیمت بتاؤں گا۔ اگر آپ کو مناسب لگے تو لے لیجیے گا ورنہ چھوڑ دیجیے گا۔ اس سے آپ کا وقت بھی بچے گا اور میرا بھی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ان دونوں سیٹس کی قیمت میرے حساب سے ڈیڑھ ہزار روپے تھی۔ اس میں میرا منافع بھی شامل تھا۔

''ان دونوں سیٹ کی قیمت پندرہ سو روپے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''نو سو روپے اس فرنچ سیٹ کے اور چھ سو روپے دوسرے سیٹ کے... لیکن آپ میری فرسٹ کسٹمر ہیں اس لیے میں یہ دونوں سیٹ آپ کو چودہ سو روپے میں دے دوں گا۔''

''اس میں کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں ہوگا؟'' نسرین نے پوچھا۔

''میں نے آپ کے کہنے سے پہلے ہی سو روپے کا ڈسکاؤنٹ دے دیا ہے۔''

اسی وقت ایک گاہک اور آگیا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

وہ دونوں آپس میں کچھ کھسر پھسر کرتی رہیں پھر نسرین بولی۔ ''ہم ان دونوں کے تھرٹین ہنڈریڈ دے سکتے ہیں۔''

''سوری!'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں بارگیننگ کا قائل نہیں ہوں۔'' میں دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہوگیا۔

وہ دونوں آگے بڑھ گئیں۔ ان کا خیال ہوگا کہ میں بھی انہیں واپس بلاؤں گا اور کہوں گا کہ... چلیے تیرہ سو ہی میں لے جائیں لیکن میں نے انہیں بالکل ہی نظرانداز کردیا۔

کچھ دور جاکر وہ واپس آگئیں اور بولیں۔ ''لائیں، دونوں سیٹ پیک کردیں۔''

میں نے دونوں سیٹ پیک کر کے ان کی طرف بڑھادیے۔

نسرین نے مجھے ادائیگی کی اور وہ دونوں سیٹ لے کر آگے بڑھ گئیں۔

اسی وقت دو تین گاہک مزید آگئے۔ وہ تینوں ہی مرد تھے اس لیے مجھے زیادہ بارگیننگ نہیں کرنا پڑی۔

ان کے جانے کے بعد میرا پڑوسی اسٹال والا میرے پاس آیا اور ترش لہجے میں بولا۔ ''تم نے وہ دونوں سیٹ انہیں اتنی کم قیمت میں کیوں بیچے؟''

میں نے غور سے اسے دیکھا پھر رسان سے کہا۔ ''میں نے ان سے اتنی ہی قیمت لی ہے، جتنی لینا چاہیے۔''

''ابھی تمہیں دکان داری کا اندازہ نہیں ہے۔ آج تمہارا پہلا دن ہے اس لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم اس طرح مال دیتے رہے تو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔''

''اگر نقصان ہوا تو آئندہ قیمت بڑھا کر بیچوں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''خود ہی پچھتاؤ گے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے اسٹال کی طرف لوٹ گیا کیونکہ وہاں کچھ کسٹمر آگئے تھے۔

بارہ بجے کے بعد تو رش بہت بڑھ گیا۔ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملی۔

میں شام کو اسٹال سمیٹنے کی تیاری کر رہا تھا کہ دو آدمی آگئے۔ میں سمجھا کہ یہ گاہک ہیں۔ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''جی فرمائیے؟''

''سیکیورٹی ڈپازٹ نہیں دیا آپ نے؟'' ان میں سے ایک بولا جو دوسرے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ پڑھا لکھا نظر آرہا تھا۔

''سیکیورٹی ڈپازٹ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ تو افضل صاحب نے دے دیا ہوگا۔''

''افضل صاحب نے نہیں دیا ہے۔ یہ ڈپازٹ ہر اسٹال والا خود ہی دیتا ہے۔'' اسی شخص نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''کتنا ڈپازٹ دینا ہے مجھے؟

اصل میں آج میرا پہلا ہی دن ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"پانچ سو روپے۔" اس نے جواب دیا۔

"پانچ سو روپے؟" میں نے حیرت سے کہا پھر جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ وہ پیسے لے کر جانے لگے تو میں نے کہا۔ "اس کی رسید تو دے دیں۔"

"اس کی رسید نہیں ہوتی۔" پیسے لینے والے نے جواب دیا اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

میں نے شام کو حساب کیا تو معلوم ہوا کہ تمام اخراجات نکالنے کے بعد مجھے پانچ ہزار روپے بچے تھے۔ آغاز اچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اسی طرح اوسطاً میں پانچ ہزار روپے ہفتہ بھی کماتا رہا تو مہینے میں مجھے بیس ہزار روپے کی آمدنی ہو جائے گی۔ پندرہ ہزار روپے کے قریب مجھے ٹیوشن سے ملتے تھے۔ اتنی رقم میں تو میں بہت فراخ دلی سے نہ صرف اپنے بھائیوں کے تعلیمی اخراجات پورے کر سکتا تھا بلکہ گھر کا خرچ بھی اٹھا سکتا تھا۔

میں نے فوری طور پر ملازمت کرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور فیصلہ کر لیا کہ اب میں سی ایس ایس کا امتحان دوں گا۔

رات کو واپسی پر افضل چاچا سے ملاقات ہوئی۔ بازار میں ایک دو بار ان سے سامنا ہوا تھا لیکن بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔

"اور سنا پُتر ارسلان! دن کیسا گزرا؟"

"چاچا! دن تو میری توقع سے زیادہ اچھا گزرا۔ آج پہلے ہی دن پانچ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی ہے۔"

"صرف پانچ ہزار؟" افضل چاچا نے حیرت سے پوچھا۔ "پُتر! تُو نے حساب کتاب میں کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟ تیرے پاس سارے آئٹم مہنگے ہیں۔ میرے حساب سے تجھے کم سے کم آٹھ سے دس ہزار روپے کی بچت ہونی چاہیے۔"

"میں نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ حساب لگایا ہے چاچا۔ تمام اخراجات نکالنے کے بعد مجھے اتنی ہی آمدنی ہوئی ہے۔"

"چل، یہ بھی بہت ہے۔ آج تیرا پہلا دن تھا، شاید اس لیے۔ اللہ نے چاہا تو اگلے ہفتے تجھے اس سے زیادہ آمدنی ہوگی۔"

"چاچا! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے پوچھا۔ "یہ سیکیورٹی ڈپازٹ کیا ہوتا ہے؟ وہ لوگ مجھ سے پانچ سو روپے لے گئے اور کوئی رسید بھی نہیں دی۔"

افضل چاچا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ سنبھل کر بولے۔ "بیٹا! اس قسم کے بازاروں میں اکثر گاہکوں سے تلخ کلامی اور مار پیٹ تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر بازار کے دکان داروں اور اسٹالوں کی حفاظت کے لیے ایک کمیٹی کام کر رہی ہے۔ یہ کمیٹی دکان داروں کی حفاظت کرتی ہے۔ ظاہر ہے، وہ یہ کام فی سبیل اللہ تو نہیں کریں گے۔"

میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر واپس آ گیا۔

☆☆☆

مجھے اتوار بازار میں اسٹال لگاتے ہوئے چھ سات ہفتے ہو گئے تھے۔ گھر میں خاصی خوش حالی آ گئی تھی۔ زندگی اچانک پُرسکون ہو گئی تھی۔ امی کو بھی اب اسٹال لگانے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ دو مہینے بعد اتنی رقم پس انداز ہو جائے گی کہ میں ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لوں گا۔ موٹر سائیکل سے مجھے یہ فائدہ ہوتا کہ میری ٹیوشنز میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ ابھی تو کئی ٹیوشنز میں نے محض اس لیے چھوڑ دی تھیں کہ وہ ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقوں میں تھیں۔

میں نے ابو کے ساتھ کھانا کھایا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ دیر باہر جا کر چہل قدمی کر لوں، پھر پڑھنے بیٹھوں گا۔ میں پوری تن دہی سے اپنی تعلیم میں بھی مصروف تھا۔

ان دنوں میٹرک اور نویں کے امتحانات شروع ہونے والے تھے اس لیے مجھے عثمان کو بھی پڑھانا پڑ رہا تھا۔ وہ بھی میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔

اسی وقت کال بیل بجی۔ ابو نے چونک کر کہا۔ "اس وقت کون آ گیا؟"

"عثمان کا کوئی دوست ہوگا۔" فرحانہ نے منہ بنا کر کہا۔ عثمان کے دوست کچھ زیادہ ہی تھے اور وہ وقت بے وقت آتے رہتے تھے۔ عثمان بھی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔

فرحانہ دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے کہا۔ "ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے دو اجنبی کھڑے تھے۔ وہ دونوں اپنے لباس سے معزز لگ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "جی فرمایئے؟"

"ہیڈ ماسٹر نثار صاحب کا گھر یہی ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔ وہ سفید براق شرٹ اور نیلی پینٹ میں ملبوس تھا۔

"جی ہاں.... آپ بالکل درست جگہ آئے ہیں۔"

"نثار صاحب گھر پر تشریف رکھتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ..."

"میں شاہد ہوں... ملک شاہد۔"

"ایک منٹ انتظار فرمائیں۔" یہ کہہ کر میں اندر آیا اور دوسری طرف سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ "آیئے، تشریف لایئے۔"

وہ دونوں اندر آ گئے۔ شاہد کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا۔

میں نے ابو کو بتایا کہ کوئی ملک شاہد صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

"ملک شاہد...؟" ابو نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں نہیں جانتا۔ شاید میرا کوئی پرانا اسٹوڈنٹ ہوگا۔" یہ کہہ کر ابو ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ میں بھی ابو کے ساتھ تھا۔

ابو ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہ دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے اور بہت ادب سے ابو کو سلام کیا۔

"تشریف رکھیے۔" ابو نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "ارسلان بیٹا! ذرا چائے کے لیے کہہ دو۔"

"کوئی تکلف نہ کریں سر!" شاہد نے کہا۔ "میں بس آپ کے دس منٹ لوں گا۔ آپ کو بے وقت تکلیف دینے کی معذرت چاہتا ہوں۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں شاہد صاحب!" ابو نے کہا۔

میں چائے کے لیے کہنے باہر نکل گیا۔ فرحانہ نے پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں چائے کے کپ ایک ٹرے میں رکھ کر مجھے دے دیے۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو شاہد ابو سے کہہ رہا تھا۔ "سر! آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک بچے کا تعلیمی سال کتنا قیمتی ہوتا ہے۔"

"مجھ سے زیادہ کسے اندازہ ہوگا۔" ابو نے مسکرا کر کہا۔ "زندگی بھر پڑھاتا رہا ہوں۔"

"تو پھر ایک بچے کا تعلیمی سال ضائع ہونے سے بچا لیجیے۔"

"فرمایئے، میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟ کیا اس بچے کو ابھی تک رول نمبر سلپ نہیں ملی یا بورڈ آفس کا کوئی چکر ہے؟ آپ فکر مت کریں۔ بورڈ آفس میں بھی میرے کئی شناسا ہیں۔ آپ بچے کا نام اور اسکول کا نام بتائیں۔ میں کل ہی اس کا ایڈمٹ کارڈ منگوا لوں گا۔"

"سر! اس کا ایڈمٹ کارڈ تو آ چکا ہے۔" شاہد نے ہنس کر کہا۔ "اس کا سینٹر سوسائٹی کے جس اسکول میں پڑا ہے، وہاں کے ہیڈ آپ ہیں۔"

"جی ہاں... میں ہی ہوں۔" ابو نے کہا۔ وہ اب کچھ کچھ معاملے کی نوعیت کو سمجھ رہے تھے۔

"سر! آپ سے ایک فیور چاہیے۔"

"کیا تعاون چاہتے ہیں آپ؟" ابو نے پوچھا۔

"میں ڈپٹی سیکریٹری کا پی اے ہوں۔" شاہد نے کہا۔

"اچھا، آپ شاہنواز میر صاحب کے پی اے ہیں۔" ابو نے کہا۔ "فرمایئے مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں جس بچے کی بات کر رہا ہوں وہ شاہنواز صاحب کا بیٹا ہے۔ اس کا نام سرفراز ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" ابو اب کچھ بے چین سے نظر آ رہے تھے۔ "میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں سر!" شاہد نے کہا۔ "اصل میں سرفراز اس سال خاصا بیمار رہا ہے۔ وہ امتحان کی تیاری بھی نہیں کر پایا ہے۔ شاہنواز صاحب چاہتے ہیں کہ اس کا تعلیمی سال ضائع ہونے سے بچ جائے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ پرچے کے دوران میں اس کے ساتھ تھوڑی رعایت کر دیں۔ اگر وہ کسی سے کچھ پوچھے تو اسے نظر انداز کر دیں۔"

"میں وہاں ہر کلاس میں تو جاؤں گا نہیں۔" ابو نے سرد لہجے میں کہا۔

"وہاں جو ٹیچرز ہیں ان سے میری بات ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تو راضی ہیں لیکن آپ کا نام سن کر جھجک رہے ہیں کیونکہ آپ اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ وہ لوگ یہی بتا رہے تھے کہ نثار صاحب اگر راضی ہو جائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"کھل کر بات کریں شاہد صاحب!" ابو نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آپ چاہتے ہیں کہ میں اس بچے کو نقل کرنے کی چھوٹ دے دوں۔ اس طرح ان بچوں کا نقصان ہوگا جو سارا سال محنت کرتے ہیں۔"

"سر! آپ یہ بھی تو سوچیے کہ ایک بچے کے تعلیمی سال کا سوال ہے۔" پھر اس نے بریف کیس ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ سیکریٹری صاحب نے آپ کے لیے کچھ گفٹس بھیجے ہیں۔"

"کیسے گفٹ؟" ابو کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"سر! آپ خود ہی دیکھ لیں۔" شاہد نے کہا۔

جب ابو نے بریف کیس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو اس نے خود ہی بریف کیس کھول کر ابو کے سامنے کر دیا۔ اس میں ہزار روپے کے نوٹوں کی کچھ گڈیاں، دو انتہائی قیمتی پین،

ایک لیدر کا فولڈر اور ایک مہنگا سیل فون تھا۔

''آپ مجھے رشوت دے رہے ہیں؟'' ابو نے گرج کر کہا۔

''یہ رشوت نہیں بلکہ تحفہ ہے۔'' شاہد نے کہا۔

''اٹھائیے اسے اور نکل جائیں۔'' ابو نے تلخ لہجے میں کہا۔

''دیکھیے جناب! میں آپ سے عزت اور احترام سے بات کر رہا ہوں اور آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ اس لہجے میں بات کرنا میں بھی جانتا ہوں۔''

''آپ کسی بھی لہجے میں بات نہ کریں تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب ابو نے آپ سے کہہ دیا تو آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔''

''سوچ لو ماسٹر!'' شاہد کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ ''اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت خوفناک نکلے گا۔''

''شٹ اَپ۔'' ابو نے کہا۔ ''اس قسم کی دھمکیاں سنتے ہوئے مجھے تیس سال ہو گئے ہیں۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں گا۔''

''جا رہا ہوں۔'' شاہد نے بریف کیس بند کر کے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ کو بہت پچھتانا پڑے گا۔''

پھر اس سے پہلے کہ ابو مزید کچھ کہتے، وہ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ ان دونوں نے چائے بھی نہیں پی تھی۔

ابو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور ان کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ غصے میں ان کی یہی حالت ہو جاتی تھی۔

میں انہیں اندر لے گیا اور انہیں ایک گلاس پانی پلایا تو ان کی حالت کچھ سنبھلی۔ وہ تلخ لہجے میں بولے۔ ''یہ تو حال ہے ملک کا! ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار خود یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے بیٹے کو نقل کی اجازت دی جائے۔ پھر لوگ ہمارے ملک کے نظامِ تعلیم میں کیڑے نکالتے ہیں، اہلیت کا رونا روتے ہیں۔ میں عموماً بچوں کی چھوٹی موٹی غلطیاں نظرانداز کر دیتا ہوں لیکن اس لڑکے کو تو میں گردن بھی نہیں ہلانے دوں گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ کون سے اساتذہ ہیں جو اس بچے کو نقل کرانے کو تیار ہو گئے۔''

''اچھا، اب آپ غصہ کر کے اپنا جی مت جلائیں۔'' امی نے کہا۔ ''یہ کوئی پہلا واقعہ تو ہے نہیں۔ اس سے پہلے بھی تو اس قسم کے واقعات ہو چکے ہیں۔''

''بس بیگم! دعا کرو کہ میری ملازمت کا جو ایک سال باقی رہ گیا ہے وہ بھی باعزت طور پر گزر جائے اور اللہ تعالیٰ مجھے ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔''

☆☆☆

اس دن ہفتہ تھا۔ میں لائبریری سے پڑھ کے گھر میں داخل ہوا تو دوپہر کے بارہ، ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ میرا ارادہ تھا کہ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کروں گا پھر اسٹال کے لیے سامان وغیرہ لینے نکل جاؤں گا۔ افضل چاچا نے مارکیٹ میں مجھے سب لوگوں سے ملوا دیا تھا اور اب ان کے بغیر میں سب کچھ کرنے لگا تھا۔ ہفتے کی سہ پہر ہی سے اسٹال لگنا شروع ہو جاتے تھے۔

ابھی میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کوئی نیا نمبر تھا۔ میں نے سوچا کہ مارکیٹ کا کوئی آدمی کال کر رہا ہو گا۔

میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کوئی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ہیڈ ماسٹر صاحب کے بیٹے ارسلان بول رہے ہیں؟''

''جی ہاں، فرمائیے۔'' میں اس کے انداز سے گھبرا گیا کہ خدانخواستہ ابو کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔

''میں ان کے اسکول کا ایک ٹیچر اقبال بات کر رہا ہوں۔''

''جی کہیے اقبال صاحب! میں سن رہا ہوں۔'' مجھے اس کے سسپنس پر غصہ آ رہا تھا۔

''ارسلان صاحب! ہیڈ ماسٹر صاحب کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ ''کیا کہا آپ نے؟''

''جی ہاں، انہیں ابھی کچھ دیر پہلے پولیس نے اس امتحانی مرکز سے گرفتار کیا ہے جہاں ان کی ڈیوٹی تھی۔''

''لیکن کیوں؟ اس وقت ابو کہاں ہیں؟'' میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ اس وقت فیروز آباد تھانے میں ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کا ٹیلی فون نمبر دیا تھا کہ میں آپ کو اطلاع دے دوں۔''

''میں پولیس اسٹیشن پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور عجلت میں.... تیزی سے جانے لگا۔

امی اس وقت کچن میں تھیں۔ فرحانہ کالج گئی ہوئی تھی اور عثمان اور عدنان بھی ابھی تک اسکول سے نہیں آئے تھے۔

مجھے جوتے پہنتے دیکھ کر امی نے حیرت سے پوچھا۔ ''ارسلان! کہاں جا رہے ہو؟ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ایسا بھی کیا کام؟'' وہ میرے لیے گرم روٹی لے کر آئی تھیں۔

''امی کھانا میں واپسی پر کھا لوں گا۔ اس وقت بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا میں باہر نکل گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر کون میری مدد کر سکتا ہے؟ میں گھر سے باہر نکل کر سوچتا رہا۔ میرے سب دوست اور جاننے والے بھی میری ہی طرح تھے۔

اچانک مجھے آصف کا خیال آیا۔ وہ میرے کام آ سکتا تھا۔ اس کے والد چند مہینے قبل ہی ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ آصف سے میری اچھی دوستی تھی۔ میرے پاس اس کا سیل نمبر بھی تھا۔

اسی وقت مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اسے روکا اور فیروز آباد پولیس اسٹیشن چلنے کو کہا۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے آصف کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی اور ہنس کر بولا۔ ''ہاں ارسلان! آج اتنے عرصے بعد کیسے خیال آ گیا؟ تو نے سوچا ہو گا کہ معلوم کر لوں کہ آصف زندہ ہے یا مر گیا۔ ابے یار! ہم تو...''

''اپنی ہی بکواس کیے جائے گا یا میری بات بھی سنے گا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''سوری یار! تو مجھے کچھ پریشان لگ رہا ہے؟''

''یار! ابو کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پولیس نے گرفتار کر لیا ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''کیوں... کیا کیا ہے انہوں نے؟''

''یہ تو ابھی مجھے بھی معلوم نہیں، میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ وہ فیروز آباد پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ تو کچھ کر سکتا ہے تو کر یار! انکل سے بات کر... ان کے تعلقات ہوں گے۔''

''تو پریشان مت ہو۔'' آصف نے کہا۔ ''میں ابھی بابا سے بات کرتا ہوں اور میں بھی پولیس اسٹیشن پہنچ رہا ہوں۔''

ٹیکسی ڈرائیور بہت غور سے میری باتیں سن رہا تھا اور مجھے بیک ویو مرر میں دیکھ بھی رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ ''صاحب! آپ سرشار کے بیٹے ہیں؟''

میں چونک اٹھا۔ ''ہاں، میں انہی کا بیٹا ہوں لیکن تم انہیں کیسے جانتے ہو؟''

''میٹرک میں وہ ہمارے کلاس ٹیچر تھے۔ یہ کوئی دس بارہ سال پرانی بات ہے۔ آپ کی شکل ان سے بہت ملتی ہے۔ لیکن صاحب! وہ تو بہت ایمان دار ہیں۔ انہیں پولیس نے کیوں گرفتار کر لیا ہے؟''

''یہ تو تھانے جا کر ہی معلوم ہو گا۔ مجھے صرف یہ اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ گھبرائیں مت صاحب! پولیس والوں کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ سرشار تو ان ٹیچرز میں سے ہیں جن کی ایمان داری کی مثالیں دی جاتی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر تھانے پہنچ جاؤں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔

''صاحب! فیروز آباد تھانے میں میرے بھی کچھ جاننے والے ہیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں، انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ زیادہ مت سوچیں۔''

اس نے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے آناً فاناً فیروز آباد تھانے پہنچا دیا۔

اس نے ٹیکسی تھانے سے کچھ فاصلے پر پارک کی اور خود بھی میرے ساتھ اتر گیا۔

میں نے اسے پیسے دینا چاہے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور بولا۔ ''مجھے پیسے دے کر شرمندہ نہ کریں۔ سرشار کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔''

تھانے میں افراتفری کا عالم تھا۔ کچھ لوگ باہر کھڑے تھے۔ اس وقت پولیس کی ایک موبائل وین دو آدمیوں کو لے کر آئی تھی جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

ٹیکسی ڈرائیور مجھے لے کر سیدھا ڈیوٹی افسر کے کمرے میں چلا گیا۔

ڈیوٹی پر موجود سب انسپکٹر نے اسے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''آؤ نواب! تم یہاں کیسے؟ کیا پھر کوئی واردات کر دی؟''

سب انسپکٹر کے جملے سے مجھے دھچکا سا لگا۔ گویا ٹیکسی ڈرائیور جرائم پیشہ تھا اور اکثر وہاں آتا رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر نواب نے ابو کے بارے میں کوئی بات کی تو اس کی بات کون سنے گا؟ میں اسے اپنے ساتھ لا کر پچھتا رہا تھا۔

''میں نے کوئی واردات نہیں کی ہے بلکہ ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''کیا ضروری کام ہے؟'' سب انسپکٹر نے کہا۔

''میرے ایک ٹیچر کو آپ لوگوں نے گرفتار کیا ہے۔ انہی کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

''تم کہیں ان ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات تو نہیں کر رہے جن پر رشوت کا الزام ہے؟''

''رشوت کا الزام؟'' نواب نے حیرت سے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ ان پر کیا الزام ہے۔'' نواب نے کہا۔ ''لیکن میں انہی کے سلسلے میں آیا ہوں۔ یہ ان کے بیٹے ہیں۔''

''میرا نام ارسلان ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے بتائیے کہ نثار صاحب پر کیا الزام ہے؟''

''انہوں نے نقل کرانے کے لیے ایک امیر زادے سے رشوت لی ہے۔ اینٹی کرپشن نے اچانک چھاپا مارا اور ان کے پاس سے نشان زدہ نوٹ برآمد کر لیے۔''

''انسپکٹر صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو خیر ان کا بیٹا ہوں۔ آپ ان کے کسی دشمن سے بھی معلوم کریں گے تو وہ یہی کہے گا کہ نثار صاحب پر اگر قتل کا الزام ہو تو ایک دفعہ ہم مان بھی لیں لیکن رشوت، بے ایمانی اور بددیانتی تو وہ کر ہی نہیں سکتے۔''

''بات اصل میں یہ ہے، کیا نام بتایا آپ نے... ہاں، ارسلان... تو بات یہ ہے ارسلان صاحب کہ نثار صاحب کو دیکھ کر ہمیں بھی یقین نہیں آتا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتے ہیں۔ وہاں موجود تمام ٹیچروں نے بھی گواہی دی کہ نثار صاحب یہ کام نہیں کر سکتے۔ انہیں پھنسایا جا رہا ہے۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے دار کا پی اے ابو کے لیے رشوت لے کر آیا تھا اور ابو نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ کارروائی ضرور اسی سرکاری عہدے دار کی ہو گی۔

''انسپکٹر صاحب! کیا میں اپنے ابو سے مل سکتا ہوں؟''

''ویسے تو ان سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے لیکن آپ چونکہ نواب کے ساتھ آئے ہیں اس لیے میں آپ کی ملاقات کرا دوں گا۔ ذرا میں اس کام سے فارغ ہو جاؤں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

نواب مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ''دو چار سو روپے نکال کر الگ رکھ لیں۔ یہ لوگ بغیر پیسے کے کوئی کام نہیں کرتے۔ الگ رکھنے کو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی پولیس والے نے آپ کے پاس زیادہ رقم دیکھ لی تو وہ پھیل جائے گا اور دو سو کے بجائے پانچ سو مانگے گا۔''

میری جیب میں اس وقت تقریباً پچیس ہزار روپے تھے کیونکہ مجھے اسٹال کے لیے مال لینے بھی جانا تھا۔ میں کمرے سے باہر آیا اور سو سو روپے کے پانچ نوٹ بٹوے سے نکال کر قمیص کی سامنے والی جیب میں رکھ لیے۔

نواب ایک مرتبہ پھر سب انسپکٹر کے پاس پہنچ گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''ابھی پرچہ تو نہیں کٹا ہے نا؟''

''ابھی تو نہیں کٹا ہے لیکن کٹ جائے گا۔ ہم پر اوپر سے بہت دباؤ ہے۔'' پھر وہ رجسٹر بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''آیئے، میں ماسٹر صاحب سے آپ کی ملاقات کرا دوں۔''

ہم کمرے سے نکل کر کوریڈور میں پہنچے۔ تھانے کا لاک اپ دوسرے سرے پر تھا۔

چلتے ہوئے سب انسپکٹر نے کہا۔ ''وہاں موجود سنتری کو چائے پانی کے لیے کچھ دے دیجیے گا۔''

نواب نے میری طرف دیکھا اور غیر محسوس انداز میں دو انگلیوں سے اشارہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں سنتری کو دو سو سے زیادہ نہ دوں۔

لاک اپ کوریڈور کی دائیں جانب تھا۔ سب انسپکٹر نے سنتری کو آواز دی اور کہا۔ ''اوئے کرم داد! ان لوگوں کی ملاقات ماسٹر صاحب سے کرا دے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ذرا جلدی مل لیں۔ انچارج صاحب نے دیکھ لیا تو مجھ پر گرم ہو جائیں گے۔''

سنتری نے مجھے متوقع نظروں سے دیکھا، میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو نوٹ نکالے اور خاموشی سے سنتری کی طرف بڑھا دیے۔

سنتری نے نوٹ لے تو لیے لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ رقم کم ہے۔ پھر اس نے ہم سے کہا۔ ''جاؤ... جا کر مل لو لیکن زیادہ دیر مت لگانا۔''

میں اضطراب کے عالم میں آگے بڑھا اور لاک اپ کے آہنی سلاخوں والے دروازے پر نظر ڈالی تو مجھے ابو دکھائی دیے۔ وہ فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھے تھے۔ چہرے پر مردنی سی تھی۔ ان کی ٹائی گلے میں جھول رہی تھی اور ہمیشہ بے شکن رہنے والا لباس اس وقت شکن آلود تھا۔ وہ ویران ویران نظروں سے خلا میں نہ جانے کیا تک رہے تھے۔

میں نے انہیں آواز دی۔ ''ابو!'' انہیں اس حالت میں دیکھ کر میرا دل کٹ کر رہ گیا اس لیے میری آواز بھی بھرّا گئی۔

ابو نے چونک کر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''ابو! میں ارسلان ہوں۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر کچھ بلند لہجے میں کہا۔

ابو کی ویران آنکھوں میں کچھ چمک سی لہرائی پھر وہ اپنی

جگہ سے اٹھ کر بوجھل قدموں سے میرے پاس آئے۔

''یہ سب کیسے ہوا ابو؟'' میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''ابو! آپ ہی ہمت ہار دیں گے تو ہم کیا کریں گے؟'' میں نے بہت مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رکھے تھے۔

''ارسلان بیٹا! مجھے صدمہ تو اس بات کا ہے کہ میری برسوں کی بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی۔ پولیس نے وہاں تمام بچوں اور اساتذہ کے سامنے... مجھے... ہتھکڑی لگائی... میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔'' ابو کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

''ابو! خود کو سنبھالیں اور مجھے بتائیں کہ یہ سب کیسے ہوا؟''

''مجھے تو یہ سب اسی اعلیٰ سرکاری افسر کی سازش لگ رہی ہے۔ میں نے اس کے بیٹے کو نقل کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے انتقاماً ایسا کیا ہے۔ پیپر شروع ہونے سے پہلے ایک لڑکے نے اپنی ایک کتاب میرے پاس یہ کہہ کر رکھ دی کہ سر... اس کتاب کو حفاظت سے اپنے پاس رکھ لیں۔ کتاب تو اتنی قیمتی نہیں ہے لیکن اس میں موجود ڈاکیومنٹس بہت قیمتی ہیں۔ میں وہ کاغذات غلطی سے یہاں لے آیا ہوں۔ میں نے احتیاط کے طور پر وہ کتاب اپنی دراز میں رکھ لی اور اسے لاک کر دیا کیونکہ مجھے وہاں مستقل تو نہیں بیٹھنا تھا۔ وقفے وقفے سے دوسری کلاسوں کا راؤنڈ بھی لگانا تھا۔ پیپر ختم ہونے سے آدھا گھنٹا پہلے اچانک وہاں دو آدمی آئے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے اپنی شناخت کرائی۔ ایک اینٹی کرپشن کا انسپکٹر اور دوسرا مجسٹریٹ تھا۔ ان میں سے ایک بولا... آپ رشوت لے کر نقل کرواتے ہیں۔ میں نے کہا کیا بکواس کر رہے ہیں آپ... میں رشوت لوں گا؟''

''سر! اگر زحمت نہ ہو تو ہم آپ کی تلاشی لے لیں۔'' مجسٹریٹ نے کہا۔

''تلاشی بہت شوق سے لیں لیکن میں اس واقعے کی رپورٹ اوپر تک کروں گا۔ میں کورٹ میں ہتکِ عزت کا کیس دائر کروں گا۔''

''وہ آپ کا حق ہے سر!'' ان میں سے ایک بولا۔ ''لیکن ہم بھی مجبور ہیں۔''

''ان میں سے ایک نے میری جیبوں کی تلاشی لی۔ میری جیب سے جو نوٹ نکلے، ان کا خاص طور پر جائزہ لیا پھر نوٹ مجھے لوٹاتے ہوئے کہا..... آپ کے پاس بریف کیس بھی ہو گا... میں نے کہا۔ جی ہاں، میرے پاس بریف کیس بھی ہے۔ آپ اس کی بھی تلاشی لے لیں۔ میں نے بریف کیس اٹھا کر میز پر ڈال دیا۔ یہ لاک نہیں ہے آپ اسے کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔''

بریف کیس میں ابو کے کچھ کاغذات، سیل فون اور دیگر ضروری سامان تھا۔

ان دونوں نے بہت تفصیل سے بریف کیس کا جائزہ لیا۔ پھر بولے۔ ''آپ کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے یہ جھوٹی اطلاع آپ کے کسی دشمن نے دی ہے۔''

''آپ مطمئن ہو گئے ہوں تو میں اب اپنا کام کر لوں؟'' ابو نے کہا پھر چونک کر بولے ...... ہاں آپ نے میری ٹیبل کی درازوں کی تلاشی تو لی ہی نہیں۔ آپ اچھی طرح تسلی کر لیں اور مجھے یکسوئی سے اپنا کام کرنے دیں۔''

''میں نے دراز کی چابی ان کی طرف بڑھا دی۔ ان میں سے ایک انسپکٹر نے دراز کا لاک کھولا۔ وہ ایسا لاک تھا جو بیک وقت میز کی تینوں دراز کو لاک کر دیتا ہے۔ دراز میں بھی صرف امتحانی کاپیاں اور پرچے ہی تھے، یا پھر وہ کتاب تھی جو اس امیدوار نے مجھے دی تھی۔ ان دونوں نے درازوں کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا، پھر ان کے چہروں پر مایوسی نظر آئی۔''

ان میں سے ایک بولا۔ ''معذرت چاہتا ہوں سر! میں نے آپ کو فضول میں زحمت دی۔''

درازیں اس وقت تک کھلی ہوئی تھیں۔ اچانک ان کی نظر ایک کتاب پر پڑی۔ کتاب کے سرورق پر خاکی کاغذ کا کور تھا۔ انسپکٹر نے وہ کتاب اٹھا لی اور اس کے صفحات پلٹے تو اس میں سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکل کر فرش پر گر گئے۔

دونوں انسپکٹر چونک اٹھے۔ انہوں نے فرش پر گرنے والے نوٹ اٹھائے اور ان کا جائزہ لیا پھر ابو سے بولے۔

''ماسٹر صاحب! آپ سے یہ امید نہیں تھی۔''

''کیسی امید؟'' ابو نے جھنجلا کر پوچھا۔

''یہی امید کہ آپ جیسا معزز آدمی بھی رشوت لے سکتا ہے۔ یہ ہزار ہزار کے دس نوٹ ہیں اور سب ہی نشان زدہ ہیں۔ ہر نوٹ پر دستخط ہیں۔''

''یہ نوٹ میرے ہیں اور نہ یہ کتاب میری ہے۔'' ابو نے کہا۔ ''یہ کتاب ایک لڑکے نے میرے پاس یہ کہہ کر رکھوائی تھی کہ میں غلطی سے یہ کتاب لے آیا ہوں لیکن اس میں میرے کچھ اہم کاغذات ہیں اس لیے آپ اسے حفاظت سے رکھ لیں۔ میں پیپر کے بعد آپ سے لے لوں گا۔''

"آج پیپر کس چیز کا ہے؟" انسپکٹر کے لہجے میں اب طنز تھا۔

"آج انگلش کا پیپر ہے۔" ابو نے جواب دیا۔

"تو کیا انگلش کے پیپر میں مشتاق احمد یوسفی بھی شامل ہیں؟ یہ کتاب ملک کے ایک مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ کسی لڑکے نے آپ کے پاس رکھوائی تھی؟"

"میں کیا آپ کے خیال میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" ابو نے بگڑ کر کہا۔

"آپ خود ہی سوچیے ماسٹر صاحب کہ انگلش کے پیپر کی تیاری کے لیے کوئی بچہ یہ کتاب لے کر کیوں آئے گا؟"

"میں ابھی اس لڑکے کو بلاتا ہوں۔"

"اس کا نام بتایئے، ہم اسے بلا لیتے ہیں۔" ایک انسپکٹر بولا۔

"میں نے اس کا نام تو نہیں پوچھا تھا۔" ابو نے جواب دیا۔ "یوں بھی وہ لڑکا کسی دوسرے اسکول کا تھا اس لیے میں نے اس کا چہرہ بھی غور سے نہیں دیکھا۔ میں نے سوچا تھا کہ پیپر ختم ہونے کے بعد وہ خود ہی کتاب لینے میرے پاس آئے گا۔"

"ارشد! تم ہر کلاس میں جا کر پوچھو کہ کسی لڑکے نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس کوئی کتاب رکھوائی تھی؟" ابو نے کچھ لمحے توقف کیا پھر دوبارہ مجھے اپنی روداد سنانے لگے۔

"ارشد کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس دوران میں دوسرا انسپکٹر میرے سر پر یوں براجمان رہا جیسے میں فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد ارشد واپس آ گیا اور بولا۔ اس سینٹر کے کسی بھی لڑکے نے آپ کے پاس کوئی کتاب نہیں رکھوائی۔ میں آپ کو رشوت لینے کے جرم میں گرفتار کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ہتھکڑی نکالی اور میرے ہاتھ میں لگا دی۔ ہتھکڑی کا دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دوسرے انسپکٹر سے بولا... پولیس کو بلاؤ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو تھانے لے چلو۔"

"پولیس کی ایک موبائل باہر موجود ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "بلانے کی کیا ضرورت ہے۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "آیئے ہیڈ ماسٹر صاحب!"

"وہ لوگ اسی حالت میں مجھے سیڑھیوں سے نیچے کی منزل میں لے کر آئے۔ اس وقت پیپر ختم ہوا تھا اور بچے واپس جا رہے تھے۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر دوسری کلاسوں سے ٹیچرز بھی باہر نکل آئے۔ وہ سب حیران تھے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں یا پھر ابھی اور اسی وقت مجھے موت آ جائے تاکہ میں اس بدنامی اور ذلت سے تو بچ جاؤں جو ہونے والی تھی۔

"پولیس موبائل اسکول کے باہر کھڑی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو مجھے ہتھکڑی لگائے بغیر بھی لے جا سکتے تھے لیکن وہ تو مجھے ذلیل کرنے پر تلے ہوئے تھے پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ ضرور اس اعلیٰ سرکاری افسر کی انتقامی کارروائی ہے۔ وہ یوں ذلیل کر کے مجھے جتانا چاہتا ہے کہ تم نے میری آفر ٹھکرا کر جو حرکت کی ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ پولیس والے مجھے اسی حالت میں وین تک لے گئے اور عادی مجرموں کی طرح مجھے پولیس وین میں دھکیل دیا۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے وہاں اسکول کے بچوں اور راہ گیروں کا مجمع لگ گیا تھا۔ اس ذلت سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آ گئی ارسلان!"

یہ کہہ کر ابو پھر رونے لگے۔

"آپ فکر مت کریں ابو!" میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ورنہ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

جس باپ نے ہمیشہ مجھے نیکی اور ایمان داری کی تلقین کی تھی، آج وہ رشوت جیسے گھناؤنے جرم میں حوالات کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔

"میں نے ابھی آصف کو بلایا ہے ابو!" میں نے کہا۔ "اس کے والد ڈی ایس پی تھے۔ وہ ابھی آپ کو یہاں سے نکال لیں گے۔" پھر میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔ "ابو! آپ نے انہیں پہچانا، یہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں۔" میرا اشارہ نواب کی طرف تھا۔

ابو نے غور سے اسے دیکھا تو نواب خود ہی بولا۔ "میں نواب ہوں سر! وہی نواب جسے..."

"مجھے یاد آ گیا۔" ابو نے کہا۔ "تمہاری شرارتیں اب بھی جاری ہیں یا کچھ سدھر گئے ہو؟ تعلیم تو تم نے میٹرک کے بعد ہی چھوڑ دی تھی۔ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"سر! میں آج کل ٹیکسی چلا رہا ہوں۔"

"بیٹا! محنت کے کسی بھی کام میں کوئی عیب نہیں ہے۔" ابو اچانک ماسٹر بن گئے۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ ابو کا دھیان کچھ بٹے۔

اسی وقت سنتری آ گیا اور بولا۔ "بس کریں صاحب! کیوں میری نوکری کے پیچھے پڑے ہیں؟"

"آپ فکر مت کیجیے گا ابو! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر میں بوجھل قدموں ...... سے باہر نکل آیا۔

اسی وقت مجھے آصف نظر آیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اس کے والد بھی تھے۔ وہ اس وقت ایس ایچ او کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"یار! میں کب سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں... تُو کہاں تھا؟" آصف نے پوچھا۔

"میں ابو سے ملاقات کر رہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے میرا دل بھر آیا اور میں آصف سے لپٹ کر بری طرح رونے لگا۔

"ارے ارسلان! حوصلہ کر۔" آصف نے کہا۔ "بابا انچارج سے بات کر رہے ہیں نا، فکر مت کر... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ایس ایچ او کے کمرے سے ایک سنتری باہر نکلا اور بولا۔ "ارسلان کون ہے؟ انچارج صاحب اسے بلا رہے ہیں۔"

میں اور آصف انچارج کے کمرے میں چلے آئے۔ آصف کے والد ڈی ایس پی عارف اور انچارج کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ دونوں ہی خاموش تھے۔

پھر انکل عارف نے مجھ سے کہا۔ "ارسلان بیٹا! معاملہ کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا ہے۔ تمہارے والد کو باقاعدہ پھنسایا گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دو تین جگہ اوپر بھی بات کی ہے۔ وہ لوگ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ان پر دباؤ ہے اس لیے وہ فوری طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں، کورٹ سے نثار صاحب کی ضمانت ہو جائے گی۔"

"کورٹ سے ضمانت ہو جائے گی؟" میں نے کہا۔ "ابھی تو ایف آئی آر بھی نہیں کٹی۔"

"ایف آئی آر کٹ چکی ہے بیٹا!" انچارج نے کہا۔ "میں تو آخر وقت تک اس معاملے کو ٹالتا رہا لیکن جب مجھے سختی سے حکم دیا گیا تو مجھے پرچہ درج کرنا پڑا۔"

"آج ہفتہ ہے، کل اتوار کو کورٹس بند ہوتی ہیں۔ اب تو پرسوں ہی ضمانت ہو سکے گی۔" انکل عارف نے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "کیا ابو اس وقت تک لاک اپ میں رہیں گے؟"

"مجبوری ہے بیٹا!" انکل نے کہا۔ "کوئی عام کیس ہوتا تو میں ابھی اور اسی وقت انہیں شخصی ضمانت پر رہا کرا لیتا لیکن یہ کیس تو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بنایا گیا ہے۔"

"تم فکر مت کرو بیٹا!" انچارج نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہاں تمہارے ابو کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تم جب چاہو ان سے مل سکتے ہو۔ گھر سے کھانا لا سکتے ہو، انہیں سگریٹ وغیرہ بھی دے سکتے ہو۔ ایک ہی دن کی تو بات ہے۔"

"ابو یہ سب کیسے برداشت کریں گے؟" میں نے کہا۔ "وہ تو یہ سن کر ہی مر جائیں گے کہ انہیں دو دن حوالات میں گزارنا پڑیں گے۔"

"میں تمہارے ابو کو سمجھا دیتا ہوں۔" انکل عارف نے کہا۔ "وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی ہیں۔ میری بات سمجھ جائیں گے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "ہاں، تم بھی پریشان مت ہونا، میں نے بیرسٹر نصیر باجوہ سے بات کر لی ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"نصیر باجوہ تو بہت بڑے وکیل ہیں انکل! وہ اتنا چھوٹا کیس کیوں لیں گے؟"

"واقعی وہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے کیس ہی لیتے ہیں لیکن وہ میرے بچپن کے دوست ہیں اس لیے راضی ہو گئے ہیں۔ مجسٹریٹ تو ان کا نام سن کر ہی تمہارے ابو کی ضمانت کر دے گا۔"

باجوہ صاحب واقعی بہت معروف اور ذہین وکیل تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ بار کونسل کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

"اب تم گھر جاؤ اور اپنی والدہ اور بہن کو تسلی دو۔ ممکن ہے یہ اطلاع انہیں مل چکی ہو۔"

میں باہر نکل ہی رہا تھا کہ باجوہ صاحب انچارج کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انچارج نے اپنی کرسی سے اٹھ کر بیرسٹر باجوہ کا خیر مقدم کیا۔

"نثار صاحب کہاں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔ "عارف! جلدی سے میری ان سے ملاقات کراؤ۔ میں ان کا اسٹیٹ منٹ لے لوں اور وکالت نامے پر سائن کرا لوں۔"

"کچھ دیر بیٹھیں سر!" انچارج نے کہا۔ "میں نے آپ کے لیے چائے منگوائی ہے۔"

"تھینک یو انسپکٹر صاحب!" بیرسٹر باجوہ نے کہا۔ "مجھے ابھی بار کونسل کی ایک میٹنگ میں بھی جانا ہے۔ چائے پھر کبھی سہی۔ چلو عارف! مجھے نثار صاحب کے پاس لے چلو۔"

میں نے ان کے ساتھ جانے کی کوشش کی لیکن انکل عارف نے مجھے روک دیا۔

میں نے سوچا کہ ابو بھوکے ہوں گے۔ میں گھر کے بجائے یہیں سے ان کے لیے کھانا لے لوں۔

میرے ساتھ ہی آصف بھی باہر آ گیا۔ نواب بھی ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "نواب! اب تم جاؤ۔ ویسے بھی تمہارا بہت وقت برباد ہو گیا۔ تم نے تو آج کچھ بھی نہیں

کمایا۔‘‘

’’کیسی باتیں کرتے ہیں ارسلان صاحب! سر نثار کے لیے تو میں جتنا بھی کروں کم ہے اور میں نے کیا ہی کیا ہے؟‘‘

’’تم مجھے اپنا سیل نمبر دے دو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔‘‘

’’ہاں، آپ بھی اپنا نمبر مجھے دے دیں۔‘‘

میں نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور اس سے کہا۔ ’’اب آصف آ گیا ہے۔ یہ میرے ساتھ رہے گا۔ اس کے پاس گاڑی بھی ہے۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔‘‘

’’اچھا آپ یہیں ٹھہریں، میں سر کے لیے کھانا لے آتا ہوں۔ ممکن ہے یہاں آپ کی ضرورت پڑ جائے۔‘‘

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے لیکن نواب نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اور جلدی سے اپنی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

ہم لوگ دوبارہ پولیس اسٹیشن کے اندر گئے تو باجوہ صاحب ابو سے مل کر واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ’’تم بالکل پریشان مت ہو بیٹا! میں پہلی ہی پیشی پر نثار صاحب کی ضمانت کرا لوں گا۔‘‘

’’مجھے یقین ہے سر!‘‘ میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

پھر باجوہ صاحب وہاں سے روانہ ہو گئے۔

انکل عارف ہماری طرف آ گئے اور وہ آصف سے بولے۔ ’’آصف! میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔ گاڑی تم اپنے پاس ہی رکھو، تم لوگوں کو اس وقت گاڑی کی زیادہ ضرورت ہے۔‘‘ پھر وہ مجھے مزید تسلی دے کر جانے لگے۔ انہوں نے جاتے جاتے پھر ایک مرتبہ بتایا کہ تم کسی بھی وقت نثار صاحب سے مل سکتے ہو۔ میں نے انچارج اور دوسرے انسپکٹر سے بات کر لی ہے۔ اس کیس کا تفتیشی افسر سب انسپکٹر خالد رانا ہے۔ میں نے اسے بھی بتا دیا ہے۔ اس نے کئی سال میری ماتحتی میں کام کیا ہے۔ وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا اور ابھی کچھ دیر بعد نثار صاحب کو لاک اپ سے نکال کر کسی دوسرے کمرے میں بٹھا دے گا۔

ان کے جانے کے بعد آصف نے مجھ سے کہا۔ ’’یار! تُو بھی تو صبح سے بھوکا ہوگا۔ چل کچھ کھا لیتے ہیں۔‘‘

’’نواب ابھی ابو کے لیے کھانا لینے گیا ہے۔ میں انہیں کھلانے کے بعد ہی کچھ کھاؤں گا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد نواب بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کئی شاپرز تھے۔ وہ بریانی، کڑاہی اور تافتان کے ساتھ منرل واٹر کی دو بوتلیں بھی لایا تھا۔ دو ڈسپوزیبل گلاس اور پلیٹیں بھی تھیں اور پلاسٹک کے چمچے بھی۔

’’اتنا سب کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’ابو کی خوراک تو بہت کم ہے۔‘‘

’’بس میری جو سمجھ میں آیا، میں وہ لے آیا۔‘‘ نواب نے کہا۔

’’اچھا نواب! اب تم جاؤ۔ میں تمہیں ٹیلی فون پر اطلاع دے دوں گا۔‘‘

’’اچھا ارسلان صاحب!‘‘ نواب نے کہا۔ ’’مجھے بتایئے گا ضرور۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

آصف کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ یہ ابو کا کوئی شاگرد ہے۔ پھر ہم کھانے کے شاپرز لیے اندر گئے تو آصف نے ایس آئی خالد رانا کے بارے میں پوچھا۔ ایک کانسٹیبل نے ہمیں اس کے پاس پہنچا دیا۔ وہ کسرتی جسم کا گورا چٹا آدمی تھا۔

آصف نے اسے یہ بتایا کہ میں عارف صاحب کا بیٹا ہوں تو وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ’’ہاں، ڈی ایس پی صاحب نے مجھے بتایا تھا۔‘‘ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

’’آپ شاید ہیڈ ماسٹر صاحب کے بیٹے ہیں؟‘‘

’’جی ہاں، ہم ان کے لیے کھانا لائے ہیں۔‘‘

’’اچھا آپ بیٹھیے، میں نثار صاحب کو بلواتا ہوں۔‘‘

اس نے ایک کانسٹیبل کو آواز دی اور کہا کہ نثار صاحب کو یہاں لے آؤ۔

تھوڑی دیر بعد ابو وہاں آ گئے۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی نہیں تھی اور اب وہ انتہائی صدمے سے خاصے سنبھل گئے تھے۔

’’ماسٹر صاحب!‘‘ خالد رانا نے کہا۔ ’’پہلے آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیں۔ یہ سامنے باتھ روم ہے، وہاں چلے جائیں۔‘‘

ہم نے اس دوران میں کھانا نکال کر میز پر لگا دیا۔ ابو باتھ روم سے آئے تو ان کی حالت مجھے مزید بہتر نظر آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کھانا کھا لیں۔

’’ارے بیٹا! تم نے اتنا کھانا منگوا لیا۔ مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔‘‘

’’ابو! بھوک نہ بھی ہو تب بھی انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانا تو پڑتا ہے۔ یہ آپ ہی تو کہتے ہیں۔ آیئے کھانا کھایئے۔‘‘

’’آپ بھی کچھ کھا لیں۔‘‘ آصف نے خالد رانا سے کہا۔

’’میں لنچ کر چکا ہوں۔‘‘ خالد رانا نے جواب دیا۔ ’’آپ لوگ ماسٹر صاحب کو کھانا کھلائیں۔ میں دروازہ باہر سے بند کر دیتا ہوں تاکہ کوئی آپ کو ڈسٹرب نہ کرے۔ باہر سنتری موجود ہوگا۔ جب آپ لوگ کھانے سے فارغ ہو جائیں تو دروازہ کھلوا لیجیے گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ابو نے اصرار کر کے مجھے اور آصف کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ابو نے تھوڑا سا کھانا کھا کے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے بھی دو چار لقمے لیے، دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے بچا ہوا کھانا باندھا، پیپر گلاس اور پلیٹیں ڈسٹ بن میں پھینکیں اور ابو سے کہا۔ ’’آپ کا پائپ اور تمباکو یاد نہیں رہا، ابھی تھوڑی دیر میں لے آؤں گا۔‘‘

’’شاپر میں سگریٹ کے دو پیکٹ بھی موجود تھے۔‘‘ آصف نے کہا۔ ’’انکل جب تک ان سے کام چلا سکتے ہیں۔‘‘

’’ارے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔‘‘ ابو نے کہا۔ ’’تم نے اب تک اپنی امی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تم گھر بھی نہیں گئے ہو گے۔‘‘ ابو کچھ سوچ کر بولے۔ ’’ہم گھر جا کر اپنی ماں اور فرحانہ کو تسلی دو۔ خاص طور پر زبیدہ کو سنبھالو، وہ تو اس صدمے سے مر ہی جائے گی۔ میری فکر مت کرو، میں یہاں بہت سکون سے ہوں۔ اللہ بھلا کرے عارف صاحب کا... بس اب تم گھر جاؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے ابو!‘‘ میں نے کہا۔ ’’اب میں رات کو کھانا لے کر آؤں گا تو آپ سے ملاقات ہوگی۔‘‘

آصف نے دروازے پر دستک دی تو سنتری نے باہر سے دروازہ کھول دیا اور بولا۔ ’’آپ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے ہیں جی؟‘‘

’’ہاں، ہم لوگ فارغ ہو گئے ہیں۔‘‘ آصف نے کہا اور بچے ہوئے کھانے کے شاپرز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ’’کھانا بہت زیادہ بچ گیا ہے۔ آپ اسے مستحق آدمی کو دے دیں ورنہ ضائع ہو جائے گا۔‘‘

اس نے شاپرز لے لیے اور ہم سے بولا۔ ’’ایک منٹ ذرا ٹھہریں۔‘‘ پھر اس نے بلند آواز میں کسی سے کہا۔ ’’ذرا رانا صاحب کو بھیجو۔‘‘

فوراً ہی سب انسپکٹر خالد رانا وہاں آ گیا اور بولا۔ ’’آپ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’آپ رات کو بارہ بجے سے پہلے کسی بھی وقت یہاں آ کر نثار صاحب سے مل سکتے ہیں۔ میں نے دوسرے افسروں اور سنتریوں کو بتا دیا ہے کہ آپ کو ملنے سے نہ روکا جائے۔‘‘

’’آپ کا بہت شکریہ!‘‘ میں نے کہا اور ابو سے رخصت لے کر ہم تھانے سے باہر آ گئے۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد آصف نے کہا۔ ’’یار! جب تُو رات کو کھانا لے کر آئے گا تو مجھے ایک کال کر دینا۔ میں تیرے گھر پہنچ جاؤں گا۔‘‘

’’اب تُو بار بار کیا تکلیف کرے گا۔ میں کھانا لے آؤں گا۔‘‘

’’زیادہ بک بک مت کر۔‘‘ آصف نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

میں نے کال بیل بجائی تو اندر سے فوراً ہی بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی فرحانہ تھی۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی اور رونے کی وجہ سے آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

میں اور آصف گھر میں داخل ہوئے تو وہ متلاشی نظروں سے ہمارے پیچھے دیکھنے لگی اور گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔ ’’بھیا! ابو کہاں ہیں؟‘‘

’’ابو کچھ قانونی کارروائی کی وجہ سے ابھی وہیں ہیں، وہ بعد میں آئیں گے۔‘‘ میں نے اسے گول مول جواب دیا۔ اس وقت تک عثمان اور عدنان بھی وہاں آ گئے تھے اور وہ بھی متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ پھر عثمان نے بھی ابو کے بارے میں وہی سوال کیا۔ میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔

پھر فرحانہ سے پوچھا۔ ’’امی کہاں ہیں؟‘‘

’’امی کو شکیلہ آنٹی کسی بابا کے پاس لے گئی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بابا کے عمل سے ابو آج ہی گھر پہنچ جائیں گے۔‘‘

’’تم نے امی کو روکا نہیں؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’شکیلہ آنٹی کی تو پوری زندگی ان عاملوں اور باباؤں کے چکر میں گزر گئی۔‘‘ میں نے تلخی سے کہا۔ ’’تم ایسا کرو جلدی سے دو کپ اچھی سی کافی بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔‘‘

’’بھیا! آپ نے تو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میں پہلے کھانا لاتی ہوں۔ آصف بھائی بھی بھوکے ہوں گے۔‘‘

’’ہم لوگ ابو کے ساتھ کھانا کھا چکے ہیں، تم بس کافی پلا دو۔‘‘ میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے عثمان سے پوچھا۔ ’’تمہارا پیپر کیسا ہوا؟‘‘

’’اے ون بھیا!‘‘ عثمان نے کہا۔ ’’آج کا پیپر تو کچھ

زیادہ ہی آسان تھا۔''

''تم کسی بھی بات کی ٹینشن مت لینا، اپنی ساری توجہ پڑھائی پر رکھو۔ ابو بھی جلد آ جائیں گے۔''

میں نے اپنے کمرے میں بیڈ کے بجائے میٹرس ڈال رکھا تھا۔ میں جوتے اتار کر گدے پر نیم دراز ہو گیا اور آصف بھی۔

فرحانہ کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم لوگوں کو اس بات کا علم کیسے ہوا؟''

''آج کل میڈیا بہت تیز ہے بھیا! میں نے کالج سے آ کر ٹی وی کھولا تو خبریں نشر ہو رہی تھیں اور نیوز کاسٹر ہیڈ لائنز پڑھ رہی تھی۔ امی بھی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ امی ابو کی واپسی نہ ہونے پر پریشان تھیں۔ میں انہیں سمجھانے لگی کہ پیپر وغیرہ لینے میں دیر ہو گئی ہو گی۔ اچانک نیوز کاسٹر نے کہا۔ امتحانی مرکز کا ایک انچارج رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار۔ سوسائٹی کے علاقے میں واقع امتحانی مرکز کے انچارج نثار احمد کو اینٹی کرپشن پولیس نے گرفتار کر کے ان کے قبضے سے نشان زدہ نوٹ برآمد کر لیے۔ اس کے ساتھ ہی امتحانی مرکز کا منظر اور ابو کی تصویر بھی تھی۔ امی گم صم سی ہو کر میری طرف دیکھنے لگیں، پھر بولیں.... فرحانہ! یہ کیا کہہ رہی ہے؟ پولیس نے کسے گرفتار کیا ہے اور تمہارے ابو کی تصویر کیوں دکھائی ہے؟''

''میں خود بری طرح بوکھلا گئی تھی لیکن امی کے خیال سے خود کو نہ جانے کیسے سنبھالا اور بولی۔ امی! ابو کے امتحانی مرکز میں کسی ٹیچر نے رشوت لینے کی کوشش کی تھی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔''

''لیکن ٹی وی والوں نے تمہارے ابو کی تصویر کیوں دکھائی؟'' امی نے پوچھا۔

''اس سینٹر کے انچارج تو ابو ہی ہیں۔ اس ٹیچر کو ابو ہی کی شکایت پر گرفتار کیا گیا ہے۔ میں نے جلدی سے بات بنائی۔ امی کچھ مطمئن ہوئیں، کچھ نہیں ہوئیں، وہ تو شکر ہے کہ نیوز کاسٹر نے اس وقت تفصیلی خبر نہیں بتائی اور وقفہ ہو گیا۔ میں بے دھیانی میں ٹی وی کے چینلز بدلتی رہی، پھر ٹی وی آف کر دیا۔

''امی بھی اٹھ کر کچن میں چلی گئیں اور مجھ سے کہا... فرحانہ! کیا آج کھانا کھانے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''امی! آج سلمٰی نے کالج کی کینٹین میں اچھا خاصا کھلا دیا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا کیونکہ وہ خبر سن کر میری بھوک اڑ گئی تھی۔ پھر شکیلہ آنٹی اور نفیسہ آنٹی بھی آ گئیں۔ انہوں نے ابو کی گرفتاری کے حوالے سے امی کو بتا دیا۔''

''مجھ سے تو فرحانہ نے... کہا تھا کہ...'' امی نے اپنا سر پکڑ لیا اور چکر کھا کر وہیں صوفے پر گر گئیں۔

''میں جلدی سے پانی لے کر آئی۔ شکیلہ آنٹی نے امی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسی وقت عثمان بھی آ گیا۔ امی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا اور فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا۔

''امی کو کچھ دیر بعد ہوش آ گیا۔ نفیسہ آنٹی اور شکیلہ آنٹی جا چکی تھیں۔ میں نے عثمان سے کہا کہ اب محلے کا کوئی بھی آدمی آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانا یا پھر باہر ہی سے ٹال دینا اور کہنا کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ کسی سے نہیں مل سکتیں۔ پھر میں مسلسل آپ کو کال کرتی رہی لیکن آپ کال ریسیو ہی نہیں کر رہے تھے۔''

''تم مجھے کال کرتی رہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر دیکھا۔ اس میں فرحانہ اور دوسرے لوگوں کی تقریباً ستائیس مسڈ کالز تھیں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میرا فون سائیلنٹ پر لگا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد امی بھی آ گئیں۔ وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور بولیں۔ ''ان کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اتنا گھناؤنا الزام انہوں نے کیسے برداشت کیا ہو گا؟ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ تو انہیں ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا؟''

''امی! حوصلہ رکھیں... ابو وہاں بہت آرام سے ہیں۔ وہ کوئی عادی مجرم یا بدمعاش نہیں ہیں۔ گریڈ سترہ کے سرکاری افسر ہیں۔ وہاں ہر شخص ان کا احترام کر رہا ہے۔ انہیں سب سے الگ ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔ وہاں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔'' پھر میں نے انہیں بتایا کہ یہ اسی اعلیٰ سرکاری افسر کی سازش ہے۔ پولیس کو بھی اس کا علم ہو چکا ہے۔ وہاں ابو کے کئی شاگرد بھی ہیں۔ وہ لوگ حقیقت کا سراغ لگا رہے ہیں۔ جلد ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اس لڑکے کا سراغ نہیں مل رہا تھا جس نے ابو کو وہ کتاب دی تھی لیکن پولیس نے اس کا بھی سراغ لگا لیا ہے اور اب کچھ ہی دیر میں اسے گرفتار کر لیں گے۔

میرے اس سفید جھوٹ سے امی کی کچھ ڈھارس بندھی۔ انہوں نے پھر ایک مرتبہ پوچھا۔ ''وہ وہاں خیریت سے تو ہیں... کسی پولیس والے نے ان کے ساتھ بدتمیزی تو نہیں کی؟''

''کیسی باتیں کرتی ہیں امی؟'' میں نے کہا۔ ''ابو ایک معزز آدمی ہیں... ان کے ڈپارٹمنٹ کے... لوگوں نے بھی یہ گواہی دی ہے کہ ابو کا ریکارڈ بے داغ ہے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

امی میری باتوں سے کچھ مطمئن ہو گئیں اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہم کوشش کریں تو اس لڑکے تک پہنچ سکتے ہیں۔

میں نے اس کا تذکرہ آصف سے کیا تو وہ بھی چونک اٹھا۔ ''یار! بات تو تیری ٹھیک ہے۔ اگر وہ لڑکا مل جائے تو پریشانی ہی ختم ہو جائے گی لیکن ہم اسے کہاں ڈھونڈیں گے؟''

''اس ڈپٹی سیکریٹری کا گھر تو معلوم کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ لڑکا سرفراز کا دوست ہو گا یا پھر اس کا کوئی جاننے والا۔ میں ابو سے ابھی اس لڑکے کا حلیہ پوچھوں گا، پھر اس لڑکے کی شناخت کرنا آسان ہو جائے گا۔''

''یار! میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔'' آصف نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم ڈائریکٹ سرفراز ہی سے پوچھ گچھ کریں؟''

''سرفراز ہمیں کہاں ملے گا؟'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے وہ اپنے گھر کے علاوہ اور کہاں ہو گا؟ کل چھٹی ہے ورنہ ہم پیپر دینے کے بعد بھی اسے پکڑ سکتے تھے۔ خیر، اس چھٹی کی وجہ سے ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔''

''یار! پہلے ابو کو کھانا اور ضروری چیزیں تو پہنچا دیں پھر کچھ سوچیں گے۔'' میں نے کہا اور فرحانہ کو آواز دی۔

فرحانہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔

''فرحانہ! تم ایسا کرو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ابو کا ایک جوڑا اور تولیا، ٹوتھ پیسٹ، برش، صابن اور ان کی شیونگ کٹ خاموشی سے لے کر آ جاؤ۔ امی کو معلوم نہ ہونے پائے۔''

''کیا مطلب بھیا؟'' فرحانہ نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ابو رات وہیں گزاریں گے؟''

''آہستہ بولو۔'' آصف نے کہا۔ ''کچھ قانونی مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے انہیں رات وہاں گزارنا پڑ رہی ہے۔ ہاں، ایک ٹفن میں ان کے لیے کھانا، چائے کا تھرماس اور انکل کا پائپ اور تمباکو کا پاؤچ بھی لیتی آنا۔''

''لیکن بھیا...''

''فرحانہ پلیز! اب جاؤ اور جلدی سے یہ چیزیں لے کر آؤ۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

فرحانہ خاموشی سے چلی گئی۔ ہم لوگ اس دوران میں چائے پیتے رہے اور سوچتے رہے کہ کل تک امی کو کیسے سمجھائیں گے؟ وہ تو ابھی تک یہی سمجھ رہی تھیں کہ ہم لوگ رات کو ابو کو گھر لے آئیں گے۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر افضل چاچا کا نام تھا۔

''السلام علیکم!'' میں نے کال ریسیو کرنے کے بعد کہا۔

''وعلیکم السلام!'' افضل چاچا نے جواب دیا پھر شکایتی انداز میں بولے۔ ''ارسلان! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تم نے مجھے بتایا تک نہیں کہ بھائی نثار کے ساتھ...''

''افضل چاچا!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ ناراض مت ہوں۔ مجھے اتنا ہوش ہی کب تھا۔ میں تو صبح سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔ میں ابھی آپ سے ملنے کے لیے ہی آ رہا تھا کہ آپ کی کال آ گئی۔''

''میں خود تیرے پاس آ رہا ہوں۔'' افضل چاچا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں اور آصف وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں پہنچے اور دروازہ کھولا تو افضل چاچا سامنے سے آ رہے تھے۔

میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور سارا واقعہ تفصیل سے بتا دیا۔

''میں اصل میں کراچی میں موجود نہیں تھا۔ حیدر آباد گیا ہوا تھا۔'' افضل چاچا نے کہا۔ ''ابھی آیا ہوں تو مجھے معلوم ہوا ہے۔'' پھر وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''تو بالکل پریشان مت ہو بیٹا اور پیسے کی بھی فکر مت کرنا۔ چار پانچ لاکھ کا بندوبست تو میں فوری طور پر کر سکتا ہوں۔''

''مجھے ضرورت پڑی تو آپ ہی سے کہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میرا ایک سالا پولیس میں ایس ایس پی ہے۔ میں ابھی اس سے بھی بات کرتا ہوں۔ ویسے پولیس والوں نے بھائی نثار کو پریشان تو نہیں کیا؟''

''نہیں چاچا! آصف کے والد بھی ڈی ایس پی تھے۔ ان کی وجہ سے ابو کو وہاں بہت رعایتیں مل گئی ہیں۔''

''میں ابھی جا کر اپنے سالے سے بات کرتا ہوں۔'' افضل چاچا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ان کے جانے کے بعد فرحانہ دو شاپرز میں تمام چیزیں لے آئی اور بولی۔ ''آپ ایک چیز بھول گئے تھے۔ ابو کو رات کو کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی۔ میں نے شاپر میں آج کے

اخبارات اور دو تین کتابیں بھی رکھ دی ہیں۔''

ہم وہ چیزیں لے کر تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ آصف نے راستے میں گاڑی روک کر منرل واٹر کی دو بوتلیں بھی خرید لیں کیونکہ ... ہم لوگ پانی لینا۔ بھول گئے تھے۔

ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو اس وقت رات کے نو بج رہے تھے اور اندر گاڑیاں بھی کم تھیں۔ آصف نے گاڑی اندر لے جانا چاہی تو ایک سنتری نے اسے روک دیا اور بولا۔

''صاحب! گاڑی باہر پارک کریں۔''

آصف جواب میں کوئی سخت جملہ بولنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

آصف نے گاڑی باہر پارک کی اور ہم لوگ...... شاپرز لے کر اندر داخل ہونے لگے تو سنتری نے ایک مرتبہ پھر روک لیا اور بولا۔ ''آپ اندر کہاں جا رہے ہیں؟''

''مجھے انچارج صاحب سے ملنا ہے۔'' آصف نے جھنجلا کر کہا۔

''وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔'' سنتری نے جواب دیا۔

''خالد رانا صاحب، نعیم صاحب یا ڈار صاحب موجود ہیں؟'' آصف نے بھنا کر کہا۔ ''میں ڈی ایس پی عارف خان کا بیٹا ہوں اور...''

''ارے سر... تو پہلے بتاتے نا!'' سنتری نے دانت نکال کر کہا۔ ''اصل میں انچارج صاحب اس وقت موجود تو ہیں لیکن انہوں نے خود ہی کہا ہے کہ کوئی پوچھے تو اس سے یہی کہو کہ انچارج صاحب موجود نہیں ہیں۔''

ہم جلدی سے اندر داخل ہو گئے ورنہ وہ باتونی سنتری نہ جانے اور کتنا بولتا۔

ہم سیدھے انچارج صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ انچارج نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا لیکن اس کے انداز میں پہلے والی گرم جوشی نہیں تھی۔

آصف نے کہا۔ ''سر! یہ کچھ چیزیں اور کھانا ہیڈ ماسٹر نثار صاحب کو پہنچانا ہے۔ میں...''

''سوری مسٹر!'' انچارج نے کہا۔ ''آپ لاک اپ میں کچھ بھی نہیں بھیج سکتے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' آصف جھنجلا گیا۔ ''آپ شاید مجھے پہچانے نہیں ہیں...''

''میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آپ ڈی ایس پی صاحب کے بیٹے ہیں لیکن میں بھی مجبور ہوں...... اوپر سے بہت سخت قسم کے آرڈرز ملے ہیں کہ نثار صاحب کے ساتھ کوئی بھی رعایت نہ کی جائے۔ جن لوگوں نے ماسٹر صاحب کے خلاف یہ سازش کی ہے، وہ بہت بارسوخ ہیں۔ انہیں اطلاع مل گئی ہو گی کہ نثار صاحب کے ساتھ یہاں خصوصی سلوک کیا جا رہا ہے۔''

''لیکن سر! یہ چیزیں تو ان تک بھجوا دیں۔ بے شک آپ ہمیں ان سے ملنے نہ دیں۔'' میں نے کہا۔

''سوری مسٹر!'' ایس ایچ او نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے خود بھی افسوس ہے لیکن آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہمیں کتنے سخت احکامات ملے ہیں۔ میں نے اگر ایسا کیا تو میری نوکری چلی جائے گی یا پھر کسی دور دراز علاقے میں ٹرانسفر کر دیا جائے گا۔''

مجھے اچانک شدید غصہ آ گیا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے غصے پر قابو پایا۔ اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بے چارہ تو حکم کا غلام تھا۔

میں بغیر کچھ کہے کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ آصف بھی میرے پیچھے پیچھے تھا۔

''یار آصف! یہ معاملہ تو الجھتا ہی جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس اعلیٰ سرکاری افسر کو گولی مار دوں۔''

''اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ ارسلان!'' آصف نے کہا۔ ''مجھے کچھ سوچنے دے۔''

ہم یہ باتیں کرتے ہوئے کوریڈور سے باہر نکل کر پولیس اسٹیشن کے احاطے میں آ گئے تھے۔

اچانک ایک سنتری ہمارے پاس آیا اور بولا۔ ''کیا ہوا صاحب جی! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی سنتری تھا جس نے سب انسپکٹر خالد رانا کے کہنے پر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے ابو کو کھانا کھانے کا موقع دیا تھا۔

''یار! پریشانی یہ ہے کہ اس وقت تو سب ٹھیک تھا لیکن اب انچارج صاحب کا رویہ ایک دم بدل گیا ہے۔''

''سر جی! بات یہ ہے کہ آپ لوگوں کے جانے کے بعد ایس ایس پی صاحب خود یہاں آئے تھے۔ پہلے تو انہوں نے انچارج صاحب اور دوسرے افسروں کو بری طرح ڈانٹا، پھر بولے کہ آپ لوگوں نے تھانے کو بھی مذاق بنا رکھا ہے۔ ماسٹر کو کس کے کہنے پر اتنی رعایت دی گئی ہے؟ آپ لوگوں نے ان سے کتنی رقم لی ہے؟ آئندہ ایسا ہوا تو میں پورے عملے کو معطل کر دوں گا۔ ملزموں کے ساتھ ملزمان والا ہی سلوک کرنا چاہیے۔ غریب آدمی کو تو مار مار کے آپ لوگ حلیہ بگاڑ دیتے ہیں، کئی ملزمان اس تشدد میں مر بھی جاتے ہیں، پھر نثار صاحب میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ وہ کوئی بڑے سیاسی لیڈر بھی نہیں ہیں۔ وہ کوئی صحافی بھی نہیں ہیں۔ وہ بس ایک ملزم ہیں۔ انہوں نے رشوت لی ہے اور رشوت لینا کوئی ایسا کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ وی آئی پی سلوک کیا جائے۔''

''ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ یہ چیزیں نثار صاحب تک پہنچ جائیں۔'' آصف نے کہا۔

''اس کی آپ فکر مت کریں۔'' سنتری نے آہستہ سے کہا۔ ''میں یہ چیزیں ان تک پہنچا دوں گا۔''

میں نے جیب سے سو سو روپے کے تین نوٹ نکالے اور سنتری کی طرف بڑھا دیے۔

اس نے خاموشی سے نوٹ لے کر جیب میں رکھے اور بولا۔ ''خالد رانا صاحب کو مت بتائیے گا کہ میں نے آپ لوگوں سے پیسے لیے ہیں۔''

''تم فکر مت کرو۔'' آصف نے کہا۔ ''اگر تم نے یہ چیزیں نثار صاحب تک پہنچا دیں تو کل میں تمہیں مزید رقم انعام میں دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، آپ یہ چیزیں وہاں رکھ دیں۔'' اس نے وہاں رکھی ہوئی ایک سنگی بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں موقع ملتے ہی خاموشی سے یہ چیزیں نثار صاحب تک پہنچا دوں گا۔''

''اچھا یہ بتاؤ۔'' آصف نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا کسی نے نثار صاحب پر تشدد بھی کیا ہے؟''

سنتری کچھ ہچکچایا اور بولا۔ ''تشدد تو نہیں سر! بس حوالدار عالم خان نے تفتیش کے موقع پر انہیں دو چار چمانٹ ضرور مارے تھے۔''

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس عمر میں ابو کو یہ ذلت بھی سہنا تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ نہ جانے یہ اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش تھی یا ہمارے کسی گناہ کی سزا تھی؟ میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے اندر ایک آگ سی لگ گئی تھی۔

''کیا سوچ رہا ہے ارسلان!'' آصف نے آہستہ سے کہا۔ ''چل یار... تُو نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے، انکل کے ساتھ بھی صرف دو چار لقمے ہی لیے تھے۔ پہلے کہیں چل کر کھانا کھاتے ہیں پھر اس مسئلے پر غور کرتے ہیں۔''

''یار! تو کھانے کی بات کر رہا ہے، مجھے تو سانس لینا دوبھر ہو رہا ہے۔ ابو نے یہ ذلت کیسے سہی ہو گی؟''

''مجھے بھی اس بات کا احساس ہے لیکن یار! دشمن سے لڑنے کے لیے بھی تو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خالی پیٹ انسان تو کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ چل پہلے کچھ کھا لیں۔''

وہ زبردستی مجھے ایک اسنیک بار میں لے گیا۔ میں واقعی بھوکا تھا۔ اس کے اصرار پر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ واقعی آصف ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ پیٹ خالی ہو تو انسان کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔

میرا ذہن بھٹکتا ہوا پھر اسی سرکاری افسر کی طرف چلا گیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے آصف سے کہا۔ ''کیوں نہ ہم اس افسر کے بیٹے ہی کو اغوا کر لیں؟''

''تو پاگل تو نہیں ہو گیا؟ کسی کو اغوا کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ تُو نے اس سے پہلے اغوا کی کتنی وارداتیں کی ہیں؟''

''ہر انسان کبھی نہ کبھی تو پہلی واردات کرتا ہی ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''وہ لوگ شروع ہی سے جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔'' آصف نے کہا۔ ''ان کے پاس ایسے وسائل ہوتے ہیں کہ وہ کسی کو اغوا کر سکتے ہیں۔ ہم کیا کریں گے؟ ہمارے پاس تو ہتھیار کے نام پر چھوٹا موٹا کوئی چاقو بھی نہیں ہے۔''

''انسان فیصلہ کر لے تو سارا بندوبست ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس وقت اس کے سوا کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تُو کچھ دیر ٹھنڈے دل سے سوچ، پھر ہم اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔'' آصف نے کہا۔ ''میں ذرا بابا سے بات کر لوں۔'' یہ کہہ کر وہ جیب سے اپنا سیل فون نکالنے لگا۔

اس نے انکل عارف کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''جی بابا! میں ارسلان کے ساتھ ہوں۔'' پھر اس نے انکل کو موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ میں اس دوران میں اضطرابی کیفیت میں مبتلا رہا۔

وہ سیل فون کا سلسلہ منقطع کر کے مجھ سے بولا۔ ''یار ارسلان! پولیس اسٹیشن کے انچارج نے بابا کو پہلے ہی سب کچھ تفصیل سے بتا دیا ہے۔ نہ صرف اس نے بلکہ ایس ایس پی نے بھی بابا کو ٹیلی فون کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ آئندہ قانونی معاملات میں مداخلت نہ ہی کریں تو ان کے حق میں بہتر ہو گا۔''

''سب مجبور ہیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''لیکن میں

مجبور نہیں ہوں۔ میں اب اس کو ضرور اغوا کروں گا۔''

''پولیس سب سے پہلے ہم ہی لوگوں پر شبہ کرے گی... تُو کیا چاہتا ہے کہ انکل کی طرح تُو بھی گرفتار ہو جائے؟''

''یار آصف! اگر تو میرا ساتھ نہیں دینا چاہتا تو نہ دے لیکن میں اس وقت کچھ بھی نہیں سمجھوں گا اس لیے مجھے سمجھانے کی کوشش مت کر۔''

''جو تیرا دل چاہے کر... میں تو ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں۔ جیل جائیں گے تو دونوں ساتھ جائیں گے لیکن یہ سمجھ لے کہ اس سے انکل کا معاملہ مزید پیچیدہ ہو جائے گا۔''

''ان کا اس معاملے سے کیا تعلق؟'' میں نے کہا۔ ''وہ تو خود لاک اپ میں ہیں۔ ان پر اس واردات کا شبہ کیسے کیا جائے گا؟''

''تُو کیا کسی اور ملک سے آیا ہے؟'' آصف نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یا اپنے ملک کی پولیس سے واقف نہیں ہے؟ یہاں تو پولیس بیٹے کے جرم کی پاداش میں ماؤں کو اٹھا لیتی ہے... تُو ایک دن صبر کر لے۔ باجوہ صاحب پہلی ہی پیشی میں انکل کی ضمانت کرا دیں گے۔ انکل پر کوئی دفعہ تین سو دو یا تین سو سات کا کیس نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ کیس بھی ہوتے تو باجوہ صاحب ان میں بھی ضمانت کرا لیتے۔''

''اور اس ایک دن میں ابو پر کیا گزرے گی۔ پولیس تو زیرِ تفتیش ملزمان سے رات کے وقت تفتیش کرتی ہے اور تُو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ ''تفتیش'' کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ ابو پر تو آج کی رات بھی بہت بھاری ہے۔ پولیس ان سے اپنی مرضی کا بیان حاصل کر لے گی۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کورٹ میں اس بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔''

''بہرحال، میں سرفراز کو تو آج ہی اغوا کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

''میری بات مان لے ارسلان۔'' آصف نے کہا۔ ''تیرے اس اقدام سے انکل کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''فائدہ ہوگا۔ جب بیٹے کی زندگی داؤ پر لگی ہو تو انسان سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ میں سرفراز کو اغوا کرنے کے بعد اس کے باپ سے کہوں گا کہ میرے ابو کو ابھی اور اسی وقت رہا کراؤ اور اپنے بیٹے کو بچا لو۔''

''کیا آج کل تُو انڈین فلمیں زیادہ دیکھ رہا ہے؟'' آصف نے ہنس کر کہا۔ ''یہ سب کچھ صرف فلموں میں ہوتا ہے۔''

''اب حقیقت میں بھی ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اچانک مجھے نواب کا خیال آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ڈیوٹی افسر کا وہ جملہ بھی یاد آیا جو اس نے نواب کو دیکھتے ہی کہا تھا کہ پھر کوئی واردات کر کے آئے ہو؟ اس کا مطلب یہی تھا کہ نواب کا ریکارڈ مجرمانہ تھا۔ وہ اس موقع پر میرے کام آ سکتا تھا۔

اس کا سیل نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور نواب کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی۔ پھر فوراً ہی نواب کی آواز آئی۔ ''جی ارسلان صاحب! کوئی نئی خبر؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں گلشن اقبال میں ایک سواری کو چھوڑ کر وہیں دوسری سواری کے انتظار میں کھڑا ہوں۔''

''تم فوری طور پر شہید ملت روڈ پر آ سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔ پھر اسے بتایا کہ ہم کس ریسٹورنٹ میں موجود ہیں۔

''میں ابھی دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔'' نواب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''تُو واقعی سنجیدہ ہے؟'' آصف نے پوچھا۔

''میں سو فیصد نہیں بلکہ دو سو فیصد سنجیدہ ہوں۔'' میں نے کہا۔

نواب اتنی طوفانی رفتار سے آیا تھا کہ وہ دس کے بجائے نو ہی منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

میں نے اس سے کھانے کا پوچھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔

میں نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

سب کچھ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''ان بے غیرتوں نے سرشار پر ہاتھ اٹھایا۔ میں نے ڈیوٹی افسر سے کہا بھی تھا کہ سرشار میرے باپ کی طرح ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ میں ان ہاتھوں ہی کو توڑ دوں گا جو سرشار پر اٹھے ہیں۔ ارسلان صاحب! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے پیسے لے کر لوگوں کے ہاتھ پیر بھی توڑے ہیں اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی کی ہیں۔''

''میرے لیے ایک کام کر سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ایک کیا، میں سرشار کے لیے تو ہزار کام کر سکتا ہوں۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔''

پھر وہ گویا ماضی میں چلا گیا۔ ''ارسلان صاحب! میں صرف تین سال کا تھا جب میرا باپ مر گیا تھا۔ ماں محنت مزدوری کرتی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں جھاڑو، برتن

صاف کرتی تھی تو ہمارے گھر میں چولہا جلتا تھا۔ ایک دفعہ ماں بیمار ہو گئی اور کئی دن کام پر نہ جا سکی۔ وہ دن تو ہم نے کسی نہ کسی طرح گزار لیے لیکن جب وہ دوبارہ کام پر گئی تو اسے کہیں کام نہیں ملا۔ لوگوں نے اس کی جگہ دوسری کام والیاں لگا لی تھیں۔

''وہ بہت خوفناک دن تھے۔ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا۔ اتنے چھوٹے بچے کے لیے تو ایک وقت کی بھوک برداشت کرنا بھی مشکل ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں تو اس دن تیسرا فاقہ تھا۔ مجھ میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ نقاہت سے بار بار مجھے غش آ رہے تھے۔ اردگرد کے لوگوں سے ماں پہلے ہی اتنا ادھار لے چکی تھی کہ اب کوئی ایک پیسا بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔

''ماں حسرت بھری نظروں سے بار بار میری طرف دیکھتی تھی۔ میں نقاہت کے عالم میں ہر بار یہی کہتا تھا... اماں! مجھے بھوک لگی ہے... پھر اماں کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور خودکلامی کے انداز میں بولی... اللہ، تُو میری مجبوری دیکھ رہا ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچے کو مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں اپنے بچے کے لیے اپنی عزت داؤ پر لگا رہی ہوں... یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

''کراچی میں اس زمانے میں بھی ایسے ہوٹل تھے جہاں غریبوں کو مفت میں کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن اماں کو ان ہوٹلوں کی خبر نہیں تھی ورنہ شاید ہمیں اتنے فاقے نہ کرنے پڑتے۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اماں اس وقت کہاں گئی ہے؟ اس وقت رات کے شاید آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے تھے۔

''یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اماں مجھے موت سے بچانے کے لیے اپنی عزت نیلام کرنے نکلی تھی۔ اسے ملے بھی تو سرشار...

''تھوڑی ہی دیر بعد وہ روٹی اور سالن کے ساتھ واپس آ گئی۔ سرشار نے جاتے ہوئے اماں کو دو سو روپے بھی دیے اور اسے ملازمت دلانے کا وعدہ بھی کیا۔ جاتے جاتے انہوں نے کہا۔ 'بہن! عزت سے زیادہ کچھ بھی قیمتی نہیں ہوتا، اولاد بھی نہیں۔'

''پھر سرشار نے اماں کو لڑکیوں کے ایک اسکول میں چپڑاسی کی ملازمت دلا دی اور ساتھ ساتھ مجھے بھی تعلیم دینے لگے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں لیکن پڑھائی میں میرا دل ہی نہ لگا اور میں نے میٹرک کے بعد ہی تعلیم چھوڑ دی۔

''اس زمانے میں میری دوستی کچھ غلط قسم کے لڑکوں سے ہو گئی اور میں ان کے ساتھ مل کر چوری کی چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے لگا۔ پھر اماں مر گئی تو مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں رہا۔ میں چوری کے الزام میں کئی دفعہ جیل بھی گیا ہوں اور پولیس کے ہر حربے سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔ سرشار میرے محسن ہیں۔ انہوں نے میری ماں کی عزت بچائی تھی۔ میں ان کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے ہمیں ایک باعزت زندگی گزارنے کا آسرا مہیا کر دیا تھا۔ ماں تو مرتے دم تک سچائی اور دیانت داری کی راہ پر چلتی رہی۔ سرشار بھی ہمیشہ ان کے ساتھ بہنوں والا سلوک کرتے رہے لیکن میں بدنصیب اس راہ پر نہ چل سکا۔''

پھر وہ چونک کر بولا۔ ''آپ حکم کریں ارسلان صاحب! مجھے کیا کرنا ہے؟''

''ایک لڑکے کو اغوا کرنا ہے۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے اس لڑکے کا ایڈریس بتائیں۔'' نواب نے سنجیدگی سے کہا۔

''ایڈریس تو مجھے بھی معلوم کرنا پڑے گا لیکن وہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

''کب اغوا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آج... بلکہ ابھی۔'' میں نے غصے سے بل کھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسے اغوا کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر کا بیٹا ہے۔''

''اگر وہ صدر کا بیٹا ہو، تب بھی میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' نواب نے کہا۔ ''میں نے اس سے پہلے بھی اغوا کی دو وارداتیں کی ہیں۔''

''تم لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' آصف بھنا کر بولا۔

''آصف پلیز!'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''تم سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اپنی زبان بند رکھنا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ سنجیدہ ہو؟''

''ہاں تو اب تک تم کیا اسے مذاق سمجھ رہے تھے؟'' پھر میں نواب سے مخاطب ہوا۔ ''اس وقت دس بجے ہیں۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں گیارہ بج جائیں گے۔''

''ہاں... یہ تو ہے۔'' نواب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایسے وقت میں اسے گھر سے باہر نکالنا مشکل ہوگا۔''

''اس کا بھی میرے پاس حل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم چلنے کی تیاری کرو۔''

''ارسلان! تم کیا کرنے جارہے ہو؟'' آصف نے چیخ کر کہا۔ ''کم سے کم اپنی امی، فرحانہ اور چھوٹے بھائیوں کا تو خیال کرلو۔''

''میں انہی کا خیال تو کررہا ہوں۔ پھر تم بھی تو موجود ہو۔ کیا مجھ سے دوستی کا اتنا حق بھی نہیں نبھاؤ گے؟'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت واقعی میرا ذہن کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بس میرے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ مجھے سرفراز کو اغوا کرنا ہے۔ مجھے ابو کی ذلت کا شدید احساس تھا۔ میری نظروں میں بار بار ان کا معصوم چہرہ آجاتا تھا۔

پھر آصف مجھے آوازیں ہی دیتا رہ گیا لیکن میں نے اس کی کسی آواز پر کان نہیں دھرا۔

نواب کی ٹیکسی نئی تو نہیں تھی لیکن بہت اچھی حالت میں تھی۔ اس کا انجن بھی بہت طاقت ور تھا۔

میں نواب کے ساتھ پہلے ایک میڈیکل اسٹور پر گیا اور میڈیکل اسٹور والے سے بہت مہذب انداز میں کہا۔ ''سر! آپ کے پاس ٹیلی فون ڈائریکٹری تو ہوگی؟''

''جی ہاں، ڈائریکٹری موجود ہے۔'' اس نے کہا اور ٹیلی فون اور ڈائریکٹری میرے سامنے رکھ کے خود گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے اس اعلیٰ سرکاری افسر کا ٹیلی فون نمبر اور ایڈریس نوٹ کیا اور میڈیکل اسٹور والے کا شکریہ ادا کرکے باہر آگیا۔

باہر آکر میں نواب کی ٹیکسی میں بیٹھا تو میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہ آصف کا فون تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ''ارسلان! کیا تجھے اپنی امی کا بھی خیال نہیں؟ ابھی تو صرف ان کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ تیری اس حرکت پر تو وہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکیں۔ پھر تو نے فرحانہ کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے۔ جو شخص انکل پر ذرا سی بات پر اتنا بڑا الزام لگا سکتا ہے وہ اپنے بیٹے کے اغوا پر کیا کچھ نہیں کرے گا۔ وہ سب سے پہلے فرحانہ کو اغوا کرائے گا۔ پھر چاہے تو اس کے بیٹے کو یا اس کے پورے خاندان کو ختم کردے۔ کیا تیری بہن کی عزت واپس آجائے گی؟ بس میں اب تجھ سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

واقعی اس کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں۔ یہ اس کی باتوں کا اثر تھا یا پھر میرا ذہن ابو کی ذلت کے صدمے سے سنبھل گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ابو تو پرسوں ضمانت کے بعد گھر آجائیں گے لیکن اگر میں نے ایسی کوئی حرکت کی تو واقعی فرحانہ کی عزت اور میرے بھائیوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیا یہ تمام صدمے سہہ کر ابو زندہ رہ سکیں گے؟

میں نے نواب سے کہا۔ ''نواب! واپس چلو۔ اب رات بہت ہوگئی ہے۔ اس معاملے کو بعد میں دیکھیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' نواب نے کہا۔ ''ویسے آپ جب بھی حکم کریں گے میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

میں نے آصف کو کال کی تو اس نے فوراً کال ریسیو کرلی۔ وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا ہوگا کہ ارسلان کو کیسے روکا جائے؟ میں نے اس سے کہا کہ فی الحال میں نے اغوا کا ارادہ ملتوی کردیا ہے اور میں واپس آرہا ہوں۔

''شکر ہے، تیری کھوپڑی میں کوئی بات تو بیٹھی۔'' ارسلان نے سکون کا طویل سانس لے کر کہا۔

نواب نے پھر مجھے اسی ریسٹورنٹ پر پہنچا دیا۔ وہ مجھ سے اور آصف سے مل کر چلا گیا۔

''یار! تو واپس آگیا، مجھے واقعی سکون مل گیا ورنہ ساری رات میں سو نہیں پاتا... چل اب گھر چلیں۔''

''یار آصف!'' میں نے کہا۔ ''مجھ میں اپنے گھر جانے کی تو ہمت نہیں ہے۔ گھر جا کر امی کو کیا جواب دوں گا؟ تو ٹیلی فون کرکے فرحانہ کو بتا دے کہ آج ارسلان گھر نہیں آئے گا۔''

آصف نے فرحانہ کو ٹیلی فون کردیا۔ اگر میں اس سے بات کرتا تو وہ ہزاروں سوالات کرتی۔

وہاں سے ہم لوگ آصف کے گھر چلے گئے۔ انکل عارف سونے کے لیے جا چکے تھے۔ آصف نے میرا دل بہلانے کو ٹی وی کھول لیا لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے ٹی وی بند کردیا پھر آصف دیر تک مجھ سے پرانی باتیں کرتا رہا، لیکن میرا دل کسی بھی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی محسوس ہورہی تھی اور گھبراہٹ کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔

جب دل بہت زیادہ گھبرایا تو میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

''کیا بات ہے ارسلان؟'' آصف نے تشویش سے پوچھا۔ ''تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''یار! عجیب سی کیفیت ہورہی ہے... دل ڈوبا جارہا ہے۔''

''تو سونے کی کوشش کر... صبح سے بھاگ دوڑ کررہا

ہے۔ بے آرامی سے بھی عموماً یہ کیفیت ہوجاتی ہے۔''

''مجھے نیند بھی تو نہیں آرہی۔'' میں نے کہا اور آصف کے اصرار پر لیٹ گیا لیکن نیند تو مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں کروٹیں بدلتا رہا۔

آصف سو چکا تھا۔ چار بجے کے قریب میرا دل پھر بہت بری طرح گھبرایا۔ میں نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر ٹہلنے لگا۔

آصف کی آنکھ کھل گئی اور اس نے پوچھا۔ ''ارسلان! تُو ابھی تک سویا نہیں؟ میں ایسا کرتا ہوں، نیند کی دو گولیاں لے آتا ہوں۔ بابا کبھی کبھی نیند کی گولیاں کھاتے ہیں۔ ان کے کمرے میں گولیاں موجود ہوں گی۔''

وہ باہر جانے کے ارادے سے اٹھا تو انکل عارف اچانک ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے تاثرات تھے۔

''کیا ہوا بابا؟'' آصف نے پوچھا۔

''خبر اچھی نہیں ہے۔'' انکل نے کہا پھر مجھ سے بولے۔ ''ارسلان! تمہیں بہت ہمت اور حوصلے سے یہ خبر سننا ہوگی۔''

''انکل! آخر بتائیں تو ہوا کیا ہے؟''

''بیٹا! پولیس اسٹیشن کے انچارج کا ٹیلی فون آیا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''انکل پلیز! مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟''

''بیٹا... وہ بتا رہا تھا کہ... اب نثار صاحب... اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''تو وہ کہاں چلے گئے؟ وہ پولیس اسٹیشن سے کہاں جا سکتے ہیں؟'' میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا پھر میں نے چونک کر کہا۔ ''کیا کہا آپ نے... انکل! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ارسلان بیٹا! صبر اور سکون سے میری بات سنو۔ نثار صاحب... اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' انکل نے افسردگی سے کہا۔

''کیا ہوا انہیں... کل دوپہر تک تو وہ بالکل ٹھیک تھے، کسی حد تک پُرسکون بھی تھے۔'' پھر مجھے زور کا چکر آیا اور مجھے ایسا لگا جیسے کمرے کی چھت میری طرف آرہی ہو۔ میں چکر کھا کر گرا تو آصف نے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ نہ جانے کتنا طویل تھا۔ آدھا گھنٹا یا شاید ایک گھنٹا... مجھے کچھ احساس نہیں تھا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو آصف مجھ پر جھکا ہوا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ''ارسلان! اب کیسی طبیعت ہے؟''

میں گھبرا کر اٹھ گیا۔ اس وقت وال کلاک پانچ بجا رہی تھی۔ گویا میں تقریباً ایک گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔

میں اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ آصف نے پوچھا۔ ''کہاں جارہا ہے؟''

''یار! ابو کے لیے چائے لے کر جانا ہے۔ وہ صبح نماز کے فوراً بعد چائے پینے کے عادی ہیں۔'' پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ ابو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہ سوچ کر میں بلک بلک کر رونے لگا۔

آصف نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ ''حوصلہ کر ارسلان! اب تجھے ہی سب کو سنبھالنا ہوگا۔ آنٹی کو، فرحانہ کو اور اپنے دونوں بھائیوں کو۔''

''میں پولیس اسٹیشن جارہا ہوں۔ اب تو ان لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' میں نے وحشت بھرے انداز میں کہا۔

''بابا وہاں گئے ہیں۔ تُو بے ہوش ہوگیا تھا۔ بابا نے اس وقت ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔ ڈاکٹر نے تجھے پُرسکون رہنے کے لیے نیند کا انجکشن دیا تھا اور کہا تھا کہ تجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ بابا اسی وقت پولیس اسٹیشن چلے گئے تھے۔''

''یار! مجھے وہاں جانا ہے۔ ابو وہاں اکیلے ہوں گے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

آصف بھی رونے لگا اور بولا۔ ''وہ اکیلے نہیں ہیں ارسلان! وہاں بہت سے لوگ ہوں گے۔''

میں نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

''گاڑی تو پاپا لے گئے ہیں، میں بائیک نکالتا ہوں۔'' آصف نے کہا۔

مجھے پھر ابو کا خیال آیا۔ ان کی حسرت بھری نظریں یاد آئیں، ان سے آخری ملاقات یاد آئی تو میرے آنسو پھر بہنے لگے۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''یار آصف! انصاف اور قانون کے ان ٹھیکے داروں نے میرے باپ کی جان لے لی۔ خوب صلہ ملا ہے انہیں اپنی نیکی اور ایمان داری کا!''

آصف نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ارسلان! تجھے جتنا رونا ہے رو لے۔ میں تجھے روکوں گا نہیں لیکن مجھ سے وعدہ کر کہ آنٹی اور گھر کے دوسرے لوگوں کے سامنے تیری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلے گا۔ اگر تُو ان کے سامنے رویا تو انہیں کون سنبھالے گا؟''

''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ امی اور فرحانہ کا سامنا کیسے کروں گا؟ کیسے انہیں یہ اندوہناک خبر سناؤں گا؟''

آصف بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بائیک نکالی اور ہم لوگ پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک ہی دن میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ کل اس وقت ابو نماز کے لیے اٹھے تھے اور آج ان کی نماز کی تیاری ہونے والی تھی۔

پولیس اسٹیشن میں اس وقت خلافِ معمول کئی گاڑیاں موجود تھیں۔

میں آصف کے ساتھ سیدھا تھانہ انچارج کے کمرے میں پہنچا۔ کمرے میں انچارج کے علاوہ دو تین آدمی اور بھی موجود تھے۔

''میرے ابو کہاں ہیں؟'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ آرام سے بیٹھ جائیں مسٹر ارسلان! وہ یہیں موجود ہیں۔'' پھر وہ وہاں موجود ایک شخص سے مخاطب ہوا۔ ''سر! یہ نثار صاحب کے بیٹے ہیں۔''

اسی وقت انکل عارف بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

میں ان سے لپٹ کر پھر رونے لگا اور بولا۔ ''انکل! ان لوگوں سے کہیں کہ اب تو مجھے ابو سے ملوا دیں۔ اب تو انہیں کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ڈیڈ باڈی ابھی تک آئی نہیں؟'' اس باوقار شخص نے پوچھا جس سے انچارج نے میرا تعارف کرایا تھا۔

''پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے سر! ڈیڈ باڈی ابھی تھوڑی دیر میں مل جائے گی۔''

''پوسٹ مارٹم؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کیوں؟ کیا ہوا تھا انہیں؟'' میں نے چیخ کر پوچھا۔

''نیچی آواز میں بات کریں مسٹر!'' وہاں موجود ایک اور شخص نے کہا۔ ''آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں۔ یہ ایس ایس پی صاحب ہیں۔''

''یہ ایس ایس پی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ میرے ابو کو واپس لا سکتے ہیں؟ آپ سب حکم کے غلام ہیں، کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں ہے اور آپ لوگ بلا سوچے سمجھے ان کے اشاروں پر ناچتے رہتے ہیں۔''

''ارسلان!'' انکل نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔'' وہ مجھے کمرے سے باہر لے گئے۔ ''ان لوگوں سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ جھنجلا کر تمہیں بھی کسی کیس میں بند کر دیں گے۔ یہ لوگ احساسات اور جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ میں نے تیس سال پولیس میں ملازمت کی ہے اور ان سب کی نفسیات اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ یہ اپنے افسرانِ بالا کا غصہ مجبور لوگوں پر اتارتے ہیں۔''

''انکل! آخر ابو کو اچانک کیا ہوا؟ وہ تو کل بالکل ٹھیک تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹا! پولیس کا مؤقف یہ ہے کہ انہوں نے خودکشی کی ہے۔''

''خودکشی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''نہیں انکل! ابو ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو خودکشی کر لیں۔ ان کی ساری زندگی حلال و حرام کی جنگ میں گزر گئی۔ وہ حرام موت مرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں پولیس نے ہلاک کیا ہے۔ وہ پولیس کے تشدد سے مرے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' انکل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ورنہ کوئی شخص محض شلوار کے کمربند سے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کیسے کر سکتا ہے۔ میں نے خود موقع کا جائزہ لیا ہے۔ جس کمرے میں ان سے تفتیش کی جا رہی تھی، اس کمرے میں پنکھے کے ہک میں ان کی لاش لٹکتی ہوئی پائی گئی تھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اتنی بلندی پر بغیر کسی سیڑھی یا کسی اور سہارے کے وہاں چڑھ نہیں سکتا۔ پھر اگر چڑھ بھی جائے تو شلوار کا کمربند اتنا مضبوط نہیں ہوتا کہ اسے گلے میں ڈال کر انسان لٹک سکے اور کافی دیر تک لٹکا رہے۔ پولیس نے وہاں اونچا سا ایک اسٹول اوندھا کر کے ڈال دیا ہے لیکن یہ سب خود ساختہ لگ رہا ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ موت کی اصل وجہ کیا ہے؟''

''یہ لوگ پوسٹ مارٹم کی من مانی رپورٹ بھی تو بنوا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔'' انکل نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم جس ڈاکٹر نے کیا ہے، وہ میرا خاص آدمی ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ رپورٹ میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ کرے۔ بس مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار ہے۔ کل تک رپورٹ مل جائے گی۔ ہاں، نثار صاحب کی ڈیڈ باڈی ابھی تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔ میں نے باجوہ کو بھی ٹیلی فون کر دیا ہے۔ وہ بھی بس پہنچنے ہی والا ہوگا۔''

''انکل! اب باجوہ صاحب بھی کیا کر لیں گے؟ وہ پھانسی کے مجرموں کو پھانسی کے پھندے سے تو چھڑا سکتے ہیں لیکن پھانسی کے بعد کسی شخص کو دوبارہ زندہ تو نہیں کر سکتے۔''

میں پھر رونے لگا۔

''ارسلان بیٹا! حوصلے سے کام لو۔ اب تو تم پر پورے گھر کی ذمے داری ہے۔ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو تمہارے گھر والوں کو کون سنبھالے گا؟''

اسی وقت ایک ایمبولینس شور مچاتی ہوئی تھانے کی حدود میں داخل ہوئی۔ انکل عارف نے بتایا۔ ''نثار صاحب کی ڈیڈ باڈی آ چکی ہے۔ تم انہیں لے کر گھر چلے جاؤ۔ باقی کارروائی سے میں نمٹ لوں گا۔ تمہیں بس ایک فارم فل کرنا ہوگا۔''

میں تو اس وقت بالکل گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس حالت میں امی کا سامنا کیسے کروں گا؟

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ افضل چاچا کا فون تھا۔ میں نے کال ریسیو کی تو افضل چاچا بولے۔ ''ارسلان پتر! میں نے اسٹال کے لیے ایک آدمی سے بات کر لی ہے... تو آج آرام کر۔''

''چاچا!'' اتنا کہنے کے بعد میری آواز بھرا گئی۔

''کیا ہوا بیٹا! سب خیریت تو ہے؟ تو رو کیوں رہا ہے؟''

''چاچا! آپ ابھی اور اسی وقت فیروز آباد تھانے آ جائیے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''سب خیریت تو ہے نا بیٹا؟'' چاچا کے لہجے میں بھی تشویش اور فکرمندی تھی۔ ''اچھا، میں آ رہا ہوں۔''

پھر میں نے نواب کو کال کی۔ وہ شاید سو رہا تھا کیونکہ تیسری یا چوتھی بیل پر اس کی غنودہ آواز سنائی دی۔ ''جی ارسلان صاحب! خیریت تو ہے... اتنی صبح صبح میری یاد کیسے آ گئی؟''

''تم ابھی فیروز آباد تھانے پہنچو۔'' میں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

پھر انکل مجھے ایک مرتبہ پھر انچارج کے آفس میں لے گئے۔ اس نے ایک فارم میرے سامنے رکھ دیا۔ اس پر نہ جانے کیا لکھا تھا۔ حرف گڈمڈ ہو کر میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ میں نے بغیر پڑھے اس پر اپنا نام لکھا، ابو کا نام لکھا اور فارم کے نیچے دستخط کر دیے۔

اس وقت نہ جانے کہاں سے میڈیا کے کچھ لوگ آ گئے۔ ان کے پاس کیمرے بھی تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ایس ایس پی سے پوچھا۔ ''ایس ایس پی صاحب! پولیس کی حراست میں ایک شخص ہلاک ہو گیا۔ اس کی ہلاکت میں کس کا ہاتھ ہے؟''

''ملزم نے خودکشی کی ہے؟''

''کیا پولیس اسٹیشن میں انتظامات اتنے ناقص ہیں کہ کوئی بھی ملزم خودکشی کر لے؟''

''ملزم نے اپنے کمربند سے گلے میں پھندا لگایا اور پنکھے کے ہک سے لٹک گیا۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

''کیا آپ کا ذہن اس بات کو تسلیم کرتا ہے؟'' ایک رپورٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں فوری طور پر اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اصل صورتِ حال تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے کے بعد ہی واضح ہوگی۔''

پھر الیکٹرانک میڈیا کے کچھ نمائندے اس کمرے کا منظر ریکارڈ کرنے لگے جہاں بہ قول پولیس کے ابو نے خودکشی کی تھی۔ میں نے اس وقت خود بھی اس کمرے کا جائزہ لیا۔ پنکھے کا ہک کافی اونچا تھا اور جو اسٹول وہاں پڑا تھا، اس پر کھڑے ہونے کے باوجود بھی پنکھے کے ہک میں پھندا ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ میڈیا والوں نے اس اسٹول کی بھی تصویریں بنائیں اور اپنے کیمرے سے اسٹول اور پنکھے کا ہک بھی دکھایا۔

ایک رپورٹر نے تفتیشی افسر خالد رانا سے پوچھا۔ ''کیا تمام ملزمان کو یہاں لا کر اسی طرح تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ چاہیں تو خودکشی کر لیں؟''

''میں تو اس وقت یہاں موجود ہی نہیں تھا۔'' خالد رانا نے جواب دیا۔

مختلف چینلز کے کچھ نمائندے میری طرف بھی آ گئے۔ میری آنکھیں روشنی میں چندھیا کر رہ گئیں۔ ایک رپورٹر نے مائک آگے بڑھاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ ''ارسلان صاحب! آپ کا کیا خیال ہے... کیا آپ کے والد خودکشی کر سکتے تھے؟''

''یہ سب باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا ہے۔'' میں نے کہا پھر اسے تفصیل سے بتایا کہ کیسے اس سرکاری افسر نے ابو کو رشوت کی پیشکش کی تھی، پھر انہیں کس طرح رشوت کے الزام میں پھنسایا گیا تھا۔ اس کے بعد پولیس کو حکم دیا کہ نثار صاحب کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے بلکہ ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو عادی مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ رات کو جب میں کھانا لے کر آیا تھا تو پولیس کا رویہ اچانک ہی بدل گیا تھا۔

اس کے بعد رپورٹرز ایس ایس پی اور انچارج سے جرح کرتے رہے۔ میرا ذہن ماؤف ہوا جارہا تھا اور ذہن میں پھر وہی خیالات پیدا ہو رہے تھے جن پر کل رات میں نے بہت مشکل سے قابو پایا تھا۔

چاچا افضل اور نواب تقریباً آگے پیچھے ہی وہاں پہنچے۔ جب ان لوگوں کو حقیقت کا علم ہوا تو چاچا افضل چکرا کر وہیں ایک بینچ پر ڈھے گئے۔ ان کے برعکس نواب کے چہرے پر صدمے کے ساتھ ساتھ غیظ وغضب کے تاثرات تھے۔

اس نے کہا۔ ”ارسلان صاحب! آپ نے کل آصف صاحب کی بات مان کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر ہم کل ہی سرفراز کو اٹھا لیتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی... لیکن اب میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”وہ لوگ اب میرا شکار ہیں نواب۔“ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ابو کی ڈیڈ باڈی ہمارے حوالے کر دی گئی۔

میں ابو کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔ افضل چاچا بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں ابو کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر ان کا چہرہ دیکھوں۔ مجھے ابھی تک یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ابو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔

میرے نہ چاہنے کے باوجود ہوا سے ابو کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ میری نظر ان کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔ ان کے چہرے پر اس وقت بھی بچوں جیسی معصومیت تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابو مجھ سے پوچھ رہے ہوں۔ ”ارسلان بیٹا! میں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی ہے؟“

اچانک میں ضبط کھو بیٹھا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ افضل چاچا نے مجھے رونے دیا پھر وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”ارسلان پتر! یہیں رو لے، جتنا رونا ہے پھر تجھے رونے کا موقع نہیں ملے گا۔“

میں پھر بُری طرح سسکنے لگا۔ اب گھر قریب آرہا تھا۔

اچانک میرے دل میں سرفراز، اس کے باپ اور تمام پولیس افسران کے خلاف نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”مجھے تو جتنا رونا تھا رو لیا... اب رونے کی باری ان تمام لوگوں کی ہے جو ابو کی موت کے ذمے دار ہیں۔“

میں نے اپنے آنسو خشک کر لیے۔ میرے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔

انکل عارف اور نواب مجھ سے پہلے ہی گھر پہنچ چکے تھے۔ انکل نے شاید امی کو بھی یہ خبر سنا دی تھی۔

ایمبولینس محلے میں داخل ہوئی تو پورے محلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ ابو اتنے ہی ہر دل عزیز تھے۔ ان کی موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔

آصف نے... گھر کے ڈرائنگ روم اور گھر سے باہر لوگوں کے لیے دریاں بچھوا دی تھیں۔ میرے لیے سب سے بڑی آزمائش امی کا سامنا تھا۔ میں انہیں کن الفاظ میں دلاسا دوں گا؟ فرحانہ کو کیسے سمجھاؤں گا؟ عثمان اور عدنان کو کیا بتاؤں گا؟

میں ابھی سب کچھ سوچتا ہوا ایمبولینس سے اترا۔ ایمبولینس کے ایک آدمی نے ابو کو اسٹریچر سے بیڈ پر منتقل کیا اور مشینی انداز میں واپس چلا گیا۔

اندر سے بھی عورتوں کی رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک عثمان اور عدنان روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے اور عثمان سسکتے ہوئے بولا۔ ”بھیا! ابو...“

”صبر کرو بیٹا!“ میں نے کہا۔ ”میں ابو کی موت کو رائگاں نہیں جانے دوں گا۔ آج کے بعد وہ لوگ بھی اسی طرح روئیں گے، تڑپیں گے، تب میرے دل میں ٹھنڈک پڑے گی۔“

محلے کا ہر فرد ابو کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن افضل چاچا نے رضاکارانہ طور پر یہ ذمے داری سنبھال لی تھی کہ کوئی ابو کے نزدیک نہ آسکے۔ بس دور ہی دور سے چہرہ دیکھے اور آگے بڑھ جائے۔

”بھیا!“ عدنان نے کہا۔ ”باجی آپ کو بلا رہی ہیں۔“

گویا آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

امی اور فرحانہ کا کمرا اوپر کی منزل پر تھا۔ میں نے زینہ چڑھنے کی کوشش کی تو میرے پیر گویا من من بھر کے ہوگئے۔ میں جیسے تیسے زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا۔ گھر میں ہر طرف محلے کی خواتین بھری ہوئی تھیں۔ وہ سب قرآن خوانی میں مصروف تھیں۔

میں اوپر پہنچا تو فرحانہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھ سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

”روتے نہیں ہیں فری!“ میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو ابو کی روح کو مزید تکلیف پہنچے گی۔“

”بھیا! آپ تو ابو کو لینے گئے تھے۔ آپ اس حالت میں انہیں لے کر آئے ہیں؟“

اس نے میرا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ”غلطی میری ہی ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”میں نے دعا ہی ادھوری مانگی تھی۔ میں ساری رات یہی دعا مانگتی رہی کہ بھیا صبح ابو کو لے کر آجائیں۔ مجھ بدنصیب کے منہ سے یہ نہیں نکلا کہ ابو ساتھ خیریت کے گھر واپس آئیں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر دھاڑیں مار کے رونے لگی۔

”فری!“ میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”خود کو سنبھالو۔ ابو کی روح کا نہیں تو کچھ امی ہی کا خیال کر لو۔“

اس کی چیخیں رک گئیں اور وہ سسکتی رہی۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”امی اپنے کمرے میں ہیں۔ وہ بے ہوش ہیں۔ ڈاکٹر ابھی کچھ دیر پہلے انہیں انجکشن دے کر گیا تھا۔ ہمیں تو ٹی وی کے ذریعے اس خبر کی اطلاع ملی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی آصف بھائی اور انکل عارف آگئے۔“

میں امی کے کمرے میں گیا تو وہ سکون آور ادویات کے زیر اثر سو رہی تھی۔

پھر سب کچھ خواب کے سے عالم میں ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ابو کی تکفین اور تدفین کا بندوبست کس نے کیا؟ اگر اس موقع پر آصف، افضل چاچا اور نواب نہ ہوتے تو میرے لیے یہ سب کچھ کرنا بہت مشکل ہوتا۔ محلے کے دوسرے لڑکے بھی ہر کام میں ہماری مدد کر رہے تھے۔

میں نے قبر میں ابو کا آخری دیدار کیا اور دل ہی دل میں قسم کھائی کہ میں ان لوگوں سے ایسا انتقام لوں گا کہ انہیں دوسروں کے لیے عبرت بنا دوں گا۔

ابو کو مٹی دیتے ہوئے افضل چاچا بھی ضبط کھو بیٹھے اور بلک بلک کر رونے لگے۔ نواب بھی مسلسل آنسو بہا رہا تھا۔

ہم ابو کو منوں مٹی تلے دبانے کے بعد جب گھر پہنچے تو مجھے ایسا لگا جیسے میں ابو کے ساتھ ساتھ اس ارسلان کو بھی دفن کر آیا ہوں جو ہر برائی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا... جس نے یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری کے باوجود محض رزق حلال کمانے کی خاطر اتوار بازار میں اسٹال لگایا تھا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک میرے سر سے سائبان کھینچ لیا گیا ہو اور میں کڑکتی دھوپ میں کھڑا ہوں۔

پھر وہی سب کچھ ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ لوگ پُرسہ دینے آتے ہیں اور یوں کھانے پر ٹوٹتے ہیں جیسے ان کی آمد کا مقصد یہی تھا۔

شام تک سب لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آنے والوں میں ابو کے بے شمار شاگرد تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ وہ بھی تھے جو دفتروں میں کلرک تھے اور ایسے بھی تھے جو چھوٹے موٹے کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اسکول کے وہ تمام اسٹوڈنٹ تھے جو ابھی زیر تعلیم تھے۔

ان سب کے جانے کے بعد گھر میں انکل عارف، آصف، افضل چاچا اور نواب ہی رہ گئے۔

امی کو ہوش آچکا تھا لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھیں اور بہکی بہکی باتیں کر رہی تھیں۔

میں ہمت کر کے ان کے پاس گیا تو وہ بولیں۔ ”تُو نے اتنی دیر لگا دی ارسلان بیٹا! تیرے ابو کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ تو جانتا ہے کہ وہ تیری واپسی کا کس بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔“

”امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ان کے پائپ کی تمباکو ختم ہو گئی ہے۔ عثمان سے کہہ کہ وہ ان کے لیے تمباکو لے آئے ورنہ تو جانتا ہے کہ پائپ کے بغیر وہ کتنے بے چین ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا امی! میں ابھی عثمان کو بھیجتا ہوں۔“ میں نے کہا اور خود پر ضبط کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

امی کی حالت دیکھ کر میری نفرت اور انتقام کی آگ مزید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ابو کا سوئم بھی ہو چکا تھا اور پھر بظاہر سب کچھ نارمل تھا لیکن کچھ بھی نارمل نہیں تھا۔ ابو کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی۔ اس کے مطابق ابو کی موت پشت پر چوٹ پڑنے سے واقع ہوئی تھی، دم گھٹنے سے نہیں۔ میڈیا نے اس خبر کو بہت اچھالا تھا۔ ایس ایس پی نے تھانے کے ان تمام لوگوں کو معطل کر دیا تھا جو ابو سے تفتیش میں شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی تھانے کے انچارج کو بھی معطل کیا گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ ہوگا کچھ بھی نہیں۔ یہ لوگ دو چار ماہ کی رسمی انکوائری کے بعد بحال کر دیے جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان کا ٹرانسفر کہیں اور کر دیا جائے گا۔

میں تو ان لوگوں کو معطل بلکہ برطرف کرنا چاہتا تھا جن کے حکم سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ میں ان لوگوں کو ملازمت سے نہیں بلکہ اس دنیا ہی سے برطرف کرنے والا تھا۔ میں نے بیرسٹر باجوہ سے بھی منع کر دیا تھا کہ میں کسی کے بھی خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کرنا چاہتا۔ اس قانونی چارہ جوئی کی آڑ

میں بھی وہی لوگ لپیٹ میں آتے جو اس وقت تھانے میں موجود تھے۔ بڑی مچھلیوں پر کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

ابو کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنے پلان پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ پہلے مرحلے میں تو میں وہ مکان فروخت کرنا چاہتا تھا اور کسی ایسی جگہ مکان لینا چاہتا تھا جس کا علم کسی کو نہ ہو۔

امی کی حالت میں ابھی تک کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ نیم پاگل سی ہو گئی تھیں۔ وہ سارا سارا دن کچھ نہ کھاتیں۔ فرحانہ کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے اور انہیں بہلا پھسلا کر کھانے پر آمادہ کرتی تھی۔ وہ دن بھر ابو کے کپڑے دھوتیں، ان کے جوتے پالش کرتیں، ان کے کمرے کی صفائی کرتیں اور پھر ان کے انتظار میں بیٹھ جاتیں۔ ڈاکٹر نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا کہ آپ عارضی طور پر یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں ورنہ آپ کی والدہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھیں گی۔

میں نے نواب سے مکان بیچنے کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا۔ ''ارسلان صاحب! مکان بیچنے کے بجائے اس مکان کو کرائے پر اٹھا کر کسی دوسری جگہ شفٹ ہو جائیں۔''

دوسرے ہی دن اس نے مجھے گلشن اقبال، سوسائٹی اور گلشنِ معمار میں کچھ مکانات کے بارے میں بتایا۔

میں نے گلشن اقبال کا ایک مکان پسند کر لیا اور نواب سے کہا۔ ''مکان کا ایگریمنٹ تم اپنے نام سے بنوانا اور کسی کو بھی یہاں کا پتا مت بتانا... آصف کو بھی نہیں۔''

ایک ہفتے بعد ہم لوگ نئے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ وہ جدید طرز پر بنا ہوا خوب صورت بنگلا تھا۔ اس کا کرایہ بھی کچھ زیادہ تھا لیکن مجھے وہی مکان پسند آیا۔ پھر میں نے اپنی اور فرحانہ کی سیل فون سم تبدیل کیں اور اسے تاکید کر دی کہ اپنے کسی بھی رشتے دار اور کسی بھی دوست کو ایڈریس مت بتانا۔ ہمارے دشمن اب بھی ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

امی کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ اب بھی کبھار ہی وہ بہکی بہکی باتیں کرتی تھیں ورنہ عموماً خاموش رہتیں یا پھر ابو کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔

میں نے ایک دن نواب سے کہا۔ ''نواب! تمہارے پاس کوئی گن تو ضرور ہو گی؟''

نواب نے کہا۔ ''ایک گن... میرے پاس تو ایک مشین پسٹل اور دو ماؤزر ہیں لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ارے یار! یہ اب آپ جناب چھوڑ دو۔ یوں بھی عمر میں تم مجھ سے بڑے ہو۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے گن چلانا سیکھنا ہے۔ میں نے تو آج تک گن ہاتھ میں لے کر بھی نہیں دیکھی۔''

''یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ میں آپ... میرا مطلب ہے کہ تمہیں دو دن میں گن چلانا سکھا دوں گا۔''

پھر ہم گن لے کر کورنگی کے غیر آباد علاقے میں چلے جاتے اور میں وہاں فائرنگ کی مشق کرتا۔

دس دن کے اندر اندر میرا نشانہ ایسا ہو گیا کہ میں نشانہ لے کر کسی کی بھی کھوپڑی اڑا سکتا تھا۔

''تم پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہر کام میں جینئس ہو ارسلان!'' نواب نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''مجھے ایسا نشانہ بنانے کے لیے سال بھر تک محنت کرنا پڑی تھی۔''

میں اس دوران ایک دفعہ بھی اتوار بازار کے اسٹال پر نہیں گیا تھا۔ یہ تو افضل چاچا کی شرافت تھی کہ وہ اب بھی میرے اسٹال پر کسی دوسرے آدمی کو بٹھا رہے تھے اور باقاعدگی سے مجھے پیسے دے رہے تھے۔ ان سے بھی میں خود ہی مل لیتا تھا۔ گھر کا ایڈریس میں نے انہیں بھی نہیں بتایا تھا۔

ابو کو اتوار کے روز قتل کیا گیا تھا اس لیے میں نے بھی اپنے دشمنوں کو مارنے کے لیے اتوار ہی کا دن مقرر کیا تھا۔

تھانے ہی کے ایک آدمی کے ذریعے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ابو کی موت سب انسپکٹر محمود کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے ابو کی پشت پر پوری قوت سے لات ماری تھی۔ وہ لمبا تڑنگا اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ پھر پولیس کے بھاری بوٹ کی زوردار ضرب سے ابو کی موت واقع ہو گئی تھی۔ ہم نے سب سے پہلے اسے ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔

وہ ابھی تک معطل تھا اس لیے زیادہ وقت گھر ہی پر گزارتا تھا۔ بس شام میں گھر سے نکل کر ایک نزدیکی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں اسی جیسے دو تین آدمی اور ہوتے تھے۔

وہ لوگ وہاں بیٹھ کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک گپ شپ لگاتے تھے، پھر محمود وہاں سے اٹھ کر پان سگریٹ کی ایک دکان پر آتا تھا اور وہاں سے سگریٹ، پان لے کر گھر لوٹ جاتا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ... محمود کو اس وقت ماروں گا جب وہ ہوٹل میں بیٹھا ہو گا۔

وہ شروع سردیوں کے دن تھے، فضا میں خنکی سی ہونے لگی تھی۔ میں نے سب انسپکٹر محمود کی موت کا وہی دن مقرر کیا تھا۔

میں نے نواب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ٹیکسی کے بجائے موٹر سائیکل پر آئے کیونکہ ایسے موقعوں پر موٹر سائیکل

زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔

نواب ٹھیک سات بجے موٹر سائیکل لے کر آ گیا۔ میں نے جینز اور جیکٹ پہنی، گلے میں مفلر ڈالا تاکہ حلیہ بدمعاشوں والا نظر آئے۔ پھر ہم لوگ ہر طرح سے تیار ہو کر اس علاقے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سب انسپکٹر محمود مقیم تھا۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آٹھ بجے کے قریب سب انسپکٹر محمود اپنے گھر سے نکلا۔ وہ سفید براق کلف دار شلوار سوٹ میں ملبوس تھا اس کے انداز اور رہن سہن سے یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ان دنوں معطل ہے۔ میں نے اس کے خلاف نہ کوئی پرچہ درج کرایا تھا، نہ مقدمہ کیا تھا۔ میں اس مقدمے کا فیصلہ خود ہی کرنا چاہتا تھا۔

وہ گھر سے نکل کر اس ہوٹل کی طرف بڑھا جہاں وہ بیٹھتا تھا۔ وہ اس علاقے کا صاف ستھرا ہوٹل تھا اور وہاں نسبتاً خوش حال لوگ ہی آتے تھے۔ ہوٹل کے باہر باربی کیو کا بھی انتظام تھا۔

میں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ محمود کے دوست پہلے ہی وہاں موجود تھے۔

نواب کے پاس ہیلمٹ بھی تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ تم یہ ہیلمٹ پہن لو اور مفلر مجھے دے دو۔ ہمیں ہوٹل میں بیٹھنا نہیں ہے بلکہ فوری طور پر کارروائی کر کے نکلنا ہے۔ بہت سے موٹر سائیکل سوار ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد ہیلمٹ اتارتے ہیں۔ مجھے اس کی یہ تجویز پسند آئی۔ میں نے ہیلمٹ لگایا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے ہوٹل کے سامنے جا ٹھہرا۔ نواب نے مفلر اپنے گلے میں لپیٹ لیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس سے اپنا چہرہ چھپا سکے۔

میں نے موٹر سائیکل سائڈ اسٹینڈ پر لگائی۔ مفلر بدمعاشوں کی طرح سر پر باندھا اور ہیلمٹ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر لٹکا کر اندر کی طرف بڑھا۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہ دی۔

میں ہوٹل میں داخل ہوا اور جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مشین پسٹل نکال لیا اور چیخ کر بولا۔ ''کلمہ پڑھ لے محمود! تیرا آخری وقت آ گیا ہے۔''

''لیکن کیوں... تم... کون...'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اچانک فائر کر دیا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں اتر گئی۔ میں نے دوسرا فائر اس کے سینے پر کیا اور اطمینان سے باہر نکل آیا۔

وہاں اچانک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ نواب نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ میں پھرتی سے موٹر سائیکل پر سوار ہوا تو نواب نے دو چار ہوائی فائر کر دیے تاکہ وہاں موجود کوئی شخص ہیرو بننے کی کوشش نہ کرے۔ لوگ گرتے پڑتے وہاں سے بھاگنے لگے۔ میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھائی اور آناً فاناً وہاں سے دور نکل آیا۔

میں نے یونہی موٹر سائیکل کو مختلف سمتوں میں موڑا تاکہ اگر کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہو تو ہمیں معلوم ہو جائے۔

پھر نواب نے کہا۔ ''ارسلان! یہ موٹر سائیکل کسی مارکیٹ میں روک دو اور اسے وہیں چھوڑ دو کیونکہ یہ موٹر سائیکل بھی چوری کی ہے۔ میں کوئی بھی کام کچا کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

ہم نے موٹر سائیکل ہیلمٹ سمیت طارق روڈ کے ایک علاقے میں چھوڑ دی۔ اس سے پہلے نواب نے موٹر سائیکل کی ہر اس جگہ کو صاف کر دیا تھا جہاں اس کے فنگر پرنٹس ہو سکتے تھے۔ اس نے ہیلمٹ کو بھی اچھی طرح صاف کر دیا۔ میں نے تو یوں بھی دستانے پہن رکھے تھے۔

وہاں سے کچھ دور چل کر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور اسے عائشہ منزل پر چھوڑ دیا کیونکہ نواب کی ٹیکسی وہیں کھڑی تھی۔

نو بجے تک ہم گھر پہنچ گئے۔ ٹی وی پر خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ میڈیا نے اس خبر کو خاص طور پر نشر کیا جس میں پولیس کے ایک سب انسپکٹر کی ٹارگٹ کلنگ کا تذکرہ تھا۔ ٹارگٹ کلنگ.... اس لیے کہا جا رہا تھا کہ قاتل نے اسے نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ اس وقت تو میڈیا محمود کی خون آلود لاش کو دکھا رہا تھا۔ خبروں ہی کے ذریعے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی نے اس موٹر سائیکل کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس دن میں نے کئی ہفتے بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ نواب بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ اب ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چلا گیا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹ کر سوچنے لگا کہ اب میرا دوسرا شکار کون ہو گا؟ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میرا دوسرا شکار ایس ایس پی ہو گا۔ یہ کام ذرا مشکل تھا لیکن کہتے ہیں کہ جب کوئی انسان پہلا خون کرے تو دوسرا خون کرنے میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن ایس ایس پی کو مارنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ اس کے ساتھ گارڈز بھی ہوتے ہیں اور وہ سب انسپکٹر محمود کی طرح ہوٹلوں میں بیٹھ کر گپ شپ نہیں کرتا

تھا۔

میں نے دوسرے دن نواب کو بلایا اور اسے بتایا کہ ہمارا دوسرا شکار ایس ایس پی ہوگا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''ایس ایس پی کو ہم براہِ راست نہیں مار سکتے..... اس میں اپنی جان جانے کا بھی امکان ہے۔ اس کے گھر پر بھی پولیس کے گارڈز ہوتے ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یار! وہ کسی تقریب میں جاتا ہوگا، کسی ہوٹل میں جاتا ہوگا... ہم وہاں اسے آسانی سے جہنم رسید کر سکتے ہیں۔ پولیس ہیڈ آفس میں میرا ایک دوست ہے۔ میں کسی ذریعے سے معلوم کرلوں گا کہ اس ہفتے ایس ایس پی کی مصروفیات کیا ہیں۔''

دوسرے ہی دن نواب نے بتایا کہ آج شام ایس ایس پی اینٹی نارکوٹکس کے ایک سیمینار میں جائے گا۔ یہ سیمینار کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد ہو رہا تھا۔ ہم وہاں بہت آسانی سے اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔

''وہاں جانے کے لیے ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آنا۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ کوئی ہمیں وہاں گھسنے بھی نہیں دے گا۔''

''اس کی تو تم فکر ہی مت کرو۔'' نواب نے کہا۔ ''تم خود بھی میرا حلیہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔''

دوسرے دن میں نے بہترین سوٹ نکالا، جوتوں پر خوب رگڑ کر پالش کی۔ بہترین ٹائی لگائی اور پرفیوم لگا کر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

''کیا بات ہے بھیا؟'' فرحانہ نے ہنس کر پوچھا۔ ''یہ اس قدر بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟''

''ارے یار! ایک دوست کی بہن کی شادی ہے۔ جانا بھی ضروری ہے ورنہ وہ میری بہن کی شادی میں نہیں آئے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

فرحانہ کچھ شرما کر خاموش ہوگئی۔ اسی وقت نواب نے سیل فون پر کال کر کے مجھے باہر آنے کو کہا۔

میں پہلے تو اس کی گاڑی دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ جدید ماڈل کی ہنڈا اکارڈ تھی۔ پھر اس کا حلیہ دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس نے بہت سلیقے سے سوٹ پہن رکھا تھا۔ پرفیوم بھی بہت قیمتی استعمال کیا تھا۔

وہ چونک کر بولا۔ ''ارسلان! تم نے اپنے ساتھ کوئی گن تو نہیں رکھی ہے؟''

''نہ رکھنے کا کیا سوال ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کیا ایس ایس پی کو خیالی ہتھیاروں سے مارو گے؟''

''تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ شہر کے تمام فائیو اسٹار ہوٹلوں پر بہت کڑی چیکنگ ہوتی ہے۔ ہم وہاں اسلحہ لے کر نہیں جا سکتے۔''

''پھر؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''پھر کچھ نہیں۔ ہم اسے ماریں گے ضرور۔'' نواب نے کہا۔

''لیکن کیسے؟'' میں نے الجھ کر کہا۔

''پہلے تم گن واپس رکھ کر آؤ پھر بتاتا ہوں۔''

میں دوبارہ گھر میں گیا اور گن رکھ کر واپس آگیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد نواب نے گاڑی آگے بڑھا دی اور بولا۔ ''گن ہمارے پاس نہ سہی لیکن وہاں موجود سیکیورٹی والوں کے پاس تو ہوتی ہے۔ بس ہمیں کسی سیکیورٹی اہلکار سے گن چھیننا ہوگی۔''

''یار! یہ پلان تو پرفیکٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فرض کرو کہ ہمیں کسی سے گن چھیننے کا موقع ہی نہیں ملا تو؟''

''تو کیا...'' نواب نے کہا۔ ''ہم آج نہیں تو کل اس ایس ایس پی کو نشانہ بنائیں گے۔ اصل میں پہلے میرا ذہن بھی اس طرف نہیں گیا تھا ورنہ کچھ اور سوچتا۔''

ہم بیس منٹ کے اندر اندر اس فائیو اسٹار ہوٹل پر پہنچ گئے جہاں وہ سیمینار منعقد ہو رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ ہاتھوں میں اسکن پہن لیے تھے تاکہ گاڑی کے کسی بھی حصے پر ہماری انگلیوں کے نشانات نہ رہ جائیں۔ نواب نے وہ گاڑی بھی ایک پارکنگ لاٹ سے چرائی تھی لیکن اس کی نمبر پلیٹ بدل دی تھی۔

ہم ہوٹل کے پورچ میں پہنچے تو ہوٹل کے ایک باوردی ملازم نے ہم سے گاڑی کی چابی لی اور اسے پارکنگ لاٹ کی طرف لے گیا۔ نواب وہیں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چابی لے آیا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو پہلے ہمیں اسکینر سے گزرنا پڑا پھر ہمارے سیل فون کو اسکین کیا گیا اور ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔

میری نظریں کسی ایسے سیکیورٹی اہلکار کو تلاش کر رہی تھیں جو مسلح ہو لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ ہوٹل میں ایسا کوئی بھی سیکیورٹی اہلکار نہیں تھا۔ ہاں، ہوٹل کے باہر ہر گارڈ کے پاس رائفل یا ریوالور تھا۔

میں نے نوٹس بورڈ کے ذریعے اس ہال کے بارے میں معلوم کیا جہاں وہ سیمینار ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ ایس ایس پی ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ البتہ

آدھے سے زیادہ مہمان وہاں آچکے تھے۔ وہاں کسی نے ہم سے تقریب کا دعوت نامہ بھی طلب نہیں کیا۔ ہم دونوں خاموشی سے جا کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد پروگرام شروع ہوگیا۔ اب خاصے مہمان آچکے تھے۔ میری نظریں داخلی دروازے کی طرف تھیں۔ اچانک ایس ایس پی دو آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں آدمیوں نے بھی سوٹ پہن رکھے تھے لیکن ان کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایس ایس پی کے گارڈز ہیں۔ اس کی تصدیق بھی یوں ہوگئی کہ ایس ایس پی کے اسٹیج پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ کسی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے اسٹیج کے نزدیک ہی کھڑے ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے یونہی ان کے نزدیک ایک چکر لگایا تو مجھے ان میں سے ایک کا نام معلوم ہو گیا۔ ایک گارڈ دوسرے کو انور کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔

میں نے نواب کو بتایا تو اس نے کہا۔ ''یار! میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔ تم ان لوگوں کے پاس جا کر کہو کہ آپ میں سے انور کون ہے؟ باہر کوئی خاتون آپ کو بلا رہی ہیں۔ خاتون کا نام سن کر وہ فوراً باہر آئے گا۔ باہر اسے میں سنبھال لوں گا مگر تم بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آجانا۔ ممکن ہے دوسرا گارڈ بھی باہر آجائے۔''

میں ٹہلتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور بہت مہذب انداز میں کہا۔ ''ایکسکیوزمی! آپ میں سے انور صاحب کون ہیں؟''

انور نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''فرمائیے... میں ہی انور ہوں۔''

''باہر کوئی خاتون آپ کو بلا رہی ہیں۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں نے دیکھا کہ انور فوراً ہی داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس ہال کے دو دروازے تھے۔ میں دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ انور نے باہر آ کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ خواتین موجود تھیں لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

اس سے کچھ فاصلے پر نواب کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ''انور صاحب! اس طرف آجائیے۔''

اس نے حیرت سے نواب کو دیکھا پھر اس طرف بڑھ گیا جہاں ہوٹل کے باتھ رومز تھے۔ وہ آگے بڑھا تو نواب نے جیب سے پین نکال کر اس کی پشت پر رکھ دیا اور سرگوشی میں کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ان کے پیچھے پیچھے میں بھی باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ اندر ایک رو میں واش بیسن لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف باتھ رومز تھے۔ نواب نے اسے ایک باتھ روم میں دھکیل دیا۔

دو منٹ بعد ہی وہ باتھ روم سے باہر آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں دو ریوالور تھے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں نے اس گارڈ کو بے ہوش کر دیا ہے۔ یہ گن سنبھالو اور فوراً باہر چلو۔ اگر کسی کی نظر اس گارڈ پر پڑ گئی تو ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔''

ہم دونوں ریوالور جیب میں رکھ کر بہت عجلت میں باہر نکلے۔

میں نے گن جیب میں رکھی اور اس دروازے سے اندر گیا جو اسٹیج کے بالکل نزدیک تھا۔

اسی وقت ایس ایس پی تقریر کے لیے اسٹیج پر آگیا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایس ایس پی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک لڑکی مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زرد رنگ کی بہت کھلے گلے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کا گلا پشت سے بھی اتنا کھلا تھا کہ اس کی آدھی پشت عریاں تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال ایک ہیئر بینڈ سے بندھے ہوئے تھے اور اس نے انہیں اپنے بائیں شانے سے سامنے کی طرف ڈال رکھا تھا۔ اس کے کانوں میں نفیس سے ہیروں کے بُندے تھے۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں اسے دیکھ کر بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا کہ یہ لڑکی کون ہے؟ کہیں یہ مجھے پہچانتی تو نہیں؟ ممکن ہے کبھی ابو کی شاگرد رہی ہو۔

اچانک وہ لڑکی اسٹیج سے اتر کر میری طرف بڑھی تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ کچھ نزدیک آئی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نوشین تھی۔ وہ ابو سے ٹیوشن پڑھنے گھر آتی تھی۔ بعض اوقات ابو تھکے ہوئے ہوتے تھے تو وہ مجھ سے کہتے تھے کہ آج نوشین کو تم پڑھا دو۔ وہ ان دنوں میٹرک میں پڑھ رہی تھی اور اس کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے پسند کرنے لگی ہو۔ میں اس کے ذومعنی جملوں کا مطلب تو سمجھتا تھا لیکن جان بوجھ کر انجان بنا رہتا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت حسین لڑکی تھی لیکن مجھ پر ان دنوں پڑھائی کی دھن سوار تھی اس لیے میں نے کبھی اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیا۔

ایک وہ ہی کیا، یونیورسٹی کی کئی لڑکیاں بھی میرے قرب کی خواہش مند تھیں لیکن مجھے احساس تھا کہ میرا غریب باپ نہ جانے کیا کیا جتن کر کے میری تعلیم کے اخراجات

پورے کرتا ہے۔ میں ان چونچلوں میں پڑ جاتا تو پھر پڑھائی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں تو اپنی کلاس میں ٹاپ کرنا چاہتا تھا۔

نوشین ان سب سے مختلف تھی۔ وہ اکثر مجھے بہت مہنگے مہنگے تحفے بھی دیا کرتی تھی لیکن میں ہمیشہ بہت خوب صورتی سے اس کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔

آخر اس نے مجھے ایک خط لکھ ہی دیا۔ اس میں نوشین نے اقرار کیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

میں نے اسے بہت نرم لہجے میں سمجھایا کہ ابھی تمہاری عمر ان باتوں کی نہیں ہے۔ تم خود بھی اپنی تعلیم پر توجہ دو اور مجھے بھی یکسوئی سے پڑھنے دو۔ ایم اے کرنے کے بعد میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا تو تمہاری بات پر ضرور غور کروں گا۔

اب وہی نوشین میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیسے ہو ارسلان؟“

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔

”میں نے گزشتہ دنوں سر کے بارے میں سنا تھا... مجھے بہت افسوس ہوا۔“

میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا کیونکہ وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ ایس ایس پی کسی بھی وقت اپنی تقریر ختم کر سکتا تھا۔

اسی وقت نواب نے مجھے آواز دی اور بولا۔ ”تم یہاں کھڑے ہو... ڈائریکٹر صاحب تمہیں وہاں تلاش کر رہے ہیں۔“

”نوشین! تم مجھے اپنا سیل نمبر دے دو۔“ میں نے اس سے جان چھڑانے کو کہا۔ ”میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ بعد میں اطمینان سے ملاقات ہوگی۔“

”میں اپنے ڈیڈی کا وزیٹنگ کارڈ دے رہی ہوں۔“ نوشین نے کہا۔ ”اس کی پشت پر اپنا سیل نمبر بھی لکھ دیتی ہوں۔“

اس نے اپنے پاس سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی پشت پر ایک سیل نمبر لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”کارڈ میں میرے گھر کا نمبر تو ہے ہی، میں نے اپنا سیل نمبر بھی لکھ دیا ہے۔“ اس نے کہا۔ میں نے بغیر دیکھے کارڈ جیب میں ڈال لیا اور نواب کے ساتھ وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ کاش! میں وہ کارڈ دیکھ لیتا... کاش!

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ایس ایس پی اختتامی جملے ادا کر رہا تھا کہ میں نے اچانک گن نکالی اور نشانہ لے کر ایس ایس پی پر دو فائر کر دیے۔ ایک گولی اس کی گردن میں لگی اور دوسری سینے میں۔

گارڈ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اسے نواب نے پاؤں اڑا کر گرا دیا۔ یوں بھی وہاں بھگدڑ مچ چکی تھی۔

میں وہاں سے تیزی سے باہر نکلا اور ہال کی مخالف سمت میں بھاگ لیا۔ آگے جا کر میں نے اپنی رفتار سست کر دی۔ آگے کوئی اور ہال تھا۔ وہاں بھی کوئی پروگرام ہو رہا تھا۔ میں وہاں بنے باتھ روم میں گھس گیا۔ گارڈ کی گن ڈسٹ بن میں پھینکی اور خود منہ دھو کر باہر نکلا تو کوریڈور میں اچھا خاصا رش تھا۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا۔ ”کیا ہوا... یہ رش کیسا ہے؟ مجھے فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی تھی۔“

وہ صاحب شانے اچکا کر بولے۔ ”نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ آدمی کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ اب فائیو اسٹار ہوٹل بھی محفوظ نہیں رہے۔“

اسی وقت میں نے نواب کو باہر نکلتے دیکھا، کئی اور آدمی بھی گرتے پڑتے باہر جا رہے تھے۔ ہوٹل کی سیکیورٹی نے فوری طور پر تمام دروازے سیل کر دیے تھے اس لیے ان لوگوں کو واپس جانا پڑا۔ نواب نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

وہ میرے پاس آ کر آہستہ سے بولا۔ ”یار! یہاں تو بہت گڑبڑ ہو گئی۔ ہوٹل کی سیکیورٹی نے تمام دروازے سیل کر دیے ہیں۔ ہم باہر کیسے نکلیں گے؟“

”ہم ہوٹل کے کمروں کی طرف چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں جا کر کچھ سوچیں گے۔“ ہم ٹہلتے ہوئے ہوٹل کے لاؤنج میں آ گئے۔ وہاں بھی بہت سے لوگ موجود تھے اور ہوٹل انتظامیہ پر برس رہے تھے۔ اسی وقت لفٹ آ کر رکی۔ اس میں سے کچھ لوگ باہر نکلے تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ نواب نے سات نمبر فلور کا بٹن دبا دیا۔

لفٹ کے ذریعے ہم ساتویں منزل پر پہنچے۔ وہاں کوریڈور میں بالکل سناٹا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ہم یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہوٹل کے چپے چپے پر پولیس پھیل جائے گی۔ آخر پولیس کے ایک ایس ایس پی کا قتل ہوا تھا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں اس گارڈ کو بھی ہوش آ جائے گا جسے نواب نے بے ہوش کیا تھا۔ وہ مجھے بھی پہچان لے گا اور نواب کو بھی۔ پولیس ہمیں فوراً ہی گرفتار کر لے گی۔ پھر اس وقت مجھے ایک ویٹر نظر آیا۔ میں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔

”ہوٹل سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟ مین گیٹ تو ہوٹل سیکیورٹی نے سیل کر دیا ہے۔“

”جی ہاں ہے... لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ ویٹر نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہمیں یہاں سے باہر نکلنا ہے۔ ہمیں ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔ پولیس کی کارروائی میں تو کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔“

پھر نواب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”تم ہمیں یہاں سے نکال دو۔ یہ تمہارا انعام ہے۔“

ویٹر چند لمحے کے لیے ہچکچایا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”آئیے میرے ساتھ لیکن اپنے کوٹ اور ٹائیاں اتار دیجیے۔“

میں نے کوٹ اور ٹائی اتار دی اور اس کا بنڈل سا بنا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ نواب نے بھی اپنا کوٹ اتار کر ہاتھ پر ڈال لیا تھا اور ٹائی کھول کر جیب میں رکھ لی تھی۔

ویٹر ہمیں ہوٹل کے کچن کی طرف لے گیا اور وہاں سے ہوتا ہوا ایک برآمدے میں نکلا۔

”یہاں سے سیدھے نکل جائیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ تک پہنچ جائیں گے۔ وہاں دائیں طرف ایک دروازہ ہے۔ وہ دروازہ ہم لوگوں کے استعمال کے لیے ہے۔ وہ اندر سے بند ہوگا۔ آپ اس دروازے سے باہر نکل جائیں لیکن جلدی کریں۔ پولیس آ گئی تو اس دروازے سے نکلنا بھی مشکل ہو جائے گا۔“

ہم تیزی سے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھے۔ وہ جگہ دراصل ہوٹل کے اسٹاف کی گاڑیوں کے لیے مخصوص تھی۔ ہمیں وہاں ایک دروازہ بھی نظر آ گیا۔ دروازے میں اندر سے کنڈی لگی تھی۔ نواب نے دروازہ کھولا اور ہم لوگ باہر نکل آئے۔ ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ وہاں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ہمیں ایس ایس پی پر فائرنگ کرنے کے بعد وہاں سے باہر نکلنے میں دس منٹ لگے تھے۔ پولیس کو تو وہاں فوراً پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن شاید وہ لوگ مطمئن ہوں گے کہ سیکیورٹی اسٹاف نے تمام دروازے سیل کر دیے ہیں۔ وہ باہر بھی پورے ہوٹل کو گھیر لیتے پھر قاتلوں کو پکڑنا کیا مسئلہ تھا۔

ہم نے اپنے کوٹ دوبارہ پہن لیے اور ٹہلتے ہوئے آگے بڑھے۔

اسی وقت مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی اور میں نے اس سے صدر چلنے کو کہا۔ صدر کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔

وہ ٹیکسی ہم نے صدر پر چھوڑی اور دوسری ٹیکسی کے ذریعے لیاقت آباد پہنچے۔ وہاں سے تیسری ٹیکسی میں گلشن اقبال روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ میں تو فرحانہ سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ میں ایک منگنی میں جا رہا ہوں۔ میں اس سے کھانا مانگوں گا تو وہ یہ ضرور پوچھے گی کہ دوست نے آپ کو کھانا نہیں کھلایا۔

میں نے ٹیکسی ایک اسنیک بار کے سامنے رکوائی اور وہاں بیٹھ کر کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ گھر روانہ ہو گئے۔

میں نے گھر پہنچ کر کپڑے بدلے اور ٹی وی کھول کر اطمینان سے اس کے آگے بیٹھ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق وہاں کئی ٹی وی چینلز کی ٹیمیں پہنچ گئی تھیں اور فائیو اسٹار ہوٹل کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ کیمرے میں ایس ایس پی کو بھی دکھایا گیا جو اب لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میرے کلیجے میں گویا ٹھنڈ پڑ گئی۔ میڈیا نے اسے بھی ٹارگٹ کلنگ کا واقعہ قرار دیا اور پولیس پر لعن طعن کی کہ ان کا ایک افسر قتل ہو گیا اور قاتل ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے فرار ہو گئے۔ ایس ایس پی کا وہ گارڈ اس شخص کا حلیہ بتا رہا تھا جس نے اسے باتھ روم میں لے جا کر بے ہوش کیا تھا۔ انہوں نے میرا حلیہ بھی بتایا کہ میں نے اسے کس بہانے سے باہر بھیجا تھا۔ پولیس کے مطابق قاتل دو تھے، زیادہ بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن فی الحال ان کے سامنے دو ہی آدمیوں کے حلیے تھے۔ وہ حلیے بھی ایسے تھے کہ کسی کے بھی ہو سکتے تھے۔ نواب نے اپنے بالوں کا اسٹائل بدل لیا تھا اور اس کے چہرے پر زیرو پاور کے گلاسز کا چشمہ بھی تھا۔ میں نے بھی اپنے بالوں کے اسٹائل میں تبدیلی کی تھی۔

ایس ایس پی کے قتل کے بعد تو پورے کراچی کی پولیس الرٹ ہو گئی تھی۔ پولیس کا ہر افسر اپنے ساتھ گارڈز لے کر چلنے لگا۔ پولیس نے اس ہوٹل سے ہم سے ملتے جلتے حلیوں والے چار آدمیوں کو گرفتار بھی کیا تھا۔

دوسرے دن نواب آیا تو میں نے کہا۔ ”اب اگلی واردات معاملہ ٹھنڈا ہونے تک ملتوی کر دو۔“

”میں بھی یہی کہنے والا تھا۔“ نواب نے کہا۔ ”اب کچھ دن آرام کر لو۔ پولیس نے ہمارے خاکے بھی جاری کر دیے ہیں لیکن دونوں کے خاکے ہمارے چہروں سے بہت مختلف ہیں۔“

اسی دن مجھے آصف سے ملنے کا خیال آیا۔ میں اس سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”آج تو ادھر کا رستہ

کیسے بھول گیا؟''

''یار! بھولا تو اسے جاتا ہے جو دل میں نہ ہو۔'' پھر میں گنگنا کر بولا۔ ''یہ پیار کرنے والے، دل سے نہیں نکلتے۔''

انکل بھی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ ''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں لیکن تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گے۔''

آصف مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گیا اور اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ ''ارسلان! تو آگ سے کھیل رہا ہے۔ تجھے اپنے بہن بھائیوں اور ماں کا خیال بھی نہیں ہے۔''

''کھل کر بات کر۔'' میں نے کہا۔ ''تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''تو اب تک دو قتل کر چکا ہے۔'' آصف نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تیری ذہانت کا تو میں قائل ہوں لیکن ایسی منفی ذہانت کی تجھ سے امید نہیں تھی۔''

''تو کیا جاگتے میں خواب دیکھنے لگا ہے؟'' میں نے سنبھل کر کہا۔ ''کیسے قتل؟ تو کس کے قتل کی بات کر رہا ہے؟''

''مجھ سے جھوٹ مت بول ارسلان! میں تجھے بچپن سے جانتا ہوں۔ جو بات تیرے ذہن میں سما جاتی ہے پھر تو اسے پورا کر کے ہی دم لیتا ہے۔ تو نے سب انسپکٹر محمود کو قتل نہیں کیا؟ کل ایس ایس پی کو نشانہ نہیں بنایا؟''

''یہ تو کہاں کی اڑا رہا ہے۔'' میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ''ایس ایس پی کوئی عام آدمی ہے کہ میں اسے اتنی آسانی سے قتل کر دوں گا۔''

''مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟'' آصف نے کہا۔ ''اگر تو ان وارداتوں میں ملوث نہیں ہے تو انکل کی قسم کھا۔''

میں خاموش ہو گیا۔ میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کیسے کھا سکتا تھا۔

''اس سلسلے کو یہیں ختم کر دے ارسلان!'' آصف نے کہا۔ ''ورنہ تجھے پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''سمجھ لے کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''ایس ایس پی کو قتل کرنے کے بعد میرے انتقام کی آگ بجھ چکی ہے۔ اب میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔ اب تو جلدی سے کھانا کھلا، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اپنا سیل نمبر دے۔'' آصف نے کہا۔

''یار! میں نے اب تک سیل لیا ہی کب ہے۔ لوں گا تو سب سے پہلے تجھے کال کروں گا۔''

''چل سیل فون میں تجھے گفٹ کر دیتا ہوں۔'' اس نے اپنی الماری کھولی اور ایک ڈبا نکالا۔ ''یہ سیل فون کچھ دن پہلے میرے ایک انکل نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ میں تجھے سم کارڈ بھی منگوا دیتا ہوں، پھر تو تیرے پاس کوئی بہانہ نہیں رہے گا نا؟''

''یار! اگر تو اسے بہانہ ہی سمجھ رہا ہے تو سیل فون مجھے دے دے۔'' میں نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر اس نے اپنے ملازم کو بھیج کر ایک سم کارڈ بھی منگوا لیا اور سیل فون کو چارجنگ پر لگا دیا۔ جب تک ہم نے کھانا کھایا۔ سیل فون کی بیٹری چارج ہو چکی تھی۔ آصف نے سم کارڈ کا نمبر اپنے سیل فون میں فیڈ کر لیا۔

پھر وہ بولا ''.... اب مجھ سے رابطے میں رہنا۔ اب تو مجھے اپنا ایڈریس بتا دے۔ آنٹی اور فرحانہ بھی سوچتی ہوں گی کہ آصف تو بہت بے مروت نکلا۔''

میں نے سوچا کہ آصف کو ایڈریس بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ چاہتا تو مجھے ابھی گرفتار کرا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

کھانے کے بعد بھی وہ دیر تک مجھے سمجھاتا رہا کہ انکل نے ساری زندگی نیکی اور ایمان داری کا درس دیا ہے... تو ان کی روح کو کیوں شرمندہ کر رہا ہے۔

☆☆☆

ایس ایس پی کی موت کو ایک ماہ سے زیادہ گزر چکا تھا لیکن پولیس ابھی تک ہمارا سراغ نہیں لگا پائی تھی۔

ہفتے والے دن نواب میرے پاس آیا تو میں نے کہا۔ ''نواب! میں نے سوچا ہے کہ کل میں سرفراز کو اٹھا لوں۔''

''اتنی جلدی مت کرو ارسلان!'' نواب نے کہا۔ ''ابھی ایس ایس پی کا معاملہ بھی ٹھنڈا نہیں پڑا ہے۔ کم سے کم دو ہفتے تو مزید گزرنے دو۔''

''دو ہفتے نہیں... صرف ایک ہفتہ۔'' میں نے کہا۔ ''اس دوران میں تم اس جگہ کا بندوبست کر لینا جہاں سرفراز کو اغوا کے بعد رکھا جائے گا۔''

''جگہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے بہت پہلے جگہ کا بندوبست کر لیا تھا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم اگلے اتوار کو سرفراز کو اغوا کریں گے۔''

میں اتوار کے اتوار اسٹال پر بھی جا رہا تھا اور اب مجھے وہاں سے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔ میں جس اتوار کو نہیں جاتا تھا، افضل چاچا میرے اسٹال پر بیٹھنے کے لیے کسی ایمان دار آدمی کا بندوبست کر دیتے تھے۔ البتہ اب میں نے

ٹیوشنز پڑھانا چھوڑ دی تھیں لیکن سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا کیونکہ یہ ابو کی خواہش تھی۔

اگلے ہفتے نواب آیا تو وہ دوسرے روز سرفراز کو اغوا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

اس نے اس دوران میں سرفراز کے معمولات بھی نوٹ کر لیے تھے۔ وہ صبح سویرے جاگنگ کرتا تھا پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنے کسی دوست کی طرف نکل جاتا تھا اور دوپہر تک واپس آتا تھا۔ پھر شام تک گھر میں رہتا تھا۔ شام کو وہ ٹینس کھیلنے کے لیے نکلتا تھا۔ میٹرک کے امتحان ہو چکے تھے اس لیے ابھی وہ کالج نہیں جا رہا تھا۔

''سب سے مناسب وقت وہی ہے جب وہ جاگنگ کے لیے جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، میرے خیال میں یہی وقت مناسب ہے۔'' نواب نے کہا۔

اس بات پر ہم دونوں کا اتفاق ہو گیا کہ سرفراز کو صبح سویرے اغوا کیا جائے گا۔ نواب نے سرجانی ٹاؤن کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا۔ وہ مکان آبادی سے کچھ ہٹ کر تھا۔ یوں بھی وہ علاقہ ابھی اتنا زیادہ آباد نہیں ہوا تھا۔ نواب نے کہا تھا کہ میں سوزوکی ہائی روف لے کر آؤں گا۔ ایسی واردات کے لیے وہ گاڑی بہت بہترین ہوتی ہے۔

دوسرے دن منہ اندھیرے میرے سیل فون کی بیل بجی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال نواب کی تھی۔ میں نے کہا کہ میں آ رہا ہوں۔ میں پہلے ہی تیار تھا۔ اس وقت گھر میں سب سو رہے تھے اس لیے میں خاموشی سے باہر نکل گیا۔

نواب گاڑی سمیت موجود تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ گاڑی بھی چوری کی ہے؟''

''ہاں، یہ بھی چوری کی ہے۔'' نواب نے کہا۔ ''میرے پاس گاڑیوں کا شوروم تو ہے نہیں۔ میں نے تو بس اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کی ہے۔''

اس وقت سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا اس لیے نواب نے گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح اڑایا اور ہم اس جاگنگ ٹریک تک پہنچ گئے جہاں سرفراز جاگنگ کرتا تھا۔ میں اسے شکل سے نہیں پہچانتا تھا لیکن نواب نے چونکہ اس کے معمولات کا جائزہ لیا تھا اس لیے وہ اسے پہچانتا تھا۔

خوب رو سا ایک لڑکا ٹریک سوٹ میں بھاگتا ہوا نظر آیا تو نواب نے بتایا کہ یہی سرفراز ہے۔

نواب نے گاڑی بالکل ٹریک کے نزدیک روک دی۔ جب سرفراز دوڑتا ہوا وہاں سے گزرا تو نواب نے اسے آواز دی۔ ''سرفراز میاں!''

سرفراز چونک کر رک گیا اور نواب کو دیکھنے لگا۔

''ذرا ادھر آئیے... آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔''

سرفراز بلا جھجک وہاں تک آ گیا۔ ''جی فرمائیے؟''

''یار! تمہارے ڈیڈی سے ایک کام ہے۔ وہ تو ہمارا کام کرتے ہی نہیں، تم ہی سفارش کر دو۔ یہ لفافہ ان تک پہنچا دو۔'' نواب نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ لفافہ لینے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے جھٹکے سے اسے گاڑی کے اندر کھینچ لیا اور سلائڈنگ ڈور بند کر کے اسے ریوالور کی جھلک دکھائی۔

اس دوران میں نواب گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

''اگر تم نے آواز نکالنے کی کوشش کی تو تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔'' میں نے کہا اور اپنی جیب سے کالے رنگ کی ایک پٹی نکال کر اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ پھر ایک رسی سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور گاڑی کے فرش پر دھکیل کر اس پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا۔

''آپ لوگ کون ہیں اور مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

میں نے جھک کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا اور گرج کر کہا۔ ''خاموش رہو ورنہ اس مرتبہ آواز نکالی تو تھپڑ کے بجائے گولی ماروں گا۔''

وہ سہم کر خاموش ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں سفاکی سے اس کے سینے پر پیر رکھے بیٹھا رہا۔

نواب بہت ماہر ڈرائیور تھا اور بہت طوفانی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔

''آہستہ چلو۔'' میں نے کہا۔ ''ہماری تیز رفتاری دیکھ کر ٹریفک سارجنٹ یا پولیس کی کوئی موبائل وین بھی ہماری طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔''

نواب نے رفتار کم کر دی۔

ہم لوگ چالیس منٹ کے اندر اندر سرجانی ٹاؤن پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں اتنی زیادہ آبادی نہیں تھی۔ اب تو شہر اس سے بھی آگے میلوں تک پھیل گیا ہے۔ اس وقت سرجانی ٹاؤن ہی کراچی کا آخری سرا تھا۔

وہاں پہنچ کر میں نے بیدردی سے سرفراز کو باہر گھسیٹ لیا۔ اس کے گھٹنوں اور ہاتھوں کی کھال چھل گئی۔ وہ تکلیف کی شدت سے رونے لگا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''آواز نکالی تو گولی کھوپڑی میں اتار دوں گا۔''

ہم اسے لے کر مکان میں داخل ہوئے اور اس کے

ایک کمرے میں اسے لے گئے۔ اس کمرے میں صرف ایک چارپائی اور مانی کا ایک مٹکا رکھا تھا۔ وہاں جاکر میں نے سرفراز کے ہاتھ کھول دیے اور اس کی آنکھوں سے پٹی بھی ہٹادی۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

''ڈرو مت۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم نے ہمارے کہنے پر عمل کیا تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے... لیکن اگر تم نے ہماری بات نہ مانی یا یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے باپ کو تمہاری لاش کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔''

نواب گاڑی سے کھانے پینے کا کچھ سامان، پلیٹیں، گلاس اور چمچے نکال لایا۔ پلنگ پر بستر اور میلا سا ایک کمبل پہلے ہی موجود تھا۔

''تم بھوکے ہو، چلو ناشتا کرلو۔'' میں نے کہا اور ڈبل روٹی کے سلائس پر مکھن لگا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر میں نے دو سلائس خود بھی لیے اور تھرماس سے چائے پیالیوں میں نکال کر ایک کپ اس کی طرف بڑھادیا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں کھانے لگا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ وہ محض ہمارے خوف سے کھا رہا تھا کہ مبادا کہنا نہ ماننے پر میں اسے گولی مار دوں گا۔

نواب نے مجھے کمرے کے دوسرے سرے پر لے جاکر کہا۔ ''میں یہ گاڑی کہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔''

''واپسی میں اپنے کھانے کے لیے بھی کچھ لیتے آنا۔'' میں نے کہا۔

نواب کے جانے کے بعد میں نے سرفراز سے پوچھا۔ ''تم پڑھتے ہو؟''

''جی ہاں، میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''امتحان میں تمہیں نقل کس نے کرائی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''جھوٹ مت بولنا ورنہ میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔''

''پہلے تو ڈیڈی نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کی تھی، وہ نہیں مانے تو انہوں نے سر اقبال سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب مان جائیں تو میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ مانیں گے نہیں۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو وہ کتاب کس نے دی تھی جس میں نوٹ تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کتاب انہیں ماجد نے دی تھی۔ ماجد بھی میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ ڈیڈی نے اس سے کہا تھا کہ اگر تم نے یہ کام کردیا تو تمہیں بھی نقل کرنے کا موقع دلوادوں گا۔ ہاں، بعد میں اگر پوچھا جائے تو تم صاف مکر جانا۔''

''ماجد کہاں رہتا ہے؟''

''ماجد بھی سوسائٹی ہی میں رہتا ہے۔'' پھر اس نے ماجد کا پتا بتایا جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد باتیں کرتے کرتے سرفراز کو نیند آنے لگی۔ میں نے اسے سونے دیا۔

نواب کی واپسی دو کے بجائے تین گھنٹے میں ہوئی۔ وہ اس مرتبہ اپنی ٹیکسی میں آیا تھا اور ضرورت کا تقریباً سارا سامان لے آیا تھا۔ وہ سیل فون کے کئی سم کارڈز بھی لے کر آیا تھا۔

اس کے آنے سے سرفراز بھی جاگ گیا۔ میں نے نواب سے کہا کہ پہلے کھانا کھائیں باقی کام بعد میں کریں گے۔

نواب نے شاپر کھولے اور ان میں سے کھانے کا سامان نکالنے لگا۔ وہ اپنے ساتھ ایک دری بھی لے کر آیا تھا۔ فرش پر گرد بالکل نہیں تھی۔ شاید ایک دن پہلے نواب نے اس مکان کی اچھی طرح صفائی کی تھی۔ نواب نے دری فرش پر بچھا کر اس پر کھانا رکھ دیا۔ میں رات کا بھوکا تھا اس لیے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ ہم لوگوں نے اپنے ساتھ سرفراز کو بھی کھانا کھلایا۔ پھر نواب نے اس سے کہا۔ ''جانتے ہو کہ ہم تمہیں کھلا پلا کیوں رہے ہیں؟ تاکہ تم مرنے سے پہلے بھوکے نہ رہو۔ ذبح کرنے سے پہلے گائے اور بکرے کو بھی تو چارا کھلایا جاتا ہے نا!''

نواب کی بات سن کر سرفراز سہم کر رونے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر لگاتار تین چار زوردار تھپڑ مارے اور ریوالور نکال کر اس کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔ ''مجھے رونے والے بچوں سے سخت چڑ ہے۔ اب تیری آواز بھی نکلی تو دوسرا سانس نہیں لے پائے گا۔'' سرفراز سہم کر خاموش ہوگیا۔ یہ بھی ہمارے پلان کا حصہ تھا۔

نواب نے جیب سے ایک نئی سم نکالی اور اپنے سیل فون میں لگا کر سرفراز سے پوچھا۔ ''تمہارے گھر کا نمبر کیا ہے؟''

''گھر پر نہیں اس کے باپ کے سیل فون پر کال کرو۔ ممکن ہے گھر کا نمبر آبزرویشن پر ہو۔'' میں نے کہا۔ سرفراز نے پوچھنے پر اپنے باپ کا سیل نمبر بتایا۔

نواب نے کال کی، دوسری طرف سے دو ہی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کرلی گئی۔ نواب نے کرخت لہجے میں کہا۔

''شاہنواز صاحب...! آپ کا بیٹا ہمارے قبضے میں ہے... یقین نہیں آرہا ہے تو اس سے بات کرو۔'' میں نے سرفراز کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کیا اور سیل فون اسے دے کر ریوالور کی نال اس کے سر پر لگادی۔

''ہیلو ڈیڈی...!'' سرفراز نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بچالیں ڈیڈی... یہ لوگ مجھے ماردیں گے۔'' وہ باپ کی آواز سن کر بلک بلک کر رونے لگا۔

میں نے سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور کہا۔ ''شاہنواز صاحب! اب یقین آیا یا نہیں؟''

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''اس بات کو چھوڑو کہ ہم کون ہیں۔'' میں نے انتہائی درشت اور اکھڑ لہجے میں کہا۔ ''ہاں، یہ ضرور بتائیں گے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر بتاؤ۔'' وہ بے تابی سے بولا۔ ''اس کے لیے ہماری دوسری کال کا انتظار کرو۔''

''ہیلو... ہیلو...''

وہ ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔ میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

''اب تم یہاں رہو۔'' میں نے نواب سے کہا۔ ''میں کچھ ضروری کام نمٹا کر آتا ہوں۔''

''کتنی دیر میں آؤ گے؟'' نواب نے پوچھا۔

''دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ لاؤ گاڑی کی چابی مجھے دو۔''

میں وہاں سے سیدھا سوسائٹی پہنچا اور ماجد کے گھر پہنچ گیا۔ ڈوربیل بجائی تو اندر سے آواز آئی۔ ''کون؟''

پھر فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ وہ سرفراز کا ہم عمر لڑکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام ماجد ہے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''بیٹا! ذرا تم سے ایک کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ ذرا میرے ساتھ۔''

میرے حلیے اور مہذب لب و لہجے سے وہ دھوکا کھا گیا اور میرے ساتھ آگیا۔

''آؤ گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا، میں نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی اور جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ''آواز نکالی تو گولی ماردوں گا۔ خاموشی سے بیٹھا رہ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا اور اسے ملیر کی طرف لے گیا۔ اس زمانے میں شاہ فیصل کالونی اور کورنگی کو ملانے والا پل نہیں بنا تھا۔ ویسے بھی رفاہِ عام کے علاقے میں بہت سناٹا ہوتا تھا۔ میں اسے سیدھا وہیں لے گیا اور پوچھا۔ ''امتحان والے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کو وہ کتاب تم نے دی تھی؟''

''کک... کون سی کتاب؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کے چہرے پر بھرپور تھپڑ جڑ دیا اور کہا۔ ''وہ کتاب انہیں تم نے دی تھی؟''

''مجھ سے انکل شاہنواز نے کہا تھا کہ...''

''نیچے اترو۔'' میں نے کہا۔ ''اور بھاگو۔''

وہ گاڑی سے اتر کر اندھا دھند بھاگا۔ میرے سر پر اس وقت خون سوار تھا۔ اس کی وجہ سے ابو کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

میں نے ٹیکسی کا رخ اس مرتبہ فیڈرل بی ایریا کی طرف کردیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اقبال کہاں رہتا ہے۔ وہ ابو کے اسکول میں پڑھاتا تھا اور ایک مرتبہ ابو نے مجھے کسی کام سے اس کے گھر بھیجا تھا۔

میں فیڈرل بی ایریا پہنچا اور سیدھا اقبال کے گھر پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے ایسی جگہ کھڑی کی تھی کہ اگر عجلت میں فرار ہونا پڑے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔

ڈوربیل بجانے پر اقبال ہی باہر نکلا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور بولا۔ ''ارے، تم! آؤ اندر آؤ۔''

میں اندر داخل ہوا تو داخلی دروازہ اندر سے بولٹ کردیا۔ پھر میں نے اچانک ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ''سرفراز کو نقل تم نے کرائی تھی؟''

''اوہ... وہ... مجھے...''

''میری بات کا جواب دو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں نے ہی کرائی تھی۔'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ موت کو سامنے دیکھ کر انسان اسی طرح لرزتا ہے۔

میں نے اچانک ریوالور کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالی اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''تم جیسے استاد کا مرجانا ہی بہتر ہے، ابو تو مرگئے محض تمہاری وجہ سے... تم اگر اس لڑکے کو نقل کرانے کی ہامی نہ بھرتے تو ابو آج زندہ ہوتے۔'' میں نے یہ کہہ کر فائر کردیا۔

اس کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی اور وہ اوندھے منہ پیچھے کی طرف گرا۔ خون کے چھینٹے میری شرٹ اور چہرے پر بھی آئے تھے لیکن زیادہ نہیں تھے کیونکہ اس کا منہ بند تھا اور گولی حلق سے گردن کی ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اردگرد کا جائزہ لیا اور تیزی سے باہر نکل

گیا۔ اقبال شاید گھر میں اکیلا تھا ورنہ دھماکے کی آواز سن کر اندر سے ضرور کوئی آتا۔
میں تین کے بجائے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں واپس پہنچ گیا۔ وہاں جا کر میں نے منہ ہاتھ دھویا، شرٹ پر لگے ہوئے خون کے داغ دھوئے اور لمبی تان کر سو گیا۔
میری آنکھ رات کو دس بجے کے قریب کھلی۔ نواب جاگ رہا تھا۔ سرفراز بھی جاگ رہا تھا۔ میں نے نواب سے کہا کہ سم کارڈ تبدیل کرو اور اس کے باپ کا نمبر ملا کر مجھے دو۔
نواب نے سم کارڈ تبدیل کیا اور شاہنواز کا نمبر ملا کر سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ اس مرتبہ پہلی ہی گھنٹی پر شاہنواز نے کال ریسیو کرلی۔ میں نے لہجے میں سفاکی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''میری بات غور سے سنو۔ اگر تمہیں بیٹے کی زندگی عزیز ہے تو اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ایک کروڑ روپے کا بندوبست کرلو۔''
''اتنے پیسے... وہ بھی اڑتالیس گھنٹے میں؟ میں کہاں سے لاؤں گا؟'' شاہنواز نے کہا۔
''پھر بیٹے کو بھول جاؤ۔ ہاں، اگر پولیس کو انفارم کرنے کی کوشش کی تو تمہیں بیٹے کی کٹی پھٹی لاش ملے گی۔ میں دو گھنٹے بعد تمہیں کال کر کے بتا دوں گا کہ تمہیں رقم کب اور کہاں لے کر آنا ہے۔''
''لیکن پولیس کو تو معلوم ہو چکا ہے۔'' شاہنواز نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میڈیا کو بھی اطلاع مل چکی ہے۔''
''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم بس رقم کا بندوبست کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور موبائل آف کر کے سم کارڈ نکال لیا۔
میں نواب کی نگرانی میں سرفراز کو چھوڑ کر گھر روانہ ہو گیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب میں کل کسی وقت آؤں گا۔
میں گھر پہنچا ہی تھا کہ دوسرے سیل پر آصف کی کال آ گئی۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ ''آخر تم نے وہی کیا جو تم کرنا چاہتے تھے۔'' اس نے کہا۔
''مجھے اور کیا کرنا چاہیے تھا؟'' میں نے کہا۔
''ارسلان! آج کے بعد میری اور تمہاری دوستی ختم۔ میں پولیس کو تو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن آئندہ کبھی مجھے شکل مت دکھانا۔''
''مائی فٹ!'' میں نے بھنا کر کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
ٹی وی کے ہر چینل پر یہی خبر دکھائی جا رہی تھی کہ کسی نے ڈپٹی سیکریٹری شاہنواز کے بیٹے کو اغوا کر لیا ہے اور اب ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔
میں نے ان خبروں پر کوئی توجہ نہ دی اور لمبی تان کر سو گیا۔
صبح فرحانہ نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا اور بولی۔ ''بھیا۔ آپ... آپ نے... شاہنواز صاحب کے بیٹے کو اغوا کیا ہے؟''
''ہاں، میں نے اسے اغوا کیا ہے۔ اس کے باپ ہی کی وجہ سے تو ابو کی جان گئی ہے... لیکن یہ بات تجھے کیسے معلوم ہوئی؟''
''اس بات کو چھوڑیں بھیا۔ آپ... آپ نے اس کے باپ سے پیسوں کا مطالبہ کیا ہے؟''
''مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے، میں ان لوگوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''آپ جانتے بھی ہیں، کیا ہوا ہے؟'' فرحانہ کے لہجے میں وحشت تھی۔ ''بھیا! کل رات صدمے سے سرفراز کی ماں کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ اگر آپ کی رگوں میں ابو کا خون ہے تو مجھے آپ پر حیرت ہے کہ آپ نے یہ حرکت کی کیسے؟ ابو نے تو آپ کو رزق حلال سے پرورش کیا ہے... پھر آپ کے ذہن میں یہ مجرمانہ خیالات آئے ہی کیوں؟ ابو کی روح کتنی شرمندہ ہوگی کہ جس اولاد کی بہتری کی خاطر میں نے دکھ اٹھائے، تکلیفیں اٹھائیں، وہی اولاد اب جرم کے راستے پر اتر آئی ہے۔''
ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے ابو سامنے کھڑے ہیں، مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ ''ارسلان! تف ہے تجھ پر... اس سے تو بہتر تھا کہ تو پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔''
مجھے ایسا لگا جیسے اب تک مجھ پر کسی آسیب کا سایہ ہو۔ میں نے جس ارسلان کو تھپک تھپک کر بہت مشکل سے سلایا تھا، وہ پھر بیدار ہو گیا تھا۔ وہی ارسلان جو بہت نیک نام، معزز اور ایماندار ماسٹر نثار کا بیٹا تھا۔
میں اسی وقت گھر سے نکلا اور سیدھا سرجانی ٹاؤن پہنچا۔
میں نے نواب سے کہا۔ ''میں ابھی اور اسی وقت اس بچے کو اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔ تم مجھے کسی ایسی جگہ چھوڑ دو جہاں سے مجھے ٹیکسی مل جائے۔''
نواب نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''لیکن ارسلان...''
''نواب پلیز! تم فکر مت کرو۔ ان تمام واقعات میں تمہارا نام نہیں آئے گا۔ چلو جلدی کرو۔''

نواب نے مجھے ایسی جگہ ڈراپ کر دیا جہاں سے مجھے آسانی کے ساتھ ٹیکسی مل گئی۔ میں سرفراز کو لے کر سیدھا شاہنواز کے پاس پہنچا اور اس سے بولا۔ ''میں آپ کا مجرم ہوں۔ آپ پولیس کو بلائیں اور مجھے گرفتار کرا دیں۔''
''نہیں... تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے اس لیے میں ایسا نہیں کر سکتا۔''
''میں نے آپ کے بیٹے کی جان تو بچالی ہے لیکن میری گردن پر چار انسانوں کا خون ہے۔ آپ پلیز پولیس کو بلائیں۔'' یہ اس ارسلان کی آواز تھی جو ہیڈ ماسٹر نثار کا محنتی بیٹا تھا... جو اتوار بازار میں اسٹال لگاتا تھا۔
شاہنواز نہ مانا تو میں نے خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ کر گرفتاری دے دی اور اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرلیا۔ مجھے فوراً ہی گرفتار کر کے حوالات میں پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

اسی شام آصف مجھ سے ملنے آیا تو وہ بری طرح رو رہا تھا۔
''رو کیوں رہے ہو یار۔ وہ جرائم پیشہ اور قاتل ارسلان تو مر گیا۔ یہ تو اسی محنت کش اور دیانت دار ہیڈ ماسٹر نثار کا بیٹا ہے۔ ہاں، اس ارسلان کی سزا بھی ماسٹر نثار کے بیٹے کو بھگتنا ہوگی۔''
''کاش... کاش! وہ جرائم پیشہ ارسلان اسی دن مر جاتا جب اس نے قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا ارادہ کیا تھا۔ میں اسی لیے تو رو رہا ہوں۔''
''میں نے برائی کی ہے تو اس کی سزا تو مجھے ضرور ملنا چاہیے۔'' میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''تم اکیلے یہ سزا نہیں بھگتو گے ارسلان!'' اچانک نواب کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گیا تھا۔ ''میں ہر جرم میں تمہارے ساتھ برابر کا شریک رہا ہوں۔ کیا سر نثار کے نقش قدم پر صرف تم ہی چل سکتے ہو۔ وہ میرے نہ صرف استاد تھے بلکہ محسن بھی تھے۔ میں بھی خود کو قانون کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔''
اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔
مجھے فخر محسوس ہوا کہ ابو کے نقش قدم پر چلنے والا میں تنہا نہیں ہوں بلکہ ان کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شاگرد ہیں۔ انہوں نے سچائی کی جو شمع روشن کی تھی، وہ اتنی آسانی سے بھلا کب بجھ سکتی تھی۔
اچانک مجھے وہاں نوشین کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس کا چہرہ شدت غم سے بجھا بجھا تھا اور مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں متورم تھیں۔
''کیسی ہو نوشین؟'' میں نے بھاری لہجے میں پوچھا۔
''تم نے تو میرا سب کچھ لوٹ لیا ارسلان!'' نوشین بری طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ ''تمہیں تو شاید یاد بھی نہ ہو کہ میں ہی ایس ایس پی سبحان احمد کی بیٹی ہوں۔''
''تت... تم... ان کی بیٹی...''
''ہاں، میں نے تمہیں گولی چلاتے دیکھ لیا تھا لیکن اپنی زبان بند رکھی کہ میں باپ کے سائے سے تو محروم ہو ہی گئی تھی، تم سے بھی بچھڑ جاتی۔ تم نے... آخر یہ سب کیا ہی کیوں؟'' نوشین ہسٹریائی انداز میں بولی۔ ''اور کیا تھا تو خود کو قانون کے حوالے کیوں کیا؟ میں جانتی ہوں کہ میرا باپ پارسا نہیں تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے بے گناہ لوگوں کی آہیں سمیٹی تھیں۔ اب میں... کس کے سہارے جیوں گی ارسلان... کس کے سہارے جیوں گی؟'' وہ پھر رونے لگی۔
آصف اسے سمجھا بجھا کر وہاں سے لے گیا۔
دوسرے دن انکل عارف اور باجوہ صاحب مجھ سے ملنے آئے لیکن میں نے وکالت نامے پر سائن کرنے سے انکار کر دیا۔ میری گردن پر ایک نہیں بلکہ چار انسانوں کا خون تھا۔
پھر شام تک ایک خون کا مزید اضافہ ہو گیا۔
آصف نے مجھے بتایا کہ ایس ایس پی صاحب کی بیٹی نوشین نے خودکشی کرلی ہے۔
میرا دل چاہا کہ میں بھی حوالات کی آہنی سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دے دوں۔ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق بھی نہیں تھا پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ باجوہ صاحب میری وجہ سے زندگی میں پہلی دفعہ کوئی کیس ہار جائیں۔ اس لیے میں نے آخری وقت تک وکالت نامے پر سائن نہیں کیے۔
کیس تو میں نے بھی نہیں ہارا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ابو کی روح پرسکون ہے۔ ان کا رزق حلال رنگ لا رہا ہے اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں انہی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔ سچائی کا راستہ بعض اوقات پھانسی گھاٹ پر بھی ختم ہوتا ہے۔
جب آپ یہ کہانی پڑھ رہے ہوں گے تو ممکن ہے مجھے سزائے موت سنائی جا چکی ہو یا مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکایا جا چکا ہو۔ اطمینان مجھے اس بات کا ہے کہ آصف نے فرحانہ سے منگنی کرلی ہے اور جلد ہی ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آصف بھی میری طرح امی اور میرے بھائیوں کا خیال رکھے گا۔ اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھے... آمین۔

دوسرا رنگ

اصلی نقلی کا

شبنم شفیق

دولت...... شہرت...... عورت اور طاقت کا نشہ...... اچھے بھلے انسان کو پل بھر میں سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتوں سے عاری کر کے شیطان بناسکتا ہے...... حد سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش اور اوقات سے زیادہ مل جانے والی دولت، ہمیشہ نت نئے فتنوں کو جنم دیتی ہے...... یہ ہرجائی جس کے پاس آتی ہے، اپنے پیچھے ایسے عوامل ضرور لاتی ہے جو جرم کی ایک نئی داستان رقم کرنے لگتے ہیں...... ایک بھرے پرے خاندان سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی...... جس کا ہر فرد سازش اور فتنہ و فساد کی ذہنیت کا حامل تھا۔

سفاک دل جاگیردار کا فسانۂ حیات...... ہر کوئی اس کی جان اور مال کے درپے تھا

نواب سکندر حیات خان پر یہ دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنی خوش بختی کی وجہ سے بچ گئے تھے۔ نواب سکندر حیات کوئی جدی پشتی رئیس نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی اربوں کی دولت اور جاگیر اپنی کوششوں اور محنت سے بنائی تھی۔ دریائی پٹی کے قریب ہی ان کی جاگیر میں اپنا نظام چلتا تھا۔ کتنے ہی گاؤں ان کی ملکیت میں تھے۔ اور وہ وہاں بیک وقت سفاک اور انصاف پسند نواب کی حیثیت سے مشہور تھے۔ لوگوں کو انصاف دینے کے معاملے میں وہ مجرموں کو اتنی بھیانک اور سفاک سزائیں سناتے کہ لوگ اندر تک لرز جاتے۔ اسی لیے ان کی جاگیر میں کم سے کم جرم پنپتے تھے۔ ہر سال ان کی سالگرہ کا دن پوری جاگیر میں جوش و خروش سے منایا جاتا تھا کیونکہ لوگ ان سے خوش تھے اس لیے ان کے لیے ہر کام کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے لیکن جہاں ان کے بے شمار چاہنے والے تھے وہیں ان کے دشمن بھی تھے۔

نواب صاحب پر یہ دوسرا حملہ ان کی سالگرہ والے دن ہی ہوا تھا۔ پہلا حملہ کوئی چار ماہ پہلے جب وہ اپنے آموں کے باغات کا معائنہ کرنے اپنی فیملی کے ساتھ گئے تھے تب ہوا تھا۔ کچھ لوگ کالے کپڑوں میں ملبوس چہروں پر ڈھاٹے پہنے اچانک باغ میں گھسے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے لمحوں میں فرار ہو گئے تھے۔

نواب صاحب کے وفاداروں میں سے ایک نے اپنی زندگی کی بازی ہار کر اور دوسروں نے شدید زخمی ہو کر اپنی وفاداریوں کی قیمت چکا دی مگر نواب اور ان کی فیملی پر ایک آنچ نہ آنے دی۔ اور اب چار ماہ بعد نواب صاحب پر ہونے والے دوسرے حملے نے نہ صرف نواب بلکہ ان کی ساری فیملی کو ہراساں کر دیا تھا۔

ہوا یوں کہ نواب صاحب جیسے ہی اپنی سالگرہ کی تقریب میں سجے ہوئے اسٹیج پر آ کر بیٹھے، ایک انتہائی تیز رفتار گولی ان کے شانے کو چھوتی ہوئی اسٹیج کے پیچھے شامیانے میں سوراخ پیدا کرتی ہوئی نکل گئی۔ اسٹیج اور اس کے اردگرد جیسے بھونچال سا آ گیا۔ لوگ خوف و ہراس سے چیختے چلاتے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ نواب صاحب کے باڈی گارڈز اور ملازموں نے فوراً نواب صاحب کو اپنے حصار میں لے لیا اور گاڑی میں لے کر حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ نواب صاحب کی جاگیر چونکہ کسی بھی بڑے شہر سے کافی فاصلے پر تھی، اس لیے ضروریاتِ زندگی کی تمام جدید سہولتیں انہوں نے اپنی حویلی میں ہی میسر کر رکھی تھیں۔ حویلی میں ایک چھوٹا مگر جدید طبی سہولیات سے مزین اسپتال تھا جہاں شہر کے بہترین ڈاکٹروں کو اعلیٰ معاوضے کے ساتھ بہترین رہائشی سہولتیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ وہ اپنی فیملیز کے ساتھ خوش و خرم یہاں رہائش پذیر تھے اور ضرورت پڑنے پر شہر جانے کے لیے مہنگی گاڑیاں ہر وقت ان کے دروازوں پر کھڑی ہوتیں۔ انہیں یہاں چونکہ کوئی فکر اور مالی پریشانی نہیں تھی اس لیے وہ دلجمعی سے اپنا کام کرتے تھے۔ نواب صاحب کو جب زخمی حالت میں لایا گیا تو وہ سب تیزی سے ان کو ٹریٹمنٹ دینے لگے۔ گولی شانے کو چھوتی ہوئی گزری تھی اس لیے خون تو تھوڑا بہا تھا لیکن اس نے نواب صاحب کے سفید کرتے کو رنگین کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے سب پریشان ہو گئے لیکن جب سینئر ڈاکٹر زاہد رضا نے گھر والوں کو تسلی دی تو سب کی جان میں جان آئی۔

واقعے کی اطلاع پر ملحقہ تھانے سے انسپکٹر آصف بذاتِ خود معاملے کی تحقیق کے لیے آیا تھا۔ نواب سکندر پورے ہوش و حواس میں تھے۔ اس لیے ڈاکٹر زاہد کے روکنے کے باوجود انسپکٹر آصف کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

''السلام علیکم نواب صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' آصف اندر آتے ہی نواب سکندر کے بارعب چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بولا تو جواب میں نواب سکندر نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ آصف سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''گستاخی معاف نواب صاحب! پہلے حملے سے اب تک آپ نے ہمیں اپنی ذہانت آزمانے کا موقع نہیں دیا ورنہ اس دوسرے حملے کی نوبت نہ آتی۔'' وہ پولیس والوں کے مخصوص انداز میں بولا۔ اس کی بات سن کر نواب سکندر کی بھویں تن گئیں۔

''برخوردار! اب تک آپ کی ذہانت نے کیا معلوم کیا ہے؟'' وہ اپنی رعب دار آواز میں اس پر ایک گہری نظر ڈال کر بولے۔

''آپ کے موجودہ دشمن کا تو فی الحال پتا نہیں لگایا جاسکا۔ آپ پر کسی اسنائپر گن سے فائر کیا گیا ہے، گولی دو سو میٹر دور واقع ایک گھنے اور اونچے درخت سے چلائی گئی ہے۔ مجرم پکڑا نہیں گیا بلکہ اس کا سراغ تک نہیں ملا جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کا دشمن بااثر ذرائع رکھتا ہے۔ اب آپ ہی اس معاملے پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔''

''جس نے مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت کی ہے، وہ بااثر ہی ہوگا۔ مجھے اب ہر قیمت پر وہ بندہ چاہیے... زندہ یا مُردہ۔'' نواب سکندر کی آنکھوں میں ایک خاص چمک نمودار ہوئی۔

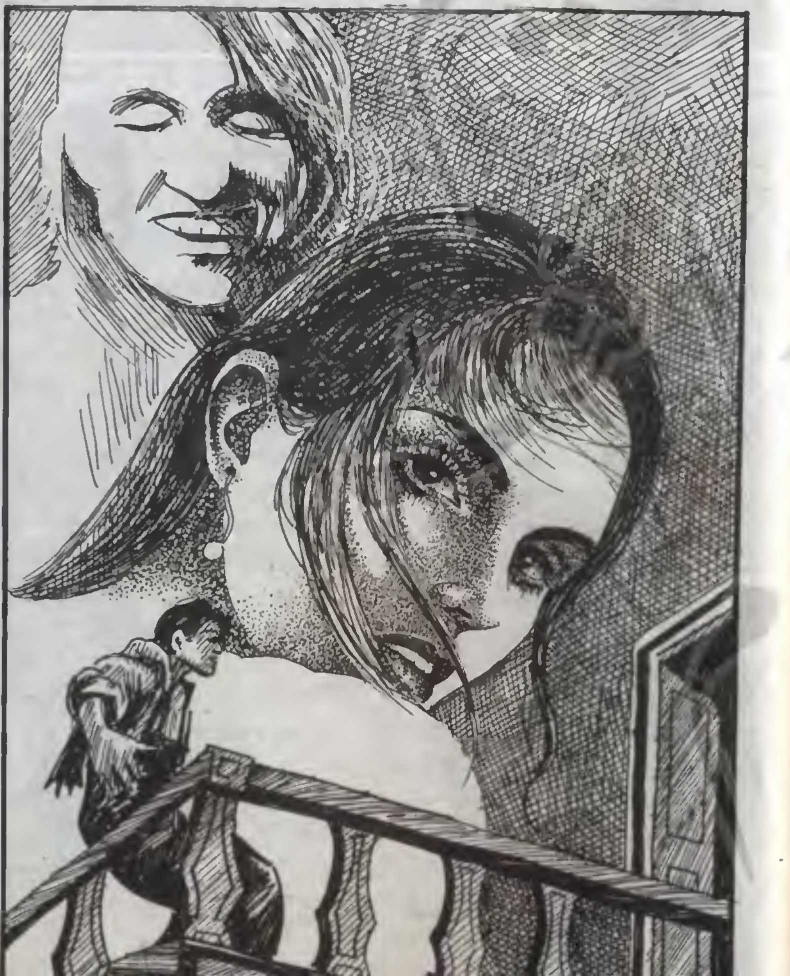

''فکر نہ کریں نواب صاحب! بس اب آپ کی اجازت مل گئی ہے تو انشاء اللہ جلد ہی بندہ بھی حاضر کر دیں گے مگر ایک گزارش ہے۔''

''کیا...؟''

''آپ کی اگر کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ ہے... یا رہی ہو تو مہربانی کر کے ہمیں بتائیں تاکہ معاملہ کچھ سمجھ میں آئے۔''

''اس جاگیر میں .... کوئی بھی میرا دشمن ہو سکتا ہے... مجھے ہر ایک پر شک ہے۔'' وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے بولے۔

''نواب صاحب! کوئی وصیت یا جائداد وغیرہ کا چکر تو نہیں؟''

''معاملہ اربوں کی جائداد کا ہو تو چکر تو خود ہی بن جاتے ہیں۔'' قریب موجود ڈاکٹر زاہد رضا جس کے نواب صاحب سے کافی دوستانہ مراسم بھی تھے، پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''نواب صاحب کی حویلی میں سب ان کے قریبی عزیز... دو عدد بیٹیاں اور داماد رہتے ہیں۔ ایک ہی پوتی ہے جو ملک سے باہر رہتی ہے لیکن نواب صاحب نے اس کے بارے میں ابھی تک کسی کو بتایا نہیں ہے، ہو سکتا ہے کسی کو علم ہو گیا ہو۔'' ڈاکٹر زاہد بولا۔

''ہوں... تو پھر معاملہ صاف ہے... مجھے تو یہ جائداد کا چکر ہی لگتا ہے۔ دولت کے لیے غیر کیا اپنے بھی خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔'' انسپکٹر آصف ہنکارا بھر کر بولا۔ ''نواب صاحب! حویلی میں کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے جو پُراسرار لگا ہو؟''

''جب تک پرانی وصیت تھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ کچھ عرصے پہلے جب سے میں نے اپنی وصیت بدلی ہے، تب سے ہی مجھے حالات کچھ بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔ پہلے میں نے سب کو کچھ نہ کچھ دینے کا ارادہ کر رکھا تھا مگر ان کی حرکتوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں۔'' نواب سکندر غصے سے سرخ ہوتے ہوئے بولے۔

''کچھ وضاحت کریں گے نواب صاحب!'' انسپکٹر چونک کر بولا۔

''یہ سب جونک کی طرح میری دولت سے چمٹے ہوئے ہیں اور اندر ہی اندر مجھے کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔ سب سانپ ہیں جن کو میں نے دودھ پلا پلا کر اتنا بڑا کیا ہے کہ اب وہ میری گردن کو آنے لگے ہیں لیکن میں بھی سکندر حیات خان ہوں... جس طرح ان کو پالا ہے اسی طرح کچل بھی سکتا ہوں۔ بس میری پوتی آ جائے، ان کو گردن سے پکڑ نکال باہر کروں گا۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مجھ پر حملہ کرنے میں کون ملوث ہے تو ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ اس کی نسلیں تک تڑپتی رہیں گی۔'' نواب سکندر وحشت ناک لہجے میں پھنکار کر بولے۔ ڈاکٹر زاہد نے ایک سرد لہر اپنے پورے وجود میں دوڑتی محسوس کی۔

''زیادہ پریشان نہ ہوں نواب صاحب! اب معاملہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ دوسری ملاقات میں کچھ خاص خبر ہی آپ کو سناؤں گا... اب اجازت دیجیے۔'' وہ رخصت ہوتے ہوئے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''اُشمل بیٹی کب آ رہی ہے؟'' انسپکٹر کے جاتے ہی ڈاکٹر زاہد نے پُرجوش انداز میں پوچھا تو سکندر حیات کے سرخ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑنے لگی۔

''اسی ہفتے آ رہی ہے، بس دعا کرو خیریت سے پہنچ جائے۔''

''ہاں، کیوں نہیں... مگر اس کا یہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔''

''جانتا ہوں... مگر یہاں تو اسے آنا ہی ہے، میری زندگی میں آ جائے گی تو اسے کچھ سمجھا سکھا دوں گا۔ وہ یہاں رہے گی تو یہاں کے لوگوں کو بھی پتا چلے گا کہ نواب سکندر حیات خان کی پوتی ہے۔ سب اس کا احترام کریں گے ورنہ میرے بعد تو اس کا مجھ سے تعلق ہی کوئی ثابت نہیں کر سکے گا۔ یقین کرو تو میرا تو اب زندگی سے بھروسا ہی اٹھ گیا ہے۔''

''اب ایسا بھی نہ سوچیں نواب صاحب! اللہ سب بہتر کرے گا۔ اب آپ حویلی جائیے، ریسٹ کیجیے۔ اُشمل بیٹی کے استقبال کی تیاریاں بھی کرنا ہوں گی مگر اب ہر پہلو کو نظر میں رکھیے گا۔ میں بھی انشاء اللہ چکر لگاتا رہوں گا۔''

''میں تمہارا بہت ممنون رہوں گا دوست... اگر میں نہ رہا تو میری پوتی کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔''

''خدانخواستہ کچھ نہیں ہو گا آپ کو نواب صاحب! اشمل میری بیٹی کی طرح ہے۔''

☆☆☆

سان فرانسسکو سے روانہ ہونے والی انٹرنیشنل فلائٹ میں مختلف نسلوں کے لوگ موجود تھے۔ بزنس کلاس کی تیسری قطار میں ونڈو سائڈ پر بیٹھے جبران نے کوئی تیسری مرتبہ اپنی رسٹ واچ کو بے قراری سے دیکھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی میناکشی نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں کہ یہ تمہارا پہلا مشن ہے... اس لیے زیادہ بے چینی شو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اپنے سرخ لپ اسٹک والے بھرے بھرے ہونٹوں کو تقریباً اس کے کان میں گھسیڑتے ہوئے بولی۔ جبران نے ایک گہری سانس لی اور قدرے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اسے ایک مرتبہ دیکھ لینا چاہتا ہوں۔''

''گھنٹا بھر پہلے ہی میں تمہیں اس کی فوٹو دکھا چکی ہوں۔''

''لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے اسے دیکھنا چاہیے۔''

''ہیتھرو ائرپورٹ سے پہلے نہیں۔'' وہ سخت لہجے میں بولی۔

''مانا کہ اس مشن کی انچارج تم ہو مگر اسے پورا میں نے کرنا ہے، اس لیے زیادہ مشورے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ روکھے انداز میں بولا۔

''میری ایک کال پر ہیتھرو پر مجھے کوئی بھی جوائن کر سکتا ہے۔ تم میری گڈ بک میں ہو اسی لیے تمہاری بکواس برداشت کر رہی ہوں۔ مجھے مجبور مت کرو۔'' وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔ جبران نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی اور قدرے لگاوٹ سے اسے دیکھنے لگا۔

''جیسے مادام کا آرڈر...'' وہ اس کی طرف کچھ جھکا۔ ''ویسے تم غصے میں بھنی ہوئی مکئی کا بھٹا لگتی ہو۔ جی چاہتا ہے کہ کھا جاؤں۔'' وہ آنکھوں میں پیار سموتے ہوئے بولا تو انتہائی بولڈ ہونے کے باوجود بھی میناکشی شرمانے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

''ٹوائلٹ چلتی ہو؟'' وہ اس کے تیکھے سانولے نقوش کو بے باکی سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ ہنس دی۔

''ہیتھرو ائرپورٹ پر وی آئی پی روم ملے گا، اس کا ٹوائلٹ زیادہ بہتر رہے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''دیکھ لو، دغا نہ دے جانا... اب اور انتظار نہیں ہوتا۔'' وہ بے صبری سے اس پر جھک کر بولا تو میناکشی نے اپنی انگلی اس کی ناک پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔

''میرا خیال ہے کچھ ریسٹ کر لینا چاہیے، اس کے بعد کافی ایکشن میں رہنا ہے۔'' وہ اپنی سیٹ سے سر ٹکاتے ہوئے بولی۔ جبران نے ایک اطمینان بھری نظر اس پر ڈالی۔ کچھ دیر پہلے کولڈ ڈرنک میں ڈالی ہوئی اس کی گولی نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پانچ منٹ مزید انتظار کر کے وہ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرنے لگا اور گود میں رکھے چھوٹے سائز کے جدید ماڈل کے لیپ ٹاپ کو سیٹ پر رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ واٹر کولر کی طرف تھا۔

☆☆☆

طیارے میں دیے گئے لنچ سے فارغ ہو کر اشمل اپنے شولڈر بیگ سے ایک ٹورازم پر مبنی میگزین نکال کر دیکھنے لگی۔ وہ بائیس برس کی نشیلے نقوش والی ماڈرن طرزِ زندگی کی حامل لڑکی تھی۔ اس کے سنہری بال ایک اونچی سی پونی ٹیل میں کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ بلیک لونگ اسکرٹ پر ریڈ چمک دار لیدر کی جیکٹ میں وہ کافی دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے ممی پاپا نے ہفتہ بھر پہلے ہی اسے بتایا تھا کہ وہ پاکستان جا رہی ہے، اپنے دادا کے پاس... جہاں وہ ان کی اربوں کی دولت کی وارث بننے والی ہے۔ اسے پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک میں رہنے والے اپنے دادا سے اگر کوئی دلچسپی محسوس ہوئی تو صرف اس حد تک کہ وہ بہت زیادہ امیر بننے والی تھی... اور وہ اس پورے ہفتے میں اپنے فرینڈز کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جانے کے پلان ترتیب دیتی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی واپس لوٹ کر ایک شان دار زندگی کا آغاز کرنے والی ہے۔ وہ خود کو دنیا کی خوش نصیب لڑکی تصور کر رہی تھی۔

میگزین پر اچٹتی سی نظر ڈالتی اشمل کو یک دم بے چینی سی محسوس ہوئی۔ آہستگی سے میگزین نظروں سے نیچے کر کے اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ زیادہ تر افراد سفر طویل ہونے کے سبب اونگھ رہے تھے۔ اس کی نظریں گھومتی گھماتی ایک شخص پر جیسے ٹھہر گئیں اور غالباً اس کی بے چینی کا سبب بھی وہی تھا۔ واٹر کولر کے پاس ڈسپوزیبل گلاس کو منہ سے لگائے کھڑا وہ شخص اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر وہ اسے نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا پیغام دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اشمل نے گھبرا کر میگزین دوبارہ چہرے کے آگے کر لیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا دماغ بھی تیزی سے چلنے لگا تھا۔ وہ عنقریب ارب پتی ہونے والی تھی اور اس نے ایسے کئی واقعات سن رکھے تھے جو اکثر ایسے مواقعوں پر رونما ہوتے تھے۔

'کیا یہ شخص میرا تعاقب کر رہا ہے؟' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا اور ڈرتے ڈرتے دوبارہ میگزین نیچے سرکانے لگی۔ وہ آدمی اب وہاں نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری اور طویل سانس لی اور خود کو یقین دلانے لگی کہ یہ سب اس کا وہم ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی اسے اپنے ممی پاپا پر بے طرح غصہ آیا جو اس کی زندگی کو داؤ پر لگا کر خود آرام سے گھر بیٹھے تھے۔ وہ شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہو گئی۔ اس نے آنکھیں موند کر سر کو سیٹ سے ٹکایا اور اپنے حالات کا جائزہ لینے لگی۔ وہ واقعات کو تھوڑا پیچھے کر کے سوچنے لگی جب اس کے باپ نے اسے پاس بٹھا کر آہستگی سے کچھ پُراسرار رازوں کے بارے میں

آگاہ کیا تھا۔ وہ دن پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں گھومنے لگا جب اس کے باپ نے اسے بتایا تھا کہ اسے اشمل بن کر پاکستان میں موجود ان کے دوست کی پوتی کا کردار ادا کرنا ہے جو کہ ایک نواب ہے اور اس نے برسوں پہلے اپنی چھوٹی سی پوتی کو ان کی تحویل میں دے کر ملک سے باہر بھیج دیا تھا تاکہ پوتی دشمنوں سے دور رہ کر محفوظ رہے۔ لیکن اس بچی کی ڈیتھ بچپن میں ہی ڈبل نمونیہ کے باعث ہو گئی تھی۔ اپنے نواب دوست کو صدمے سے بچانے کی غرض سے اس نے برسوں ان سے جھوٹ بولا کہ بچی زندہ ہے اور اب ان کے مطالبے پر اپنی بیٹی کو ان کے پاس بھیج رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کا دوست اپنی پوتی کی موت کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے وقت سے پہلے ہی اوپر چلا جائے۔ جب اس کے باپ نے اسے یہ سب بتا کر اسے اشمل کا کردار پلے کرنے کو کہا تو وہ فوراً سے پہلے تیار ہو گئی۔ اسے آخر کرنا ہی کیا تھا؟ کچھ عرصے کے لیے نقلی پوتی بننا تھا پھر ڈھیر ساری دولت کی وارث بن کر واپس لوٹ آنا تھا... مگر اب طیارے میں بیٹھے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں، جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اسے اپنے آس پاس ہی خطرہ منڈلاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے خشک گلے کو تر کرتی وہ بھی واٹر کولر کی طرف بڑھی پھر اسے حاجت محسوس ہوئی تو وہ کچھ سہمے ہوئے انداز میں ٹوائلٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اچانک کسی نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف کھینچا اور دبوچ لیا۔ چھوٹے سے ٹوائلٹ میں طاقتور شکنجے میں پھنسی وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اسے پہچان چکی تھی۔ وہ وہی شخص تھا جو کچھ دیر پہلے واٹر کولر کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی مضبوط بانہوں میں بے بس کچھ دیر وہ اپنی رہائی کی ناکام کوشش کرتی رہی پھر نڈھال ہو کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ تصور میں خود کو خون میں ڈوبا دیکھنے لگی۔

''اگر تم چلاؤ نہیں تو میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' دبوچنے والے نے سرسراتی آواز میں کہا تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس آدمی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی۔ اس نے زور سے چیخنے کے لیے سوچا مگر پھر اپنی اس خواہش کو دبا لیا۔ وہ آدمی اگر اسے مارنا چاہتا تو پہلی فرصت میں مار سکتا تھا۔ اس نے اس کی بات سننے کے لیے خود کو تیار کیا۔

''تمہاری جان کو شدید خطرہ ہے۔'' وہ اچانک بولا۔

''تو تم کیا میرے باڈی گارڈ ہو؟''

''فی الحال ایسا ہی سمجھ لو۔ میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔''

''کیسا تعاون...؟'' وہ بولی۔

''ہیتھرو ائرپورٹ پر پورا پلان تیار ہے، تمہیں مارنے کا... بلکہ یوں کہہ لو کہ منظر سے غائب کرنے کا۔''

''لیکن کیوں...؟'' وہ لرزتے وجود کے ساتھ بولی۔

''کیونکہ اس طیارے میں تمہاری جگہ ایک دوسری اشمل پاکستان جائے گی۔'' وہ بولا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بڑی بری طرح پھنس چکی تھی۔ اسے ہر حال میں اس شخص کو اعتماد میں لینا تھا۔

''تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟'' وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تمہاری مدد ہی کرنا چاہتا ہوں۔ غور سے میری بات سنو۔'' وہ اسے اپنا پلان بتانے لگا جسے سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اس کی بات کے اختتام پر اس کے سرخ و سپید چہرے کا رنگ جیسے اڑ گیا۔

''یہ سب بہت خطرناک ہے۔ مم... میں نہیں...''

''کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ جیسا تمہیں کہا ہے، ویسا ہی کرنا ہوگا۔ اب میں چلتا ہوں، مینا کشی کسی بھی وقت اٹھ سکتی ہے۔''

''لیکن میں تم پر اعتبار کیونکر کروں؟'' وہ جانے لگا تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بولی۔ اس شخص نے اپنی گہری براؤن آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے دیکھنے کا انداز کچھ خاص تھا۔

''اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔''

☆☆☆

حویلی میں نواب سکندر نے واپس آتے ہی کچھ خاص قسم کی تیاریاں شروع کروا دی تھیں۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر حویلی کے افراد میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ نواب کی پوتی کی آمد کے بارے میں چونکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا، اس لیے ہر کوئی قیاس آرائیوں میں مگن تھا۔ اس وقت بھی نواب صاحب کی دونوں بیٹیاں اپنے مستقل طور پر فارغ رہنے والے شوہروں کے ہمراہ حویلی کے پائیں باغ میں بیٹھی کینو کھاتے ہوئے حویلی میں ہونے والی شاندار تیاریوں کے سلسلے میں بحث میں مشغول تھیں۔ ان کے قریب ہی ان کے دور پرے کا خالہ زاد اور اس کا بیٹا حارث بھی بیٹھا تھا۔ چونکہ نواب کی بڑی بیٹی زمرد کی دونوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں، اس لیے وہ ہمہ وقت حارث جیسے جوان اور ہینڈسم لڑکے پر نظر رکھتی تھی کیونکہ حال ہی میں وہ انگلینڈ سے بیرسٹر کی ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ ورنہ عام حالات میں وہ بمشکل ہی خفیہ معاملات کی ڈسکشن اپنی بہن کے علاوہ کسی اور سے شیئر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

''یہ خاص الخاص تیاریاں دو وجوہات کی بنا پر ہی ہو سکتی ہیں... یا تو ابا جان اپنے صحیح سلامت بچ جانے کی خوشی منانا چاہ رہے ہیں یا پھر کوئی خاص مہمان آ رہا ہے۔'' نواب صاحب کی چھوٹی بیٹی زونیرہ کینو کے بیج منہ سے نکال کر دور نیچے پھینکتے ہوئے بولی۔

''تمہارا پہلا خیال غلط لگتا ہے کیونکہ پچھلی مرتبہ ایسا کوئی صحت یابی کا جشن نہیں منایا گیا تھا۔ ہاں، البتہ دوسری بات سے میں قدرے متفق ہوں۔'' زونیرہ کے شوہر ماجد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنی اہم ہستی آخر کون ہے؟'' زمرد کے شوہر زبیر نے کہا۔

''ابا جان کو پیسا یوں بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آنے والا جو کوئی بھی ہے، ہم سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو گن گن کر رقم خرچ کرنے کو دیتے ہیں اور خود اب ایسی تیاریاں کروا رہے ہیں جیسے کسی سلطنت کا مہاراجا آنے والا ہو۔'' ماجد نے منہ بگاڑ کر اپنی ناگواری ظاہر کی۔

''ابھی پچھلے ہفتے ہی میں نے ابا جان سے پانچ لاکھ روپے مانگے تھے مگر صرف پچاس ہزار کی معمولی رقم تھما دی۔ ارے بھئی جوان بچوں کا باپ ہوں، سو ضرورتیں پڑتی ہیں مگر مجال ہے بوڑھے کو اس بات کا خیال ہو۔'' زبیر بھی غصے سے بولا تو ماجد نے اسے گھور کر دیکھا۔

''تمہاری ضرورتوں کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ شراب کی کوئی نایاب قسم مل گئی ہوگی ورنہ اپنے بچوں پر تم ایک روپیا خرچ نہ کرو۔''

''تمہیں بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جواباً غصے سے بولا۔ حالانکہ حویلی میں ہر کوئی اس کی کثرت شراب نوشی سے واقف تھا۔ اس کی آنکھیں ہمہ وقت سرخ رہتی تھیں۔

''تم دونوں لڑنے کے بجائے کوئی کام کی بات سوچو تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' زمرد نے ناگواری سے دونوں کو دیکھ کر کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے قاسم؟'' زونیرہ کب سے خاموش بیٹھے اپنے خالہ زاد سے بولی۔

''میں تو نواب صاحب کی وصیت کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔'' قاسم نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑا۔ برسوں سے وہ اس حویلی سے یونہی نہیں چمٹا ہوا تھا۔ اسے یہاں سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے ہی جانا تھا۔

''وصیت سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' زبیر نے منہ بنا کر کہا کیونکہ نواب صاحب کی دو ہی بیٹیاں تھیں اور ممکنہ طور پر جائداد کی وارث بھی وہی تھیں مگر نواب صاحب کے یہ خوامخواہ کے اکٹھے کیے گئے عزیز اسے زہر لگتے تھے۔

''ارے بھئی، میرا وصیت سے کیا تعلق۔ میرا بیٹا شہر میں کامیاب بیرسٹر ہے۔ اس کی کمائی ہی میرے لیے بہت ہے۔ میں تو یہاں نواب صاحب کو وقت دینے کے لیے رکنے پر مجبور ہوں۔ تم سب واقف ہی ہو کہ وہ میرے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں۔ میں تو تم لوگوں کے لیے ہی بات کر رہا تھا۔'' قاسم بہت کائیاں آدمی تھا، جلدی سے بات بنا کر بولا۔

''قاسم بھائی! آپ نے ابا جان کی وصیت کے بارے میں بتا کر بہت پریشان کر دیا ہے۔ کچھ پتا چلا ہے کس قسم کی تبدیلی ہوئی ہے؟'' زمرد پریشانی سے بولی تو یکایک قاسم کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا کیونکہ وہ ان سب لوگوں سے نسبتاً زیادہ ہی نواب صاحب کے قریب تھا۔ اکثر ان کے منہ سے کوئی بات نکل جاتی تو اسے خوب مرچ مسالا لگا کے پیش کرتا تھا۔

''کچھ خاص پتا تو نہیں چل سکا مگر تم سب سے نواب صاحب کافی ناراض لگتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان پر قاتلانہ حملوں کے پیچھے حویلی کے لوگوں کا ہی ہاتھ ہے۔'' وہ ایک نظر حاضرینِ محفل پر ڈال کر بولا تو سب اپنی اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

''ارے بھئی، ہم کیوں اپنے باپ کو نقصان پہنچانا چاہیں گے؟ ہماری تو دعا ہے وہ سدا یونہی ہمارے سروں پر سلامت رہیں۔'' زونیرہ جلدی سے بولی تو سب اس کی حمایت میں سر ہلانے لگے۔

''ویسے بھی ان کی عمر بہت لمبی ہے۔ دو حملے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے اور مزید بھی ایسے امکانات نظر نہیں آتے اور نہ ہی انہیں کوئی بیماری ہے۔'' ماجد حسرت سے بولا۔

''ان لوگوں کے خاندان میں تو کینسر یا ٹی بی جیسی کوئی موروثی بیماری بھی نہیں جو بندہ فرض کر لے کہ ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔'' زبیر بھی بیزاری سے بولا۔

''ہاں، تم لوگ تو امیدیں لگائے بیٹھے ہو کہ کب ابا کی روح پرواز کرے اور کب تم لوگ چیل کوؤں کی طرح سب کچھ ہڑپ کر جاؤ۔ بس دولت ہم دونوں بہنوں کے ہاتھ

آنے دو، مجال ہے جو تم لوگوں کو ہوا لگنے دیں۔'' زمرد کا اشارہ شاید اپنے شوہر اور بہنوئی کی طرف تھا۔ اس کی بات پر دونوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ اب اگلا سارا گھنٹا بیویوں کی خوشامد میں گزارنے والے تھے اور کیوں نہ گزارتے... وہ چلتی پھرتی مستقبل کی دولت کی تجوریاں تھیں اور اس سارے عمل میں قاسم آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے بیٹے کو کچھ خاص اشارے کرنے میں مگن تھا۔

☆☆☆

ہیتھرو ائرپورٹ پر طیارے کا ٹرانزٹ تھا۔ مسافروں کو آدھا گھنٹا آرام کے لیے دیا گیا تھا۔ ائرپورٹ کے ملحقہ لاؤنج میں مسافروں کے آرام کے لیے اعلیٰ سہولتوں سے مزین کمرے تھے۔ میناکشی کا سر طیارے میں گہری نیند ہونے کے باعث کچھ بھاری سا ہو رہا تھا۔ وہ ایک کافی شاپ پر کافی کے لیے آئی تاکہ آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ بھی تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر کچھ الجھی ہوئی بھی تھی۔ وہ اتنی گہری نیند لینے کی عادی نہیں تھی۔ اسے جبران پر شک ہو رہا تھا مگر بظاہر وہ اس پر ظاہر نہیں کر رہی تھی اور جبران کی اس حرکت پر وہ اس کی وجہ جاننے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

جبران اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا سیڑھیوں پر لگی ریلنگ سے نیچے جھانکتا ہوا سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھا۔ شعوری طور پر وہ میناکشی سے اپنی کیفیات چھپانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ان دونوں کو گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ قیمتی لگ رہا تھا۔ ان کو ملے تیں.... منٹس میں سے سات.... منٹس اپنے انجام کو پہنچ بھی چکے تھے۔ اب ان کے پاس صرف تیئس منٹس تھے اور فی الوقت انہیں ملر کا انتظار تھا جو کہ ایک اجرتی قاتل تھا۔ اسے انہی سیڑھیوں سے اوپر آنا تھا جہاں اس وقت جبران کھڑا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد اسے ملر اوپر آتا نظر آیا۔ وہ بھاری جثے اور لمبے قد کا مالک ایک گنجا انگریز تھا۔ اس کا قدرے گھسا ہوا لباس اس کی ان دنوں کی بدحالی کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر جبران کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔ سامنا ہونے پر تعارف کے بجائے دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے اور پھر ایک دم ہی جبران مڑا اور اب اس کا رخ لاؤنج سے ملحقہ کمرے کی طرف تھا۔ ملر بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے تھا۔ میناکشی ان کو اندر جاتا دیکھ کر خود بھی اسی جانب چل پڑی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر وہ دونوں ہی بیک وقت...
...... اندر داخل ہوئے تھے۔ ٹھیک آدھے منٹ کے وقفے سے میناکشی بھی اندر آئی۔ اس کے اندر آنے پر جبران نے لائٹ جلادی.... اس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود واحد الماری کے اوپر سے ایک عدد کالا بیگ کھینچ کر اتارا اور جلدی سے اسے کھولا۔ اس کے اندر ایک عدد جدید سائلنسر لگے پسٹل کے ساتھ میک اپ سرجری کا سامان بھی تھا۔ انہیں یہاں اشمل کو ختم کر کے میناکشی کا میک اپ کر کے اسے اشمل سے مشابہ بنانا تھا اور اس سارے کام کے لیے ان کے پاس صرف انیس منٹس تھے۔ کمرے سے ملحقہ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز ظاہر کر رہی تھی کہ ٹارگٹ اندر ہی ہے۔ ان تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا... پھر ان کا رخ باتھ روم کی طرف ہوگیا۔ ٹھیک ایک منٹ کے وقفے کے بعد ایک گھٹی گھٹی سی چیخ بلند ہوئی اور پھر ساتھ ہی کمرے کی خاموشی میں ڈوب گئی۔

پچیس منٹ بعد وقفے وقفے سے نکلنے والے افراد میں سب سے آگے نواب سکندر حیات کی کل جائداد کی وارث ان کی اکلوتی پوتی اشمل تھی۔

☆☆☆

طیارے کا دوسرا ٹرانزٹ دبئی ائرپورٹ پر تھا۔ کچھ فنی مرمت کے علاوہ طیارے کو ری فیول بھی کیا جانا تھا۔ یہاں سے جبران اور اشمل کو اس طیارے کو خیرباد بھی کہنا تھا۔ اس سے آگے ان کو خطرہ تھا کیونکہ ہیتھرو ائرپورٹ پر ہونے والا قتل کسی بھی لمحے سامنے آسکتا تھا۔ دبئی سے پاکستان کا سفر اب انہیں ایک موٹر بوٹ پر کرنا تھا جو کہ جبران کے ایک دبئی میں رہنے والے دوست کی تھی۔ موٹر بوٹ کی روانگی دو گھنٹے بعد تھی۔ اس لیے ان کا رخ قریبی مارکیٹ کی جانب تھا کیونکہ وہاں سے زیادہ محفوظ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اپنا حلیہ اور لباس بھی تبدیل کرنا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' جبران کے ساتھ چلتی اشمل سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ ان دونوں کا رخ کسی بھی سپر اسٹور کے بجائے ایک عام درجے کی حامل دکان کی جانب تھا۔ جبران نے ایک تفصیلی نظر اس کے حلیے پر ڈالی۔

''میرا خیال ہے پہلے ہمیں اپنا ظاہری حلیہ تبدیل کرنا چاہیے۔ اس معاملے پر بعد میں بات ہوگی۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ اشمل نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اپنا بھاری بیگ گھسیٹتی ہوئی دکان میں موجود ٹرائل روم کی جانب بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ نکلی تو کافی بدلے ہوئے حلیے میں تھی۔ لانگ اسکرٹ کے بجائے اس نے جینز کی بلیو پینٹ کے اوپر پھول دار گہرے سبز رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بندھے

بالوں کو کھول کر وہ شانوں پر بکھیر چکی تھی۔ جبران نے ایک مطمئن نظر اس پر ڈالی اور پھر خود بھی ٹرائل روم میں گھس گیا۔ ٹھیک تین منٹ بعد وہ بھی اپنے سابقہ حلیے سے کافی بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ دکان سے اس نے ایک عدد بڑا سفری بیگ خریدا اور اپنا اور اشمل کا سامان اس میں ڈال کر پرانے بیگز سے جان چھڑائی۔ یہ ایک عدد ٹورسٹ شاپ تھی جہاں..... ٹورسٹ کی ضرورتوں سے متعلق سامان موجود تھا۔ دکان سے نکلتے وقت جبران نے ایک عدد بڑا سا لیڈیز ہیٹ خریدا اور اشمل کے سر پر رکھ دیا۔ شاپ کیپر ان کو نیو ہنی مون کپل سمجھ رہا تھا۔ وہ مسکرا کے اپنے باقی گاہکوں کو ڈیل کرنے لگا۔

☆☆☆

''مما! پیٹ میں بہت سخت درد ہو رہا ہے۔'' علینہ، زمرد کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر درد سے بلبلاتے ہوئے بولی۔

''یہ جو شہر سے پیزا منگوا کر کھاتی ہو یہ اسی کی کرامات ہیں۔'' وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ درد کی شدت سے علینہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ حویلی کے اسپتال میں تھی۔ ڈاکٹر عامر جو کہ زاہد رضا کا بیٹا تھا، اس نے اس کا چیک اپ کیا۔ چیک اپ ہونے پر سیریس بیٹھی علینہ نے آہستگی سے اسے آنکھ ماری اور پھر زوردار طریقے سے ہنس دی۔

''جتنی بھرپور ایکٹنگ تم کر رہی تھیں، میں سمجھا واقعی ... درد ہو رہا ہے۔'' وہ اسٹیتھس اسکوپ ٹیبل پر رکھ کر کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ البتہ اس کا چہرہ علینہ کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

''پورا ایک ہفتہ ہوگیا ہے تم سے ملے، تمہیں دیکھے۔ تمہیں تو یاد نہیں آتی، سوچا خود ہی کوئی بہانہ گھڑ لوں۔'' وہ شرارت سے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ نواب سکندر حیات کی یہ نواسی نہ جانے کب اس پر مر مٹی تھی۔ پہلے تو عامر نے اسے کافی نظرانداز کیا مگر کھانا پلیٹ میں خود چل کر آئے تو کون کافر کھانے سے انکار کرتا ہے' وہ بھی اسے چاہنے لگا اور نواب صاحب کے روٹین چیک اپ کے بہانے دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ حویلی میں ابھی تک کسی کو ان پر شک نہیں گزرا تھا۔ وہ دونوں ہی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جلد یا بدیر ان کا یہ راز کھل جائے گا۔ علینہ نے اسی خطرے کے پیش نظر اسے یہاں سے جانے کا مشورہ بھی دیا تھا مگر عامر جیسا نفیس طبیعت رکھنے والا نوجوان ہر دفعہ ٹال جاتا تھا۔ علینہ شہر سے گریجویشن کر رہی تھی اور آج کل چھٹیوں کی وجہ سے حویلی آئی ہوئی تھی۔ حویلی کیا آئی تھی ڈاکٹر عامر کی کم بختی لائی تھی مگر اسے یہ کم بختی کافی سے زیادہ عزیز تھی۔

''مسکراتے رہو گے یا کچھ پھوٹو گے بھی۔'' وہ ٹیبل سے پیپر ویٹ اٹھا کر اس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''اصل میں آج کل بابا جاتے ہیں اس طرح انکل نواب کو کمپنی بھی مل جاتی ہے۔ دوسرے اٹیک کے بعد وہ کافی پریشان رہنے لگے ہیں۔''

''نانا حضور اور پریشان... یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آج کل تو پہلے سے بھی خوش نظر آرہے ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بیزاری سے بولی۔

''بھئی یہ بھی ان کی نوابی ادا ہوگی۔''

''جی نہیں، وہ اتنے خوش آنے والے مہمان کی وجہ سے ہیں۔ پوری حویلی دلہن کی طرح سجادی ہے۔''

''اچھا تو تمہاری کزن امریکا سے آگئی؟'' وہ اشتیاق سے آگے کو جھکتے ہوئے بولا تو علینہ کے پیپر ویٹ سے کھیلتے ہاتھ رک گئے۔

''کزن...!'' وہ منہ کھولے حیرانی سے بولی۔ ''کون سی کزن؟''

''ارے بھئی نواب انکل کی پوتی کی بات کر رہا ہوں، وہ آرہی تھی نا اسی ہفتے؟''

''پوتی... کیا بات کر رہے ہو تم... میری ایسی کوئی کزن نہیں ہے۔'' وہ الجھ کر بولی۔

''اوہ... تو تم نہیں جانتیں؟ اصل میں پاپا اور انکل نواب کی گفتگو میں نے سن لی تھی۔ وہ اپنی پوتی کی آمد کے بارے میں بابا سے بات کر رہے تھے۔''

''عجیب بات ہے۔ ہمارے ماموں تو جوانی میں ہی کسی ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے پھر یہ ان کی بیٹی اچانک کہاں سے ٹپک پڑی؟''

''میرا خیال ہے کہ مجھے اس راز کو نہیں کھولنا چاہیے تھا۔'' اس کی اتنی حیرانی پر عامر بوکھلا کر بولا۔

''اینی ہاؤ... اگر کوئی پوتی صاحبہ آ بھی رہی ہے تو ہمیں کیا...'' علینہ جیسی لڑکی زیادہ دیر کسی چیز کو اپنے اوپر طاری نہیں رکھتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر بولی تو عامر بھی مسکرا دیا لیکن وقتی طور پر وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے یہ بات اسے بتا کر غلطی کر دی ہے۔

☆☆☆

حویلی میں موجود اس بڑے بیٹھک نما کمرے میں اس

وقت ہنگامی بنیادوں پر میٹنگ کال کی گئی تھی جس میں زمرد اور زونیرہ کے شوہروں کے علاوہ قاسم بھی تھا۔ علینہ نے اسپتال سے واپس آکر سرسری سی بات ماں سے کی تھی جس پر زمرد نے ہر طرح سے اسے کریدڈالا تھا مگر اس نے بھی ڈاکٹر عامر کا نام نہیں لیا تھا۔ زمرد نے اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا مگر اب سب کو جمع کر کے یہ راز ان پر کسی بم کی طرح پھوڑا تھا۔

سب کے اعصاب پر تو جیسے بجلی آگری تھی۔ نواب کی کسی پوتی کی آمد کا مطلب تھا، ان سب کا یہاں سے کوچ کر جانا۔ ماجد تو مارے غصے کے پورے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔

''تمہارے باپ کی رنگینیاں کبھی نہ کبھی تو سامنے آنی ہی تھیں۔''

''ساری دنیا جانتی ہے کہ ابا جان کبھی رنگین مزاج نہیں رہے اس لیے یہ فضول خیال اپنے پاس ہی رکھو۔'' زونیرہ بیزاری سے بولی۔

''تو پھر یہ تمہارے باپ کی کوئی لے پالک پوتی ہے یا پھر حقیقی؟''

''یہ پوتی آکب رہی ہے؟'' قاسم کو پوتی کی آمد سے کافی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی اس لیے بے تابی سے پوچھا۔

''غالباً آج کل میں آنے والی ہے۔'' زمرد بولی۔

''آ کہاں سے رہی ہے؟''

''امریکا سے آرہی ہے۔''

''لیکن علینہ کو پتا کیسے چلا؟'' زبیر بولا۔

''اس کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ اسپتال گئی تھی، وہیں سے سن کر آرہی ہے۔ بتا نہیں رہی ہے لیکن مجھے پتا ہے ڈاکٹر زاہد سے سنا ہوگا۔ ہم سے زیادہ ابا جان کا خیر خواہ جو ٹھہرا۔''

''لیکن میں ایسا کوئی وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا یہاں آنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' ماجد نے بے قراری کا اظہار کیا۔

''مجھے تو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اگر ہماری کوئی بھتیجی تھی تو ابا جان نے ہمیں آج تک کیوں نہیں بتایا؟'' زونیرہ افسردگی سے بولی۔

''بیٹیاں تو ان کی دشمن ہیں، بتاتے کیوں... مگر میں اس لڑکی کو یہاں آنے سے پہلے ہی غائب کروا دوں گا۔'' ماجد اپنی جلد باز طبیعت کی بدولت بے تابی سے بولا۔

''اس کا یہاں آنا واقعی ہمارے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔ تم ایسا کرو ساری فلائٹس کی آمد چیک کرو۔ جیسے ہی وہ آئے گی اس سے نمٹ لیں گے۔'' زبیر بولا۔

''جی نہیں، تم لوگ ایسا کوئی کام نہیں کرو گے۔ وہ بہرحال ہماری بھتیجی ہے۔ میرا دل نہیں مانتا اسے کوئی نقصان پہنچانے کو۔'' زمرد کو اپنی ان دیکھی بھتیجی پر پیار آنے لگا۔

''تو پھر کوئی بھی لے کر جاتے ہیں محترمہ کو لینے۔'' زبیر غصے سے بولا۔ ہاتھ آئی دولت اسے کھسکتی محسوس ہو رہی تھی۔

''بس میں نے منع کر دیا ہے کوئی بھی غلط کام کرنے سے۔ ابا جان آخر ہمارے باپ ہیں۔ ہمارے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔''

''آہا... محترمہ کس دنیا میں رہتی ہیں۔ آپ کے والد محترم پہلے ہی ہمارے بہت خلاف ہیں، پوتی کے آتے ہی آنکھیں پھیر لیں گے۔ بلکہ اب تو میرا خیال ہے کہ بہت جی لیے محترم، اب پوتی کے ساتھ انہیں بھی چلتا کرنا چاہیے۔'' زبیر سرد لہجے میں بولا تو سب کے جیسے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

''ہوسکتا ہے... کسی دوست کی بیٹی ہو۔'' قاسم اس سنگین صورتِ حال پر بولا۔

''میں قاسم بھائی سے متفق ہوں۔'' زمرد جلدی سے بولی۔

''میں بھی۔'' زونیرہ بولی جبکہ ماجد اور زبیر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا پھر اچانک ہی ماجد زور سے ہنس دیا۔

''ارے بھئی، واقعی ہمیں حقیقت کو جاننا تو چاہیے، ہو سکتا ہے جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں وہ غلط ہو۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' زبیر بھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

شام کے گہرے سائے میں جیٹی پر کھڑی ایک درمیانے سائز کی لانچ کے قریب ہی وہ دونوں کھڑے تھے۔ جانے سے پہلے جبران کا دوست نواز لانچ کا اچھی طرح جائزہ لے رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے پیٹرول کے چار بڑے کین بھی رکھنے شروع کر دیے۔ اس کام میں اس کے ساتھ .... چھوٹے سے قد والا نوعمر ملازم لڑکا معاونت کر رہا تھا..... وہ بنگلا دیشی تھا جو غیر قانونی طریقے سے دبئی آیا تھا اور اب نواز کے پاس ہی ملازم تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے کام کر رہا تھا۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے ان کا سفری بیگ بھی کیبن میں رکھ دیا تھا پھر نواز کے اشارہ کرنے پر وہ دونوں کیبن میں چلے گئے۔ سائز کے اعتبار سے یہ چھوٹا سا

کیبن تھا جس کے ایک طرف میٹریس پڑا تھا اور ساتھ ہی ہلکا پھلکا پرانی طرز کا فرنیچر بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف مختصر سا کچن تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک شکستہ حال الماری تھی۔ اشمل کو کیبن میں آتے ہی تیز بو کا احساس ہوا، یہ غالباً شراب کی بو تھی جس کا یہاں یقیناً بے دریغ استعمال ہوتا تھا۔ امریکی معاشرے میں پلی بڑھی اشمل اس بو سے اچھی طرح واقف تھی لیکن اس کی نفاست پسند طبیعت شروع سے ہی شراب وغیرہ جیسی خرافات سے دور رہی تھی اور اب کیبن میں پھیلی بو سے اسے متلی سی ہونے لگی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ جبران اس کے باہر نکلنے کی وجہ سمجھ گیا تھا اس لیے اس کے پیچھے ہی باہر آگیا۔ آہٹ پر مڑ کر وہ جبران کو کاٹ کھانے والے انداز میں دیکھنے لگی۔

''اس سے گھٹیا موٹر بوٹ نہیں ملی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ بے ساختہ مسکرایا۔ ''فی الوقت یہی سب سے گھٹیا تھی۔''

''لیکن میں اندر نہیں بیٹھ سکتی۔'' وہ نخوت سے بولی۔

''ان حالات میں اگر آپ اپنی نوابانہ عادات کو کچھ دبا سکیں تو بہتر ہے، فی الوقت یہ ہمارے لیے محفوظ ترین بوٹ ہے۔'' وہ بنگالی لڑکے کو لانچ کی رسیاں کھولتے دیکھ کر بولا۔ جبران کی اردگرد کے پورے ماحول پر نظر تھی۔ وہ بہرحال مافیا کی ایک بڑی تنظیم سے ٹکر لے چکا تھا اور وہ اسے یوں آسانی سے معاف کر دینے والے نہیں تھے۔ بنگالی لڑکا جیسے ہی لانچ پر آیا، جبران نے دور ساحل پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس گردش کرتی دیکھیں۔ اس کے جسم میں ایک دم سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ پاس کھڑی اشمل بھی گاڑی .... دیکھ چکی تھی اور اب تصور میں خود کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا دیکھ رہی تھی۔ آخر وہ ایک قاتل کی ساتھی بنی ہوئی تھی۔

''میرا دل چاہ رہا ہے، تمہارا منہ توڑ دوں۔'' وہ اسے دیکھ کر پھٹ پڑی۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے لیکن میں خود کو یوں مرتا نہیں دیکھ سکتی، میں جا رہی ہوں۔'' وہ غصے سے بولتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لانچ سے اترتی، جبران نے تیزی سے اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ گاڑی کی لائٹس اب ان کے کافی قریب آچکی تھیں۔

''پاگل ہوگئی ہو... اس جگہ پورے ساحل پر ریت کے سوا چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ نیچے اتر کر پھنسواؤ گی۔ آرام سے کھڑی رہو۔ وہ ہمیں پہچان نہیں سکیں گے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''کیوں نہیں پہچان سکیں گے؟ انہیں ایک لڑکی، لڑکے کی تلاش ہے اور وہ ہم ہی ہیں۔ پلیز! کہیں چھپ جاتے ہیں، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ اضطراری انداز میں اس کا بازو تھام کر بولی۔ جبران واضح طور پر اس کے ہاتھ کی لرزش کو محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی اب رک چکی تھی۔ ان کے اندازے کے مطابق یہ پولیس کی ہی گاڑی تھی۔ اس میں سے تین آدمی نکل کر اب ان کی لانچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جبران نے بے اختیار ہی نواز کو پکارا۔

☆☆☆

نواز، جبران کی آواز پر انجن روم سے باہر آیا تو پولیس کو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹک گیا پھر قدرے اعتماد سے آگے بڑھا کیونکہ ان میں سے ایک سینئر پولیس آفیسر نے اسے نیچے اترنے کو کہا تھا۔

''کُل کتنے مسافر ہیں تمہاری بوٹ پر؟'' وہ عربی زبان میں نواز سے بولا۔ اس کے ہاتھ میں ایک طاقتور ٹارچ بھی تھی جس سے وہ بار بار بوٹ کا معائنہ کر رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی گھومتی ہوئی ان دونوں پر بھی پڑی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر کسی پتھر کی سل کی طرح جمے ہوئے تھے۔

''جی... مسافر تو کوئی نہیں ہے۔ میری بہن اور اس کا شوہر ہنی مون پر دبئی آئے ہوئے تھے، اب انہیں اگلے جزیرے پر چھوڑنے جا رہا ہوں۔'' نواز کے بتانے پر انہوں نے ایک مرتبہ پھر ٹارچ کی روشنی میں دونوں کا جائزہ لیا اور پھر جیسے اپنے مطلوبہ افراد نہ پا کر مطمئن ہوگئے۔

جبران کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔

''یہ آفیسر تمہارے ساتھ جا رہا ہے' اسے بھی اگلے جزیرے پر اترنا ہے۔'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے ایک آفیسر کی طرف اشارہ کیا تو نواز نے جلدی سے سر ہلا دیا اور پھر جبران کو بھی اردو میں اس کے بارے میں بتایا۔ جبران کے ڈھیلے پڑتے اعصاب پھر سے تن گئے۔ اشمل نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی اور مڑ کر کیبن کے اندر چلی گئی۔

پولیس کی گاڑی کے جاتے ہی نواز نے موٹر بوٹ اسٹارٹ کی۔ وہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پولیس مین کیبن میں بیٹھا تو جبران سگریٹ پینے کے لیے اٹھ کر عرشے پر آگیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے پینٹ کا پائنچا اوپر کر کے نیچے لگے بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکال کر چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈڈ تھا۔ یہ ایک جدید امریکن پسٹل تھا جس کی خاصیت یہ تھی کہ اس سے نکلنے والی گولی ٹارگٹ کو چھوتے ہی کسی پھول کی طرح پھول جاتی تھی

اور بڑا سا سوراخ بناتی اندر پیوست ہو جاتی تھی۔ پسٹل کو بیلٹ میں دوبارہ اڑس کر وہ پائنچا ٹھیک کرتے ہوئے سیدھا ہو رہا تھا کہ آہٹ پر... بری طرح چونک کر پلٹا۔

''کون ہو تم...؟'' اشمل نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''خیریت...؟'' وہ خوامخواہ ہنس دیا۔

''میرے سوال کا جواب دو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

'' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اندر ایک پولیس مین بیٹھا ہے اور یہاں تم ایسے احمقانہ سوال کر رہی ہو۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''وہ عربی ہے اور میں ایک اردو اسپیکنگ سے سوال کر رہی ہوں۔'' اس نے جیسے اطلاع دی..... جبران نے ایک گہری سانس لی۔ موٹر بوٹ پوری رفتار سے سمندر پر تیرتی ہوئی اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ موٹر بوٹ کی رفتار اتنی ہی رہتی تو اگلے چھ سات گھنٹوں میں وہ پاکستانی ساحل پر ہوتے۔ مگر اب حالات تھوڑے بدل گئے تھے۔ پولیس مین کے ساتھ انہیں بھی قریبی جزیرے پر اترنا پڑتا۔ جبران اسی بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اشمل کے سوال نے اسے الجھا دیا۔ وہ فی الوقت اسے اپنے بارے میں بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

☆☆☆

جبران نے بھرپور انداز میں اسے دیکھا اور پھر دل ہی دل میں اس کے حسن کو سراہا۔ اشمل کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے مستقبل کے منصوبوں کو نئے سرے سے ترتیب دینا مناسب سمجھا۔

''اپنے متعلق اگر کوئی بہتر جھوٹ تیار کر لیا ہے تو پلیز مجھے بھی آگاہ کر دو۔'' اس کی خاموشی سے وہ بھنا کر بولی۔

''جھوٹ... ہوں...'' وہ بے اختیار ہنس دیا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ جھٹکا لگنے سے وہ اس سے جا لگی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو پیچھے ہٹانا چاہا تو جبران نے اس کے بازو پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ اشمل نے بے اختیار آنکھیں سکیڑ کر غصے سے اسے دیکھا لیکن وہ جن نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' وہ بلا ارادہ نظریں چرا گئی۔

''میرا سوال جواب طلب ہے۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا مگر ابھی نہیں۔''

ہر شمارہ خاص شمارہ

سچی، بانوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

نومبر 2010ء کا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

فاتح

ایک عظیم شہنشاہ کے عزم و حوصلے کی داستان

تلاش جہانِ نو

دنیا گول ہے، اسے ثابت کرنے کے لیے پہلے سمندری سفر کی روداد

لہور لہور اے

شہر زندہ دلانِ لاہور کا مختصر سا تعارف و تاریخ

ان کے علاوہ

سیلابی ریلا، کمبل، کیا کھویا کیا پایا کے ساتھ اور بھی بہت ساری سچ بیانیاں، سچی داستانیں، معلومات بھری کہانیاں

آپ کے علم کی پیاس بجھانے کا واحد ذریعہ دلچسپ ماہنامہ
صرف ایک بار پڑھ کر دیکھیں پھر خود ہی آپ گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

وہ اس کے سنہری بالوں کو دیکھ کر بولا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں... مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔'' وہ سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے ساتھ کوئی بڑا فراڈ کرنے جا رہے ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو تم پر اعتماد کر کے یہاں تک چلی آئی۔ تم نے اپنی ایک گھڑی ہوئی کہانی مجھے سنائی اور کمرے میں اس معصوم لڑکی کو ختم کروا دیا۔ دبئی ائرپورٹ سے مجھے بھگا کر یہاں لے آئے اور اب نہ جانے تمہارا کیا پلان ہے۔ اور مجھے دیکھو' بالکل ہی بے وقوفوں کی طرح تمہاری من گھڑت کہانی پر اندھا یقین کر کے یہاں ایک گھٹیا سی لانچ میں کھڑی ہوں۔ اندر ایک پولیس مین بیٹھا ہے اور پولیس جگہ جگہ ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں بھی ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' وہ سر پر جمایا ہیٹ غصے سے دور پھینکتے ہوئے بولی۔

''اشمل... پلیز چپ ہو جاؤ۔'' جبران اس کی تیز ہوتی آواز پر یک دم بوکھلا کر بولا۔

''شٹ اَپ۔'' وہ دہاڑی۔ ''مجھے اب مزید تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ میں اکیلی بھی پاکستان جا سکتی ہوں۔'' اس کی اونچی آواز پر کیبن کے اندر سے پولیس مین نکل کر باہر آ گیا اور اب دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

''وہاٹس اپ۔'' وہ انگلش میں بولا۔

''نتھنگ آفیسر! اٹس جسٹ آ پرسنل میٹر۔'' جبران لہجے پر قابو پاتے ہوئے قدرے مسکرا کے بولا اور ایک قدم آگے بڑھ کر اشمل کو خود سے قریب کر لیا۔ باوجود غصے کے وہ خاموش ہی رہی۔

''سوری ایش۔'' وہ اسے گلے لگا کر بازو اس کے گرد پھیلا کر آفیسر کی تسلی کے لیے محبوبانہ انداز میں بولا۔

''اٹس اوکے۔'' اشمل نے بھی مسکرا کے اس کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے۔ جبران نے آفیسر کو دھیرے سے آنکھ ماری تو وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اشمل نے جھٹکے سے خود کو چھڑوایا اور ایک زوردار مکّا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ پھر دھپ دھپ کرتی دوسری طرف چلی گئی۔ مکّا اس قدر زوردار تھا کہ جبران کو اپنے دانت ہلتے محسوس ہوئے۔

☆☆☆

''جی نواب صاحب! آپ نے یاد فرمایا؟'' ڈاکٹر زاہد رضا، نواب سکندر حیات کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تکلفی سے بولا۔

''آؤ بھئی بیٹھو۔ میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' نواب سکندر کے چہرے پر یک دم مسکراہٹ پھیل گئی۔ رات کے دو بج چکے تھے لیکن ڈاکٹر زاہد اسی طرح فریش موڈ میں تھا۔

''خیریت؟'' وہ بیٹھتے ہی بولا۔

''ہاں، بس ایک کام ہے تم سے۔ مجھے پتا تھا کہ تم جاگ رہے ہو گے اور اس وقت تمہارے سوا میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''جی حکم کیجیے، بندہ حاضر ہے۔'' ڈاکٹر زاہد سوالیہ انداز میں بولا۔

''اشمل بیٹی آ رہی ہے، کچھ دیر پہلے ہی اس کا فون آیا تھا۔'' وہ خوشگوار انداز میں بولا۔

''اوہ... یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔''

''تم اسے ریسیو کرنے جاؤ۔ میں جلد از جلد اپنی پوتی کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے قرار لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے نواب صاحب۔'' وہ اٹھ گیا۔

''ٹھہرو... وہ ہوائی جہاز سے نہیں آ رہی ہے، اس کے لیے تمہیں پورٹ پر جانا پڑے گا۔''

''پورٹ پر...؟''

''ہاں، وہ ایک موٹر بوٹ سے آ رہی ہے۔ بس تم ابھی نکلو، گاڑی باہر تیار کھڑی ہے۔ تمہیں تین گھنٹے آنے جانے میں لگیں گے۔ چار گارڈز اور دو مزید گاڑیاں حفاظت کے لیے تمہارے ساتھ جائیں گی۔ بس محتاط رہنا۔'' وہ اسے اشمل کی ایک تصویر دیتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے نواب صاحب۔'' ڈاکٹر زاہد تابع داری سے بولا اور تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ایک خوب صورت سنہری بالوں والی اسمارٹ سی نوعمر لڑکی تھی۔

''فی امان اللہ۔'' نواب سکندر نے قدرے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بے فکر رہیے نواب صاحب! آپ کی پوتی مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رہے گی۔'' ڈاکٹر زاہد مضبوط لہجے میں بولا۔

☆☆☆

پولیس آفیسر... جزیرے پر اترا تو ان کو بھی کچھ دیر کے لیے ساتھ ہی اترنا پڑا۔ کوئی آدھ گھنٹے مزید اطمینان کے بعد نواز کے اشارہ کرنے پر وہ دوبارہ لانچ میں سوار ہوئے۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ اب نواز موٹر بوٹ کو پہلے سے

زیادہ تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ سارے دن کی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کے بعد نہ جانے کب دونوں کی آنکھ لگ گئی اور پھر وہ تب ہی اٹھے جب بوٹ پاکستان کی ساحلی پٹی سے لگ چکی تھی۔ یہ ساحلی حصہ قریبی بندرگاہ سے ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بے حد شکریے کے ساتھ انہوں نے نواز کو الوداع کہا کیونکہ ان کی آمد غیر قانونی تھی اس لیے اس کا مزید یہاں رکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

سفری بیگ اٹھائے جبران، اشمل سے کچھ قدم آگے چل رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ عجیب سے تاثرات کے ساتھ چاروں طرف گھوم گھوم کر اس سرزمین کو دیکھتی رہی۔ یہ بہرحال اس کی جائے پیدائش تھی۔ اسے یک دم ہی انسیت سی محسوس ہوئی۔ ایک گہری مسکان نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا۔ پھر ایک دم سے اسے خیال آیا کہ اس کا اب تک اپنے دادا سے رابطہ نہیں ہوا تھا اور اب تو اسے اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی دینی تھی۔

''ایکسکیوز می مسٹر!'' وہ بولی تو جبران کے آگے بڑھتے قدم رک گئے لیکن اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس خوفناک مُکّے کے بعد وہ اس سے دور ہی تھا۔

''مجھے اپنے دادا کو فون کرنا ہے۔'' وہ خود ہی تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پاس آ کر بولی۔

''تو موبائل سے کر لو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''وہ تو نہ جانے کب سے بند ہے۔ شاید گھر سے نکلنے سے پہلے مجھے چارج کرنا یاد نہیں رہا تھا۔''

''ویری گڈ...'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا پھر اپنی جیب سے موبائل نکالا لیکن اس کے سگنل آؤٹ تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اب پورٹ سے ہی کرنا پڑے گا۔'' اس نے کہا پھر وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھنے لگے۔ رات کے اس پہر بھی پورٹ کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور اتنی روشنی کے سبب انہیں راستے کا تعین کرنے میں کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

بندرگاہ پر چونکہ رات دن جہاز لنگر انداز ہوتے رہتے تھے اس لیے وہاں گہما گہمی پورے عروج پر تھی۔ غالباً کچھ دیر پہلے ہی کوئی تجارتی جہاز لنگر انداز ہوا تھا... کیونکہ لکڑی کے بڑے بڑے باکسز کو کرینز کی مدد سے ساحل پر اتارا جا رہا تھا۔ سامنے موجود ایک کافی ہاؤس سے اشمل نے اپنے دادا کو فون کر کے اپنے صحیح سلامت پہنچ جانے کی اطلاع دی اور انہیں کافی ہاؤس کا پتا بتایا۔ نواب صاحب نے اسے وہیں ٹھہرنے کو کہا۔ اسے لینے کے لیے گاڑی ایک ڈیڑھ گھنٹے تک پہنچ جاتی۔ اب انہیں وہیں بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔

''دل تو چاہ رہا ہے تمہیں یہیں سے خدا حافظ کہہ دوں لیکن بہرحال، تم نے مجھے بحفاظت یہاں تک پہنچایا ہے۔ میرے دادا تمہاری آج رات کی میزبانی سے کافی خوش ہوں گے۔ صبح بہرحال تم جہاں جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔'' ایک کارنر ٹیبل پر اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وہ بولی۔ جبران نے اسے دیکھنے کے بجائے سگریٹ نکال کر سلگانا بہتر سمجھا۔

''انفارمیشن کا شکریہ۔'' وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا جبکہ اس کی نظریں باریکی سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

''مجھے اسموکرز سے سخت نفرت ہے۔'' اشمل کچھ دیر

گونگے

گونگے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان میں سے اگر کسی میں کمینہ پن پایا بھی جاتا ہو تو اس کا واضح اظہار نہیں ہوتا۔ وہ باہمی طور پر ایک دوسرے کی خامیوں سے آگاہ ہوتے ہیں لیکن ہم لوگ اس سے ایک حد تک بے خبر رہتے ہیں اور یوں حسنِ ظن کا جو رویہ ہمیں تمام انسانوں کے ساتھ روا رکھنا چاہیے اور جس طرح دوسروں کی صرف خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے، وہ رویہ ہم کم از کم گونگوں کے ضمن میں ضرور روا رکھتے ہیں اور اسی طرح ان کی وجہ سے ہمارے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی لکھی جاتی ہے۔ گونگوں کو ہم پر ایک فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ ہم زبان والے اپنی زبان، اظہار کے لیے نہیں اخفا کے لیے استعمال کرتے ہیں جبکہ گونگوں کی بے زبانی بھی زبان بن جاتی ہے۔

مجھے اچھی طرح علم نہیں کہ گونگوں میں سیاست داں ہوتے ہیں کہ نہیں؟ تاہم امکان غالب یہی ہے کہ نہیں ہوتے ہوں گے کیونکہ وہ اندھیرے میں گفتگو نہیں کر سکتے، ان کی ساری گفتگو روشنی میں ہوتی ہے۔ میں نے کسی گونگے کو اقتدار میں آتے بھی نہیں دیکھا۔ البتہ اکثر لوگ اقتدار میں آنے کے بعد گونگے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے قومی سلامتی کے سودے ہوتے ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں۔

(''ہنستا رونا منع ہے'' عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

برداشت کرنے کے بعد بولی۔
''اور مجھے زیادہ بولنے والوں سے۔'' وہ بھی دوبدو بولا۔ کافی ہاؤس کے باہر وہ ایک مشکوک آدمی کو دیکھ چکا تھا اور اب بھی گلاس وال سے اس کی نظریں اس گنجے آدمی کے تعاقب میں تھیں جواب غالباً اپنا سیل فون کان سے لگائے کسی سے بات کر رہا تھا۔ جبران کی چھٹی حس اسے خطرے سے آگاہ کرنے لگی۔ ایسے میں اشمل کا بولنا اسے ناگوار گزر رہا تھا۔
''بس اب تم اپنا راستہ ناپو، میں تمہیں مزید برداشت نہیں کرسکتی۔'' اس کی بات کے جواب میں وہ غصے سے بولی اور ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''تم بالکل ہی بچوں کی طرح ری ایکٹ کرتی ہو۔ تمہیں پتا ہے اس وقت ہم کس قدر خطرناک صورتِ حال میں ہیں۔ مافیا کے لوگ ہمارے پیچھے پڑے ہیں اور تمہاری ذرا سی نادانی سے ہم ایسے شکنجے میں پھنس سکتے ہیں کہ جہاں سے تمہارا نواب دادا بھی تمہیں چھڑوا نہیں سکے گا۔'' وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔
''مافیا کے لوگ میرے نہیں، تمہارے پیچھے پڑے ہیں۔ قتل میں نے نہیں، تم نے کیا ہے۔'' وہ بھی اسی دبے انداز میں بولی کیونکہ کافی ہاؤس میں ابھی بھی کچھ میزوں پر اِکا دُکا لوگ بیٹھے تھے۔
''یہ تمہاری غلط فہمی ہے، وہ لوگ تمہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے میرے جیسے مہرے کو آگے بڑھا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اپنی تنظیم سے ٹکر لے کر تمہاری جان بچائی اور اب یہاں بیٹھا تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔''
''سوال یہ ہے کہ تم نے میری جان کیوں بچائی؟'' وہ شکی لہجے میں بولی۔
''تمہارے اس سوال کا جواب بھی دوں گا مگر فی الوقت مجھے اس باہر کھڑے نمونے سے نمٹنے دو جو غالباً ہمارے بارے میں کسی کو مطلع کر رہا ہے۔'' وہ کافی ہاؤس کے سامنے موجود کھمبے کی اوٹ میں کھڑے شخص کی طرف اشارہ کر کے بولا تو اشمل کے ذہن میں یک دم سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

☆☆☆

جبران، اشمل کو وہیں چھوڑ کے خود کافی ہاؤس کے کچن والے متبادل راستے سے باہر آگیا۔ یہ کافی ہاؤس کے پیچھے تھا.... باہر آتے ہی اس نے جلدی سے اپنا پسٹل نکالا اور پچھلی دیوار کی اوٹ سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ گنجا آدمی اب سڑک کی دوسری جانب ویٹنگ بینچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اسے غالباً اپنے ساتھیوں کا انتظار تھا...اب جبران بھی انتظار کرنے لگا۔ اسے کھڑے ہوئے تقریباً آدھ گھنٹا گزر چکا تھا مگر فی الوقت کوئی نہیں آیا تھا۔ جبران گھوم کر کافی ہاؤس کے دوسری جانب آیا۔ یہاں سے ایک تو دور تک سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔ دوسرے وہ کافی ہاؤس کے دروازے پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اچانک اسے دور سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ وہ گاڑی کچھ اور آگے آنے کے بعد رک گئی۔ جبران نے اس میں سے دو آدمیوں کو نکلتے دیکھا۔ گنجا آدمی بھی سڑک کی ..... جانب دیکھ رہا تھا پھر وہ جیسے ہی سگریٹ پھینکنے کے لیے جھکا، جبران نے تیزی سے کافی ہاؤس کی دیوار کو چھوڑا اور قریبی جھاڑیوں کی جانب بڑھ گیا۔ اس کا رخ اب کافی فاصلے پر سڑک سے آنے والے تاریک سایوں کی جانب تھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے سرکتا ہوا، اب وہ ان کے انتہائی قریب آچکا تھا۔ پھر ایک دم ہی وہ سڑک پر آگیا اور اس نے اپنی جانب موجود سائے کو ایک زوردار کک ماری۔ وہ دونوں چونکہ متوازی چل رہے تھے اس لیے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اوپر نیچے گرے۔ جبران کے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ اس نے کافی مؤثر ضربیں ان کی کھوپڑیوں پر رسید کیں۔ اب وہ صبح سے پہلے ہوش میں آنے والے نہیں تھے۔ جبران نے دونوں کو گھسیٹ کر قریبی جھاڑیوں کے پیچھے پھینکا اور ان کے پستول لے کر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ پیچھے سے ہالٹ کی آواز پر وہیں کا وہیں جم گیا۔ آہستگی سے رخ موڑ کر وہ سیدھا ہوا تو وہی گنجا شخص ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔
''میں تمہیں دیکھ چکا تھا جبران۔'' وہ آہستگی سے لیکن غصیلے انداز میں بولا۔ ''مگر تم میری توقع سے زیادہ پھرتیلے نکلے۔ میرے یہاں آنے تک ان دونوں کو ٹھکانے بھی لگا دیا۔ اب جلدی سے آگے بڑھو اور اس لڑکی کو لے کر میرے ساتھ چلو۔ باس نے تمہیں زندہ لانے کو نہ کہا ہوتا تو اب تک تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا ہوتا۔'' اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ جبران نے وہیں سے اپنی ٹانگ..... تیزی سے چلائی۔ گنجے شخص کا پستول ہوا میں بل کھاتا ہوا اب جبران کے ہاتھ میں تھا۔
''تمہارے باس نے شاید تمہیں کم بولنا نہیں سکھایا۔'' اس نے گولی اس کی کھوپڑی میں ہی اتاری تھی۔ ''بہرحال سائلنسر فٹ کرنے کا شکریہ۔'' اس کے نیچے گرتے وجود کو

دیکھ کر وہ مسکرا کے بولا۔ گنجے شخص کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اب بھی حیرت پھیلی ہوئی تھی۔ جبران نے اسے بھی جھاڑیوں میں پھینکا اور سائلنسر لگا پستول اپنی پینٹ کی جیب میں اڑس کر آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

''کہاں تھے تم اتنی دیر سے؟'' وہ واپس آکر بیٹھا تو اشمل بے قراری سے بولی۔ ''اور وہ گنجا آدمی بھی نظر نہیں آرہا؟'' وہ کافی ہراساں لگ رہی تھی۔
''اس گنجے اور اس کے آنے والے دو باراتیوں کو ٹھکانے لگا کر آرہا ہوں۔'' وہ اس کی بے چینی کو انجوائے کرتے ہوئے بولا۔
''تو...تم نے انہیں مار دیا؟''
''خوامخواہ کے قتل میں نہیں کرتا۔ دو کو بے ہوش کیا ہے، تیسرا کچھ اوور ہو رہا تھا...اسے جہنم رسید کرنا پڑا۔'' وہ مسکرا کے بولا تو اشمل نے اپنے منہ سے نکلتی چیخ کو بمشکل ہاتھ رکھ کر روکا۔ وہ کافی دہشت زدہ لگ رہی تھی۔
''تت...تم...تم نے...''
''تم اپنے اوپر قابو رکھو تو بہتر ہوگا، بنا بنایا کھیل خراب کرواؤ گی۔'' وہ اردگرد نظر دوڑا کر اسے تنبیہی انداز میں بولا۔
''میں تم جیسے خطرناک انسان کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' کچھ دیر بعد وہ اپنے لہجے پر کنٹرول کرتے ہوئے بولی لیکن جبران نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی نظر ایک مرتبہ پھر کافی ہاؤس کے باہر کا جائزہ لے رہی تھی۔ اگر کچھ دیر مزید گاڑی نہ آتی تو لازماً مافیا کے لوگ اپنے بندے ڈھونڈنے آنکلتے۔ بالآخر بیس منٹ کے مزید انتظار کے بعد دو تین گاڑیاں اکٹھی کافی ہاؤس کے دروازے کے باہر آکر رک گئیں۔ جبران سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

سیاہ مرسیڈیز سے نکلتے ہی ڈاکٹر زاہد نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کافی ہاؤس کے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر جبران اور اشمل سمجھ گئے کہ یہی انہیں لینے آئے ہیں اس لیے وہ دونوں خود ہی باہر آگئے۔ ڈاکٹر زاہد نے اشمل کو دیکھا تو اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔
''میں ڈاکٹر زاہد ہوں، نواب صاحب نے مجھے آپ کو لینے بھیجا ہے۔'' وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا تو اشمل نے قدرے مسکرا کے انہیں ہیلو کہا پھر جلدی سے گاڑی

جواب

ایک تنہا اور حسین لڑکی کو دیکھ کر ایک نوجوان نے پوچھا، ''کیا آج کی حسین شام میرے ساتھ گزارنا پسند کرو گی؟''
بدقسمتی سے لڑکی جوڈو کی ماہر تھی، اس نے زبان سے کام لینے کے بجائے نوجوان کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ نوجوان نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے، بال بنائے اور لڑکی کے پاس پہنچ کر نہایت ڈھٹائی سے بولا ''داؤ بہت اچھا تھا مگر تم نے میرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں؟''
آمنہ زبیری — دمام

کی طرف بڑھتے ہوئے رکی اور ایک دم سے رک کر جبران کو دیکھا۔
''ڈاکٹر زاہد! یہ جبران ہے۔ اس نے دو مرتبہ دشمنوں سے میری جان بچائی ہے۔ یہ ہمارے ساتھ ہی حویلی چلے گا۔ بقیہ رات وہاں گزار کر صبح چلا جائے گا۔'' یہ کہہ کے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تو ڈاکٹر زاہد نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔ جبران خفیف سا مسکرا کے اشمل کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔
''مہمان بنانے کا شکریہ۔'' وہ بیٹھتے ہی آہستگی سے بولا۔
''تمہارا سامان میرے بیگ میں نہ ہوتا تو یہیں سے چلتا کر دیتی۔'' وہ ادھار رکھنے کی قائل نہ تھی، بھویں اچکا کر بولی۔

گاڑی چل پڑی۔ ان کی گاڑی کے آگے پیچھے بھی مسلح گارڈز گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ جبران نے دل ہی دل میں نواب کی عقل مندی کی داد دی۔ گاڑی نے بمشکل ہی سات آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا جب ان سے آگے چلتی گارڈز کی گاڑی یک دم رک گئی۔ اس کے سڑک کے بیچوں بیچ رکنے کے انداز نے جبران کو بری طرح چونکا دیا۔ اس کی چھٹی حس نے جیسے الارم بجانے شروع کر دیے۔ اگلی گاڑی کے رکنے پر ڈرائیور نے مرسیڈیز کو بھی جلدی سے بریک لگائے ورنہ وہ اسس سے ٹکرا جاتی۔ جبران کے ہاتھ تیزی سے پسٹل کی طرف بڑھے۔ اگلی گاڑی سے دو گارڈز اور اسی طرح پچھلی گاڑی کے گارڈز نے نکل کر ایک دم سے ہی گاڑی کا محاصرہ کر لیا۔ ڈاکٹر زاہد کے اوسان خطا ہو گئے۔ ڈرائیور کا بھی یہی عالم تھا۔
''ڈاکٹر صاحب! آپ نے غلط گارڈز کا انتخاب کیا

ہے۔" ڈاکٹر زاہد کو حواستہ باختہ دیکھ کر جبران نے پستول کی گولیاں چیک کرتے ہوئے کہا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے؟" اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ڈاکٹر ہکا بکا رہ گیا۔ جبران نے جیکٹ سے دوسرا پستول نکال کر انہیں بھی تھما دیا۔

"اس کو حفاظت کہتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولا اور پھر ڈرائیور کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔" اشمل غصے سے چلائی۔

"یہ مافیا کے لوگ نہیں ہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا اور پھر جلدی سے گاڑی کو پچھلے گیئر میں ڈالا کیونکہ پچھلی گاڑی کچھ فاصلے پر روکی گئی تھی۔ اسے گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے لے جا کر فارورڈ کرنا تھا۔ اسی اثنا میں.... ان میں سے ایک شخص نے جو غالباً گارڈز کا انچارج تھا، اشارے سے انہیں نیچے اترنے کو کہا۔

"سب نیچے جھک جائیں۔" وہ شیشہ نیچے سرکاتے ہوئے بولا اور پھر اس کے خاموش پستول نے تیزی سے دو فائر کیے۔ گولیاں دائیں جانب کے دونوں گارڈز کے بھیجے اڑاتی ہوئی نکل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی ریورس کی۔ پچھلے گارڈز کو اس حملے کی توقع نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے، جبران کے پستول نے دو اور فائر کیے اور گاڑی کو فارورڈ گیئر میں ڈال کر ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا، گاڑی تیزی سے آگے نکلی۔ پیچھے سے ان پر اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ ایک گولی پچھلا شیشہ توڑتی ہوئی جبران کے اسٹیئرنگ کو پکڑے ہوئے بازو کو ادھیڑتی ونڈ اسکرین کو توڑ کر نکل گئی۔ شدید تکلیف کی لہر نے جبران کو آدبوچا۔ گولی چونکہ گوشت کو پھاڑتی ہوئی ... نکلی تھی اس لیے خون اس کی گہری نیلی جیکٹ کو بھگونے لگا مگر اس نے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی تھی۔ گاڑی کو اسپیڈ سے بھگاتا ہوا وہ گارڈز کی رینج سے دور نکل گیا۔ ڈاکٹر زاہد نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کے بازو پر اچھی طرح باندھ دیا تھا تاکہ خون زیادہ نہ نکلے۔

"جبران بیٹا! تم میری سیٹ پر آ جاؤ، میں ڈرائیونگ کرتا ہوں۔" ڈاکٹر زاہد اس کی حالت کے پیشِ نظر بولا تو جبران نے خاموشی سے سیٹ تبدیل کر لی۔ اب وہ وقفے وقفے سے بازو دبا کر چھوڑنے لگا تاکہ خون زیادہ نکلنے سے بچ سکے۔ اس پورے علاقے میں کہیں بھی کوئی اسپتال نہیں تھا، نہ ہی فرسٹ ایڈ کی سہولت موجود تھی۔ اس لیے ڈاکٹر زاہد گاڑی کو تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا تاکہ جلد از جلد حویلی پہنچ کر اسے ٹریٹمنٹ دے سکے۔ جبران نے ایک نظر پیچھے ڈالی تو اشمل کو سیٹ پر لڑھکے ہوئے پایا۔ وہ غالباً خوف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی جبکہ ڈرائیور کی حالت بھی پتلی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

حویلی کے بڑے ہال نما کمرے میں اس وقت سبھی لوگ موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں نواب صاحب کی آمد کی اطلاع پا کر سب لوگ متجسس نظروں سے کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ نواب کی پوتی کے آنے کی اطلاع کچھ کو رات میں مل چکی تھی اور باقیوں کو اب پتا چل چکا تھا۔ ان سب کے لیے یہ ایک طرح کی دھماکا خیز خبر تھی۔ انہوں نے آج تک ایسی کسی پوتی کے بارے میں نہ سنا تھا اور نہ ہی نواب صاحب نے انہیں کبھی بتایا تھا۔

نواب سکندر پُروقار طریقے سے چلتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ ان کے بائیں جانب اشمل تھی۔ اس نے سرخ لانگ اسکرٹ کے اوپر زرد رنگ کی منی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ لمبے سنہری بال کسی آبشار کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اوپر سے اس کی من موہنی صورت اور باوقار چال نے سب کو سحر زدہ کر دیا تھا۔ نواب سکندر کے بیٹھتے ہی باقی لوگ بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ایک بھرپور نظر پورے ہال پر ڈالی۔ سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ ایک گہری مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"یہ اشمل ہے، میری اکلوتی پوتی۔ اتنے دنوں سے حویلی میں جو تیاریاں ہو رہی تھیں وہ اسی سلسلے میں تھیں۔ آپ سب یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے اس سے پہلے اپنی پوتی کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے کچھ دیر توقف کیا پھر گویا ہوئے۔ "میرا ایک ہی بیٹا تھا جس کا جوانی میں ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ بات آپ سب لوگ بھی جانتے ہیں مگر اس حقیقت کا صرف مجھے پتا ہے کہ یہ ایک قتل تھا اور اس گاڑی میں اس کی بیوی زارا اور چھ ماہ کی میری پوتی اشمل بھی تھی۔ یہ شادی مجھ سے چھپ کر کی گئی تھی لیکن پھر اشمل کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد احمد، میرے بیٹے نے مجھے ساری حقیقت بتا دی۔ میں نے اسے پہلی فرصت میں حویلی واپس آنے کو کہا اور ساتھ ہی اپنی بہو اور پوتی کو لانے کی اجازت بھی دے دی لیکن راستے میں میرے کچھ دشمنوں نے اس کی موت کا جال بچھایا ہوا تھا۔ بظاہر گاڑی کا ایک

بڑے ٹرالر سے ٹکرا جانا ایک عام سے ایکسیڈنٹ کو ظاہر کر رہا تھا لیکن بعد کی تحقیقات سے پتا چلا کہ وہ میرے دشمنوں کی سازش تھی۔ اس حادثے میں احمد اور زارا موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے لیکن پچھلی سیٹ پر ان کی ملازمہ کی گود میں بیٹھی ننھی اشمل کو آنچ بھی نہیں آئی تھی۔ ملازمہ بھی کافی زخمی تھی لیکن وہ وہاں سے بچتی بچاتی مجھ تک پہنچ گئی اور میری امانت مجھے پہنچا دی۔" نواب نے یہاں پہنچ کر ایک نظر پھر سارے حاضرینِ محفل پر ڈالی۔ وہ سب کہانی کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے حتیٰ کہ اشمل اور اس کے پاس ہی بیٹھا جبران بھی پوری طرح محو تھے۔

"ایک ملازمہ کے پاس اپنی پوتی دیکھ کر میرا مشکوک ہو جانا لازم تھا لیکن اس کے پاس ایک چھوٹے سے چمڑے کے بیگ میں ایک البم، احمد اور زارا کے نکاح کے پیپرز بھی تھے۔ البم میں ان کی شادی اور پھر ننھی اشمل کے ساتھ تازہ تصویریں بھی تھیں جس کے بعد شک کی گنجائش باقی نہ رہی... لیکن مجھے ڈر تھا جس طرح میرے بیٹے کو ختم کیا گیا، اسی طرح میری پوتی کے خلاف سازشیں ہو سکتی تھیں۔ میں نے اپنے ایک پرانے دوست کی بیوی کو اپنی پوتی اور اس ملازمہ کی ہمراہی میں امریکا بھجوا دیا۔ یہ وہیں پلی بڑھی اور اپنی تعلیم کے مراحل طے کرتی رہی۔ میں مکمل طور پر اس سے باخبر رہتا تھا۔ مختلف مواقع پر لی گئی اس کی تصویریں مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ یہی میری حقیقی پوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی واپسی آپ سب کے لیے بھی خوشی کا باعث ہو گی۔" نواب صاحب کی بات کے اختتام پر پورے ہال میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں پھیلنے لگیں۔ اب سب کی نظریں جبران کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جس کے بازو پر بندھی پٹی دیکھ کر سب ہی تجسس کا شکار تھے۔

"یہ جبران ہے۔ امریکا سے یہ بھی پاکستان آ رہا تھا۔ اشمل کی یہاں آمد شاید میرے دشمنوں کے علم میں آ چکی تھی۔ انہوں نے طیارے میں بھی میری پوتی پر قاتلانہ حملہ کیا اور پھر یہاں پاکستان پہنچتے ہی اس کے زندہ بچ جانے پر دوبارہ حملہ کیا لیکن دونوں مرتبہ ہی اس نوجوان کی بدولت میری پوتی کی جان بچی۔ فی الوقت یہ کچھ دن ہمارا مہمان رہے گا۔" انہوں نے سب کی نظروں سے اٹھتے سوال پر قدرے خوشگوار انداز میں اس کا تعارف کروایا۔

"ابا جان! آپ کی اتنے برسوں سے کن لوگوں سے دشمنی چل رہی ہے، کچھ وضاحت کریں گے؟" ماجد نے سوال کیا۔

"بھئی دولت ہو تو اپنے ہی غیر ہو جاتے ہیں، دشمن تو پھر دشمن ہیں۔" نواب صاحب نے ایک چبھتی نظر اس پر ڈال کر کہا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"م... میرا مطلب ہے اتنی پرانی دشمنی کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ آپ نے کچھ سراغ تو لگایا ہی ہو گا ان کے بارے میں۔ آخر اتنے برسوں بعد اشمل کی آمد کی اطلاع انہیں کیسے ہوئی جبکہ اس حویلی میں ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ آ رہی ہے۔"

"لیکن میری اطلاع کے مطابق اشمل کی آمد کا بہت پہلے ہی آپ میں سے زیادہ تر لوگوں کو علم ہو چکا تھا۔ غالباً یہیں سے بات پھیلی اور یقیناً میرے دشمنوں تک بھی پہنچ گئی ہو گی، اس کا ثبوت گارڈز کا خریدے جانا ہے... ورنہ وہ کافی پرانے گارڈز تھے، کسی بڑی رقم کے عوض ہی بکے ہوں گے۔ بہرحال میری پوتی صحیح سلامت پہنچ چکی ہے۔ میں خوش ہوں اور اسی خوشی میں کل شام ایک بڑی پارٹی منعقد کرنے کا اعلان کرتا ہوں اور انتظامات کی ذمے داری زبیر، ماجد اور قاسم کے ساتھ ساتھ جبران پر بھی ڈالنا چاہوں گا۔ مجھے یقین ہے جس طرح اس نے میری پوتی کی پہلے حفاظت کی ہے، اسی طرح یہاں بھی خطرے کو قریب منڈلانے نہیں دے گا۔ کیوں بیٹا! ٹھیک ہے؟" نواب صاحب نے بات کے اختتام پر اس کی رضامندی چاہی۔

"یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہو گی۔" وہ خوشگوار انداز میں بولا تو نواب صاحب نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا جبکہ کتنے ہی لوگوں نے اس کی یہاں موجودگی پر ناگواری محسوس کی لیکن اس کا اظہار نہ کر سکے۔

"ابا جان! اگر آپ کو برا نہ لگے تو ہم وہ نکاح کے کاغذات اور البم دیکھنا چاہیں گے۔" زبیر نے قدرے جرأت مندی سے تقاضا کیا۔

"ہاں، کیوں نہیں... میں اس کی کاپی لے کر آیا ہوں۔ ابھی دلدار صاحب آپ کو دکھا دیں گے۔" انہوں نے بُرا مانے بغیر اپنے ادھیڑ عمر سیکریٹری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"مجھے اور اشمل بیٹی کو اجازت دیجیے، یہ بھی تھکی ہوئی ہے، آج آرام کرے گی۔ باقی کی ملاقات کل شام پارٹی پر ہو گی۔" نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اس کے ساتھ ہی اشمل بھی ان کی ہمراہی میں ہال سے چلی گئی۔ ان کے جاتے ہی ہال وہاں موجود لوگوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

☆☆☆

"دیکھا، بوڑھے نے کس چالاکی سے بات گول کر دی۔ اپنی دشمنی کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔" ماجد مٹھیاں بھینچ کر

بولا۔ وہ لوگ اپنے مشترکہ سٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ موضوعِ بحث تازہ واقعات تھے۔ ”لیکن میں جانتا ہوں اس دشمنی کا تعلق ان کے چھپائے ہوئے خزانے سے ہے جس پر وہ برسوں سے سانپ بنے بیٹھے ہیں۔“

”ایک زمانہ ہوگیا اس خزانے کے بارے میں سن سن کر... مجھے نہیں لگتا کہ یہ بات حقیقت ہے۔ ایسا کوئی خزانہ ہوتا تو اب تک سامنے آچکا ہوتا۔ ابا جان کو آخر کیا ضرورت تھی اسے چھپا کر رکھنے کی؟“ زمرد اکتا کر بولی۔

”ان کی ضرورت کی وجہ بھی سامنے آگئی ہے۔ اب تو مجھے اور یقین ہوگیا ہے کہ خزانے کی موجودگی ایک حقیقت ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اشمل؟“ زبیر بولا۔

”ہاں اور اس پر جہاز میں ہونے والا حملہ... کیونکہ اس حملے سے کم از کم ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس انجانی دشمنی نے برسوں پہلے بھی اشمل کی پیدائش پر یونہی زور پکڑا تھا اور اب ابا جان پر ہونے والے حملے بھی اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دشمن پھر سے بیدار ہوگئے ہیں۔ اس دشمنی کی وجہ خزانے کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔“ ماجد نے کڑیاں ملاتے ہوئے قدرے جوش سے کہا۔ سب کی آنکھیں اَن دیکھے خزانے کے لیے چمکنے لگیں۔

”لیکن ایک بات تم لوگ بھی گول کر رہے ہو۔“ اچانک قاسم نے کہا۔

”کون سی بات...؟“

”گارڈز کو خریدنے والی۔“ وہ چبھتی ہوئی نظروں سے بیک وقت زبیر اور ماجد کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”تت... تم...“ اپنی بیویوں کی موجودگی میں وہ دونوں گڑبڑانے لگے۔

”ہاں، میں یہ جانتا ہوں کہ یہ بے وقوفی تم لوگوں سے سرزد ہوئی ہے اور عنقریب اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے خود کو تیار کرلو کیونکہ نواب صاحب اس معاملے کی تہ تک پہنچے بغیر نہیں رہیں گے۔“ زونیرہ اور زمرد انہیں قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اپنے باپ کے غصے اور انتقام سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔

”قاسم بھائی اور ہمارے منع کرنے کے باوجود تم لوگوں نے یہ غلط حرکت آخر کیوں کی؟“ زمرد غصے سے بولی۔

”اب کیا ہوسکتا ہے۔ جو غلطی ہونا تھی وہ تو ہوچکی، اب آگے کی پلاننگ کرو۔“ زبیر ڈھٹائی سے بولا۔

”تم لوگ ایسی اَن گنت غلطیاں پہلے بھی کر چکے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ اپنا بوریا بستر گول کرو اور یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ۔“

”ہاں تاکہ تم یہاں اس بوڑھے کی دولت پر عیش کر سکو۔ اب تو خزانہ لیے بغیر ہم یہاں سے ہلیں گے بھی نہیں۔“ زبیر دوٹوک لہجے میں بولا تو زمرد اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”تم لوگ ساری عمر ٹھیک نہیں ہوسکتے۔ اولاد جوان ہو چکی ہے... مگر تمہیں ان کی کوئی فکر نہیں؟“

”ہمیں فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ فکر اس بوڑھے کو ہونی چاہیے آخر اتنے برسوں سے نوکروں کی طرح اس کی خدمت میں جتے ہوئے ہیں، اپنی جوانی یہیں گزاری ہے۔“

”قاسم بھائی! آپ ہی کوئی حل نکالیے۔ ان کو کچھ کہنا یا سمجھانا بے کار ہے۔“ زمرد خاموش بیٹھے قاسم سے بولی۔

”حل یہی ہے کہ نواب صاحب کا دھیان کسی اور طرف لگا دیا جائے۔“

”کس طرف؟“ سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

”بہت آسان، اس حویلی میں آنے والے اشمل بی بی کے دُم چھلّے پر۔“ قاسم کو جبران کی آمد ہی ناگوار لگ رہی تھی۔ اشمل کا مستقبل چونکہ وہ اپنے بیرسٹر بیٹے حارث کے ساتھ جوڑ چکا تھا اس لیے جبران جو اشمل کے خاصا قریب تھا، اس کا پتا صاف کرنا ضروری تھا۔

”بالکل ٹھیک کہا قاسم بھائی! ابا جان کو اس کے خلاف کرنا بھی آسان ہے۔“ زونیرہ بولی۔

”ہاں، مجھے بھی وہ لڑکا بہت تیز اور مشکوک لگتا ہے۔ اسی کی وجہ سے رات کا منصوبہ فیل ہوا ہے، اس کے پاس سائلنسر والا پستول تھا جس سے اس نے دو گارڈز کو مارا اور باقی دو کو زخمی کر دیا ایک تو شدید زخمی ہوا تھا اور یہ بات مجھے بچ جانے والے گارڈ نے بتائی تھی۔“ ماجد نے جبران کے کردار پر روشنی ڈالی۔

”اور اس گارڈ کو تم نے زندہ چھوڑ دیا ہوگا؟“ زبیر تشویش سے بولا۔

”میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔“ ماجد منہ بنا کر بولا۔

”شکر ہے اتنی عقل مندی تو تم نے دکھائی۔“ زمرد قدرے اطمینان سے بولی۔ اب وہ ابا جان کے عتاب سے کافی حد تک بچ گئے تھے۔

”بس تو پھر کل کی پارٹی میں ہی اس کا پتا صاف کرنے کی ترکیب نکالتے ہیں۔ اگر وہ لڑکا واقعتاً اتنا خطرناک ہے تو

نواب صاحب کو ہمارے خلاف بھی کر سکتا ہے کیونکہ فی الوقت وہ نواب صاحب کی گڈ بک میں ہے۔“ قاسم نے کہا تو سب اس سے متفق ہوگئے۔

☆☆☆

”اشمل بیٹی! میں ..... معذرت خواہ ہوں، تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا۔ میری پرانی دشمنیوں کی وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔“ نواب سکندر حیات، اشمل سے مخاطب تھے جو آرام کرنے کے بعد اب ان کے کمرے میں ان کے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی اور ساتھ ساتھ کمرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

”دادا جان! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی، آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بڑے آرام سے یہاں پہنچی ہوں۔ جبران نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔“

”جبران بہت اچھا لڑکا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے تمہاری حفاظت کے لیے مستقل طور پر یہیں رکھ لوں۔“ وہ ان کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھی مگر فی الحال خاموش رہی۔

”دادا جان! کیا آپ کو میری کبھی یاد نہیں آئی؟ آپ مجھ سے ملنے امریکا بھی تو آسکتے تھے؟“ اچانک وہ شکوہ بھرے انداز سے بولی۔

”تم سے ملنے آتا تو تم اب تک یوں محفوظ نہ ہوتیں۔ میرے دشمن مجھ سے پہلے تم تک پہنچ جاتے۔“

”آپ کسی ملازمہ کا نام لے رہے تھے جس کو آپ نے غالباً پاکستان سے میرے ساتھ بھیجا تھا؟“ وہ ایک دم سیدھی ہوکر بیٹھ گئی کیونکہ ایسی کسی ملازمہ کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”ہاں، کافی عرصے تک وہی مجھے تمہارے بارے میں مطلع کرتی رہی تھی۔ تمہاری تصویریں بھی بھیجتی تھی پھر اچانک ہی کسی ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہوگئی۔“

”اور اس کے بعد میری تصویریں آپ کو مما پاپا بھیجتے رہے۔ میرا مطلب ہے انکل جمال اور آنٹی عرشیہ، ٹھیک کہا نا میں نے؟“

”ہاں، آمنہ بھابی کی وفات کے بعد ان کے بچوں نے ہی تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے۔“ وہ اپنے دوست کی بیوہ کا نام لے کر بولے۔ ”جمال کا تو ایک ہی بیٹا ہے نا جو غالباً نیویارک میں رہتا ہے۔ اس کی بیٹی کی وفات تو بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔“

”جی، آپ کی معلومات درست ہیں۔“ وہ ہنس دی۔

”آپ سے ایک بات پوچھوں؟“ کمرے میں لگی قیمتی تصویروں پر نظر دوڑاتے ہوئے وہ بولی۔

”ہوں...“ وہ ہمہ تن گوش تھے۔

”وہ کون لوگ ہیں جو آپ کے اتنے پرانے دشمن ہیں اور اس دشمنی کی وجہ کیا ہے؟“

”اس دشمنی کی وجہ جلد ہی تمہیں بتاؤں گا مگر فی الحال تم انجوائے کرو۔ اور ہاں، حویلی کے لوگوں سے زیادہ گھلنے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اعتماد کے قابل نہیں ہے... خاص کر تمہارے وہ دونوں پھوپھا۔“

”اچھا...“ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”دادا جان! اگر وہ اتنے ہی بے اعتبار ہیں تو آپ نے انہیں یہاں رہنے کی اجازت کیوں دے رکھی ہے؟“

”رہنے کی اجازت دینا میری ایک بڑی بھول تھی مگر اس کا کفارہ یہ لوگ ادا کریں گے۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ ایک عدد بڑی تصویر پر آکر اس کی نظریں جیسے ٹھہر گئیں۔

”پالتو سانپ اگر زہریلے ہو جائیں تو ان کا زہر نکالنا پڑتا ہے۔“ آنکھیں سکیڑ کر وہ برف زدہ لہجے میں بولے۔ ان کے لہجے میں کچھ تھا کہ اشمل نے ایک سرد لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اٹھتی محسوس کی۔

”دادا جان! مجھے اپنے بچپن کی تصویریں دیکھنی ہیں۔“ کافی دیر بعد وہ اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”ہاں، کیوں نہیں۔“ وہ قدرے نرمی سے بولے اور اپنی سائڈ ٹیبل سے ایک پرانا مگر خوب صورت کور والا البم نکال کر اسے دے دیا۔ وہ اشتیاق سے البم دیکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ نواب صاحب اسے اس کے باپ کے بارے میں بتانے لگے۔

☆☆☆

جبران، زبیر اور ماجد وغیرہ کے ہمراہ حویلی کا جائزہ لے رہا تھا۔ مقصد اگلے دن منعقد ہونے والی پارٹی کے انتظامات تھے جو نواب صاحب اپنی پوتی کے آنے کی خوشی میں دے رہے تھے۔ حویلی کیا تھی، وہ تو پورا محل تھا جس کی تعمیر میں نہ صرف قیمتی پتھر استعمال کیا گیا تھا بلکہ اس کی آرائش و جمال کے لیے بھی مہنگی اور نایاب چیزیں منگوائی گئی تھیں۔ حویلی کی طرزِ تعمیر پرانے مغل شہنشاہوں کی یاد تازہ کررہی تھی۔ کتنی ہی راہداریاں تھیں جن کے اطراف میں کافی تعداد میں رہائشی کمرے اور سٹنگ روم کے علاوہ دو بڑے ہال بھی تھے۔ حویلی کے اطراف میں وسیع رقبے پر پھیلا باغ تھا۔ اس باغ کی تراش خراش شان دار طریقے سے کی گئی تھی۔ نواب

صاحب اپنی پارٹیاں اسی باغ میں منعقد کرتے تھے۔ حویلی کی سیکیورٹی کے لیے بھی اس باغ میں لگے درختوں کے اندر جدید کیمرے چھپا کر لگائے گئے تھے۔ ان کی چیکنگ کے لیے حویلی کے تہ خانے میں کئی مانیٹرز نصب تھے۔

شہر سے بلوایا گیا ایک مخصوص ٹیکنیکل عملہ یہاں بیٹھ کر سیکیورٹی چیکس رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کی حفاظت کے لیے سیکڑوں گارڈز تھے جو پوری حویلی میں ہر وقت کسی جال کی طرح پھیلے رہتے تھے۔ حویلی کے سیکیورٹی انتظامات کا انچارج ایک ریٹائرڈ فوجی صوبے دار یعقوب تھا۔ اس سے ملاقات کے بعد اب وہ حویلی کے اندر کا جائزہ لے رہے تھے۔ جبران کافی عمیق نظروں سے حویلی کا معائنہ کر رہا تھا جبکہ زبیر اور ماجد خاصی ناگواری سے اس کے وجود کو برداشت کر رہے تھے۔ البتہ قاسم کا رویہ کافی بہتر تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے شکار کو اعتماد میں لے کر اچانک وار کرتے ہیں۔

''مجھے تو یہ حویلی کسی راز کی طرح لگ رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بھید چھپائے کھڑی ہے۔ کیوں قاسم صاحب؟'' دوسروں کی طرح وہ بھی انہیں ان کے نام سے بلا رہا تھا۔ اس کی بات پر جہاں قاسم چونکا، وہیں زبیر اور ماجد کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ انہیں یک دم ہی وہ لڑکا بہت خطرناک لگنے لگا۔

''تم میری سوچ سے زیادہ ذہین ثابت ہو رہے ہو۔'' قاسم تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''شکریہ!... مگر میرا سوال ابھی بھی اپنی جگہ ہے۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ کھنکھار کر بولا۔ ''اصل میں اس حویلی کی تعمیر کا انداز اور پھر جتنا پیسا اس پر نواب صاحب نے خرچ کیا ہے، ان سب نے حویلی کو کافی خاص بنا دیا ہے۔'' وہ اپنی بات کے اختتام پر جبران کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا جو اس کی بات سے متفق نہیں لگ رہا تھا مگر بہرحال، اس نے مزید کوئی بات نہیں کی اور کچھ دیر بعد سگریٹ پینے کے لیے معذرت کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

''دیکھا، میں نا کہتا تھا کہ یہ لڑکا مشکوک ہے۔ ہو نہ ہو یہ حویلی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اس حویلی میں چھپے خزانے کے بارے میں بھی جانتا ہے۔'' ماجد اس کے جاتے ہی بے تابی سے بولا۔

''بس کل تک انتظار کرو، اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔'' قاسم معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

''آخر آپ کا منصوبہ کیا ہے قاسم بھائی...؟'' زبیر بولا تو وہ آہستگی سے انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا جسے سن کر دونوں نے تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھا جبکہ قریبی ستون کے پیچھے کھڑا جبران مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔ ہمہ وقت مستعد رہنا اس کی تربیت کا حصہ تھا۔

☆☆☆

جبران حویلی کے پائیں باغ میں کھڑا سگریٹ پینے کے ساتھ ساتھ گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کرنا تھا، جلد از جلد کرنا تھا کیونکہ مافیا کی جتنی بڑی تنظیم سے وہ ٹکر لے چکا تھا، اس کے بعد اس کا یوں کھلے عام رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسے ہر حال میں اس خزانے تک پہنچنا تھا جس کا راز کسی طریقے سے اس تک پہنچ گیا تھا۔ اشمل کو وہ یونہی اپنی تنظیم سے غداری کر کے بچا کر نہیں لایا تھا۔ اس کے پیچھے اس کا اپنا مقصد پوشیدہ تھا۔ نواب سکندر حیات کا چھپایا ہوا خزانہ ہاتھ لگتے ہی وہ غائب ہو جاتا اور اس کے بعد کچھ عرصے گمنام رہ کر اپنا موجودہ حلیہ بدل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا۔

امریکا جیسے سپر پاور ملک اور اردگرد کے دوسرے ممالک کے بعد یہ مافیا بڑی تیزی سے پسماندہ ممالک پر بھی اپنا قبضہ جما رہی تھی۔ ہر ملک میں مافیا کا پوری طرح ہولڈ رکھنے کے لیے ایک ایک انچارج مقرر کیا جاتا تھا جس کا تعلق عمومی طور پر اسی ملک یا علاقے سے ہوتا تھا اور ایسے لوگ اپنے ملک و قوم کی پروا کیے بغیر مافیا کے لیے نہ صرف وہاں کے اہم راز چرا کر دیتے بلکہ مطلوبہ افراد کو اغوا یا قتل کرنے جیسے کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ پاکستان جیسے ملک پر مافیا کا ہولڈ قائم رکھنے کے لیے جسے انچارج مقرر کیا گیا تھا، اس کا نام شمشاد اختر تھا جو کسی زمانے میں بدنام زمانہ اسمگلر بھی رہا تھا اور کتنے ہی قتل کے مقدموں میں مطلوب تھا۔ جبران بھی حادثاتی طور پر اس کے ہاتھ آ لگا تھا اور پھر اسے تربیت دے کر مافیا کے ایک خطرناک ایجنٹ کے روپ میں تیار کیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اس کا انجام بھی ایک نامعلوم سمت سے آنے والی گولی ہوتا کیونکہ مافیا کے کاموں میں کسی بھی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی اور غلطی کرنے والے کے بھیانک انجام سے مافیا کا ہر فرد آگاہ تھا۔

جبران اس جال سے کسی نہ کسی طریقے سے نکلنا چاہتا تھا اس لیے جب اسے یہ کام ملا تو اس نے خاموشی سے پلاننگ کرنا شروع کر دی۔ منصوبے کے مطابق اس کی انچارج ساتھی مینا کشی کو ہیتھرو ائرپورٹ پر اشمل کو مارنے کے بعد خود نواب کی پوتی کے روپ میں پاکستان جانا تھا اور

وہاں اس کی پوتی بن کر نہ صرف اس کی دولت پر قبضہ کرنا تھا بلکہ اس خزانے پر قبضہ بھی جمانا تھا مگر جبران نے طرح جیسے قاتل کو خرید کر اس منصوبے میں تبدیلی کر دی۔ طران دنوں معاشی طور پر بدحال تھا۔ جبران کے دگنے معاوضے پر وہ آسانی سے مان گیا۔ دوسرے مرحلے پر اس نے اشمل کو اپنے اعتماد میں لیا کیونکہ اسے اعتماد میں لیے بغیر نواب صاحب کی حویلی تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اور اب کامیابی سے یہاں پہنچنے کے بعد وہ ہر پہلو پر غور کر رہا تھا۔ اسے یا تو خود کسی طریقے سے خزانے تک پہنچنا تھا یا پھر نواب سکندر سے اس راز کو اگلوانا تھا۔ اس کے لیے چاہے اسے نواب سکندر کو ختم بھی کرنا پڑتا تو وہ تیار تھا۔ بہرحال، یہ اس کے لیے ایک عام سی بات تھی مگر اب قاسم کے منصوبے سے آگاہ ہو کر اس کا دماغ پہلے سے زیادہ تیزی سے چل رہا تھا۔ اسے بیک وقت کتنے ہی محاذوں پر اپنا دفاع کرنا تھا۔

☆☆☆

اشمل نے ایک نظر موبائل پر بار بار غائب ہوتے سگنلز پر ڈالی اور زچ ہو گئی۔ اس کے باپ جمال کی امریکا سے کال تھی اور وہ بار بار کٹ رہی تھی۔ وہ بیڈ روم کی کھڑکی کے پاس آ گئی اور پھر جب ہاتھ باہر نکالنے پر سگنل آنے لگے تو وہ مسکرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر آ کر اس نے اردگرد نظر ڈالی اور پھر مطمئن ہو کر نمبر ملانے لگی۔ وہ ابھی نمبر پریس کر رہی تھی کہ دوبارہ کال آ گئی۔

''یس پاپا! دراصل کمرے میں سگنل بار بار آؤٹ ہو رہے تھے اسی لیے لائن کٹ رہی تھی۔ اب میں باہر آ گئی ہوں، یہاں سگنلز صحیح ہیں۔'' وہ کال ریسیو کرتے ہی خوشگوار لہجے میں بولی پھر دوسری طرف کی بات سن کر محتاط نظروں سے دوبارہ اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔

''نہیں پاپا! یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''ہاں، یہاں آ کر میں کافی ایکسائیٹڈ ہو رہی ہوں، آخر کو اب پوتی بننے والی ہوں۔''

''ان کی صحت تو قابل رشک ہے، جتنا بوڑھا آپ انہیں سمجھتے تھے اتنے بوڑھے نہیں، ویسے بھی بہت چالاک اور ہوشیار ہیں۔ مجھے تو ان سے ڈر بھی لگنے لگا ہے۔''

''نہیں، خیر اتنی ڈرپوک میں نہیں ہوں۔''

''ہاں، مناسب موقع آنے پر میں آپ کو بلوا لوں گی۔''

''او کے پاپا! میں فون بند کرتی ہوں، کہیں کوئی آ نہ جائے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر اپنے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے بولی اور رابطہ منقطع کر کے آگے بڑھنے لگی تو وہ کسی چھلاوے کی طرح اس کے سامنے آ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تت... تت... تم یہاں...'' وہ بری طرح بوکھلا کر بولی۔

''ہوں... تو میرا شک صحیح تھا کہ تم اشمل نہیں ہو۔'' وہ بھویں اچکا کر بولا۔

''تم یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو؟'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے مخاطب کرنے پر تم لیٹ رسپانس دیتی تھیں کیونکہ یہ تمہارا اپنا نام نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے بوڑھا اس حویلی میں نواب صاحب کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا... اور تیسری بات تمہارا مجھے دیکھ کر بری طرح گھبرا جانا۔'' وہ اس کے تاثرات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب ان تمام باتوں کے بعد شک کی گنجائش رہتی کہاں ہے۔ ویسے کیا نام ہے تمہارا؟''

''سارہ...'' وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولی۔ اس کے خوب صورت چہرے کے نقش کافی حد تک بگڑ چکے تھے۔

''ہاں تو سارہ محترمہ کافی اچھی ایکٹنگ کر لیتی ہو...''

''بکواس بند کرو اور مطلب کی بات پر آؤ۔ جہاں تک ایکٹنگ کی بات ہے تو تم کون سا پیچھے ہو، تمہارا مقصد بھی میں سمجھتی ہوں۔ مافیا سے غداری تم نے میرے عشق میں نہیں کی۔ تمہارا مقصد یہاں آنا تھا اور تم اس میں کامیاب رہے۔''

''ذہین لوگ مجھے ہمیشہ متاثر کرتے ہیں اور ذہانت کے ساتھ خوب صورتی ہو تو کیا کہنے۔'' وہ اس کی تیکھی ناک کو چھیڑتے ہوئے بولا تو وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

''کام کی بات کرو۔'' اس کا زیادہ دیر یہاں کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ اب یہاں سے جانا چاہ رہی تھی۔

''ففٹی ففٹی... میرا مطلب ہے پارٹنر۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دوٹوک انداز میں بولا۔

''اپنی حد میں رہ کر بات کرو۔''

''میری حد تو ستر فیصد بنتی ہے کیونکہ تمہیں بچا کر یہاں میں لایا ہوں مگر میں تمہیں ففٹی ففٹی کا پارٹنر بنا رہا ہوں۔''

''شٹ اپ... یہ بہت زیادہ ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، میں یہ کام کسی پارٹنر کے بغیر بھی کر سکتا ہوں اور اس کا اندازہ تمہیں اب تک ہو بھی چکا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔'' وہ بالآخر ڈھیلے سے انداز میں بولی اور پھر آگے بڑھنے لگی تو اس نے روک لیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو پارٹنر بنے ہیں کوئی جشن تو ہونا چاہیے۔'' وہ اس کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''کیسا جشن؟'' وہ آہستگی سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

''میں ٹھیک ایک بجے اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جیسا تم سمجھتے ہو۔'' وہ غصے سے بولی۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' وہ خباثت سے مسکرایا۔

''میں نہیں آؤں گی۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''اور مجھے یقین ہے کہ تم آؤ گی۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

''تم انتہائی گھٹیا انسان ہو۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا اور اسی طرح بند ہو گیا۔ کمرا خالی تھا جبکہ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ غالباً شاور لے رہا تھا۔ اس نے ایک تفصیلی نگاہ کمرے میں دوڑائی اور پھر آہستگی سے ہاتھ میں پکڑی شیمپین سینٹرل ٹیبل پر رکھ دی اور خود وہاں موجود سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے بالکل سامنے وال کلاک تھا جس کی سوئیاں ایک بجا رہی تھیں۔ پانی گرنے کی آواز اب رک گئی تھی۔ ٹھیک آدھے منٹ کے بعد وہ باتھ گاؤن پہنے باہر نکل آیا۔ اس پر نظر پڑی تو ٹھٹک گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اب بھرپور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ریڈ کلر کے سلکی گاؤن میں اس کا گداز جسم پوری طرح نمایاں تھا اور جس انداز میں وہ مسکرا رہی تھی' اس میں ایک نادیدہ کشش تھی اور وہ کسی مقناطیس کی طرح کھنچتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے آ کر اس نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور آہستگی سے اس کے سلکی گاؤن کی نرماہٹ محسوس کی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

''کیا خیال ہے، پہلے شیمپین ہو جائے؟'' اس نے کہا تو وہ ایک نظر سامنے ٹیبل پر رکھی شیمپین کی بوتل پر ڈالتا ہوا اسے چھوڑ کر آگے آ گیا۔

''بہت خوب۔'' وہ بوتل ہاتھ میں لے کر توصیفی نظر اس پر ڈال کر بولا۔ ''یہ کہاں سے ملی؟''

''بس مل گئی۔'' وہ بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر آگے کو جھکی اور گلاس میں ڈالنے لگی۔ وہ دعوتِ نظارہ دے رہی تھی اور وہ فیض یاب بھی ہو رہا تھا۔ اس کے اپنی طرف بڑھتے مخملی ہاتھ کو اس نے گلاس سمیت پکڑ لیا پھر گلاس لے کر ٹیبل پر رکھ دیا اور گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''تو ثابت ہو گیا کہ دولت میں بڑی طاقت ہے۔'' وہ اس کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے بولا اور پھر آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ''تم اس خوف میں خود کو میرے سپرد کرنے آئی ہو کہ کہیں یہ اربوں کی دولت تم سے چھن نہ جائے... لیکن حسن کی یہ تحقیر مجھے کچھ پسند نہیں آئی۔''

''تو ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔'' وہ ایک دم کندھے اچکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اس اعتماد نے جبران کو چونکا دیا۔ وہ جتنی ٹیڑھی تھی، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا یہاں آنا لازماً اس کی کوئی چال تھی۔

''بیٹھو، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ باہر اتنا وقت نہیں مل سکتا اسی لیے تمہیں یہاں بلوایا تھا۔'' وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔ سارہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر دوبارہ بیٹھ گئی۔ وہ اسے اس کے پھوپھا اور قاسم کے موجودہ منصوبے کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ اسے پوری توجہ سے سن رہی تھی اور سننے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہو رہی تھی۔

''ہوں... تو یہ بات ہے۔'' اس کی بات کے اختتام پر وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''پھر تم نے کیا حل نکالا ہے؟''

''میں ان کی چال انہی پر الٹوں گا۔'' وہ بولا اور پھر دھیرے سے اسے اپنا منصوبہ بتانے لگا جسے سن کر وہ مسکرا دی اور تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اچھی منصوبہ بندی ہے، میں حیران ہوں کہ نواب سکندر حیات اتنے خطرناک لوگوں کے ساتھ اتنے عرصے سے کیسے رہ رہے ہیں۔''

''وہ یونہی تو نواب نہیں ہیں۔ بہت گہرے ہیں ورنہ تو یہ لوگ اب تک انہیں کھا چکے ہوتے۔'' وہ بولا پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔

''نواب صاحب نے تمہیں خزانے کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟'' وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

''ہوں... تو میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا، یہ خزانہ ہی تمہیں یہاں کھینچ کر لایا ہے۔ بہرکیف ایسی کوئی بات نہیں ہوئی مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی اس کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔''

''بس کسی طریقے سے تم جلد از جلد ان سے پتا کرو کہ خزانہ کہاں ہے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مافیا کے لوگ یقیناً جان بھی چکے ہوں گے کہ میں یہاں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتی ہوں۔ جیسے ہی پتا چلا، تمہیں بتاؤں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔ کسی نے مجھے میرے کمرے میں نہ پایا تو بہت گڑبڑ ہو سکتی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے

بولی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''سنو۔'' وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ''میرے ساتھ شیمپین نہیں پیو گی؟'' جبران نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں، میں یہ نہیں پیتی۔ تمہارے لیے لائی تھی مگر...''

''مگر کیا...؟''

''تم اسے پینا مت۔'' وہ یہ کہتے ہی چلی گئی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کا شک صحیح تھا۔

☆☆☆

نواب سکندر حیات کی پوری حویلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ رات میں دن کا سماں ہو رہا تھا۔ تمام مہمان آ چکے تھے۔ پارٹی پورے عروج پر تھی۔ نواب سکندر اپنی پوتی کا تعارف سب سے کروا چکے تھے۔ جہاں سب لوگوں کے لیے یہ ایک حیران کن خبر تھی، وہیں وہ سب اس کی خوب صورتی سے بھی متاثر تھے۔ جن کے بیٹے جوان تھے وہ تو کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ بہانے بہانے سے اشمل کے قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ قاسم کا خوش شکل بیٹا بھی اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ زمرد کی صرف دو بیٹیاں تھیں جبکہ زونیرہ کا بیٹا کافی چھوٹا تھا۔ اس بنا پر وہ اشمل کو اپنی بہو بنانے سے قاصر تھیں۔ اسی لیے دور سے یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر تلملا رہی تھیں۔ اندر ہی اندر کسی لاوے کی طرح پک رہی تھیں مگر پھٹنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ دل ہی دل میں اس کے خلاف پلاننگ کر رہی تھیں جبکہ ان کے بچے بچیاں اشمل سے ہنس ہنس کر گپیں لگا رہے تھے۔ انہیں اپنی یہ کچھ دیسی کچھ ولایتی کزن کافی پسند آئی تھی۔

مہمانوں میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے جن کا تعلق ہر شعبے سے تھا۔ مقصد یہ تھا کہ سب اشمل کے بارے میں اچھی طرح جان جائیں اور آئندہ مستقبل میں ان کی پوتی کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور پھر آہستہ آہستہ مہمان رخصت ہونے لگے۔ نواب صاحب کے ساتھ اشمل بھی بیرونی گیٹ پر کھڑی سب کو الوداع کہہ رہی تھی۔ حویلی کے افراد بھی اِدھر اُدھر ہو گئے' اچانک ہی ایک زوردار آواز کے ساتھ ہی کچھ پھٹا اور دھواں پھیلنے لگا۔ دھماکا اتنا زوردار تھا کہ کافی فاصلے پر گیٹ پر کھڑے نواب صاحب اور اشمل کے علاوہ گھر کے کچھ افراد بھی اچھل کر دور جا گرے تھے۔ ایک دو کے علاوہ سب کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ دھماکا وہیں ہوا تھا جہاں نواب صاحب اور اشمل کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ دھماکے کا مقصد نواب صاحب کے ساتھ ان کی پوتی کو نقصان پہنچانا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سب دھماکے کی جگہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ نواب صاحب جن کو ہلکی پھلکی خراشیں آئی تھیں' اب کھڑے سیکیورٹی گارڈز پر گرج رہے تھے۔

''مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجرم چاہیے اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مجرم یہیں کہیں ہے۔'' وہ غضب ناک انداز میں بولے۔ اشمل نے ایک نظر جبران پر ڈالی اور پھر کن انکھیوں سے اپنے دونوں پھوپھا اور قاسم ...... پر نظر ڈالی جو چہرے پر مصنوعی تاثرات بکھیرے کھڑے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ دل ہی دل میں وہ بہت خوش ہوں گے مگر ان کی یہ خوشی کچھ ہی دیر میں ختم ہونے والی تھی۔ اس کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ آگے بڑھ کر اپنے دادا کے پاس آ گئی۔

''دادا جان! یہ سب کچھ میری آمد کے ساتھ ہی شروع ہوا ہے۔ کوئی ہے جسے میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔'' وہ معصومیت سے بولی۔ ایک دم ہی زبیر اور ماجد نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اشمل نے ان کے لیے جیسے راہ ہموار کر دی تھی۔

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس معاملے میں حویلی کا کوئی فرد ملوث ہے۔ برسوں سے یہاں فنکشن اور پارٹیز ہوتی رہی ہیں مگر ایسی گھٹیا حرکت کبھی کسی نے نہیں کی۔'' زبیر بولا تو ماجد نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''بالکل... یہ سب کرنے والا کوئی نووارد ہے۔ مجھے یقین ہے وہ جبران ہی ہو سکتا ہے کیونکہ جب سے یہ اشمل بچی کے ساتھ ہے کوئی نہ کوئی خوفناک واقعہ ہو رہا ہے۔''

''تم سب یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو؟'' نواب صاحب گہری نظر ان پر ڈال کر بولے جبکہ جبران سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔ وہ اس کہانی کے کلائمیکس پر پہنچنے کا منتظر تھا جبکہ باقی لوگ گہری ...... نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''وجہ صاف ظاہر ہے نواب صاحب! اسے چونکہ پتا ہے کہ اشمل آپ جیسے ارب پتی کی پوتی ہے اسی لیے ڈرامائی انداز میں یہ یہاں تک پہنچا تاکہ آپ کا اعتماد حاصل کر سکے... ورنہ سوچیے کہ اس کے پاس اسلحہ کہاں سے آیا جس سے اس نے اشمل پر حملہ کرنے والے گارڈز کو مارا... اور وہ بھی سائلنسر لگے پستول سے۔'' قاسم نے بھی اپنا نکتۂ نظر پیش کیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ پستول سائلنسر والا تھا؟'' نواب صاحب کڑے تیور میں بولے تو وہ اچانک گڑبڑا گیا مگر پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''اس کیس کی تفتیش چونکہ انسپکٹر آصف کر رہا ہے، اسی

نے کچھ دیر پہلے پارٹی میں مجھے بتایا تھا اور اسے میں نے فون بھی کر دیا ہے۔ وہ راستے میں ہی تھا، بس آنے والا ہے۔'' اس کی بات کے خاتمے پر جبران اور اشمل نے ایک دوسرے کو دیکھا، ان کے چہروں پر حیرانی تھی۔

☆☆☆

نواب سکندر خاموشی سے کھڑے سب کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر ان کی نظریں جبران پر ٹھہر گئیں۔ انسپکٹر آصف آچکا تھا اور ساری صورتِ حال کا جائزہ بھی لے چکا تھا۔

''نواب صاحب! جس کسی نے بھی دھماکا کروایا یا کیا ہے، اس کا مقصد آپ کو مارنا یا نقصان پہنچانا ہرگز نہیں لگتا... کیونکہ اس کے لیے یہ سب کرنا اس وقت بھی آسان تھا جب آپ لوگ یہاں بیٹھے تھے۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے، اس سلسلے میں تم کیا کہو گے جبران؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔ جبران نے پہلے ایک نظر سب پر ڈالی۔ ماجد، زبیر اور قاسم کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی پھر ایک گہری سانس لے کر خود کو جواب کے لیے تیار کیا۔

''نواب صاحب! میں بھی انسپکٹر صاحب سے متفق ہوں۔ دھماکا کرنے والے کا مقصد واقعی آپ کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ مجھے یہاں سے ہٹانا تھا۔''

''مگر کوئی ایسا کیوں چاہے گا؟'' نواب صاحب بولے۔

''کیونکہ اسے مجھ سے کوئی خطرہ ہے۔ اسے یہ خوف لاحق ہے کہ جس طرح میں اشمل کو بچا کر یہاں لایا ہوں، اسی طرح مستقبل میں بھی اس کی راہ میں ایسی ہی رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہوں... اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔''

''یہ سب بکواس ہے، خود کو بچانے کے ہتھکنڈے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس سب کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔ مجھے تو یہ شبہ بھی ہے کہ اسے .... دشمنوں نے ہی بھیجا ہے۔'' ماجد بھڑک کر بولا۔ اسی وقت سیکیورٹی انچارج صوبے دار یعقوب نے آ کر بتایا کہ بم فٹ کرنے سے پہلے کیمرے کے تار پہلے ہی کاٹ دیے گئے تھے تاکہ اندر کیمرا مین کو پتا نہ چل سکے۔ اب بظاہر مجرم کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور سب کا شک جبران پر جا رہا تھا اور وہ بھی اسی موقع کا منتظر تھا۔

''نواب صاحب! اب وقت آگیا ہے کہ آپ کو آپ کے دشمن سے متعارف کرواؤں۔ مجھے اس ساری پلاننگ کا پہلے سے پتا تھا۔ میں نے کیمرے کے کٹے ہوئے تاروں کو بھی دیکھ لیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میرے پاس خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا ثبوت ہے۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا تو سب حیرانی سے پلکیں جھپکائے بغیر اس کو دیکھنے لگے جبکہ سب لوگوں کے منہ بھی تعجب سے کھل گئے۔ جبران نے جیب سے موبائل نکالا اور پھر اس کے کچھ بٹن پریس کرنے کے بعد ریکارڈ مووی کو پلے کر کے نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ نواب صاحب جیسے جیسے دیکھ رہے تھے، ویسے ویسے ان کا چہرہ غضب ناک ہو رہا تھا۔ یہ کوئی دو منٹ کی مووی تھی جو جبران نے چھپ کر اپنے موبائل کیمرے کی مدد سے بنائی تھی۔

مووی میں قاسم ایک گارڈ کے ساتھ کیمرے کی تاریں کاٹتے اور پھر بم سیٹ کرتے نظر آ رہا تھا۔ مجرم سامنے آچکا تھا۔ نواب صاحب کے بعد انسپکٹر آصف اور پھر باقی لوگوں نے بھی اس منظر کو دیکھا تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''آصف صاحب! فوراً سے پیشتر اس شخص کو میری نظروں کے سامنے سے غائب کر دیں ورنہ یہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔'' نواب صاحب غضب ناک لہجے میں بولے جبکہ قاسم کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں، کچھ یہی کیفیت زبیر اور ماجد کی بھی تھی۔

''لیکن میں نے اکیلے یہ کام نہیں کیا، زبیر اور ماجد بھی میرے اس منصوبے میں برابر کے شریک ہیں۔'' انسپکٹر آصف اسے ہتھکڑی لگانے بڑھا تو وہ منمنایا۔ زبیر اور ماجد تیزی سے پیچھے ہٹے۔

''بکواس کر رہا ہے... یہ اپنے ساتھ ہمیں بھی پھنسوا رہا ہے۔ بھلا ہم کیوں ایسی حرکت کرنے لگے؟'' ان دونوں نے خود کو اس معاملے سے بری الذمہ قرار دیا، بظاہر ان کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں تھا اس لیے قاسم کے لاکھ واویلا کرنے کے باوجود پولیس اسے اور اس کا ساتھ دینے والے گارڈ کو ہتھکڑی پہنا چکی تھی۔

''میرا تو بیٹا بیرسٹر ہے، آج نہیں تو کل میں نکل ہی آؤں گا مگر یاد رکھنا تم لوگوں کو اپنی گھناؤنی حرکتوں کی اس سے زیادہ سزا ملے گی۔'' جاتے جاتے وہ زبیر اور ماجد سے بولا۔

''خس کم جہاں پاک۔'' ماجد بڑبڑایا۔ دولت کا ایک طلب گار رخصت ہو چکا تھا۔ قاسم کے ساتھ ہی اس کا بیٹا حارث بھی حویلی سے نکل گیا۔

''گڈ جبران بیٹا! تم نے تو بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہم اپنے غلط اندازے کی تم سے معافی چاہتے ہیں۔'' وہ دونوں اب نواب صاحب کے پاس کھڑے جبران سے بولے تو وہ مسکرا دیا۔ وہ پھنسوانا چاہتا تو ان کو بھی پھنسوا سکتا تھا

مگر فی الحال وہ حویلی میں زیادہ گڑبڑ نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

پارٹی میں ہونے والے دھماکے کے بعد نواب صاحب کی تشویش کافی بڑھ چکی تھی۔ اندر ہی اندر سب انتظامات کروا کے انہوں نے اپنی تمام جائداد کا وارث اپنی پوتی اشمل کو بنا دیا تھا اور اشمل کو یہ بات بتا کر انہوں نے جائداد کے پیپرز کی ایک کاپی اس کے علم میں لا کر ایک خفیہ جگہ رکھوا دی۔ اشمل کافی خوش تھی۔ اس کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اب وہ جلد از جلد خزانہ حاصل کر کے حویلی سے جانا چاہ رہی تھی جہاں ہر طرف دشمن گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اگر دشمنوں کو وراثت کی اس منتقلی کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ لازماً اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ لیکن نواب صاحب نے ابھی تک خزانے کا راز نہیں اگلا تھا۔ وہ شاید کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ اشمل بھی اندر ہی اندر بے چین تھی مگر بظاہر اس کا اظہار کر کے خود کو شک کی زد میں نہیں لانا چاہتی تھی جبکہ ہر گزرتا دن جبران پر بھاری پڑ رہا تھا۔ مافیا کے لوگ بظاہر خاموش تھے مگر اس خاموشی میں چھپے طوفان سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے وہ کافی بے چین تھا۔ اس دن اچانک ہی نواب صاحب نے شہر جانے کا پروگرام بنا لیا تو جبران اور اشمل کے چہرے کھل اٹھے۔ نواب صاحب کے جاتے ہی وہ اسے ان کے کمرے میں لے آئی۔

کمرے میں آتے ہی انہوں نے اِدھر اُدھر تلاشی شروع کر دی۔ انہیں یقین تھا کہ خزانہ یا تو اسی کمرے میں کہیں موجود تھا یا پھر اس تک پہنچنے کا راستہ یہیں سے تھا۔ کچھ یاد آنے پر اشمل کمرے میں لگی نواب صاحب کی اس بڑے فریم والی تصویر کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ یہ وہی تصویر تھی جسے وہ کچھ دن پہلے بھی نواب صاحب سے باتیں کرتے ہوئے غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ تصویر کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی لگی تھی۔ اسی بات نے اسے پہلے بھی چونکایا تھا۔ اس کے کہنے پر جبران نے تصویر کو ہٹایا۔ اس کے نیچے ایک ابھری ہوئی کیل تھی۔ جبران نے اسے پہلے اپنی طرف کھینچا پھر دائیں بائیں ہلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس کے چہرے پر قدرے مایوسی پھیل گئی۔ اس نے غصے سے کیل پر ہاتھ مارا۔ ہاتھ مار کر وہ پلٹا ہی تھا کہ کمرے میں ہلکی سی گھر گھر کی آواز پیدا ہونے لگی۔ ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر خوشی سے ان کے چہرے دمک اٹھے۔ آواز نواب صاحب کے اٹیچ باتھ روم کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھے۔ باتھ روم میں آتے ہی ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس کے نیچے اتنا بڑا خلا نمودار ہو گیا کہ ایک فرد بہ آسانی اندر جا سکتا تھا۔ باتھ روم کے نیچے اس طرح کوئی خفیہ جگہ ہو گی، یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''چلیں؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''نہیں، میں یہیں نگرانی کرتی ہوں تم جا کر دیکھو۔'' اسے خلا کے اندھیرے سے خوف سا محسوس ہوا۔

''او کے، میں دیکھتا ہوں۔ کوئی ٹارچ وغیرہ ہے؟''

''ہاں، بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں ہے، میں لاتی ہوں۔'' وہ اندر گئی اور ٹارچ لے کر آ گئی۔ نواب صاحب نے جب دراز سے البم نکالی تھی تو وہیں یہ ٹارچ اسے نظر آئی تھی۔

''گڈ!'' وہ ٹارچ لیتے ہوئے بولا اور پھر اسے روشن کر کے نیچے اتر گیا۔ یہ زینہ تھا جو نیچے جا کر ایک لمبی راہداری میں ختم ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر یہ راہداری ایک سرنگ کی سی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سرنگ کافی طویل لگ رہی تھی۔ وہ واپس پلٹ آیا۔

اشمل کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر بیڈ روم کی طرف آ گئی۔ چند ہی لمحوں میں جبران واپس آ گیا۔ وہ کافی مضطرب ہو کر اس کی طرف پلٹی۔

''خزانہ مل گیا...؟''

''نہیں، میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ نیچے ایک طویل سرنگ ہے۔ مجھے کچھ دیر لگ جائے گی، تم گھبرانا مت۔''

''میں نہیں گھبراؤں گی، تم بس جلدی سے جاؤ۔'' وہ قدرے اکتا کر بولی تو وہ سر ہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اسے گئے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ اشمل بار بار دروازے پر آ کر باہر دیکھ لیتی تھی۔ فی الوقت کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے اتنی دیر لگانے پر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''کہاں چلا گیا ....؟'' وہ بڑبڑائی۔ ''کہیں نیچے کوئی دوسرا راستہ تو نہیں جہاں سے خزانہ لے کر فرار ہو گیا ہو۔'' اسے یکا یک ایک دوسری سوچ نے آ گھیرا مگر اس خیال کو اس نے فوراً ہی جھٹک دیا۔

''نہیں وہ... خزانہ لے کر بھاگنے والوں میں سے نہیں ہو سکتا اور مجھے یوں چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا۔'' اس نے خود کو مطمئن کیا مگر اندر ہی اندر اتنا وقت لگانے پر فکرمند بھی ہو رہی تھی۔ پانچ منٹ کے مزید صبر آزما انتظار کے بعد وہ بالآخر واپس آ گیا۔ وہ بے تابی سے اس کی جانب بڑھی۔

''میں ڈر گئی تھی، تم نے بہت دیر لگا دی؟'' وہ بولی اور پھر اس کے مایوس چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''کیا ہوا؟ یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

''یہاں کوئی خزانہ نہیں ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''ساری سرنگ چھان کر آیا ہوں۔''

''پھر تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' وہ شک آمیز لہجے میں بولی۔

جبران نے چونک کر اسے دیکھا۔

''محترمہ! پتا ہے یہ سرنگ کتنی طویل ہے... کم از کم بھی ڈیڑھ دو کلومیٹر!''

''کیا...؟''

''جی ہاں اور اس کی خاک چھان کر آیا ہوں۔'' وہ طنز سے بولا۔

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے، میرا مطلب ہے، اتنی طویل سرنگ بنانے کا مقصد کیا ہے... اگر یہاں خزانہ نہیں چھپایا گیا؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''پہلے وقتوں میں ایسی سرنگیں فرار وغیرہ کے لیے بنوائی جاتی تھیں۔ بوڑھے نے بھی اسی مقصد کے تحت تیار کرائی ہوگی اسی لیے تو اپنے بیڈ روم میں چور راستہ رکھا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ اس کے لہجے میں تھکن تھی اور اس کا لباس بھی گرد آلود ہو رہا تھا۔

''تو پھر خزانہ کہاں ہے؟''

''پوچھنا اپنے دادا جان سے۔'' وہ غصے سے تلملاتا ہوا کپڑے جھاڑ کر نواب صاحب کی دیوار پر آویزاں تصویر کی طرف بڑھا قدرے گھور کر اسے دیکھا اور پھر اسے پیچھے کر کے دبی ہوئی کیل کو باہر کی طرف کھینچا۔ گھرر گھرر کی آواز کے ساتھ ہی خلا واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ دونوں نے ایک تفصیلی نظر کمرے پر ڈالی اور مطمئن ہو کر باہر نکل گئے۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی واپس اپنے کمرے میں آئی چارجنگ پر لگے موبائل پر میسج کی ٹون بجی۔ وہ سیدھی موبائل کی طرف بڑھی۔ اس کے پاپا جمال کی مسڈ کالز کے علاوہ پیغام آیا ہوا تھا۔ اس نے پیغام پڑھا تو پریشان سی ہو گئی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ کل شام کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس نے فوراً کال بیک کی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

''کیا مصیبت ہے، یہ اٹینڈ کیوں نہیں کر رہے؟'' اس نے جھنجلا کر دوبارہ کال کی، اس مرتبہ کال ریسیو کر لی گئی۔ کال ریسیو کرنے والی اس کی ماں عرشیہ تھی۔

''مما! پاپا کہاں گئے ہیں؟'' وہ بولی تو اس کی مما نے اسے بتایا کہ اس کے پاپا کچھ شاپنگ کرنے مارکیٹ گئے ہیں۔

''مما! آپ انہیں منع کریں یہاں آنے سے۔'' وہ بولی اور پھر انہیں اپنے جلد ہی واپس آنے کے بارے میں بتایا۔ اس کی مما نے اسے بتایا کہ جیسے ہی اس کے پاپا واپس آئیں گے، وہ انہیں بتا دے گی۔ اس نے او کے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور پھر خود باہر نکل آئی۔ وہ اب نئے سرے سے حویلی کا جائزہ لینا چاہ رہی تھی تاکہ خزانے کا کچھ سراغ لگا سکے۔ اس کا رخ لائبریری کی طرف تھا کیونکہ زیادہ تر خزانے وغیرہ ایسی جگہوں پر ہی چھپائے جاتے ہیں۔ لائبریری کے دروازے پر اسے علینہ مل گئی اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

''اوہ... تو تمہیں بھی مطالعے کا شوق ہے؟''

''ہاں، کبھی کبھار پڑھ لیتی ہوں۔ بس کلیکشن دیکھنے آئی تھی۔'' وہ قدرے محتاط انداز میں بولی۔

''چلو پھر میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔'' اشمل اس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی تو اسے ناچار اس کی ہمراہی میں جانا پڑا۔ یہ کافی بڑی لائبریری تھی۔ علینہ اسے مختلف شیلفس میں رکھی کتابوں کے بارے میں بتانے لگی اور وہ اس کی بات سننے کے ساتھ ساتھ لائبریری کا جائزہ بھی لیتی رہی۔

''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' علینہ نے اس کی عدم دلچسپی محسوس کر کے پُرجوش لہجے میں پوچھا تو وہ چونک گئی۔

''محبت...؟''

''ہاں، تم تو امریکا جیسے ملک سے آئی ہو، کسی کو پسند تو کرتی ہی ہوگی؟''

''پسند...'' اسے ایک دم اپنے امریکی دوست یاد آ گئے جن کو حیرت انگیز طور پر وہ یہاں آ کر تقریباً بھول ہی گئی تھی۔ وہ ان کے بھیجے گئے ایس ایم ایس کے جواب دے دیتی تھی مگر فون پر ابھی تک رابطہ نہیں ہوا تھا۔

''کہاں کھو گئیں؟'' علینہ معنی خیز انداز میں بولی تو وہ سر جھٹک کر ہنس دی۔

''ایسی کوئی بات نہیں، وہ سب میرے اچھے دوست ہیں مگر محبت وغیرہ میں کسی سے نہیں کرتی۔'' جواب دیتے ہی جبران کا تصور یک دم ہی اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس رات جس طرح اس نے اسے ریجیکٹ کیا تھا، غصے کے

باوجود اسے وہ سب اچھا لگا تھا۔

''اچھا... حیرت ہے!'' علینہ اس کے انکار پر حیران ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے ہنس کر اسے اپنے اور ڈاکٹر عامر کے بارے میں بتانے لگی۔ جسے اشمل کافی دلچسپی سے سننے لگی۔ جب اس نے اپنے بھاگ جانے کا بتایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''بڑی دلچسپ کہانی ہے۔''

''ہاں، ہے تو دلچسپ مگر وہ بدھو بھاگنے پر رضامند نہیں ہے۔ اسے کسی معجزے کا انتظار ہے مگر میرے والد اور سب سے بڑھ کر نانا جان کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''اوہ... پھر تو بھاگنا واقعی.... ضروری ہے۔''

''تھینکس، تمہارے خیالات مجھ سے کتنے ملتے ہیں۔'' علینہ جوش سے بولی تو اسے یاد آیا کہ اسے بھی یہاں سے جلد ہی بھاگنا ہے مگر کس کے ساتھ... خزانے کے ساتھ یا پھر جبران کے ساتھ؟ وہ سر جھٹک کر علینہ کے ساتھ لائبریری سے باہر آ گئی کیونکہ ایسی کوئی بھی چیز اسے نظر نہیں آئی تھی جس سے کچھ پتا چل سکتا۔

☆☆☆

نواب سکندر حیات رات گئے واپس لوٹے تھے۔ آتے ہی انہوں نے اشمل کو طلب کیا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں آئی، وہاں پہلے سے موجود جبران کو دیکھ کر قدرے پریشان ہو گئی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ نواب صاحب نے اپنے کمرے میں بھی شاید کوئی خفیہ کیمرا نصب کیا ہوا تھا جس کے ذریعے ان کی کارروائی بھی چیک کر چکے تھے۔ اس نے جبران کے تاثرات نوٹ کیے مگر اسے اس کے چہرے پر ایسی کوئی پریشانی نظر نہ آئی۔

''آؤ اشمل بیٹی... بیٹھو۔'' نواب صاحب اسے دیکھ کر نرمی سے بولے تو اس کے حواس قدرے بحال ہوئے۔ اب وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تم دونوں کو میں نے اس لیے بلوایا ہے تاکہ اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں بتا سکوں۔''

''کیسا پروگرام؟'' وہ چونک گئی۔

''ہمیں کل رات یہاں سے نکلنا ہے کسی کو بھی بتائے بغیر۔ میں اسی سلسلے میں شہر گیا تھا۔ میں نے کل رات بارہ بجے کی فلائٹ کی سیٹس بک کروائی ہیں۔ ہم یہاں سے دس بجے نکلیں گے ائرپورٹ کے لیے۔''

''لیکن کیوں...؟'' وہ حیرانی سے بولی۔ جبران کے تاثرات بھی اس سے ملتے جلتے ہی تھے۔

''بس حویلی میں حالات کافی خراب ہوتے جا رہے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یہاں کوئی خطرہ ہو۔ قاسم کی گرفتاری کے بعد زبیر اور ماجد یقیناً جلد بازی میں کوئی احمقانہ حرکت کریں گے جو تمہارے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قاسم کے ساتھ یہ دونوں بھی اس دھماکے میں ملوث تھے مگر اپنی دونوں احمق بیٹیوں کی خاطر میں نے انہیں جیل نہیں بھجوایا۔ ساری جائداد تمہارے نام منتقل ہو چکی ہے سوائے اس حویلی کے۔ یہ میں نے زمرد اور زونیرہ کے نام کر دی ہے۔ دینا تو میں انہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں چاہتا تھا مگر مجھے پتا ہے ان کے نکھٹو شوہر انہیں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکیں گے۔ باغات کی انکم سے انہیں یہاں رہنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔'' وہ سانس لینے کو رکے تو اشمل بے تابی سے بولی۔

''لیکن اس کے لیے ہمیں چھپ کے جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے بیٹی... برسوں پہلے مجھے کہیں سے خزانہ ملا تھا۔ اس کے کچھ حصے سے میں نے کاروبار شروع کیا اور اللہ کے فضل سے یہ کاروبار اتنا پھیلا کہ مجھے مزید خزانہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ میں نے چھپا کر اپنی اگلی نسل کے لیے محفوظ کر دیا تھا، بہرحال یہ راز چھپا نہیں رہا تھا۔ میرے دشمنوں کے علاوہ حویلی کے مکینوں کو بھی اس کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اسی سلسلے میں میرا بیٹا اور بہو مارے گئے۔ مجھ پر کئی مرتبہ حملے کیے گئے اور بعد میں تمہاری آمد کے ساتھ ہی دشمن پھر سے سرگرم ہو گئے ہیں۔ بس اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم خزانہ لے کر چپکے سے نکل جائیں ورنہ یہاں نہ جانے اور کتنا خون خرابا ہوگا۔'' ان کی بات سن کر جبران اور اشمل کے چہرے دمک اٹھے۔

''لیکن وہ خزانہ کتنا ہے؟ میرا مطلب ہے ہم اسے.... ملک سے باہر تو نہیں لے جا سکتے۔'' اشمل قدرے فکرمندی سے بولی۔

''میرے شہر جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ خزانے کی مالیت کے لحاظ سے میں نے اپنے ایک سنار دوست سے اس کا سودا کر لیا ہے، وہ ہمیں ائرپورٹ پر ہی ملے گا جہاں ہم خزانہ اس کے حوالے کر دیں گے اور اس کا معاوضہ وہ چیک کی صورت میں کر دے گا جسے ہم بعد میں اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروا لیں گے۔''

''لیکن وہ خزانے کے سلسلے میں دھوکا بھی تو دے سکتا

ہے؟'' اس بار جبران بولا۔
''نہیں، وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے اور تمہیں اس راز میں شریک کرنے اور ساتھ لے جانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ تم خزانے کے ساتھ میری پوتی کی حفاظت بھی کرو گے۔'' وہ اسے دیکھ کر اعتماد سے بولے تو جبران خاموش ہو گیا۔ اسے مزید بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عنقریب سب کچھ اس کا ہونے والا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا کیونکہ اس طرح چپکے سے حویلی سے نکلنا اس کے اپنے حق میں بھی بہتر تھا۔
''مگر خزانہ ہے کہاں؟'' اشمل تجسس سے بولی۔
''وہ بھی میں کل رات کو ہی تم لوگوں کو بتاؤں گا۔ بس خاموشی سے اپنی تیاری رکھو۔ ہمارے جانے کے بارے میں کسی کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بولے تو دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔

☆☆☆

نواب صاحب کی ہمراہی میں وہ اسی سرنگ میں اترے تھے جہاں انہوں نے کل تلاشی لی تھی۔ زینے سے اتر کر نواب صاحب نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی مدد سے زینے کے نیچے ہی کوئی بٹن دبایا جس سے ساری سرنگ روشن ہو گئی۔ یہ روشنی سرنگ کی چھت میں لگے چھوٹے چھوٹے بلبوں سے نکل رہی تھی جو ہر دس فٹ کے فاصلے پر نصب تھے۔ وہ بجلی کی چھوٹی چھوٹی تاروں سے لٹکے ہوئے تھے۔ اندازاً کوئی چوتھے بلب کے پاس جا کر نواب صاحب رک گئے پھر انہوں نے اسی بلب کو زور سے نیچے کی طرف کھینچا تو ان کے دائیں جانب سرنگ کی دیوار میں ایک شگاف نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر اشمل نے جبران پر ایک طنزیہ نظر ڈالی۔
''ایجنٹ صاحب! دیکھ رہے ہیں خفیہ راستہ۔'' وہ اس کے کان میں بڑبڑائی۔ جبران اس کی بات پر بس مسکرا دیا۔ شگاف کے دوسری جانب بھی ایک طویل سرنگ تھی۔ انہوں نے سرنگ کے اندر ہی کتنے موڑ کاٹے لیکن سرنگ تو جیسے شیطان کی آنت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں چلتے ہوئے غالباً پون گھنٹا گزر چکا تھا مگر اس سرنگ کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔
''اُف دادا جان! اور کتنا چلنا ہے؟ میں تو تھک گئی ہوں۔''
''اب تو چند قدم رہ گئے ہیں کان آنے میں۔''
''کان آنے میں... کیا مطلب؟ کیا ہم کسی کان میں جا رہے ہیں؟'' وہ حیرانی سے بولی۔
''ہاں، یہ کوئلے کی پرانی کان ہے۔ برسوں پہلے یہاں کافی حادثات ہوئے تھے۔ اس کے اندر زہریلی گیس ہے جس کی وجہ سے دم گھٹنے سے مزدور مر جاتے تھے۔ اس لیے حکومت نے اسے بند کرا دیا کیونکہ اس دور میں اتنے وسائل نہیں تھے کہ یہاں پیسا خرچ کیا جاتا۔ اس کے بعد کی حکومتوں نے بھی یہاں دلچسپی نہیں لی۔ یہ کان چونکہ حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی اس لیے میں نے خزانہ یہاں چھپانے کا منصوبہ بنایا۔ اسی مقصد سے بعد میں یہ سرنگ بھی کھدوائی۔''
''اس سرنگ کی کھدائی میں بھی آپ کی کافی ذہانت ہے، بظاہر نیچے اترنے والا سیدھا باہر نکل جاتا ہو گا۔ سرنگ کے اندر اس سرنگ کے بارے میں کسی کا خیال نہیں جائے گا۔'' جبران تعریفی انداز میں بولا۔
''لیکن جن لوگوں سے آپ نے سرنگ کھدوائی انہیں تو کان کا پتا ہو گا۔'' اشمل بولی۔
''ان لوگوں کو میں نے کچھ پیسا دے کر پاکستان سے باہر بھجوا دیا تھا۔ ان میں ایک انجینئر اور تین مزدور تھے۔ ویسے بھی میں نے انہیں خزانے کے یہاں رکھنے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''
''دادا جان! یہ خزانہ کیا ہیرے جواہرات کی صورت میں ہے؟'' اشمل نے اشتیاق سے پوچھا۔
''نہیں، یہ سونے کی اینٹوں کی شکل میں ہے۔''
باتوں کے دوران میں پتا ہی نہیں چلا کہ کب سرنگ ختم ہو گئی۔ سامنے صاف دیوار تھی۔ نواب صاحب نے آگے بڑھ کر اس کو ایک خاص جگہ سے اندر کی طرف دھکیلا تو وہ دیوار کسی دروازے کی طرح کھل گئی۔ اندر ایک بوسیدہ سی کان تھی جس میں اندھیرا تھا۔
نواب صاحب نے اندر آ کر ایک بورڈ میں لگے مختلف بٹن کو دبایا تو چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ کان میں جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے بنا رکھے تھے۔ ہر طرف گرد پھیلی ہوئی تھی۔ اشمل کو ایک دم ہی کان کے اندر خوف محسوس ہوا۔ نواب سکندر کی ہمراہی میں وہ سامنے بنے ایک لوہے کے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ یہاں ایک پلیا سے نیچے اترنے کے لیے لفٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ لوہے کی چار بائی چار فٹ کی لفٹ تھی جو وہاں فکس مشین سے لگی موٹر کی مدد سے نیچے جاتی تھی۔ لفٹ میں بیٹھ کر نواب صاحب نے مشین پر لگے بٹن کو دبایا... تو ہلکے سے جھٹکے سے لفٹ بغیر کسی رکاوٹ کے نیچے سرکنے لگی۔ اتنے برسوں کے بعد بھی لفٹ کی کارکردگی میں اگر کوئی فرق نہیں آیا تھا تو اس کی وجہ نواب صاحب کا وہاں آتے رہنا تھا اور یہاں تک بجلی حویلی سے پہنچائی گئی تھی۔ لفٹ زمین تک پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ کان کا یہ حصہ کافی کشادہ تھا۔ یہاں کتنی ہی سرنگیں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی چھوٹی ریل کی پٹری نظر آ رہی تھی... جہاں کوئلہ لادنے کے لیے لوہے کی ٹرالیاں کھڑی تھیں۔ ''کان'' میں پھیلی گیس کی مخصوص بو شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی طرف مزید بڑھتے، ایک تیز آواز نے ان کے قدم ساکت کر دیے۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا تو ان کے بالکل پیچھے ایک ادھیڑ عمر خوفناک چہرے والا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے اطراف دو آدمی ہاتھوں میں ریوالور پکڑے کھڑے تھے اور ان کا رخ انہی کی جانب تھا۔ سب کی آنکھیں دہشت اور خوف سے پھیل گئیں۔

☆☆☆

''تت... تم... شادے ہوتا؟'' نواب سکندر نے قیمتی سوٹ میں ملبوس اس ادھیڑ عمر آدمی سے کہا جس کے چہرے پر...... زخموں کے نشانات نے اسے کافی بھیانک بنا دیا تھا۔
''تمہاری یادداشت کی داد دیتا ہوں حیاتے... میرا مطلب ہے نواب سکندر حیات خان!'' وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اور پھر زور سے ہنس دیا۔
''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' نواب سکندر نے.... رعب دار آواز میں کہا۔ ''تم تو مافیا ایجنٹ بن کر باہر چلے گئے تھے؟''
''پرانے دشمنوں کے بارے میں واقفیت رکھنا اچھی عادت ہے۔ یاد کرو، کسی زمانے میں ہم اچھے دوست تھے مگر پھر تم نے غداری کی۔'' وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔ ''اکیلے ہی خزانہ لے کر فرار ہو گئے اور پھر اربوں کی دولت پر نواب بن گئے۔''
''بکواس... غداری میں نے نہیں، تم نے کی۔'' نواب صاحب غصے سے دہاڑے۔ ''دھوکا تم نے دیا مجھے بھی اور غیاثے کو بھی۔ تم اکیلے ہی اس دولت کو ہڑپ کرنا چاہتے تھے، ہم دونوں کا پتا صاف کر کے۔ اور غیاثے بے چارے کو تو تم نے مار بھی دیا۔ تم نے مجھے بھی زخمی کیا تھا مگر پھر پولیس کے آنے پر تم خزانہ لے کر بھاگ گئے۔ پولیس تمہیں بھاگتا دیکھ کر تمہارے پیچھے گئی..... تمہیں اندازہ تھا کہ تم پکڑے جاؤ گے اسی لیے خزانے کے بیگ وہیں جھاڑیوں میں پھینک کر بھاگ گئے۔ چونکہ تمہیں اندازہ تھا کہ پولیس سے بہتر وہ بیگز میرے پاس محفوظ رہتے اور بعد میں آ کر تم انہیں مجھ سے لے لیتے... مگر میں وہ بیگ لے کر اس نامعلوم گاؤں میں آ کر

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نومبر 2010ء کے شمارے کی ایک جھلک

انجم انصار اور **عالیہ بخاری** کے سلسلے وار ناول

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے۔ کچھ اسی تناظر میں **قیصرہ حیات** کا ناول

ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی دبیز تہیں بھی منعکس ہونے سے نہیں روک سکتیں...... زندگی کے نشیب و فراز میں اپنی منزل کو ڈھونڈتی لڑکی کی کہانی
ذکیہ بلگرامی کا دلچسپ ناول

محبت خوابوں اور خواہشوں کی رہ گزر ہے...... اس رہ گزر پر ہر کوئی ایک تجربے سے دوچار ہوتا ہے...... محبت کا ایک ایسا ہی اچھوتا رنگ لیے **شگفتہ بھٹی** کی تحریر

عمرِ رواں کے ان گنت لمحوں میں سے ایک لمحہ کشید کرنا ہر حساس دل کی خواہش ہوتی ہے...... جس میں کچھ خوابوں کی تعبیر لازمی ہو جاتی ہے ایسے ہی لمحوں کی خواہش لیے **صائمہ قیصر** کی تحریر

عالیہ حرا، سکینہ فرخ، ثمینہ لودھی، راحت وفا راجپوت، سدرہ سحر عمران، سعدیہ رئیس، صبا نور، نیر فہیم عطاری
اور **شاہدہ ملک** کی دلچسپ تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

رہنے لگا۔۔۔ کیونکہ خزانہ کلّی طور پر میری ذہانت سے اور محنت سے ہاتھ لگا تھا۔ گورنمنٹ کی خزانے والی گاڑی سے اسے صرف میں نے لوٹا تھا پھر تم لوگ حصے دار بن کر آ گئے۔ چونکہ خزانے پر حق میرا تھا اس لیے مجھے ہی ملا۔'' نواب سکندر بولے تو اشمل اور جبران حیرانی سے خزانے کی کہانی کی اس حقیقت پر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اشمل کی تو حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ اسے خزانے کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ اربوں کی دولت کی وارث بن چکی تھی۔ اسے پہلے ہی رفو چکر ہو جانا چاہیے تھا مگر خزانے کے لالچ نے اسے بالآخر یہاں پھنسا دیا تھا جبکہ جبران کی سٹی تو شادے عرف شمشاد اختر کو دیکھ کر گم ہو گئی تھی جو اس کا گینگ لیڈر تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ اور یہاں سے فرار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''تم اچھے کہانی گو ہو مگر تمہاری کہانی میں کچھ کمی ہے...''

''اپنا منہ بند کرو اور مجھے بتاؤ کہ تم یہاں پہنچے کیسے؟'' نواب سکندر کے لہجے میں خوف نام کا شائبہ تک نہ تھا۔

''میں یہاں اپنے اس لنگور کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا ہوں۔'' اس کا اشارہ جبران کی طرف تھا۔ ''جو تمہاری بنا سپتی پوتی کو کسی ہیرو کی طرح بچا کر یہاں آ چھپا ہے۔ اس نے بھی تمہاری طرح مجھ سے غداری کی ہے۔'' اس کی بات کے خاتمے پر نواب صاحب نے بےیقین نظروں سے جبران کو دیکھا۔

''یہ صحیح کہہ رہا ہے نواب صاحب! لیکن میں نے یہ سب مافیا کی دلدل سے نکلنے کے لیے کیا ہے۔ میں نے آپ کو یا آپ کی پوتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

''ہاں... تو میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری کہانی میں کمی رہ گئی ہے۔'' شمشاد اختر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ نواب سکندر سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ شمشاد اختر کے اشارہ کرنے پر قریبی سرنگ کے اندر سے اس کے دو مسلح آدمی دو افراد کو لیے آگے آ گئے۔ نواب سکندر کی ان پر نظر پڑی تو وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے جبکہ اشمل کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی کیونکہ ان میں سے ایک اس کا باپ جمال تھا۔

''ان سے ملو کیونکہ یہ بھی یہیں منڈلا رہے تھے۔'' شمشاد اختر نے ان دونوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''پاپا! آپ یہاں .. میں نے آپ کو منع کیا تھا یہاں آنے سے۔'' وہ بے ساختہ جمال کی طرف بڑھی جس کی حالت کافی خستہ تھی۔ غالباً شمشاد اختر کے لوگوں نے اس کی خوب مرمت کی تھی۔

''رک جاؤ لڑکی۔'' اشمل کے آگے بڑھتے قدم شمشاد اختر کی آواز پر رک گئے جبکہ نواب سکندر ایک ٹک جمال کے ساتھ کھڑے اس آدمی کو دیکھے جا رہا تھا۔

''غیاثے! تم زندہ تھے مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ گولی تمہارے پیٹ میں لگی تھی اور...''

''اور تم سمجھے میں مر گیا ہوں اسی لیے تم نے مجھے ایک بار بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔'' وہ آدمی نفرت سے بولا۔ ''مجھے قریبی گاؤں کے کچھ لوگوں نے بچا لیا تھا میں کتنے دن زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا رہا اور وہیں میں نے فیصلہ کیا کہ تم سے اس کا حساب لے کر رہوں گا۔''

''لیکن میں نے تمہاری بیوی اور بچوں کا مکمل خیال رکھا تھا اور اپنی پوتی کے ساتھ انہیں امریکا بھجوا دیا تھا۔''

''یہ بھی تم نے اپنی پوتی کی خاطر کیا ورنہ تم اس کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتے۔ ویسے تم نے شمشاد کی بات پر غور نہیں کیا، یہ تمہاری پوتی نہیں ہے۔ یہ میری پوتی سارہ ہے، تمہاری پوتی بچپن میں ہی مر گئی تھی۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو نواب سکندر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور وہیں نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ وہ اس شکستہ جواری کی طرح لگ رہا تھا جس کا سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا۔

☆☆☆

''اب اپنی یہ ایکٹنگ بند کرو۔ جس غیاثے پر تمہیں مجھ سے زیادہ اعتماد تھا، دیکھ لو اس نے تمہیں کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ تمہاری پوتی کو مار کر اپنی پوتی کو تمہاری جائداد بٹورنے کے لیے بھیج دیا۔ اب آگے بڑھو اور خزانہ میرے حوالے کر دو۔''

''میں یہ خزانہ کسی کا ہونے نہیں دوں گا، تم سب دھوکے باز ہو۔'' وہ ایک نظر اپنے اردگرد موجود لوگوں پر ڈالتے ہوئے غصے سے بولے۔

''سیدھے طریقے سے بتا دو خزانہ کہاں ہے ورنہ میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گا اور یہاں تمہارا کوئی اپنا نہیں ہے جو تمہیں بچانے آئے گا۔'' شمشاد اختر سرد لہجے میں بولا لیکن نواب سکندر اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلے۔ شمشاد اختر نے اپنے ایک کارندے سے پستول لیا اور گولی چلانے ہی لگا تھا کہ جبران نے چیخ کر کہا۔

''رک جاؤ... یہاں ہر طرف گیس پھیلی ہوئی ہے۔ گولی چلاؤ گے تو سب مارے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر مجھے غصہ نہ دلاؤ اور سیدھے طریقے سے خزانہ میرے حوالے کر دو۔'' وہ اب بھی پستول نواب سکندر پر تانے کھڑا تھا۔ نواب سکندر بالآخر شکستہ سے ہو کر اٹھے اور مطلوبہ جگہ سے خزانہ نکالنے لگے۔ یہ لوہے کا بھاری صندوق تھا مگر جب اسے کھولا گیا تو وہ اندر سے خالی تھا۔ سب سے زیادہ شاک نواب سکندر کو لگا تھا۔

''یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی کل میں خزانہ چیک کر کے گیا ہوں۔'' وہ گہرے صدمے کی زد میں تھے۔

''ڈرامے بازی چھوڑو اور...''

''یقین کرو خزانے کے وہ دونوں بیگ میں نے یہیں رکھے تھے۔'' نواب سکندر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ شمشاد اختر نے کڑی نظروں سے غیاث محمد اور جمال کو دیکھا۔

''وہ بیگ لازماً تم لوگوں نے اٹھائے ہیں۔'' وہ غضب ناک ہو کر بولا جبکہ اشمل نے معنی خیز نظروں سے جبران کو دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی خود پر نظر پڑتے ہی اس نے اسے آنکھ ماری۔ وہ سمجھ گئی کہ خزانہ اسی کے پاس ہے۔

''نہیں... نہیں، بیگ ہم نے نہیں اٹھائے۔ ہم تو ابھی یہاں اسے ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ تم آ گئے۔''

''یہ ایسے نہیں مانیں گے۔ پکڑ لو اس کی پوتی کو اور اس کے ساتھ وہ حشر کرو کہ اس کی اگلی نسلیں بھی عبرت پکڑیں۔'' شمشاد اختر نے اپنے چیلوں کو آرڈر دیا تو وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور اسے گھسیٹنے لگے۔ خود کو ان کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے وہ چیخنے لگی۔

''آخری وارننگ دے رہا ہوں۔'' شمشاد اختر نے ایک مرتبہ پھر انہیں گھورا مگر وہ دونوں باپ بیٹا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے جبکہ جبران نے اب حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''یہ نہیں بتائیں گے مسٹر شمشاد چاہے تم میری بوٹی بوٹی نوچ لو۔'' اشمل نفرت سے انہیں دیکھ کر بولی۔ ''کیونکہ میں ان کی پوتی ہوں ہی نہیں۔'' اس نے ایک نیا انکشاف کیا تو سب حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

''تو پھر کون ہو تم؟'' شمشاد اختر جھنجلا کر بولا۔

''میں سارہ نہیں اشمل ہوں، نواب کی اصلی پوتی... کیونکہ سارہ کی ڈیتھ بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ اس کی ڈیتھ پر ہی ان لوگوں نے یہ سارا پلان بنایا۔ مجھے بچپن سے یہی بتایا کہ میں سارہ ہوں تاکہ جب میں بڑی ہو کر دادا کی اربوں کی دولت کی وارث بنوں تو خود کو ان کی بیٹی اور پوتی سمجھ کر ساری دولت ان کے قدموں میں لا پھینکوں۔''

چڑیا گھر سے دو شیر نکل بھاگے۔ آزادی کے تین ہفتے گزارنے کے بعد وہ دونوں بالکل اتفاقیہ طور پر ایک باغ میں ملے۔ ایک شیر خوب موٹا تازہ ہو رہا تھا جب کہ دوسرا سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گیا تھا۔

سوکھے شیر نے کہا: میں تو سوچ رہا ہوں کہ چڑیا گھر میں واپس چلا جاؤں۔ بیس دن ہونے کو آئے ہیں اور مجھے کھانے کو ایک چوہا تک نہیں ملا۔

"چڑیا گھر جانے سے بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ چلو۔" دوسرے شیر نے کہا۔ "میں پارلیمنٹ کے پیچھے واقع ایک باتھ روم کے قریب چھپا رہتا ہوں اور روزانہ ایک سیاستداں کو کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے اب تک کم از کم بیس سیاست دانوں کو ہڑپ کر لیا ہے لیکن ان کی تعداد میں آج تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔"

''میرے ساتھ ان کو بھی گرفتار کرو انسپکٹر کیونکہ خزانہ ان کے پاس ہے۔'' وہ غیاث محمد اور سکندر حیات کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''قومی خزانہ لوٹنے کے جرم میں، میں آپ دونوں کو بھی گرفتار کروں گا۔ گستاخی معاف نواب صاحب! لیکن جرم بہرحال جرم ہے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' نواب صاحب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے پھر اپنی پوتی کے پاس آ گئے۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ہی نواب کی اصل پوتی ہو۔'' شمشاد اختر نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''ثبوت البم میں لگی وہ تصویریں ہیں جو میرے دادا کو میرے بچپن سے ہی موصول ہوتی رہیں اور وہ سب کی سب میری ہیں۔''

''یہ جھوٹ ہے۔ سکندر حیات کو تمہاری پہلی تصویر ہم نے اس وقت بھیجی تھی جب تم آٹھ سال کی تھیں۔ اس سے پہلے تمہاری کوئی تصویر بھیجی نہیں گئی۔'' جمال تیز لہجے میں بولا۔

''آپ نے واقعی نہیں بھیجی تھیں کیونکہ وہ تصویریں دادا جان کو میرے ساتھ ہی امریکا جانے والی ملازمہ بھیجتی رہی تھی پھر اس کے مرنے پر دادا نے تم لوگوں کو تصویریں بھجوانے کے لیے کہا۔ سارہ اس وقت مر چکی تھی ورنہ تم میری تصویریں نہ بھیجتے بلکہ سارہ کی بھیجتے لیکن اس طرح تم لوگ بہت پہلے پکڑے جاتے۔ اور ہاں، سب سے بڑا ثبوت میرے ہونٹ پر موجود یہ پیدائشی تل ہے جو میرے باپ احمد خان کے ہونٹ پر بھی تھا۔ اس کے بعد تو شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔'' وہ شمشاد اختر کو گھورتے ہوئے بولی جبکہ نواب سکندر حیات اپنی پوتی کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''گڈ... خزانے کے ساتھ جائداد کی وارث بھی ہاتھ آگئی۔'' شمشاد اختر خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا۔''ان سب کو اوپر لے کر آؤ۔ اب ان کا علاج میں اپنی گولیوں سے کروں گا۔'' وہ بولا تو اسلحہ بردار انہیں دھکیلتے ہوئے لفٹ کے ذریعے اوپر لے جانے لگے۔ کان سے نکل کر وہ لوگ جیسے ہی سرنگ میں داخل ہوئے تو ساکت کھڑے رہ گئے۔ پولیس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

''تمہاری پاکستان میں آمد کے ساتھ ہی ہم الرٹ ہو گئے تھے۔'' انسپکٹر آصف ریوالور کو شمشاد اختر پر تان کر بولا۔ ''نہ نہ... کوئی غلط حرکت مت کرنا، ورنہ حوالات لے جانے کی زحمت بھی نہیں کروں گا۔''

''یہاں سے نکلنے کا جو پروگرام بنا تھا اسی پر عمل کرنا۔ یہاں ٹھہرنا مت۔ مجھے یقین ہے کہ جبران تمہارے لیے اچھا محافظ ثابت ہوگا۔ میں جیل سے رہا ہوتے ہی تمہارے پاس آؤں گا۔'' وہ آہستگی سے بولے تو اشمل نے سر ہلا دیا۔

اس کی آنکھیں اپنے دادا کی جدائی پر بھیگنے لگیں۔ وہ ایک دم ان سے لپٹ گئی۔ ''آئی لَو یو دادا جان!''

☆☆☆

امریکا جانے والا طیارہ پرواز کر چکا تھا۔ وہ دونوں اس وقت جہاز میں بیٹھے کچھ دیر پہلے نواب صاحب کے دوست کے ذریعے ملنے والے چیک کو دیکھ رہے تھے، یہ بھاری مالیت کا چیک تھا۔

''تم نے خزانہ کب چھپایا جبکہ تم تو آدھے گھنٹے میں ہی خالی ہاتھ واپس آگئے تھے؟'' اشمل نے کب سے ذہن میں کلبلاتا ہوا سوال پوچھا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

''اس وقت میں چور راستے کا سراغ ملتے ہی واپس آگیا تھا پھر رات کو سرنگ کے باہر والے راستے سے اندر جا کر خزانہ اٹھا کر چھپا آیا۔'' وہ بولا تو وہ اسے گھورنے لگی۔

''بڑے چالاک ہو تم' مجھے بھی نہیں بتایا۔ اِنی ہاؤ... دیکھو کتنی عجیب بات ہے نا کہ ہماری پہلی ملاقات بھی طیارے میں ہوئی اور شاید آخری بھی۔'' وہ قدرے افسردگی سے بولی۔

''لیکن میرا ایسا کوئی پلان نہیں ہے۔'' وہ اسے گہری...... نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شرما گئی۔

''بھئی مطلب صاف ہے۔ اب سان فرانسسکو میں تمہارا کوئی گھر تو رہا نہیں، بس میں نے سوچا کہ ایک گھر بنا لیتے ہیں۔'' وہ اس کے شرم سے لال ہوتے چہرے کو دیکھ کر بولا تو وہ خاموشی سے مسکرائی رہی۔ اس کی خاموشی ہی اس کا اقرار تھی۔

''سنو، وعدہ کرو کہ گھر میں تم میرا استقبال وہ ریڈ کلر کا گاؤن پہن کر کیا کرو گی۔ اُف! کیا بتاؤں اس دن سے میرا چین سکون لٹ گیا ہے جب سے تمہیں...'' وہ مزید بھی کچھ کہتا مگر اشمل نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا ہے...؟'' وہ گھور کر بولا۔

''باقی باتیں اس گھر میں پہنچنے کے بعد۔'' وہ مسکرا کر بولی تو جبران نے اسے دھیرے سے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شایع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کردی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔